

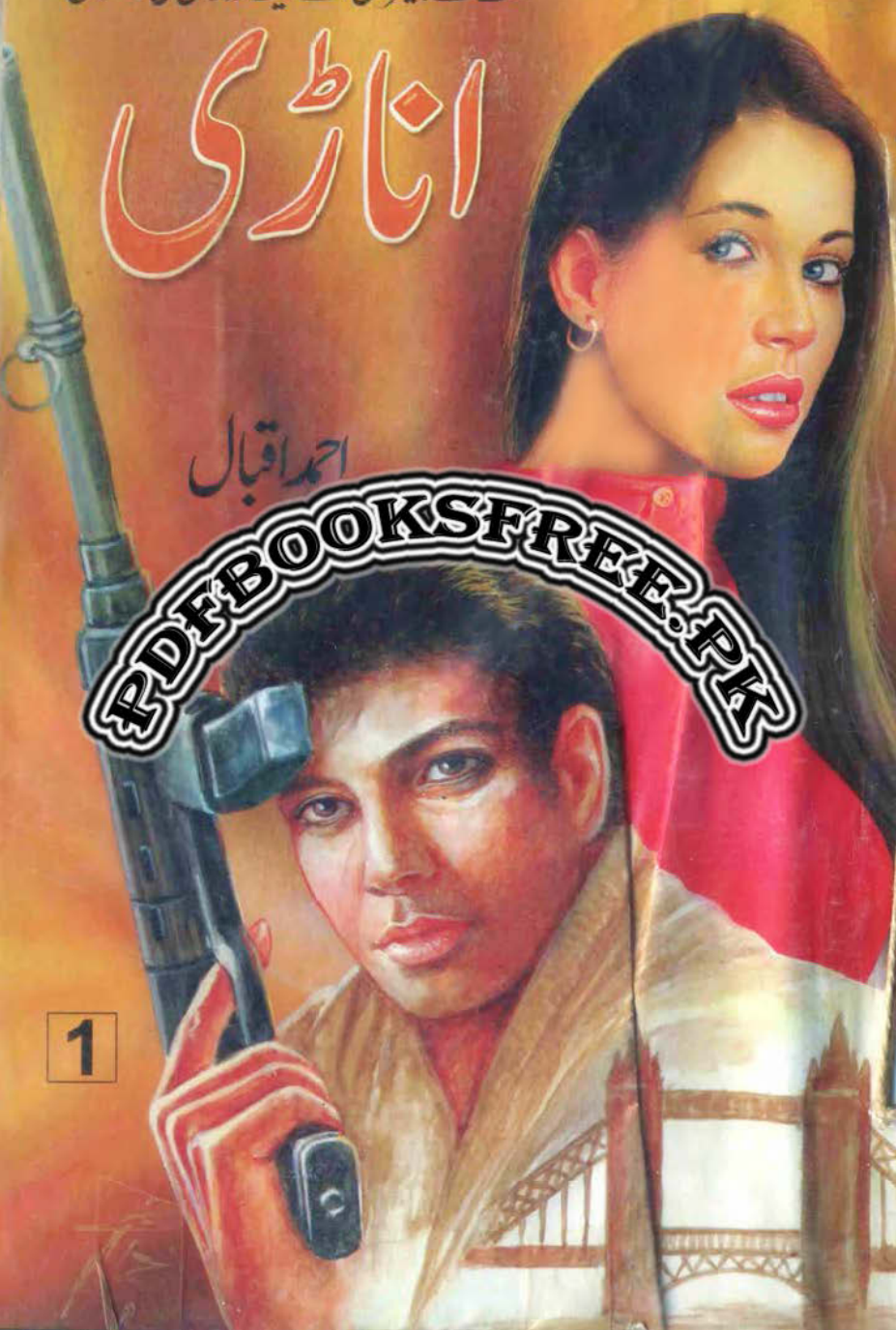
قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

انٹاری

احمد اقبال

PDFBOOKSFREE.PK

1



انٹرویو

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کٹھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیا بغیر لے گیا جہاں وہ انٹروی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا انٹروی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کا میا بیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل بھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اُس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ انٹروی سے کھلاڑی بننے کے بعد..... وہ لوٹا..... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لہجہ لہجہ تہوں سے لبریز اُس انٹروی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت دگل رنگ جذبیوں سے گندمی ایک تیز رفتار کہانی

لندن میں وہ میری آخری صبح تھی۔ اپنے پیڈروم کی گھڑی کے پردے ہٹا کے میں نے باہر کی دنیا کو دیکھا تو صبح مجھے اداس لگی۔ غم زدہ سورج نے بادلوں کی نقاب میں چہرہ چھپا رکھا تھا۔ بارش کے قطرے آسمان سے ٹپکنے والے آنسو بن گئے تھے۔ ٹریفک کا سیل رداں ایک سوگوار خاموشی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ افسردہ چہروں والے لندن کے باسی سرگوشی میں باتیں کرتے اور افسوس سے سر ہلاتے نظر آتے تھے۔

سارا لندن گویا سوگ میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ اس بار میں واقعی واپس جا رہا تھا۔ مجھے جانا پڑا رہا تھا۔ حقیقت کا اس منظر نامے سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف میرے احساس کا کرشمہ تھا کہ ساری کائنات پر مجھے اداسی پھیلی نظر آ رہی تھی۔ در نہ کیا فرق پڑتا ہے کسی کو کہ جناب آپ لندن سے واپس تشریف لے جا رہے ہیں یا اس عالم فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ میں نے حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ بقول شاعر ترک دنیا کا سماں ختم ملاقات کا وقت اور بے وفا کی گھڑی۔ یہ سب ملول کرنے والے تجربات تو ہر شخص کی زندگی میں ایسے ہی آتے ہیں۔

پھر بھی کیا حرج تھا میں نے کافی بنانے کے لیے کیتلی کا پلگ لگاتے ہوئے آ کر بھری۔ اگر آج میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہوتی۔ لندن کے شہری مجھے سپانامہ پیش کرتے کہ چھ سال قیام فرما کے آپ نے ہماری سات پشتوں پر احسان کیا۔ برطانوی اخبارات اداروں میں مجھے خراج تحسین پیش کرتے، بنگیم ہلیس پر پرچم سرنگوں ہوتا۔ مگر یہاں تو کسی کو پروا بھی نہیں۔

کافی ختم ہونے تک قنوطیت کے جذبات کا یہ ریلا گزر گیا تو میں نے خود کو قائل کرنے کے لیے اپنی مراجعت کے مثبت پہلوؤں پر غور کیا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میری جلاوطنی کا زمانہ ختم ہوا۔ میں پاکستان جا رہا ہوں جو میرا وطن ہے۔ جہاں میرا گھر ہے اور میرے والدین ہیں اور وہ سب ہیں جو مجھ سے چاہت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ لعنت اس گوری چمڑی والوں کے دیس پر جہاں نسلی تعصب ہے اور منافرت ہے۔ اپنے مستقبل سے ناامیدی آخر کیوں؟ زندگی کے سفر میں بہت سی خوشیاں اور کامراناں بھی آئیں گی۔ اچلے خوابوں والے روشن دن بھی ملیں گے۔ دلدرا راتوں میں حسین چروں کا مہرباں اجالا دہاں بھی ہوگا۔

مگر خوشی پر مجھے اختیار حاصل نہ تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے چھ سال کے لیے مجھے جیروں پر عارضی رہائی عطا کی گئی تھی کہ جاؤ دنیا کی جتنی خوبصورتی کو اپنے احساس میں سمیٹ سکتے ہو سیٹ ہو۔ مسرتوں کے جتنے خوابوں کو چھ کر سکتے ہو کرو۔ لوٹ کر تو جہیں پھر دوں آنا ہے جہاں سے چلے تھے کیونکہ دنیا گول ہے۔ جھانگ مانگ یا بچوں کی لمباں سے ناک کی سیدھ میں سڑکرتے ہوئے تم لندن، پیرس سے گزر دو یا نیویارک اور ٹوکیو سے پہنچو گے پھر وہیں تھے دی کھوئی اوتھے آن کھلوتی۔

یہ چھ سال کیسے پلک جھپکتے بیت گئے۔ میں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ بے فکری اور آزادی کے کیسے ہنگامہ پر دھرب دروز تھے کیا خوبصورت اور خواب صورت زمانہ تھا۔ حسن و رعنائی اور کیف و طرب کے کیسے کیسے عنوان تھے۔

مایوسی کے تاریک پردے پر عہد رفتہ کا ہر شوخ لمحہ ہر نظر نواز چہرہ اور ہر یاد کا رنگین نقش کسی تصویر کی طرح روشن ہوتا تھا اور اپنی آخری جھلک دکھا کر رخصت طلب کرتا تھا کر فین صاحب! یہاں کتاب زندگی کا ایک دلچسپ باب ختم ہوا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور جوزف اندر آ گیا۔ پاکستان میں وہ محمد یوسف صدیقی تھا۔ جب ہم نے ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے روانگی اختیار کی تو وہ ایم ڈانی صدیقی ہو گیا تھا مگر امریکا میں اسے جوزف بنا دیا گیا تو اسے قطعی اعتراض نہیں کیا۔

اس نے اپنی بھیلی ہوئی برساتی اتار کے بڑی بدتمیزی سے صوفے پر ڈالی اور دوڑ کو بند پھینکنے کے بعد اس نے ہنر کے سامنے ہاتھوں کو گھماتے ہوئے کہا ”نیکے پتر! کیا حال ہے تیرا؟“

میں نے کہا ”تو نیویارک سے کب آیا؟“
”بس ابھی ایر پورٹ سے سیدھا آ رہا ہوں۔ سوچا تیرے جنازے کو ایر پورٹ تک کدھا دے دوں۔ تیری صورت سے تو واقعی لگتا ہے کہ تجھے پرزور عالم طاری ہے۔“
میں نے کہا ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔“

اس نے ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ”یار! ابھی وقت ہے ہمت سے کام لے اور خود کئی کالے میرے سامنے۔“

”کواس مت کر۔ یہ بتانا شکیا ہے تو نے؟“
”یار! کیا تو تھا۔ مگر میں اسے بھول جاتا ہوں تیرے

ساتھ الوداعی ناشتا کرنا میری اخلاقی ذمہ داری ہے۔ میں نے تیری خالہ سے بھی کہہ دیا تھا۔“
خالہ وہ مارتھا کو کہتا تھا جو میری لینڈ لیدی تھی۔ جب ہم نیچے پہنچے تو وہ موجود نہیں تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کام سے جا چکے تھے۔ ناشتا مجھے خود بنانا پڑا۔
”خک سے تیری پھر وہی زندگی ہوگی“ یوسف ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

”زندگی! میرے لیے وہ عمر قید کی باقی سزا ہے۔“
”اور ایسا صرف اس لیے ہے کہ تو بزدل ہے۔ تجھ میں ہمت نہیں ہے کچھ کرنے کی۔“
میں نے انڈے پر وار کرنے سے پہلے چھری کو شیشیر آبدار کی طرح لہرایا

”یار! میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟“
”پھر وہی فضول سوال۔۔۔۔۔ اے انکار کر دے۔ بغاوت کر دے ان سارے بزرگوں کے خلاف جو بزدلی تیرے اخلاق و کردار کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں۔ جو کڑی شہمدی کی روایات اور وضع داری کا بوجھ اب تجھ پر لادنا چاہتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے ان سے صاف کہہ دے کہ میں بالکل ہی بھٹک گیا ہوں صراطِ مستقیم سے۔ اپنی عاقبت خراب کر چکا ہوں۔ بہتر ہے آپ لوگ مجھے بھول جائیں۔ تو زردے ساری غلامی کی زنجیریں۔ بھاگ جائے! کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ ناخلف کہلائے گا؟“

میں نے ناشتا میز پر رکھا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا ”دیکھ یار! تو یہ سب پہلے بھی کہہ چکا ہے اور میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ بزدلی نہیں مجبوری ہے۔ تو اپنے حالات کا موازنہ میرے حالات سے کیوں کرتا ہے؟ ایک تو تیرا گھرانہ تعلیم یافتہ ہی نہیں روشن خیال بھی ہے۔ میرے خاندان میں قدامت پرستی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ پھر تو اپنے والدین کی انگوٹی اولاد نہیں ہے۔ تیرے دو بھائی تجھ سے پہلے باہر جا کے سیل ہو چکے تھے۔ ایک آسٹریلیا میں تھا دوسرا کینیڈا میں۔ جب تو امریکا گیا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں لگتی۔ لاہور میں تیرے دو بھائی فیملی بزنس کو چلا رہے ہیں اور سب ٹھیک ہے۔ نہ کوئی معاشی مسئلہ ہے نہ جذباتی۔“

”نہیں تو ایک بات بتائیے۔ کیا ہوگا اگر تو نہ گیا۔۔۔۔۔؟ کیا وہ تجھے اٹھا کے لے جائیں گے؟“

میں نے کہا ”بالکل ایسا ہی ہوگا۔ خاندانی پولیس فورس کی سربراہ ہے میری دادی۔ وہ کہے گی کہ تم سب ٹھہرو! میں خود جا کے لاتی ہوں اس نمونے کو۔ اور وہ جی جی آجائے گی۔ اپنا

آلہ ساعت وہیں چھوڑ دے گی تاکہ میری ایک نہ رہے۔“
”اور تجھے کان سے پکڑ کے لے جائے گی۔ کسی معصوم میسے کی طرح؟“ تو اس نے افسوس سے سر ہلایا۔
میں نے کہا ”ہاں! تجھے یاد نہیں؟ جب ہم نے ایک ساتھ پڑھنے کے لیے امریکا جانے کا پروگرام بنایا تھا تو کیا ہوا تھا؟“

اس نے سر ہلایا اور جوتوں سمیت اپنے جیروں کی کرسی پر رکھ کے بیٹھ گیا۔ ”وہ تو یاد ہے مجھے۔“
”اپنے جیروں نیچے رکھ۔ مارتھا آگئی تو ایسی بے عزتی کرے گی۔“

اس نے بے پردائی سے کہا ”آدمی محسوس نہ کرے تو کوئی بے عزتی نہیں ہوتی۔ اپنا تو یہی اصول ہے۔ جب وہ دس منٹ تک کمرے کی تو میں مسکرا کے دس سینکڑں میں جیروں بنا لوں گا۔ خیر تو یہ بتا کہ تو کمرے کا کیا دہاں جا کے؟“
میں نے جی سے کہا ”اپنی بارود ڈک ڈگری لوگا دوں گا اس فائل میں جس میں میٹرک سے ایم اے تک کی اسناد اور میرے اسکول کالج کے یونیورسٹی کے زمانے تک شاندار کارکردگی پر ملنے والے سارے شوقیت لگے ہوئے ہیں۔ پھر اس فائل کو کوئے کناروں والے کسی ٹھنڈے غلاف میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دوں گا۔ جیسے ہم قرآن کو رکھتے ہیں۔ بڑی عزت احترام کے ساتھ۔ مگر عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔“

”آخر اخراج تک ایسی کیا بات ہوگئی؟“

میں نے جی سے سر ہلایا ”کچھ بتائیں۔ جب انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے امریکا بھیجا تھا تو میرے سامنے کچھ اور مقاصد تھے۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتے تو میری ہر دلیل رائیگاں جاتی۔ اس وقت مجھے اور میرے مستقبل کو محفوظ بنانے کا انہیں اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس لیے وہ مان گئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے لندن سے بڑی اچھی آفر ملی ہے تو انہوں نے کہا کہ ”بھئی! اس بارے میں صحیح فیصلہ خود ہی کر سکتے ہو۔ یہ بات تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ امریکا چھوڑ کے میں لندن کیوں آیا تھا“ جبکہ مواقع وہاں زیادہ اچھے تھے۔“

”مگر فریال یہاں تھی۔ تیرے فیصلے میں دماغ کو نہیں دل کو کوئیت حاصل تھی۔“

”اس وقت ابا کے خیالات کچھ اور تھے۔ وہ بھی حلیم کرتے تھے کہ پاکستان میں ترقی کے مواقع بہت محدود ہیں۔ بڑے بڑے قابل لوگ اس کپٹ نظام میں ترقی کا مطلب

کچھ لیتے ہیں دولت مندی اور کام صرف ایک قابل عزت مانا جاتا ہے۔ پسیا کمانا۔ اور جیسے کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے بہتر ہے کہ جہاں قابلیت کی قدر کے مطابق جیسا ملے وہیں کام کر دو۔“

”اب ان کے نظریات بدل گئے ہیں؟“
”ایسا ہی لگتا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہے ہیں میرے لیے؟“

یوسف نے کہا ”یار! اجماعی سوچ رہے ہوں گے۔ کیا پتا تجھے سیاسی لیڈر بنانا چاہے ہوں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے دوست۔ کہ وزیراعظم کے عہدے کے لیے امیدوار نہیں ملے گا جس سے کہا جائے گا وہ ہاتھ جوڑے گا کہ مجھے تو معاف کر دو۔ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے اپنی عزت اور جان دال کو داؤ پر لگانے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ تیرا کیا اندازہ ہے آخر؟“

”وہ ایک شاندار مستقبل کے بجائے مجھے ایک شاندار ماضی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے جی سے کہا۔“

یوسف ہنسنے لگا ”ابے تمہارا کون سا شاندار ماضی تھا خاندان غلاماں کے گونہار سپوت۔ آبا و اجداد سب انگریز کے غلام تھے اور جو رو کے غلام تھے۔ یہ تو نے خود بتایا ہے کئی بار۔“

میں نے کہا ”یار! ہماری خاندانی تاریخ بدل گئی ہے۔“
”یہ ہو رہا ہے دنیا میں نیکے پتر! ہر جگہ تاریخ از سر نو لکھی جا رہی ہے۔ لکھوائی جا رہی ہے۔“

”تاریخ ہمیشہ لکھوائی جاتی ہے۔“

”اب کیا ثابت ہوا ہے۔ یہ کہ تم خاندانی مغل ہو۔ پدرم سلطان بود۔ یا یہ کہ اکبر بادشاہ کا درباری مسخر الملوذ چارہ حیرانگو بگڑاؤ تھا۔؟“

میں نے کہا ”معلوم یہ ہوا ہے کہ ہماری ایک جدی پشتی عمل نما حویلی تھی۔ اور خاصا بڑی جاگیر۔ انیسویں صدی کے آخر میں میرے ابا کے پردادا اس کے پہلے مالک تھے۔“
وہ سیدھا ہوکے بیٹھ گیا ”دیری انٹرنشنگ۔ تیرے ابا کے پردادا نے جیہنا غدار کی کا انعام پایا ہوگا۔ فرنگی آقاؤں سے بڑے شرم کی بات ہے تیرے لیے۔“

میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا ”انوکے بٹھے! یہ جو ہمارے پیارے وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سیاسی وڈیرے ہیں جو آج آسٹریلیا میں اور سینیٹ میں بیٹھے ہیں۔ یہ ایسے ہی لوگوں کی اولاد ہیں جنہیں کیا خان بہادر رائے بہادر اور سر کے خطابات کسے ملتے تھے؟ انہی کی حکومت ہے

آج بھی۔“

”اوکے..... اوکے! اچانک کلر کی کرنے والوں کے طے سے کل کروا اثرانہ میں شامل ہو گیا ہے۔ میں مان لیتا ہوں..... مگر یہ سب کیسے ہوا؟“

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارا تعلق ہوتا کسی شاہی خاندان سے تو ہمارے پاس ہوتا ایک شجرہ نسب جسے ہمارے بزرگ بڑے غرور سے نگلے میں لکھتے پھرتے۔ ہم تو کسی علاقے کے صوبے دار وغیرہ بھی نہیں تھے اور نہ کوئٹہ۔“

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ اچانک یہ خاندانی حویلی اور جاگیر کہاں سے آئی۔ اب تک کہاں تھی؟“

”میں تو وہیں جہاں ہے۔ ملتان اور لاہور کے درمیان کوئی جگہ ہے۔ سمت بدھائی۔ اب مجھ سے یہ سمت پوچھنا کہ پانچ دریا تھے تو پنجاب بنا۔ سمت بدھائی کیسے بنا؟“

یوسف نے کسی دانش ور کی طرح سر ہلایا ”میں فرض کر سکتا ہوں کہ وہاں سات بھائی ہوں گے۔ ان کی بیویاں سات نہیں ہوں گی اور ان سب کے سات سات بچے ہوئے تو سب نے سات سات بار بدھائی دی یعنی مبارک باد۔“

”بھار شاد..... صحیح لوکیشن کا مجھے کوئی علم نہیں کیونکہ دیکھنا تو در کی بات ہے میں نے بھی اس جگہ کے بارے میں کسی خاندانی مورخ سے کچھ سنا بھی نہیں تھا۔ تو خالو عنایت کو جانتا ہے؟“

”ہاں..... جو آلو عنایت کہلاتے ہیں حالانکہ صرف ان کا سر آلو جیسا ہے۔“

”ابائے تو کہا کہ جب تم آؤ گے تو پھر تفصیل سے بات ہوگی۔ خالو عنایت سے ایک دن فون پر بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ میاں اب نوکری کریں تمہارے دشمن۔ واپس آ کے اپنا راج پاٹ سنجالو۔ میں نے کرید اتوا انہوں نے تاریخ پر اپنی تحقیق کا خلاصہ یوں پیش کیا کہ اس حویلی اور جاگیر پر پہلے دو بھائیوں کے درمیان عداوت ہوئی اور قانونی جنگ چلنی رہی۔ پھر ایک بار گیا اور دوسرے کو ہارنے والوں نے جنت الفردوس میں جگہ دلوائی۔ وہ جگہ کی سعادت حاصل کر کے بکری جاز سے بھیجی آرہے تھے کہ سمندر میں گر گئے۔ نہ نہیں جنازہ اٹھانہ کوئی مزار بنا۔ اب ہمارے والا قانونی وارٹ ٹھہرا کیونکہ حاجی صاحب بے اولاد تھے اور اس کی ذمہ داری تین بیویوں پر عائد کرتے تھے جن کو وہ طلاق دے چکے تھے۔ خبر عینیت سے لوٹ آتے تو چوکی تلاش

کرتے۔ پھر غالباً میرے پردادا اور ان کے بھائی کی اسٹوری ہے۔ تین چار نسلوں میں پھر وراثت کی جنگ چلی۔ اب خاندانی روایت میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی نے اولاد پیدا کی تو زیادہ سے زیادہ ایک۔ مثلاً یہ تاجپور جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔“

یوسف نے سر کھپایا ”یار! وہ جو تیرا بڑا بھائی تھا..... مرحوم۔“

میں نے کہا ”وہ الگ کہانی ہے۔ یہ سمجھ لے کہ وہ میرا بچا بھائی نہیں تھا۔ مجھے بھی یہ بات اس کی وفات کے بعد پتا چلی۔ وہ زندہ رہتا تو شاید مجھے کوئی نہ بتاتا۔ میرے دادا پردادا کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ کسی کی اولاد نہیں ملتی یا ایک بیٹا تھا تو مر گیا..... اور معلوم نہیں کیا ہوا کہ اچانک اس جاگیر اور حویلی کا کوئی وارث نہیں بچا۔ کسی دعوے کے بغیر اب اس کے مالک قرار دیے گئے۔“

”ابے دادا..... انٹری نکل آئی تیری تو..... بابت کیا ہوگی اس پر اپنی؟“

”مجھے کیا معلوم یارا مجھے تو یہ سوچ سوچ کے دھشت ہو رہی ہے کہ آخر مجھے لندن سے واپس کیوں بلایا گیا ہے؟“

”یار! پیش کرنے کے لیے اور کس لیے..... حویلی اور جاگیر جس کے پاس ہو وہ کہلاتا ہے جاگیر دار یا دُور۔ اب کام کرتی ہے اس کی رعیت۔ اس کے سختیوں میں مصطلب اور باغات میں وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے ڈاکو اور کتے پالتا ہے۔ شکار کرتا ہے غریب ہاریوں کی بہو بیٹیوں کی عزت سے کھلتا ہے۔ ایکشن لڑتا ہے اتنے کام ہیں۔“

”اے ہم ٹڈل کلاس ذہنیت والے لوگ..... شرافت اور اخلاقی قدروں کا بوجھ لاد کر پھرنے والے..... ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تین نسلوں نے شہروں میں زندگی گزاری۔ ہم نے گاؤں دیہات صرف قلموں میں دیکھے ہیں۔ ہمارا اعلیٰ ترین خواب رہا ہے سول سروس۔ ہم بورڈ کرینٹ بننے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ کاروبار کی سوچ تو زیادہ سے زیادہ ایک بہت بڑا جزل اسٹور ہوتا ہے ہمارے ذہن میں۔ ہم صنعت کاروں کی صف میں شامل ہونے کی ہمت نہیں رکھتے۔“

میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا ”اس فرسودہ روایات و قیونوی خیالات اور قدامت پرستی کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے خاندان میں رہ کر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ذہنی فارمگ آج کل ایک صنعت ہے۔ دادی اماں دادیلا چادریں کی گہائے ہائے دلاہت میں پڑھ کے یہاں دودھ پیچنے گا؟

ارنے یہ تو کجروں کا کام ہے۔ پولٹری فارم یا فاش فارم کا مطلب ہے مرغیاں بیچنا اور پھٹی بیچنے والے تو ہوتے ہیں پھیرے۔ ہم تو اشراف ہیں۔ دادا کی روح فوراً تپ کر قبر سے نکلے گی اور وہ خواب میں آئے دادی کے سامنے دہائی دیں گے۔ ورنہ تو جانتا ہے آج کل کریڈٹ فنانسنگ کا دور ہے۔ انٹرنسٹ کے لیے ہر بینک لون دینے پر تیار ہوگا۔ مگر ہم فرض لیں اور وہ بھی سود پر؟ تو یہ تو ہے..... بچا کے فوٹے کے آگے کسی کی چل سکتی ہے۔ ہوگا بالآخر یہی کر زمین اور حویلی وغیرہ سب کو فروخت کر دیا جائے گا۔ کوئٹا نہیں گی اور کارس آئیں گی۔ عورتیں خوب زیور پہنیں گی۔“

”یار! پھر تو نوکری چھوڑ کے مت جا۔ پہلے جا کے دیکھ کہ سب لوگوں نے کیا سوچا ہے؟“

”میں کوئی پاگل ہوں یار! کہ ان کی باتوں میں آ جاؤں اور ہمیشہ کے لیے بوریا بستر سیٹ کر چلا جاؤں۔ میں ایک مینے کے لیے جا رہا ہوں۔ ارادہ تو یہی ہے کہ اس کے بعد واپس آ جاؤں گا مگر کچھ بات یہ ہے کہ اب اسے بات کرنے کے بعد مجھے اپنے ارادے پر اعتبار بہت کم ہے۔“

”کچھ بتائی ان سے بات کیا ہوئی تھی؟“

میں نے کہا ”جمل باہر نہیں آتے کرتے ہیں۔ باتیں بھی کریں گے رات کو میں نے فریال کو بلایا ہے ڈنر کے لیے۔“

”پھر وہی فریال.....! اے کیوں دشمن ہوا ہے اپنی جان کا۔ عقل کے دشمن جان چھڑا اس سے بچوں کے بچے! ورنہ نہیں کا نہیں رہے گا۔ وہ مہمرا کی خاک چھانے اور دودھ کی نہر نکالنے والا صدیوں پرانا شفق اب کون کرتا ہے؟ یہ اکیسویں صدی ہے نیکے پترا! سپر کمپیوٹرز اور سیٹلائٹ کیونٹی کیشن۔ پاپ میوزک اور فاسٹ فوڈ کا زمانہ ہے۔ شارٹ فرم کنٹریکٹ پر تعلق رکھتے ہیں پیار کرنے والے۔ ایک ہفتے ایک مہینے یا زیادہ سے زیادہ سال بھر کے لیے۔“ وہ سارا راستہ بولتا گیا۔

میں اس سے کیا کہتا..... یہ اس کی سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

مجھے واپس بلانے کی تحریک کا آغاز صوفی بچانے کیا۔ نام تو ان کا نذیر احمد تھا۔ جوانی میں بڑے انقلابی اور دل بھیک قسم کے نوجوان تھے۔ دادی ان کے کارناموں کو ”کرتوت“ کے نام سے نشر کرتی تھیں تو بہت جربز ہوتے تھے۔ ایک بار اندرون بھائی میٹ کسی سے دل کا بیٹھے کچھ

دن چوری چھپے پیار کا کھیل چلا۔ کچھ خط کتابت بھی ہوئی۔ پھر راز فاش ہو گیا اور خالم ساج کی دیوار سچ میں آ گئی۔ ملاقات تو کیا اس کی دیکھو کبھی ترس گئے تو میں اس کے گھر کے سامنے والے گھر میں کسی سے دوستی کی۔ پرانے شہر کی بجلی چمکی گئیں تھیں۔ اوپر چوہارے اتنے آگے بڑھے ہوئے تھے کہ درمیان کی فاصلہ چھ آٹھ فٹ اور کہیں اس سے بھی کم رہ جاتا تھا۔ انہوں نے تیسری منزل کی ایک کھڑکی سے براہ راست محبوبہ دینواز کی خواب گاہ تک فٹائی اور بنانے کا سوچا۔ دس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا تختہ اپنی کھڑکی کے سامنے والی کھڑکی تک لگایا۔ تختہ دونوں طرف کی چوکھٹ پر بڑی مہارت سے سیٹ کیا۔ سرکس کے بازیگر کی طرح جان بھیلی پر رکھ کے اس پل صراط پر سے گزرے اور رات کے آخری پہر میں شادمان و کامراں لوٹ آئے۔ جہاں چاہے وہاں راہ ہے۔ زمین پر راستے بند کرنے والے فضائی رابطے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اسی راستے سے لڑکی کو نکالنے اور دنیا کی نظروں میں دعول جموٹ کر فرما ہونے کا پلان فائل تھا مگر لڑکی پر اس پل کو پار کرنے کے تصور ہی سے لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ بچا اس کا حوصلہ بلند کرنے میں ناکام رہے مگر عشق میں ناکامی ان کو منظور نہ تھی۔ وہ فرہاد جیسے انجینئر نہ تھے کہ دودھ کی نہر نکال لی اور پھر تیشہ مار کے خود کشی فرمائی۔ انہوں نے مسئلے کے مختلف حل تجویز کیے جس میں ایک یہ بھی تھا کہ ان کی محبوبہ اپنی کمر میں ایک رسی باندھ لے اور پل پر چل پڑے۔ رسی کا دوسرا کنارہ بچا کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ اسے یوں کھینچ لیں گے جیسے ڈور سے بندھی چنگ کو اتارتے تھے۔ خدا نخواستہ اس کے قدم دھنچل کے لڑکھٹا گئے تب بھی وہ نیچے نہیں گرے گی۔ چھ فٹ پر معلق ہو جائے گی اور بچا اسے اوپر اٹھا لیں گے۔ لڑکی پھر بھی ڈرتی رہی تو انہوں نے پل کے دونوں جانب رسی کی ریٹنگ باندھنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے یہ خاصا محفوظ طریقہ تھا۔ لڑکی نے اس کی منظوری دے دی مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شب فرار سے ایک روز قبل وہ صبح دم محبت سے بھرپور مستقبل کے پلان کو جتنی شکل دے کر مراجعت فرما رہے تھے کہ تین دن درمیان سے ٹوٹ گیا۔ بچا خلا میں ٹانگیں چلاتے ہیں فٹ کی بلندی سے محبوبہ کے ابا پر یوں گرے جیسے پیراشوٹ سے جب لگائے والا شوخی قسمت نے دشمن کی توپ پر چا جاتے۔ مذکورہ ابا نماز فجر مسجد میں ادا کرنے کے لیے عین اسی وقت گھر کے صدر دروازے سے برآمد ہوا تھا۔ بس ناسنگ ایسی ہو گئی کہ بچا کی ٹانگ ٹوٹی۔ جو راہ عشق میں کوئی عظیم قربانی نہ تھی لیکن اس کے ابا کی دو پہلیاں ٹوٹنے کو

اس کے سوا کیا کہا جاسکتا تھا کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ایسے ہی کسی خانہ خراب عشق میں چچا تارک الدنیا ہوئے۔ دلپ کمار کی طرح ماتھے پر گرنے والے بال کسی روڈ سائڈ میز اسٹالسٹ سے صاف کرا دیے۔ شوخ رنگ شرٹس اور تیل بائٹ پتلون کا اسٹاک کوزیوں کے مول نیلام کر دیا۔ کھدر کا کرتا اور شرعی ساز کا کٹھنوں سے اونچا پاجامہ بچن کے داڑھی بڑھانے کے لیے وہ بھڑٹا تک منہ پر ملنے لگے جو بالوں میں لگاتے تھے۔ فی زمانہ ان کی ایک بالشت سے بھی زیادہ لمبی لمبائی گولڈن داڑھی تھی۔ وہ مہندی نہ لگاتے تو اچلی سفید ہوئی اور وہ سائنٹا کلاز نظر آتے۔ ان کی صورت جڑواں بھائی کی طرح لگتی تھی۔

میں انہیں صوفی چچا کہتا تھا۔ وہ ایک کوالیفائیڈ پیر تھے۔ دادی کے معاملے میں یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ دروغ برگردن راوی۔ وہ ہمیشہ سچ بولتی تھیں۔ ایک دن وہ صوفی چچا سے کسی بات پر اتنی تفصیل کہ انہوں نے صوفی چچا کے ظاہر و باطن کے انقلاب کے اصل حقائق بھی جاری کر دیے۔ اس وائٹ پیپر کے مطابق چچا کو انہی جیسے کسی گرو گھنٹال نے خوار کیا تھا۔ اس کے اشتہارات شہر کی ہر دیوار پر پختے کہ ”محبوب آپ کے قدموں میں“ اس نے نقش اور تلوید وغیرہ کے نام پر چچا کو خوب لوٹا اور بالآخر کوئی وحیفہ بتا دیا کہ فلاں قبرستان میں چالیس رات ایک ٹامک پر کھڑے ہو سکے کرنا ہے یا پتا نہیں سر کے بل کھڑے رہ کر۔ چچا چلے کاٹ کے لوٹے تو حلیہ بدلا ہوا تھا۔ جب یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ جس کی خاطر سارے پاؤں نیلے تھے وہ تو دو دھنپے ہوئے پاکے گھر سدھار گئی تو چچا کی نگاہوں میں دنیا تیرہ دتار ہو گئی۔ تجربہ آبدار لے کر وحیفہ بتانے والے پیر کو مل کرنے نکلے تو گھر کے ایک ملازم نے قدم پکڑ لیے۔ اس کا نام محبوب تھا۔ چچا کو غلطی کا احساس ہوا۔ محبوب واقعی ان کے قدموں میں تھا۔ پیر و مرشد برحق تھے۔ یہ دعویٰ انہوں نے کیا ہی نہیں تھا کہ محبوب آپ کے قدموں میں۔ شاید خواتین کے دل کی مراد برآتی ہو۔

چچا کی دنیا تو بدل گئی تھی۔ حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ انہوں نے پیشہ بھی بدل لیا۔ پہلے خدمت غلطی کے ایک ٹمکے میں کلرک تھے رشوت بین کی طرح برکتی تھی۔ جب چلے کاٹ رہے تھے تو کچھ مسئل کے اندھوں نے ان کی ریاضت دیکھی۔ کسی کو کیا معلوم وہ ایک لڑکے کے چکر میں یہ سب کر رہے ہیں۔ لوگ مرادیں اور نذرانے لے کر حاضر ہونے لگے۔ چلے پورا ہونے تک خاصی شہرت ہو گئی۔ انہیں اندازہ ہوا کہ

کام دلچسپ آسان اور نوکری سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ اب ان کے آستانہ مبارک پر عقیدت مندوں کا جتنا لگا رہتا تھا۔ عزت دولت شہرت کی کمی نہ تھی۔ اب وہ سچ خود کو پیر سمجھنے لگے مگر خاندان والے حقیقت جانتے تھے۔ وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

سب سے پہلے ان کا خون موصول ہوا۔ ”بھئیے مگر شیشہ رات ہم نے ایک بہت برا خواب دیکھا۔“

میں نے کہا ”صوفی چچا! کیا نیا خواب تھا؟“

انہوں نے گڑبڑا کے کہا ”نیا خواب... یعنی...؟“

میں نے کہا ”میرا مطلب... کوئی خراب اخلاق مناظر والا خواب تھا تو... مجھے شرم آتی ہے۔“

انہوں نے بڑی غلطی کا اظہار کیا ”لا حول و لا قوہ۔ خواب میں پیر و مرشد تشریف لائے تھے۔“

”تو واقعی برا خواب تھا۔ وہی ہوں گے جن کو دادی کہتی ہیں گرو گھنٹال۔“

”بھئیے... تمہاری عاقبت ہمیں تم سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے تمہاری گستاخی کو گزر کر دیتے ہیں۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ نذرانہ سندر پار لمخ خیر اور ام النبیات کو حلال سمجھنے والے فرنگی کا فرد کے ملک میں ایک نجیب الطرفین فرزند اسلام کے قلب کو منور رکھنے والی ایمان کی روشنی پر الحاد و مگر ہی کی تاریکی غالب آ رہی ہے۔“

میں نے گھبرا کے کہا ”صوفی چچا! آپ کے پیر و مرشد یہ بات اردو میں کہتے تو شاید میری سمجھ میں آتی۔“

انہوں نے کہا ”نا مقول! یہ اردو نہیں تو کیا فرج ہے؟“

اس کے بعد انہوں نے سخت تشویش کے ساتھ تفتیش کی اور مجھ سے بیان طلب کیا کہ میں روم میں وہ سب نہیں کرتا جو رومن کرتے ہیں۔ اور میں نے ہمیشہ کی طرح انہیں یقین دلایا کہ میں بڑی استقامت کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چل رہا ہوں۔ ایسی گائے بکری بلکہ مرغی تک سے پرہیز کرتا ہوں جس کا کردار مشکوک ہو اور یہ پتا چل جائے کہ ایک بھی غارم پر کسی خنزیر سے دوستی رکھتی تھی۔ پانی میں بھی صرف وہ چتا ہوں جو ایک برادر اسلامی ملک سے ایورٹ ہوتا ہے۔ میموں کا تو مجھ پر سایہ بھی پڑے تو غسل کو فرض سمجھتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن بھئیے سے زیادہ عیار چچا ایسی باتوں سے قائل ہونے والے نہیں تھے۔ انہوں نے کہا ”برخوردار احمق کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ ہم سمجھ گئے ہیں کہ پیر و مرشد کا اشارہ کیا

تھا۔ مگر فورالوٹ کر پاکستان آ جانا چاہیے ورنہ کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ جس سے دنیا و عقبیٰ میں تمہاری اور ہماری رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔“

میں نے کہا ”صوفی چچا! وہاں آ کے میں کیا کروں؟ آپ کی طرح پیر بن جاؤں؟ پاکستان کا پہلا فارن کوالیفائیڈ ایم پی اے بنوں؟ قائد۔ خدا کا المجتہد بن کے مگاری دینے لگوں رزق کی اولاد پرینڈ کی گھر بیٹے کی شفا کی... ان سادہ لوح کمزور عقیدے والے مجبور انسانوں کو کولونوں جن کو ہر قسم کے ڈاکو پہلے ہی لوٹ رہے ہیں؟“

معلوم نہیں کیسے میں سے قابو ہو کے اتنا زیادہ بول گیا۔ صوفی چچا ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتے تھے اور میں انہیں بڑی شرافت اور سعادت مندی سے سن لیتا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف تھے چنانچہ یہ خوش فہمی کسی کو نہیں ہو سکتی تھی کہ دوسرا وہی کبہ رہا ہے جس پر صدق دل سے یقین بھی فرض ہے۔

صوفی چچا باقاعدہ ناراض ہو گئے۔ اسی شام ابا کا فون موصول ہوا۔ ”تم نے چچا سے بدتمیزی کی؟“

میں نے کہا ”وہ تو میں نے صرف سچ بولا تھا لیکن میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔“

”وہ تمہیں کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔“

میں نے کہا ”ابا! وہ تو کہہ رہے تھے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھڑا کر واپس پاکستان آ جاؤں۔“

”ہاں۔ ان کا بات کہنے کا اپنا انداز ہے۔ تم نے انہیں موقع دیا ہوتا پوری بات کرنے کا تو وہ وضاحت کرتے کہ یہ ہم سب کی خواہش ہے۔“

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ”اوہ وہ اباجی! ڈونٹ ٹیل می کہ آپ بھی ان کے مرید بن گئے ہیں۔“

”فصلوں باتیں مت کرو۔ تمہیں اب واپس آنا ہے۔“

میں نے کہا ”مگر کیوں۔ سب خیریت تو ہے ناں اباجی۔“

”ہاں ہاں۔ سب خیریت ہے۔ بس مجھے تمہاری ضرورت ہے یہاں۔“ ابا نے کہا۔

میں تشویش میں مبتلا ہونے لگا ”آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔ چچا نے بھی تمہارا کہے بات کی تھی۔“

”جیسا کہ فرنگی کوئی بات نہیں۔ میں اور تمہاری امی بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کب آ سکتے ہو؟“

میں نے کہا ”اگر ضروری کام ہے تو جو پہلی فلائٹ ملے گی میں پکڑ لوں گا۔“

انہوں نے کہا ”میرا مطلب تھا وہاں کے معاملات نیشانے میں کتنا دقت لگے گا؟ ظاہر ہے تمہارا کہنی سے کوئی ایگر مینٹ ہوگا۔ تم کو پہلے سے نوٹس دینا ہوگا۔ اس میں کتنا دھم لگے گا اندازاً؟“

میں نے جراتی سے کہا ”یعنی آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی نوکری چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے پاکستان آ جاؤں؟“

”بالکل یہی کہہ رہا ہوں۔“

”لیکن کیوں اباجی! ابھی تو میرا کیریئر شروع ہوا ہے۔ بہت محنت کی گئی تھی میں نے۔ دن رات ایک کر دیے تھے اپنی قابلیت کو تسلیم کرانے میں۔ مستغفل میرے لیے ایک چیلنج تھا۔“

”ایک بہت بڑا چیلنج یہاں بھی تمہارے لیے خطرہ ہے۔“

”کیسا چیلنج؟“ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ پاکستان میں ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ اچھے جاب نہیں ہیں۔“

”اس دقت حالات مختلف تھے۔“

”یہاں میں پاکستان کے حالات سے زیادہ باخبر ہوں۔ میری معلومات کے مطابق حالات بہتری کی طرف نہیں جارہے ہیں۔ کرپشن سیاسی عدم استحکام اور اداروں کی تباہی کی وجہ سے سرمایہ کاری رکتی ہے۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔“

”دیکھو۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں خود کچھ کر سکتا تو تمہیں بھی مل جاتا لیکن جیسا اب میرے ارادے کی راہ میں میری عمر حائل ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا ”اباجی! اب کیا کرنا ہے آپ کو؟ بہت کام کر لیا آپ نے چالیس سال۔ اب آرام کریں لائف کو انجوائے کریں۔“

”وہ تو میں کر رہا ہوں۔ میں نے اور تمہاری امی نے ج کی سعادت بھی حاصل کر لی گزشتہ سال۔ بڑی بے فکر رہی ہے“

الہ کا بڑا احسان ہے۔ سوچا تو ہم نے یہی تھا کہ تمہارے کیریئر کو ڈسٹر ب نہیں کریں گے۔ لندن میں ہمارا ہنا مشکل تو ہو گیا لیکن ہم تمہیں مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔ یہاں نہ رو سے تمہارے بغیر تو وہاں آ جاؤں گے۔ کچھ دن یہاں کچھ دن وہاں۔ اسی طرح گزارا کریں گے جب تک زندگی ہے۔“

یہاں ہیں انہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن اب اندھ

احسان ہے! ایسے اسباب پیدا کر دیے ہیں کہ نہ تمہیں حلا وطن رہنے کی ضرورت ہے اور نہ تمہیں کسی سے دوری کا دکھ محسوس

کی۔

میں نے کہا ”ابھی کیا بات ہوگئی ہے اباجی!“

انہوں نے اپنی بات جاری رکھی ”آدھی اتنی جدوجہد کیوں کرتا ہے رشتی بیٹا! پہلے کسی قابل بننے کے لیے دن رات ایک کر دیتا ہے اس کے بعد اپنی محنت کو کیش کرانے میں جت جاتا ہے۔ لوگ گھبراہ اور سارے رشتوں کی قربانی دے کر باہر جاتے ہیں۔ مگر دالوں سے دور رہنے کا دکھ اٹھاتے ہیں۔ وطن سے جلاوطن ہوتے ہیں اور اکیلے پن کا عذاب برداشت کرتے ہیں صرف ریال اور ڈالروں کے بکریں۔ جتنی دولت وہ کما چاہتے ہیں یہاں رہ کے نہیں سکتے۔“

میں نے موذبانہ عرض کی ”اباجی! کیا دولت کمانا اور اس لیے دن رات ایک کر دینا بری بات ہے؟ کم سے کم رشتہ کی ناجائز آمدنی پر تو انحصار نہیں ہے۔ محنت سے حق حاصل کی کما لی کرتے ہیں یہاں آنے والے۔“

”نہیں یہ بات نہیں۔ میں مواقع کی بات کر رہا تھا۔ جن کے لیے یہاں مواقع نہیں انہیں باہر ضرور جانا چاہیے۔ اپنے اور خاندان کے خوشحال مستقبل کے لیے محنت بھی کرنی چاہیے۔ جلاوطنی کی جتنی بھی جھیلی چاہیے لیکن سب کچھ اپنے گھر اور اپنے وطن میں رہ کر نہ لے سکتے تو پھر سارے جذبات کے رشتوں کا خون کر کے اور دماغ میں اکیلے پن کا عذاب جھیلنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بتاؤ تم وہاں رہ کے کتنا کما لیتے؟ فرض کر دو تم کھیتی کر دو پتی ہو جاتے۔ وہ اللہ کے فضل سے تم ہی سے بن گئے ہو۔“

میں نے حیرانی سے کہا ”وہ کیسے اباجی!“

وہ ہنسے ”پتا چل جائے گا تمہیں جب تم آؤ گے۔“

میں نے کہا ”نہیں اباجی! مجھے صاف بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ ایسی کون سی لاشی کل آئی ہے ہماری کوئی مدفون خزانہ لگ گیا ہے؟“

”بس کچھ ایسا ہی سمجھو رفیق بیٹا! یہ لگتی تو کچھ قصے کہانیوں کی بات ہے مگر سب قدرت کے مکمل ہیں۔ وہ دیتا ہے تو ایسے ہی چمچہ پھاڑ کے دیتا ہے۔ ہماری زندگی تو گزر گئی۔ تمہارے نصیب کی بات ہے۔ حق یہ خدا رسید۔ فون پر میں تمہیں ساری خاندانی تاریخ نہیں بتا سکتا۔ یہ سلسلہ تو کوئی سال بھر سے چل رہا تھا۔“

پھر انہوں نے مجھے محل اور جاگیر کے بارے میں بتایا۔ میری عقل خبط ہوگئی ”اباجی! آپ کی بات پر میں شک کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ جیسا آپ نے فرمایا دیا ہی

ہے اگر۔ جب بھی میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہاں آ جاؤں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

انہوں نے کہا ”مجھے معلوم ہے تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ ہمت، صلاحیت، ذہانت، مستقل مزاجی اور خود اعتمادی۔ اسی لیے تو میں تمہیں بلارہا ہوں۔ وہاں تم اپنی صلاحیت کا استعمال کر کے صنایع کا ڈھکے دوسروں کے لیے۔ تمہیں وہی مقررہ معاوضہ ملے گا۔ تم انہیں اپنی محنت سے ایک کے دس اور دس کے ہزار بنا کر دو گے۔ تری وہ کریں گے فائدہ ان کے ملک کو ہوگا۔ کیا یہ معاشی غلامی۔“

”ابا! آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔“

”گھر گھر نہیں بیٹا! میں بہت پریشانی کا شکار رہا ہوں۔ ہمیشہ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھی تمہیں باہر نہ جانے دیتا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ جذباتی قربانی دینا ہمارے لیے کتنا مشکل تھا۔ تم اکلوتے بیٹے ہو ہمارے۔ اب یہاں ایک کام ہے جو صرف تم کر سکتے ہو اور ایک چیلنج سمجھو کہ۔ خود تمہاری ذات کو تو جو فائدہ ہوگا اس کی کوئی حد نہیں مگر اس کے ساتھ تمہاری صلاحیت اور توانائی تمہارے وطن کے کام آئے گی۔ آخر پاکستان کے نوجوان کیوں باہر جا رہے ہیں؟ اس لیے کہ یہاں ان کا ہر جگہ استعمال ہوتا ہے خصوصاً جنگی سطح پر۔ ان کے پاس جذبہ ہے۔ لگن ہے اور صلاحیت ہے مگر وہ مجبور ہیں۔ ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹیں آ جاتی ہیں۔ سرخ فیزہ، اقربا پروری، تعصب، بدعنوانی، تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں مجبوری کی دیوار میں گرا کے اپنے ہی وطن میں رہتے ہوئے کامیابی کے راستے پر چلنے کا موقع ملا ہے۔ خود اپنے وسائل سے۔ اب تم واپس آ سکتے ہو۔ اپنے وطن اپنے گھر۔“

میں ان کی باتیں سن رہا تھا کیونکہ وہ میری سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ جب بالآخر ان کا احساس ہوا کہ وہ صرف فون کے ریسپورڈ سے باتیں کر رہے ہیں تو وہ اچانک جپ ہو گئے۔ میں نے کہا ”اباجی! میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔ فرض کریں تمہیں کوئی جاگیر اور ایک خاندانی محل مل گئے ہیں۔ پھر؟ ہم کیا کریں ان کا؟“ آپ نے کچھ سوچ کے ہی فیصلہ کیا ہوگا کہ مجھے واپس آ جانا چاہیے۔“

”ہم سب نے بہت سوچا۔“

”بالی سب کی بات تو رہنے دیں آلو عنایت۔ میرا مطلب ہے خالو عنایت، صوفی بیٹا۔ وادی؟ یہ سب پچھلی صدی کے لوگ ہیں۔ شاید اس سے بھی پہلے کی دنیا کے۔“

”چلو تم یوں سمجھ لو کہ میرے ذہن میں ایک پلان ہے تمہارے لیے۔“

”یعنی یہاں لندن کے اس بین الاقوامی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ملٹی نیشنل کاروباری ادارے میں جو کام میں کر رہا ہوں وہ زیادہ بڑے پیمانے پر اور بہتر طور پر وہاں کیا جاسکتا ہے؟ میری عقل میں نہیں آتی یہ بات۔“

انہوں نے برہمی سے کہا ”مجھے لگتا ہے تھ سال میں تمہاری عقل پر اس معاشرے کی سوچ غالب آ گئی ہے۔ تم نے جذبات کو اور رشتوں کو غیر اہم سمجھ لیا ہے۔ ترجیح رکھتے ہیں تمہارے ذاتی مفادات۔ وہاں آتے تو تم ہمیں چھوڑ آتے کسی اولاد ہو میں۔ اب یہاں ہم اپنے ہی گھر کو اولاد ہو مجھ میں۔ یہی چاہتے ہو نا۔۔۔۔۔ بس اخراجات پورے ہوتے رہیں گے ہمارے۔ اتنا پیسا ہے ہمارے پاس تو اور کیا چاہیے۔“ انہوں نے فون بند کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے یوں لگا جیسے ابا رونے لگے تھے۔ اچانک میرے منطقی دلائل کے غبار کی ساری ہوائ نکل گئی۔ ایک احساس جرم و گناہ کی غلغلہ نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے پھر فون ملایا اور کہا ”اباجی! آپ کی یہی فحشی ہے تو میں آ رہا ہوں“ اور ریسپورڈ کر دیا۔

لیکن اس کے باوجود یہ فیصلہ آسان نہ تھا۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اپنے کسی دوست سے یہاں تک کہ عائشہ سے یا فریال سے بھی اس مسئلے پر بات کر سکوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی زمانہ عقل کو جذبات سے الگ رکھ ہی نہیں سکتیں۔ وہ کہیں کی کہیں رتی اداں نان سنس! یہ کیا الف بیل کی داستان ہے۔ کیسی جاگیر کیسی حویلی۔ تم اب لندن کو چھوڑ کے گاؤں کی اس آسب زدہ حویلی میں رہو گے؟ لیکن تمہیں جو یونائیٹڈ کنگڈم دے رکھی ہے۔ اس کی جگہ گارگوڑوں والی بھی میں پھر دوں گے اور اپنا حرم آباد کر دوں گے۔ کیتیریں رکھو گے۔ بجرے کر او گے ہر نو مولو کی رسم مسلمان پر۔ اور تمہاری ڈوگری۔۔۔۔۔!

میں نے کتنی کے نائب صدر سے بات کی کہ مجھے لمبی چمٹی چاہیے۔ کم سے کم تین میبے کی۔

اس نے صاف انکار کر دیا ”نودے۔۔۔۔۔ تم چھوڑ کے چا سکتے ہو لیکن تم مجھے براہم بتاؤ تو شاید میں جیٹر میں کو قائل کر لوں کہ تمہاری جگہ عارضی طور پر کسی کو رکھ لیا جائے۔ تم یقیناً ہمارے لیے قابل قدر تھے۔ تم نے ثابت کر دیا تھا۔“

میں نے کہا ”میرا موقف شاید تمہیں غیر عملی لگے۔ لیکن یہ ہماری براہم ہے کہ ہم جذباتی ہیں۔ والدین کے لیے اولاد کے لیے وطن اور دین کے لیے۔ یہاں تک کہ گلگی محلے کے لیے۔“

میری بات سن کے وہ بہت حیران ہوا ”یقین نہیں آتا کہ تم جیسا تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوان اپنی سوچ میں اتنا مجبور ہو سکتا ہے۔ خیر میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر دوں گا۔ ایک مشورہ ہے جاؤ اور دیکھو کہ وہ تمہارے لیے کیا پلان رکھتے ہیں۔ مستقبل تمہارا ہے تو فیصلہ تمہارا ہی ہونا چاہیے۔ ایک ہفتہ اس کے لیے کافی ہوگا۔ اگر تم واپس آنا چاہو تو ہم دھم دھم کریں گے۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“

میں نے سوچ کے کہا ”دو ہفتے نہیں ہو سکتے؟“

تھوڑی سی بحث کے بعد وہ مان گیا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ پندرہ دن وہ کام چلائیں گے مگر سولہویں دن میری جگہ کوئی اور بیٹھا ہوگا۔ ظاہر ہے اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ ایک دوستانہ مفاہمت کا عمل تھا۔ مجبوری نہیں تھی۔ نہ انہیں کام کرنے والوں کی کتنی اوجھڑاں تھیں۔ سوچنا میں بھی یہی تھا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں ہر فیصلے کا اختیار میرے پاس ہونا چاہیے لیکن یہ فیصلہ آرزو کی بات نہیں تھی۔ ایک اندر کی آواز مجھے یقین دلاتی تھی کہ کیسے پڑا تم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ خیر سے ولایت کو خیر باد کہو تمہاری واپسی کے بعد کوئی واپسی نہیں۔

اس رات میں نے فون پر صوفی بیٹا سے معافی مانگی۔ ”میں اپنی گستاخی پر شرمندہ ہوں“ میں نے منافقانہ لہجے میں کہا ”یہ حقیقت نہیں تھا“ صرف ابا کی رنجیدگی کا خیال تھا۔ صوفی بیٹا ان کے حقیقی بھائی نہیں کزن تھے۔ تیا کے بیٹے لیکن ایک حیرت انگیز اتفاق کے باعث دنیا میں ایک ساتھ ایک ہی دن آئے تھے۔ فرق صرف ایک گھنٹے کا تھا۔ صوفی بیٹا تولد ہوئے تو تاریخ بدل گئی۔ انہیں ایک دن چھوٹا قرار دے دیا گیا۔

صوفی بیٹا نے کہا ”گویا اب تم نے جتنی مراجعت کا عزم صمیم کر لیا ہے۔“

میں نے کہا ”جی۔۔۔۔۔ کیا کر لیا ہے؟“

وہ بولے ”تم واپس آ رہے ہو ہمیشہ کے لیے۔ فہم و تدبر کے تقاضوں کی پاسداری نے تمہیں ناقابل تصور۔۔۔۔۔ پُرخطر عواقب سے محفوظ فراہم کر دیا ہے۔“

”اف!“ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ”کس نے کیا کر دیا ہے بیٹا!“

”مطلب یہ کہ بال بال بچ گئے تم۔۔۔۔۔ ورنہ ہم نے اپنے مولوں کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ تمہیں بیک بیٹی دودھ نوش ہماری خدمت میں حاضر کر دیں۔“

میں نے کہ ”مولی یعنی جنات! آپ اپنے احکامات منسوخ نہ کریں صوفی بیٹا! مقتصد وہاں پہنچتا ہے۔ پی آئی

اگر بالکل ہی صبر نہیں ہوتا۔
میں نے جل کے کہا "بعد میں کیا ہوگا؟"
"ہوئے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ تم ایک کے بعد دوسری پھر تیسری کرلو۔ بس میری جگہ خالی رکھنا۔ کیونکہ بالآخر میں سب سے سچیں لوں گی نہیں۔"
"پلیز اسٹاپ فریال! پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں فون کر دیا۔ میں کل صبح جا رہا ہوں۔"
"اتنی ابھر جیسی میں کس سے شادی کر رہے ہو اور کیوں؟"
میں نے خود کو پرسکون رکھا "ابا نے کہا ہے کہ نوکری چھوڑ دو اور اچس آ جاؤ۔"
"شادی کے لیے نوکری چھوڑنے کی کیا تک ہے؟ اسے لے آئی ہیں۔"
میں نے چلا کے کہا "کون آلو کا پتہ کر رہا ہے شادی؟ نہیں کروں گا میں کسی سے بھی شادی۔ کبھی نہیں کروں گا۔" "سوائے میرے۔ اور رونی! آئی لو!" اس نے فون پر چٹا رخ سے چوٹنے کی آواز پیدا کی "مجھے معلوم تھا۔" "دیکھو فریال! میں ملنا چاہتا ہوں تم سے۔ آخری بار۔"
"بکومت۔ یہ آخری بار کیا ہوتا ہے۔ ہمیں ملنے سے کون روک سکتا ہے؟"
"ہاں تمہارا وہ نامزد مجازی خدا۔ میرا رقیب رو سیاہ!"
"اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو آج! میں نے انکار تو نہیں کیا! اچھا یہ بتاؤ کہاں ملو گے؟"
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "وہیں۔"
"اوکے! انٹیم ہٹاؤ۔۔۔۔۔ میں آئی ہوں۔"
"چھ بچے ہیں ابھی۔۔۔۔۔ میں وہاں جا کے بیٹھ جاتا ہوں اور بیٹھا ہوں گارات آٹھ بجے تک۔"
"کیوں رات بھر کیوں نہیں۔۔۔۔۔ اچھے چاہئے والے ہو تم!" اس نے شوخی سے کہا اور فون بند کر دیا۔
اگرچہ مجھے اس کے وعدے پر بڑا بھی یقین نہیں تھا مگر میں تاؤ برج کے اس ریفرنٹ میں جا کے بیٹھ گیا جہاں سے میں اس راستے پر نظر رکھ سکتا تھا جہاں سے اسے آتا تھا۔ اس وقت چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ خود مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہاں میں کب تک انتظار کروں گا۔
آٹھ بجے کی بات تو میں نے ایسے ہی کہہ دی تھی۔
نومر وینس ٹی ٹی۔ آرڈر لینے سے زیادہ عندیہ لینے

والی برقیسم ادا کے ساتھ وہ میری طرف آئی تو میں نے اسے بڑی رکھائی کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ "ابھی میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں" میں نے کہا۔ فوری طور پر میرا چاہئے یا کافی پیسے کا موڈ نہ تھا۔
یوسف کا آنا مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے جانے سے میں ادا اس ہو گیا تھا۔ اس کا اور میرا ساتھ پرائمری اسکول سے شروع ہوا اور میٹرک پاس کرنے تک رہا۔ لحاظ فطرت ہم بیشتر معاملات میں اختلاف رکھتے تھے۔ میں پڑھا کرتا اور اسے مجبوراً پڑھنا پڑا تھا۔ چنانچہ میں اپنا ہوم ورک کرنے کے بعد اس کی مدد کرتا تھا۔ ہر امتحان سے پہلے اپنے ساتھ اس کی تیاری بھی کرتا تھا۔ میں ڈیڑھ گھنٹے کے اندر فرسٹ آنے کے پتہ میں رہتا تھا۔ اسے صرف پاس ہونے سے غرض تھی۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ایک تہائی نمبر حاصل کرنے کے لیے صرف ایک تہائی نصاب پر محنت کرے اور وہ بھی تعلیمی سال کے ایک تہائی دنوں میں۔ جیسی اسکول میں اگرچہ مینی پڑھائی ہوتی تھی تو وہ دو مینی پڑھ کے پاس ہونا چاہتا تھا۔ باقی چار مینی اس کی ساری توجہ غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف رہتی تھی مثلاً کرکٹ اور ادارہ گردی۔ ہر امتحان سے پہلے میں نصاب کا نچھڑ دس سوالات کی صورت میں نکالتا تھا اور اسے یقین دلاتا تھا کہ پرپے میں سات ضرور آئیں گے اور چوٹس کا مطلب ہے پرچا سو فیصد بھی ہوگا۔ پھر وہ اطمینان سے پانچ سوالات کاٹ دیتا تھا۔ "یار فیکے! مروا دست دینا۔ بس پانچ سوال کے لیے جو پاس تو سمجھ لے بیڑا پار۔ پچاس فیصد میں سے تینتیس فیصد بھرتو ملیں گے نا۔"
میں اسے پانچ سوال کی تیاری کراتا تھا۔ عام طور پر میرا میس میج ہوتا تھا مگر اس کے باوجود نقل میں مجھے اس کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ اس کام میں وہ جینیٹکس تھا اور ایسے ایسے طریقے ایجاد کر لیتا تھا کہ ماہرین بھی دم خوردہ جاتے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ ایک پرپے میں بھی ٹپل ہو جاتا تھا تو مجھ سے لاتا تھا۔ "یار فیکے! ابھی دوستی نبھائی تو نے۔ مروا دیا نا بڑا قابل بننا تھا۔"
"یار یوسف! میرا کیا قصور۔۔۔۔۔"
"اور کیا میرا قصور ہے میں نے وہی لکھا جو تو نے بتایا۔ پھر نمبر کیوں نہیں آئے؟"
"لکھنے والا تو خود تھا۔ پتا نہیں کیا لکھا تو نے؟"
"اب ایسا بھی نہیں کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا تو لکھنا بھی نہیں آتا۔ اب ایک ہفتے تک مصیبت رہے گی مگر میں۔۔۔۔۔ شوروں والا سلوک ہوگا میرے ساتھ۔ جو تے الگ پڑا

مع صرف تیری وجہ سے۔"
"مجھے کیوں الزام دے رہا ہے کالی نکلو الے۔"
وہ آج بھرتا "کالی تو نکلو انوں۔۔۔۔۔ مگر جواب غلط نکلتے تو کیا ہوگا؟ بڑا رسک ہے اس میں فیکے! گھر جا کے دیکھو جو تے پڑیں گے۔"
میں مار پیٹ میں مکرور تھا۔ ایسے متعدد مواقع آئے جب بڑی سے کام لینے کے باوجود کوئی زبردستی گلے پڑ گیا۔ میری سوچی ہوئی ناک یا پھٹے کپڑے دیکھ کر یوسف پہلے تو بڑی لسن طعن کرتا تھا۔ ابے پھر مار کھا کے آیا ہے سائے شرم سے ڈوب مر۔ تیرے ساتھ میری بے عزتی ہوتی ہے کہ ایسے۔۔۔۔۔ دست ہیں اس کے۔ جو لفظ وہ استعمال کرتا تھا وہ بہت عام فہم تھا۔ آج بھی انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگلے دن وہ میری حمایت میں فوج کشی کرتا تھا اور "دوست" کے دشمنوں کا حشر نشر کر دیتا تھا۔ یہ دوستی ایسے ہی بڑ پکڑی گئی لیکن دوستی کے اس جھگڑا کا سا یہ میرے اور اس کے خاندانوں تک نہ پھیلا حالانکہ ہم رہتے بھی ایک ہی گلی میں تھے۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ یوسف کے ابا کا حلق قریش برادری سے تھا۔ ان کی گوشت کی دکان پہلے گلی کے موڑ پر تھی۔ پھر وہ میں مارکیٹ میں چلے گئے۔ اگلے دس برسوں میں انہوں نے اپنے بھائیوں کی مدد سے شہر کے دیگر علاقوں تک کاروبار کو پھیلا دیا۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ بچے کاروبار میں ان کے توسیع پسندانہ عزائم کا ساتھ دیں لیکن بیوی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ ماں نے صاف کہہ دیا کہ تم خود کو لاکھ قریشی صاحب کہو! انھوں کا لوگر یہاں ہاتھ سے کام کرنے والے کو نہ عزت ملی ہے نہ ملے گی۔ زبانی ہاتھی لوگ جتنی جا ہیں کر لیں مگر بچے ان پڑھ اور اسی بیٹے میں رہے تو ہمیشہ قسائی کہلائیں گے اور کسی تعلیم یافتہ مذہب اور اچھے گھر میں انہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ بچی کوئی نہیں دور نہ جاتی ہمارے جیسے ہی کسی گھر میں۔ اس کی سوچ غلط نہیں تھی۔ یہ منافق معاشرہ کسی حق حلال کی روزی کمانے والے کو نام کی عزت تو دیتا ہے دل سے عزت دار تسلیم نہیں کرتا۔ ناکی کو بار بار حجام، ظیفہ، میسر ڈریسر، مینجر اسٹاکسٹ یا کلچر بھی کہتے ایک رشوت خور قسم کا کلرک بھی بڑی حدت سے کہتا ہے میں آدمی تو کیا دیکھوں ہے تو وہ ناکی کا اولاد۔
ماں کی وجہ سے بچوں نے پڑھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ظاہر ہے پھر وہ دکان پر باپ کے شریک کار نہ بن سکے۔ جب ہم نے میٹرک کر لیا تو یوسف کے والد ایک دن فریادی

بن کے ابا سے ملے۔
ابا نے میٹرک کے امتحان میں یوسف کی کامیابی پر انہیں مبارکباد پیش کی۔ "ماشا اللہ اچھے نمبر لیے ہیں۔"
وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے "ابھی رشید صاحب! کیا کریں ہم ابھی نمبروں کا ہمیں تو فکر پڑ گئی ہے آگے کی۔"
"کیوں قریشی صاحب! کیا ہو گیا؟"
"اولاد کس لیے ہوئی ہے رشید صاحب! وہ بولے گئے "اس لیے کہ بڑھاپے میں ماں باپ کا سہارا بنے۔" "وہ تو انشا اللہ ہوں گے۔"
"ابھی کیا خاک ہوں گے۔ ہم نے سوچا تھا کہ بچے بڑے ہوں گے تو ہمارا ہاتھ بنائیں گے۔ کاروبار ترقی کرے گا مگر ماں نے ڈال دیا انہیں پڑھنے لکھنے کے راستے پر۔ یوسف بھی ضد کر رہا ہے کالج میں جانے کے لیے۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔"
"کیا اچھی بات ہے رشید صاحب! پڑھ لکھ کے کیا کرتا ہے آدمی! وہی نوکری۔۔۔۔۔ آپ نے بھی تو بہت پڑھا تھا۔ خیر وہ امتحان پاس کر لیا تھا۔ مقابلے کا کلاس دن افسر بنے بڑی ترقی کی مگر جیسا کہ تھلا ساری عمر نوکری کر کے؟"
"قریشی صاحب! پسیا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔"
"چھوڑو جی رشید صاحب! زمانے کو آپ بھی دیکھ رہے ہو۔ عزت کس کی ہے۔ پروفیسر کی یا اسٹریکٹ۔ ٹی۔ اور اچھا پڑنا چھپنے گانے والے لڑکے لڑکیاں کتنا کار ہے ہیں اور کتنی عزت ہے ان کی۔ پیسے کے بغیر خالی عزت کس کام کی۔ آدمی جو تیاں چٹخا تا بھرتا ہے۔ ہم نے تو سوچا تھا ان کے کنڈیشنز دکانیں ہوں گی کلنٹن میں ڈیفنس میں۔۔۔۔۔ وہ ہیں رہیں گے۔ اس نے سخت طحال سے سر ہلایا۔
"اللہ نے چاہا تو پڑھ لکھ کے بھی بچے آپ کے خواب پورے کر دیں گے" ابا نے کہا۔
"یہ بھی خواب کی باتیں ہیں رشید صاحب! پڑھ لکھ کے وہ کل جاتے ہیں امریکا اور کینیڈا۔۔۔۔۔ اور لوٹ کے نہیں آتے۔ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں پیدا کرنے والے ماں باپ بھی تھے۔"
ابا نے انہیں ٹالنے کی بہت کوشش کی "دیکھیے قریشی صاحب! زمانہ بدل گیا ہے فکر معاش میں پہلے لوگ گاؤں سے شہر آتے تھے۔"
"ابھی جی تو میں کہہ رہا ہوں۔ فکر معاش تو ہوتی ہے مجبوری۔ آدمی کو ہاتھ بھی پھیلا تا پڑ جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں دن

کے لیے کمائی کرنا کوئی مسئلہ نہیں بڑی منجائش ہے یہاں مگر یہ باہر جا کے دوسروں کے لیے سب کچھ چھ لیں گے اور سبزیوں یا سبز جیروں کے بیٹھے جائیں گے۔ کوئی بڑی بیچنے والی دکان کوشت و دالے تو منظور یہاں حلال جانور کا گوشت بیچنا نامطلوبہ۔ یہاں دودھ نہیں بیچ سکتے وہاں شراب بیچ لیں گے۔

تنگ آ کے ابانے کہا "قریبی صاحب آپ بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں یہ آپ کے گھر کا مسئلہ ہے۔"

"آپ فیکے پتر سے کہیں یوسف کو سمجھائے۔ وہ اس کی مانتا ہے۔"

مجھے فیکے پتر کا خطاب دینے والے قریبی صاحب ہی تھے۔ بعد میں یوسف نے میرے چنے پرنے پر مجھے اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ یوسف کے ابا کی بات پر میرے ابا اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ اچھا! میں کبوں گا رہتی ہے۔ مگر بعد میں وہ بہت غصا ہوئے کہ کیسا جاہل باپ ہے۔ بچوں کو پڑھنے نہیں دینا چاہتا۔ خود میں نے یوسف کو اکسایا کہ وہ بغاوت کا علم بلند رکھے۔ دنیا میں سری پائے اور گردے کپورے بیچنے کے خاندانی پیشے کے علاوہ بھی کام ہیں جن سے پیسا کمایا جاسکتا ہے۔

انجام یہ ہوا کہ قریبی صاحب نے بھی بغاوت کر دی مگر ان کی بغاوت اس معاشرتی سوچ کے خلاف تھی جس نے انہیں دولت مند تو بنایا تھا مگر عزت و دار تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ عجیب الہ تھا جو عزت و دار سے ان کا مسئلہ دولت مندی بھی جو انہیں کار کوشی اور انٹینس دل کستی بھی اور جو دولت کا کچھ تھے انہیں عزت کا پسپا کیا تھا۔

کہنا تھا کہ وہ انتہائی ریڈمپل کے طور پر نام کے ساتھ جو پدری یا سید اور شاہ وغیرہ بھی لگنا چاہتے تھے مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کے رہ گئے۔

صدیقی اینڈ سنز پہلے پر اپنی کسٹمنٹ تھے۔ یوسف کے ابا نے نام کے ساتھ نیا کام شروع کیا تو ان کا تجربہ صفر تھا مگر ملاٹ مکان اور دکانیں خریدنا بیچنا یا کرائے پر اٹھنا کس مشکل تھا۔ پر اپنی دوسروں کی بھی کسٹمنٹ اپنا۔ یوسف کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے تک صدیقی اینڈ سنز بلڈ رہیں گئے تھے۔ یوسف کے دونوں بھائی اس کام میں لگ گئے۔ ایک نے کاروں کا شوروم کھولا اور دوسروں کی گاڑیاں بیچنے کے کیشن سیننے لگا۔ دوسرے نے کنسٹرکشن کی۔ ابا جزل نمبر اور ڈائریکٹر فائرس رہے۔ اشتعال میں اٹھائے جانے والے ایک انقلابی قدم اور تائید ازادی سے خوشحالی ترقی اور سوشل انٹینس سب کچھ مل گیا۔ یوسف کے ابا نے تو دوسرے بھائیوں سے بھی کہا تھا کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قریبی بڑا دردی چھوڑ دیں مگر انہوں نے ہمت نہ کی۔

آج یہ سب یاد کر تے ہوئے مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہوا کہ سب والدین کی جذباتی مجبوریاں ایک ہی ہوتی ہیں خواہ وہ یوسف کے ابا کی طرح قسائی ہوں یا میرے ابا کی طرح سی ایس ایس افسر۔ وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یوسف کے ابا تعلیم کے اس لیے خلاف تھے کہ بچے خاندانی پیشہ ہی نہیں انٹینس بھی چھوڑ دیں گے۔ ابا ہوا تھا اور اب پہلے سے زیادہ ہور ہوا تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے دو بچوں کو روک لیا ورنہ یہ بات یقینی تھی کہ یوسف کے دونوں چھوٹے بھائی بھی باہر چلے جاتے۔ میرے ابا نے بہت لبرل ہو کے اپنے جذبات کو میرے مستقبل پر قربان کیا تھا مگر بالآخر انہوں نے بھی مجبوری کے آگے اپنی ہار مان لی تھی۔ خاندانی جاگیر اور زمین تو یہاں نہ ہوتی تھی۔ ان کا مجھے واپس بلانے کا فیصلہ خالص جذباتی بنیادوں پر تھا۔

ایک باہر میں نے کھڑی دیکھی اور پھر اس راستے کو دیکھا جس پر گاڑیاں مسلسل رینگ رہی تھیں۔ میروں کمر کی ایک سیڈ ان گھوم کے اندر آئی اور پارکنگ لٹ میں ٹھہر گئی۔ پھر میں نے اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی اور ماہوی کا سارا غبار ایک دم چھٹ گیا۔ کسی ضرورت کے بغیر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا ناکی کی ناٹ درست کی اور اس کے استقبال کے لیے شیشے کے خود کار دروازے کی طرف گیا جو بڑی خاموشی سے ہر آنے جانے والے کو راستہ دیتا تھا۔

وہ اپنی نازک اور اجلی ریشمی لکس والی کمر کے خم کو ہلکا سا

بل دے کے کار سے اتری۔ اس نے خوف سے کچھ کہا اور پھر حلائی نظروں سے ہر طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی سازی کا رنگ زرد تھا۔ کسی حد تک شوخ ہنسی رنگ جو نیلے پادلوں کے پس منظر میں اور بھی نکھرا ہوا لگتا تھا۔ کاسنی رنگ سے چھوٹے چھوٹے پھولوں کی ایک تیل بھی جو سازی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی اس کے قوس در قوس جسم کے گرد لپکتی جاتی تھی۔ خاصے کشادہ گلے کا سیلیس بلاؤز اس کے کسے ہوئے پیٹ اور کمر کے ایک بالشت سے زیادہ حصے کی سنہری جلد کو بڑی دلکشی سے نمایاں کر رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ زرد رنگ اس کے مددگار شانوں اور چہرے کے نیچے گردن سے شروع ہونے والے اور پشت کی جانب پھیلے ہوئے جلد کے شفاف رنگ میں کیسا سنہرا پن جگا دیتا ہے اور مجھے کتنا مسحور کرتا ہے۔

شاید میں اس میں کچھ کمال ایک وقت سے نسبت کا بھی تھا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ہمارے ہی خاندان کی تقریب بھی چچاں مایوں کے ردائی زرد لباس میں اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں اور میری عمر ایسی تھی کہ مجھے سب ہی اچھی لگ رہی تھیں لیکن جب وہ سامنے آئی تو میری نظر میں سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ بقول شاعر میرا اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اس میں میری نظر کا ذرا بھی تصور نہیں تھا۔ وہ بھی یہی کچھ ایسی..... آج بھی ہے۔

فریال کو یہ سازی میں نے اغریا سے ٹھکوا کے اس کی منگنی پر تختے میں دی تھی۔ دس کنال پر محیط لاہور میں کیولری گراؤنڈ کے ایک قلعہ عالی شان میں وہ اپنے منگیتر مندر سلطان مرزا کے ساتھ بڑی تمکنت اور شان دلربائی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں سخت حسد محسوس کرتا تھا اور احساس کتری میں مبتلا ہو کے اسے قتل کرنے کے خطرناک منصوبے بنانے لگتا تھا۔ وہ میری طرح پینڈم میر تو خیر نہیں تھا اس کی تعلیم بھی واجبی تھی مگر وہ وہاں تھا اور دولت مند تھا۔ وہ جدی لپکتی ڈیڑھا تھا۔ شہر کی طرف آنے کے لیے وہ زمیندار سے صنعت کار بن گیا۔ اس نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر سیاسی اور حکومتی حلقوں سے رابطے خوب استوار کیے اور ابر کلاس کو حاصل ہونے والی تمام مراعات اسے خود بخود حاصل ہوتی رہیں۔ زندگی میں زمینیں اور دیکھنی کار راستہ اس نے ایک فلم کا اعلان کر کے نکالا۔ چند سالوں میں وہ فلسفہ سے ہدایت کار بھی ہو گیا۔ فریال بھی نہ جانے کتنی حسناؤں کو وہ ایک گھیر سے بھر پور زندگی کے خواب دکھا کے میرے جیسے عاشقان صادق سے چھین چکا تھا۔ بڑی

تحقیق کے بعد میں نے فریال کے سامنے تین لڑکیوں کے نام پیش کیے تھے جن سے مندر سلطان مرزا گزشتہ سات برسوں میں منگنی کا ڈراما کر چکا تھا مگر فریال نے میرے سنسنی خیز انکشافات کو بس کے نال دیا تھا اور میری ناک بڑے کے کہا تھا "یار! ایک ڈراما مجھے بھی تو کرنے دو۔ ایسی روٹی صل مت بناؤ۔"

اپنی ذہنی کیفیت کے باعث میں حال سے نکل کے یوں باضی میں بھٹکتے لگتا تھا کہ جب فریال میرے سامنے آگئی تب بھی میں اسے یوں دیکھتا رہا جیسے ہم لندن کے ریسٹورنٹ میں نہیں مندر سلطان مرزا کے اسی لان پر کھڑے ہیں۔ اسے میری یہ محرزہ خوبیت اچھی لگی۔ اس کے رخسار پر شوق سی بھوتی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں لہرا کے لہی اور اس نے میری آنکھوں میں جھانک کے اور میرے سامنے چٹکی بجا کے کہا "اے رسدو! آئی ایم میر۔"

میں نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا "مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا۔"

اس نے میرے شانے پر اپنا سر رکھا اور میرے ہمارے پر چلنے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر کے گرد محاکل کر دیا "کب سے کھڑے تھے یہاں؟"

"چھپانیں۔ شاید ہمیشہ سے۔"

اس نے کہا "مجھے کچھ دیر ہوگئی۔"

"NOTHING UNUSUAL"

"تم خام ہوتا؟"

میں نے کہا "بالکل بھی نہیں۔ انتظار کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اگر تم پہلے سے یہاں موجود ہوتیں تو یہ خوشی مجھے کہاں ملتی جو جہیں گاڑی سے اتار دیکھ کے ہوئی تھی۔"

کری پر بیٹھے ہوئے اس کا آجمل نیچے گر گیا "جہیں یقین تھا کہ میں آؤں گی؟"

"ذرا بھی نہیں۔ لندن میں چھ سال ہو گئے مجھے۔ سو بار وعدہ کیا ہوگا تم نے۔ ملی ہو گیا ہر مرتبہ..... کہو تو تاریخیں اور دن بتاؤں؟"

اس نے عادت کے مطابق چہرے پر آ جانے والے بالوں کو بڑی نزاکت سے چھپے کیا "تم نے کئی بات کرتے ہوئے فون پر تم سے بات کرتے ہوئے مجھے اتنا غماخ رہنا پڑتا ہے۔"

"معلوم ہے۔ جب تم نے کہا تھا کہ میں آؤں گی تو میں نے سوچا تھا کہ میرے ساتھ پھر وہی ہوگا۔ جو اکثر ہوتا ہے..... گھٹنا بھر جھک مار کے میں نامراد واپس جاؤں گا۔"

”آئی ایم سوری ردیو! لیکن یہ ضروری ہے۔ مندر
ایک شکی مزاج شخص ہے۔“
”نہیں کرو فریال! میرے ضبط کا حوصلہ جواب دے چکا
ہے۔ یہ بھی سوچا تھا میں نے کہ آج آخری موقع ہے تم سے
بدل لینے کا۔ میں نہ جاؤں! ایک بار تو تمہیں بھی مایوس لوٹنا
پڑے۔ پھر تمہیں احساس ہوگا کہ اس مایوسی میں کتنا دکھ کتنا
غصہ اور شکست کی کتنی جھلکا ہٹ شامل ہوئی ہے۔“
”پھر..... کیوں آگئے؟“ اس نے مجھے جمائے دیکھا۔
میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”آئی جسٹ ڈونٹ نو۔
شاید اس لیے میں الوکا پٹھا ہوں۔ میری بے چارگی کا احساس
دھینا تمہیں بہت خوش دیتا ہوگا۔“
”ایسا تم کہو۔ پلیز!“
میں نے کہا ”تم نہ بد دل ہونے دو۔ وقف۔ بد دل میں
ہوں کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کر سکا سوائے بے وقوف بننے
کے۔“
اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ”کتنی بار اپنی
مجبوری بتا چکی ہوں میں تم مجھے ہوا چھی طرح۔“
میں نے اپنا ہاتھ پیچ لیا ”نہیں فری! میرا ذہن یہ بات
بالکل قبول نہیں کرتا کہ کوئی لڑکی جو تمہاری طرح بڑھی لکھی ہو
ذہن ہو اور لندن میں رہتی ہو وہ اتنی بے بس ہو سکتی ہے جتنی
وہ عورت جو کسی ڈیرے کی کٹی جیل میں ہو۔ کیا کر سکتا ہے
آخر وہ حرام زادہ۔“
”وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مرد اسکا ہے مجھے اور
تمہیں۔“
”رہنے دو فریال! ایسا ہوتا تو وہ مجھے کب کا مرد چکا
ہوتا۔ اور کیا فائدہ ایسے جینے کا۔ روز روز کے مرنے سے
ایک بار مرنا اچھا۔“
”فضول باتیں مت کرو۔ ہم کیوں مریں
آخر؟ میری یہ اختیار صرف تمہیں بچانے کے لیے تھی۔“
میں نے کہا ”تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ اسے کچھ معلوم
نہیں۔ آخر چھ سال سے میں یہاں ہوں؟“
”اگر اسے ذرا بھی شک ہوتا۔ تو نتیجہ اب تک
سامنے آ جاتا۔ اس کے جاسوس اور خبر پہلے دن رات مجھ پر
نظر رکھتے تھے۔ تمہارے بارے میں اسے رپورٹ ملتی رہتی
تھی کہ تم امریکا میں ہو۔ پھر یہ پتا چلا تھا کہ تم نے وہیں
ملازمت کر لی ہے۔“
”تمہیں کیسے پتا چلا تھا ان رپورٹوں کا؟“
”یہ رپورٹیں میرا شو فر دیتا تھا۔“

میں نے کہا ”شو فر کو اس نے رکھوا دیا تھا۔“
”نہیں۔ رکھوا تو خود میں نے تھا۔ اس نے چسپا دے کر
خرید لیا۔ آدی بے وقوف ہے میرے ہی گھر کے فون پر مندر
کو ہر بات بتاتا تھا۔ میرے بیڈ روم کا فون الگ ہے۔ وہ
لاؤج کے فون پر بات کرتا تھا۔ وہ بھی رات ایک دو بجے۔
جب پاکستان میں شام کے سات آٹھ بجے کا وقت ہوتا تھا۔
میں نے باہر والے فون کا کنکشن لیا مگر ایسے کہ پتا نہ چلے اور
ایک کیسٹ ریکارڈ اپنے کمرے میں لگا لیا۔ روز صبح اٹھ کے
مزدور شہر کی گلیوں میں چلی گئی۔“
”اور اگر یہ راز فاش ہو جاتا۔ پھر.....؟“
”کیسے فاش ہو جاتا۔ میرے بیڈ روم میں جا سکتا ہے
کوئی؟ تمہارے سوا۔“ وہ مسکرائی۔
ویٹریس نے ہمارے درمیان کافی اور سینڈوچ رکھ
دے۔ غور سے فریال کو دیکھا اور سٹائش کے انداز میں
سر ہلا کے چلی گئی۔
میں نے کہا ”اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہے نا..... کہ تم
نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ بہت چالاک سمجھتی تھیں نا خود کو۔
کتنا مہنگا پڑا یہ ڈراما!“
”دھکا لپیٹے ہوئے باہر دیکھتی رہی۔“ اس نے دھوکا دیا
مجھے۔
میں نے کہا ”فارسی میں کہتے ہیں ’چاہ کن را چاہ
در پیش۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودے خود اس میں
گر جاتا ہے۔“
”گڑھا اس نے کھودا خود اپنے لیے۔“
میں نے کہا ”کیا فائدہ خود کو دھوکا دینے کا فری! اس
نے تم کو اپنی فلم میں ہیر دکن بنانے کا وعدہ کیا تھا۔“
”لیکن اس کی قیمت وہ مجھ سے پہلے وصول کرنا چاہتا
تھا۔“
”ایسا تو ہوتا ہے۔ ہر جگہ اور سب کے ساتھ ہوتا ہے۔
چانس کیا صرف خوبصورتی اور اداکاری کی صلاحیت پر ملتا
ہے؟ یہ جو بڑی بڑی نامور ہیر دکن ہیں آج انہوں نے
معمولی لائٹ من سے ہدایت کار تک سب کی ہر شرط بلاچوں
دچرا منظور کی۔ پردے پر نظر آنے سے پہلے کسی کسی کے
ساتھ نظر آئیں۔ تم اتنی بھولی تو نہیں تھیں کہ یہ سب تمہیں
معلوم نہ ہو؟“
”اگر مینٹ میرے والد نے سنا کیا تھا۔“
میں نے پوچھی سے کہا ”تمہاری رضامندی
سے..... بہت خوش تھیں تم۔“

”میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔“
میں نے چلا کے کہا ”بکواس مت کرو میرے سامنے۔
کہا ہوتا مگر تم انکار کر دیتی؟ وہ جان سے مار ڈالتا تمہیں؟ تم
نہیں ہی تھیں کہ پہلی فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی تم فلمی آسان کا
سب سے روشن ستارہ بن جاؤ گی۔ ایٹوریا رائے آف
پاکستان کہلاؤ گی۔“
”وہ خاموشی سے سینڈوچ کترتی رہی۔ اس کی خاموشی
اعتراض جرم تھی۔“ ”میری ایک غلطی کو معاف نہیں
کر سکتے۔“
میں نے کہا ”ایک غلطی..... جب اس نے اپنی دوستی کا
ہال چھینا تھا تو میں نے تمہیں خبردار کیا تھا یا نہیں؟ غلطی کا
ذرا مار چکا کہ وہ پہلے بھی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا
نشانہ بنا چکا تھا۔ تم نے میری نہیں سنی اپنی عقل اور ہوشیاری پر
بڑا باز تھا تمہیں۔ تم نے کہا کہ میں بھی تو ڈراما کر رہی ہوں۔
اور تم کھلم کھولی اصرار ڈرانے لگے۔ بے وقوف! پگھل لڑکی! اب
ایک لاکھ روپے لے لو اس لے کر شراب پی لیا اور تمہیں کنوئیں
میں دھکا دے کر خود قبر میں جا لیا۔ نہ فلم میں تمہاری جان
چھوٹی۔“
”مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا ضدی اور سر بھرا
ہے۔ اتنا ختم مزاج ہے۔“
”پاپا! ایسے ہی ہوتے ہیں یہ عیاش و ذیرے۔ ایک
عورت ان کی ان کی شکست کا سبب بن جاتی۔ ناممکن۔
ان کی دولت اور ان کی طاقت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔
عورت ان کے نزدیک پاؤں کی جوتی ہے۔ خواہ وہ مس
یونیورس ہو۔ اسے دھس پر نہیں چڑھنے دیتے۔ تم اس کے
لیے چیلنج بن گئی ہو۔ اب تمہارے لیے نجات آسان نہیں ہے
فریال! یہ غلطی کیسے تو زد کی تم؟“
اس نے آنکھوں میں آجانیے والے آنسوؤں کو ٹشو پیپر
سے صاف کیا ”میں سب ٹھیک کر لوں گی ردیو! مجھے تمہوڑا سا
وقت اور دو۔ اتنی جلدی مت کرو۔“
”جلدی..... چار سال گزر گئے ہیں اور تم کہتی ہو
جلدی!“ میں نے نفی سے کہا ”میرے پاس اب بالکل وقت
نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بلانے کے لیے جھوٹ نہیں بولا
تھا۔ میں صبح داغی جا رہا ہوں اور میرے واپس آنے کا بھی
کوئی امکان نہیں۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔“
”وہ مجھے دیکھتی رہی۔“ مجھے اسی لیے آنا پڑا کہ فون پر تم
بہت سیریس لگ رہے تھے۔“
میں نے چلا کے کہا ”فریال! میں سیریس ہوں۔“

”نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایسے مجھے جھوڑ کے نہیں
چا سکتے..... میں..... آئی دل کل یو۔“ اس نے میز پر آگے
جھک کر میرا کار بکڑ لیا۔
میں نے کہا ”ڈونٹ لی میڈ۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔“
”دیکھتے رہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ مجھے بتاؤ تم ایسا
کیوں کر رہے ہو آخر!“ اس پر ہنسیا طاری ہونے لگا۔
”اوکے..... اوکے! میں بتاتا ہوں ذرا آرام سے بیٹھو
پلیز!“ میں نے اس کے گالوں پر ہنسی دی۔ اسے بٹھانے کے
لیے مجھے اٹھنا پڑا۔
”نہیں۔ پہلے کہو کہ تم نہیں جاؤ گے“ اس نے مجھے ایک
جھٹکا دیا اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔
لندن میں کوئی جذباتی منظر کسی کے لیے بھی باعث
تشویش نہیں ہوتا۔ خصوصاً عشق کی داغ بیل کا۔ لوجان
مگر دوپیش سے بے خبر ایک جان دو قلب ہو کے بوس دکنار
میں مصروف رہیں کوئی محل نہیں ہوتا۔ میں نے بھی فریال کو
چوا اور اسے پیچھے کے اپنے ساتھ نیرس پر لے گیا کیونکہ وہ
زارو قطار روٹنے لگی تھی۔
جب بالآخر اس کے آنسو تھمتے تو میں نے اسے ریٹ
روم میں بیٹھ دیا جو لیزر کے لیے مخصوص تھا۔ وہ دس منٹ بعد
اپنا میک اپ ٹھیک کر کے نکلی تو خاص سنبھل چکی تھی۔ میں نے
بہتر سمجھا کہ اسے کہیں اور لے جاؤں۔
”دریا کے کنارے کی طرف چلے ہوئے میں نے کہا۔“ یہ
گاڑی کسی کی تھی..... بیرون!“
”ڈاکٹر شاستہ کی!“ اس نے بے خیالی میں جواب دیا
”میری گاڑی اس کے کلینک کے باہر کھڑی ہے۔“
میں نے آنسو اور جھٹکا ہٹ میں سر ہلا یا مگر فریال کو
کچھ کہنے سے گریز کیا۔ وہ خاص تھکی ہوئی لگ رہی تھی اور کچھ
ڈپریشن کا شکار تھی۔
ہم دریا کے کنارے خوبصورت باغ کی ایک بیچ پر بیٹھ
گئے۔ دہیں ہم جیسے لوجان تھے یا پھر بوڑھے۔ لوجان اس
منظر کا حصہ ہونے کے باوجود یہ منظر نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ
ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنے خواب دیکھ رہے تھے۔
بوڑھے اس دنیا پر الوداعی نظریں ڈالتے محسوس ہوتے تھے جو
رفتہ رفتہ ان سے چھوٹی جا رہی تھی۔
”تم کچھ دن تو ٹھہر سکتے ہو..... میری خاطر!“ فریال
نے کہا۔
میں نے نفی میں سر ہلایا ”کل علی الصباح میری ملازمت
ہے۔“

اس کا رنگ پیکا پڑ گیا ”رئی! جہاں اسنے دن گزرے ہیں وہاں چند روز.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی ”کیا ہوگا چند روز بعد فری! کچھ بھی نہیں“ تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے باپ نے مجھے سات سمندر پار کیوں بھیج دیا تھا۔ حالانکہ میں اس کا اکوڑ بیٹا تھا۔ پاکستان میں میری جان کو ایک نہیں دو جان لیوا بلا میں چٹ گئی تھیں۔ ایک گروعی سیاست..... اور دوسری تم۔“

”کیا میں بلا ہوں؟“

”بڑی خوبصورت قاتل بلا۔ ایسی حسین ناگن کہ جس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے۔ مجھے تم نے بھری جوانی میں ڈس لیا تھا۔ آج چھ سال بعد تمہارے عشق کا زہر میرے خون میں اور جسم کے ہر مسام میں ایسے رچ بس گیا ہے کہ نہ میں مر سکتا ہوں اور نہ جی سکتا ہوں۔ پتا نہیں میری زندگی کیسے گزرے گی۔“

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ”ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو۔“

میں نے کہا ”بھریا کروں! جانتی آ نکھوں سے خواب دیکھتا ہوں۔“

اس نے کہا ”ہیں کوئی انتہائی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔“

میں نے کہا ”مثلاً؟“

وہ سوچتے ہوئے بولی ”پلہم شادی کر لیں۔“

میں نے کہا ”اچھا۔ وہ کیسے؟“

”یار! جیسے سب کرتے ہیں۔ نکاح مسجد میں ہی ہو جاتا ہے دو گواہوں کے سامنے در نہ تم آ جاؤ برات لے کر میرے گھر۔“

”اور اس کے بعد؟“ میں نے کہا۔

”اس کے بعد کیا۔“

میں نے کہا ”شادی کر کے جائیں گے کہاں؟ کہاں رہیں گے؟“

اس نے کہا ”اتنی بڑی دنیا ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں! پلے جائیں گے تمہارے ماموں کے گھر امریکا۔“

”ماموں۔ کون سے ماموں؟“

”جار جن! وہ! ہمیں گلے لگا کے کہیں گے کہ میرے بچو! آرام سے رہو یہاں آ دھواڈ ہاؤس خالی کر دیا ہے تمہارے لیے۔“

”فلکی کوئی بات نہیں۔“

”تم مذاق کیوں ازاتے ہو ہر بات کا؟“

”اس لیے کہ تم باگل ہو۔ اپنے ساتھ مجھے بھی باگل بنا رکھا ہے۔ تم پر فلکی عشق سوار ہے۔ تم سمجھتی ہو ہم بھی بھرا ہروں کی طرح اس شہرہ آفاق گانے سے فلاح پاسکتے ہیں جس میں ہروں نے کہا کہ چل چلیے دینا دے اس گھر سے نچے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے اور ہیرو نے کہا فیبا۔ لاروہ جانیٹے قلب شمالی باڈاؤنٹ ایورسٹ پر۔“

فریال ہنسنے لگی ”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“

”دنیا بہت بڑی ہے۔ اور کیا مطلب ہے اس امتحان بات کا۔ ہم بھاگ کے کہاں جاسکتے ہیں فری! ہمارے پاس شہریت ہوئی امریکا، برطانیہ کی..... یا کسی یورپی ملک کی تو وہ پائے خان کا سالہا ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اب تو جینون گراؤنڈز پر بھی سیاسی پناہ نہیں ملتی۔ پہلے بہت لوگ جرمنی میں سیٹل ہو گئے کہ ہم مذہبی اقلیت ہیں اور پاکستان میں انتہا پسند ہمیں مار دیں گے۔ برطانیہ اور فرانس سب کے دروازے تو سب کے لیے کھلے ہوئے تھے لیکن وہ زمانے اب نہیں رہے۔ اب مسلمان دہشت گرد ہیں۔ خصوصاً پاکستانی۔ ہمیں تو واپس جانا ہی پڑے گا اور مرنا ہی پڑے گا۔“

”تم مرنے سے ڈرتے ہو؟“

میں اسے دیکھتا رہا ”اگر میں یہ کہوں فری کہ تم نے مجھے اتنی محبت نہیں ہے کہ تمہاری خاطر فلم مغل اعظم کا گانا ”اے محبت زندہ باد“ گا تا ہوا جان دے دوں۔“

”تو میں نہیں مانوں گی۔“

”تم اس خیال میں برا غرور محسوس کر سکتی ہو مس فریال کہ تمہارے بہت سے چاہنے والوں میں ایک ایسا بھی ہے! اتنا وفا شعار ایسا جانثار۔ زبردست الو کا پٹھا کہ تم نے ممکنہ کر لی! اس کا عشق دہی رہا۔ چھ سال سے تمہارے خیال میں جیتا ہے تمہارے نام پر مرنے والا۔ دو لڑکیوں کی ایسی انتہا پسند بھی تم نے نہیں۔ وہ جو فریاد صاحب تھے دو دھ کی نہر نکال لائے مگر شیریں کی شادی کی خبر لی تو فوراً ہی خودکشی فرمائی۔ میرا حوصلہ دیکھو کہ میں جیتا رہا، جھولی آس پر۔“

”جھولی آس.....؟“ اس نے روہا ہوا کے اپنا ہاتھ

میرے ہاتھ پر رکھ دیا ”اسنے خال تو نہ بنو دیو!“

میں نے اس کا ہاتھ جھک دیا ”بھڑا میں کیا رو میو اور اب جہنم میں جائے جیولٹ۔ میں مزید بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ابانے مجھے فوراً واپس بلایا ہے کہ لعنت بھیجو اس نوکری پر اور پاکستان آ جاؤ۔“

”مگر کیوں..... پاکستان میں کیا ہے؟“

میں نے کہا ”تمہارے لیے واقعی کچھ نہیں ہے۔ منافقت بھرے ڈانیاں تو میں بول نہیں سکتا کہ مجھے وطن کی مٹی سے بہت پیار ہے اس لیے میں چار ہا ہوں۔ اصل بات ہے کہ وہاں میرے والدین ہیں۔ گیارہ تہہ والے واقعے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ میں انہیں بھی امریکا اور برطانیہ لے جاؤں اور ہم وہاں فکسی خوش سیٹل ہو جائیں۔ جب میں گیا تھا تو حالات کچھ اور تھے۔ انہیں میری زندگی کی فکر تھی۔ مجھے بھی ایک محفوظ مستقبل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے چھائی کا عذاب قبول کر لیا۔ وہ خود اس عمر میں جلا وطنی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میرے اصرار پر وہ صرف ایک بار امریکا آئے تھے۔ ایک مہینہ انہوں نے بڑی مشکل سے گزارا۔ نہ وہاں کے ماحول کو قبول کر سکے اور نہ اس ماحول نے انہیں قبول کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پاکستان جاؤں تو پھر انہی پرانے سیاست پیشہ دوستوں اور دشمنوں کے چنگل میں پھنس جاؤں۔ تم جانتی ہو فضیلت فری کی طرح وہاں صبر فری بھی ایک انتہائی منافع بخش پیشہ ہے جسے جمہوریت کا نام دے دیا گیا ہے زبردستی۔“

”پھر اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟“

میں نے اسے بتادیا جس حد تک مجھے معلوم تھا۔ میری نظر گھڑی پر بھی تھی۔ اب نو بج رہے تھے۔ فریال کو قوت ہو گی کراب میں اسے کسی اچھی سی جگہ ڈنر کے لیے لے جاؤں گا مگر میں نے اسے بتادیا کہ آج رات میرے سب دوست ایک الوداعی دعوت میں شریک ہوں گے چنانچہ دس بجے تک مجھے واپس جانا ہوگا۔

”کچھ عجیب سی کہانی ہے“ اس نے کہا ”نا قائلین یقین۔“

میں نے کہا ”ہاں! میری اور تمہاری کہانی بھی ایسی ہی ہے۔“

”کیا کرو گے تم واپس جا کے؟“ وہ میرے کی انگوٹھی کو اپنی من گھڑی رہی۔

”وہی جو میرے والدین جا چکے۔“

”گنڈ ہوائے! فرض کرو انہوں نے کہا کہ بدخود دار نور چشم ہم نے تمہارا رشتہ تمہاری عم زانو سے طے کر دیا ہے۔

وہی جسے تم اللہ میاں کی بیٹنیں قرار دیتے ہو.....“ وہ ہنسی۔

میں نے کندھے اچکاے ”میں کہوں گا جیسی آپ کی مرضی۔ میں انکار نہیں کر سکتا۔“

”جھوٹ..... کجواس..... مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں

کر سکتے۔“

”کیوں نہیں کر سکتا مس فریال! اگر تم نہیں تو پھر کیا فریال پڑتا ہے“ کوئی بھی ہو۔ اگر میری پسند نہیں تو بھران کی پسند سہی۔ وہ تو خوش ہو جائیں۔ دس سال پہلے میری ماں نے خواب دیکھے شروع کیے تھے۔ میرے سر پر سہرا بجانے کے چاندی بھولانے کے۔ اپنے پوتے تو اسوں کے ساتھ کھیلنے کے اور انہیں لاڈ سے بگاڑنے کے۔ دو آرزو میں کٹ گئے۔ دو انتظار میں۔ باقی جو تم نے جھین لیے۔“

”مجھے الزام مت دو۔“

میں نے رکھائی سے کہا ”ادکے۔ یہ ظلم میں نے کیا ان پر۔ اب میں اس کی عطا کی کرنے چاہا ہوں“ کوئی اعتراض؟“

اس نے اعلان اور دینا دینا ہے بے خبر اکھار عشق میں مصروف ایک جوڑے کو دیکھی سے دیکھا ”تمہاری گرل فرینڈ کا کیا ہوگا؟“

میں نے بھنا کے کہا ”وہی جو تمہارے بوائے فرینڈ کا ہوتا تمہاری شادی کے بعد۔“

وہ مسکرائی ”روسیو! اگر تم کسی میم کو شادی کے بعد اپنے ساتھ لے جاتے تو کیا ہوتا۔ مثلاً وہ لارڈ کی بیٹی..... انشا“

میں نے پورے یقین سے کہا ”وہ اسے بھی گلے لگاتے۔ والدین بڑے مجبور لوگ ہوتے ہیں فری! خصوصاً وہ جن کا ایک ہی بیٹا ہو۔ بہت قابل رحم ہوتے ہیں۔ وہ انہیں جتنا بیک سیل کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ کئی بار خود انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اور کوئی لڑکی نہیں ہے دنیا میں۔ دلالت میں بھی کوئی پسند نہیں آئی تھیں۔“

”یعنی میرے سوا مجھے وہ قبول نہیں کر سکتے۔“

”پلیز سٹ آپ فریال! تمہیں شرم آتی چاہیے۔ تم الزام انہیں دے رہی ہو۔ خرابی کا ذرے دار تھا تمہارا باپ۔

اب وہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے تو میں اسے کیا کہوں؟ میری خاطر وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ اگر میں کسی چیز کا بھی کہتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ پھر تمہیں کیسے قبول نہ کرتے؟ مگر تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سوائے مجھے بے وقوف بنانے میری زندگی خراب کرنے کے۔ مجھے خواب دکھانے کے جھوٹے وعدوں سے بھلانے کے..... اور مجھے دھوکا دینے کے۔“

وہ چلائی ”ایسا مت کہو رنی! میں پھنسا ہوں گی۔“

میں نے آگے جھک کے کہا ”کس کے منہ پر..... بولو میرے یا اپنے؟“

وہ رونے لگی۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں اس کی خوبصورت آنکھوں سے چپنے والے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں

ہمارے حق میں سازگار ہو جائیں گے۔ تمہارا وہ ہول
مجازی خدا! تمہارا آقا مالک! سرتاج اچانک تمہارے
عشق کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گا۔ اتنا بڑا سیاسی
جدی پشتی فیڈول لارڈ۔ کینہ پرور اور کینہ۔ وہ انتہائی
ہو کے دست بستہ تمہاری خدمت میں حاضر ہوگا اور
مجھے معاف کر دے زور پرستی سے تمہاری محبت جیتنے کا
کرنا میری بے وقوفی تھی۔ میں تمہارا گنہگار ہوں
طرف سے تم آزاد ہو اور پھر خود تمہیں میرے پاس
تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گا اور کہے گا کہ چاہا
اب تیرے حوالے۔“

اس نے اپنا ہینڈ بیگ مجھ پر دے مارا ”کواس فو
آپ یا کچھ اور کہنا پانی ہے؟“
میں نے کہا ”نہیں۔ اب تم بتاؤ کہ ناممکن کو ممکن
بناؤ گی۔“

اس نے کہا ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جا کے
لیے آکس کریم لاؤ۔“
میں کچھ فاصلے پر نظر آنے والے پارلر تک گیا
اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آدھا لیٹر کا ایک ڈبا میں
تمہارے۔
”چاکلیٹ ہے نا“ اس نے بچوں کی طرح پوچھا
”ہاں بابا چاکلیٹ ہی ہے۔“

”بابا جی ناراض کیوں ہوتے ہو“ اس نے پلاسٹک
چمچے کو آکس کریم کے بھر کے منہ میں رکھا ”اچھی ہے۔“
”اتنی چاکلیٹ کھاتی ہو تم اور آکس کریم..... کجا
تمہیں کچھ نہیں ہوتا۔“

اس نے اوپر دیکھا ”اللہ کا کرم ہے۔ جلنے والا
رہیں۔ دیکھو رمیو! یہ میرا آخری سمسٹر ہے۔ سولہ
ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے میرے پاس شادی نہ کرا
بہانہ کوئی نہیں رہے گا۔ اس ضدی آدمی نے میرے
کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں
بتا دیا تھا کہ وہ مجھے مہلت دیتا رہے گا۔ جتنی میں چاہو
یہاں تک کہ میرے پاس سارے بہانے ختم ہو جائیں
بالآخر مجھے اس کو قبول کرنا پڑے گا۔ بات صرف وقت
حوصلے کی ہے۔“

”یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ دس بیس پچاس سال
گزر جائیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی تکبیر سے کوئی
شادی کر سکے۔“

”اس کی نفرت کا یہ پہلو بعد میں سامنے آیا۔ وہ

سے بی لوں گا۔ اسے آغوش میں لے کر کہوں گا کہ فریال! یہ
علم نہ کر دمجھ پر۔ تمہیں روتا دیکھتا ہوں تو میرے دل میں
انکارے بھر جاتے ہیں۔ لیکن میں خود پر جبر کر کے کامل بے
حسی کا اظہار کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی۔ اظہار ہمدردی کے
طور پر کسی بھی لڑکی کو رومال پیش کر دینا اس سوسائٹی کے
آداب مردانگی میں شامل تھا جو کہ شیولری کہلاتا تھا۔ دو
بوزے انگریزوں نے مجھے پر ملاحت اور شرمسار کرنے والی
نگاہوں سے گھورا مگر میں نے پروا نہ کی۔ میں اپنے رویے
سے فریال پر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ اب میرا دل بھی پتھر
ہو گیا ہے۔

اس نے دفنی بیگ سے اپنا سنہرے فریم والا نازک سا
آئینہ نکالا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھ کے میک اپ ٹھیک کرنے
لگی۔

میں نے کہا ”کچھ کھاؤ گی تم؟“
”کہاں لے جاؤ گے تم مجھے؟“ اس نے رکھائی سے
کہا۔
”کہیں بھی نہیں۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں آج سب
لوگ جمع ہوں گے۔ میرے دفتر کے ساتھی..... اور دوست!“
”وہ بھی ہوگی..... ایسا..... جو تمہارے لیے عائشہ بن
سکتی؟“

”سب ہوں گے سوائے تمہارے۔“
”مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس ڈرامے سے۔ میں تمہیں
الوداع کیوں کہوں؟ تمہارے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں میں
بھی۔“

”ابھی تمہارا کورس ختم ہونے میں چار مہینے باقی ہیں۔“
”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ابھی مت جاؤ سولہ مہینے
کی قیامت ہے۔“

میں نے کہا ”فری! کوئی اور بات کرو۔“
اس نے کہا ”پلیز..... چلو دو مہینے۔ اب کیا میں
تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں؟“

میں نے جھلا کے کہا ”کیا ہو گا وہ ہفتوں میں؟“
”وہی جو تم چاہتے ہو۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ ایک
آخری موقع..... تمہیں میری قسم۔“

”فری! خدا کے لیے.....“ مجھ پر جھنجھلاہٹ طاری
ہونے لگی۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا معجزہ رونما ہو سکتا ہے دو
ہفتوں میں۔ کوئی جادو کوئی روحانی وظیفہ سفل عمل یا نقش
اعظم ہے جس سے کایا ٹکپ ہو جائے گی۔ حالات پلٹا کھا کے

خطرناک آدی ہے اور اسی لیے میں نے تمہارے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ اس کے لیے مجھے خود پر بھی بہت جبر کرنا پڑا۔

”میں جانتا ہوں فریال! اور اسی لیے دفنی طور پر میں بہت پہلے تمہارے عشق سے تاب ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم زندہ رہو۔ اور خود مجھے بھی مرنے کا شوق نہیں تھا۔ صورت حال آج بھی وہی ہے۔“

”ہاں..... مگر اب ہمیں صورت حال کو بدلنا ہوگا۔ سناتم نے؟“

”ہاں سن!“ میں نے کہا۔ ”لیکن تم بھی سن لو کہ میں بہت کم ہمت اور بزدل ہوں۔ میں ذرا بھی بہرہ نہیں ہوں۔ مجھے محبت میں جان کا سودا اعلیٰ منظور نہیں۔ تم مجھے کم عقل اور بے وقوف بھی سمجھ سکتی ہو کہ مجھے انتقال پر ملال کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“

اس نے آئس کریم کے خالی کپ کو حسرت سے دیکھا۔

”آخر ہم ہی کیوں مر رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ عاشقی کی روایات ایسی ہی ہیں۔ محبت کرنے والے ہی مرتے ہیں۔ آج تک کسی فلمی داستان عشق کے ہیرو نے اپنے رقیب رو سیاہ کا مرز نہیں کیا۔“

”یہ ایک سو صدی سے ڈارلنگ! اب چراغ تلے نہیں چراغ کے اوپر اندھ رہا ہوتا ہے۔ محبت کی روایات بھی بدل گئی ہیں۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔“

میں نے چونک کر کہا، ”کون سا کام؟“

”بگل دیٹ باسٹرڈ!“ اس نے سکون سے کہا اور آئس کریم کے کپ کو کچھ کی سائڈ میں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ”اس کے سوا چارہ نہیں۔“

میں اسے دھتکار رہا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی۔ ”واٹ نان سنس!“

”رنی! ہمارے ملنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے درمیان سے ہٹا دیا جائے۔ اس کو قتل کر دیا جائے یا کر دیا جائے۔ آخر وہ بھی تو یہی کرے گا۔ جیت کے لیے پہل ضروری ہے۔ جارحیت ہی سب سے مؤثر دفاع ہے۔ اس سے پہلے کہ سناپ تمہیں ڈے اس کو بارڈالو۔“

میں نے آسمان کو دیکھا۔ ”ہاں اس طرح ہماری ارواح کا عالم بالا میں ملن ہو سکتا ہے۔ وعدہ کر دو کہ مجھے پھانسی ہوتے ہی تم بھی زہر کھا کے فوجا جان دے دوں گی۔ سچ وقت پر۔“

”رنی! افکار ہیون ریک۔ میرے ہوں میں۔ کیوں ہوگی تمہیں پھانسی؟“

میں نے کہا، ”چلو عر قید ہو جائے گی۔“

”ایسا کیوں سوچتے ہو؟ پاکستان میں کسی کو مردانہ کتنا آسان ہے۔ یہ تم کی طرح جانتے ہو۔ بس ہمت ہوئی چاہیے ایک واضح پلان ہونا چاہیے۔ ذہانت اور جیسا ہو چاہیے۔ کیا چیز نہیں ہے تمہارے پاس۔ پولیس خود تمہاری مدد کرے گی۔“

”اسناپ! فری! میں نے دھاڑ کے کہا۔“

”چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ قربانی عشق کے دعوں کا وقت گزر گیا۔ اب کچھ کرنے کا وقت آ رہا ہے۔“

میں نے بے بسی سے کہا، ”تم یا گل ہوگی ہو جی جی!“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، ”میری بات غور سے سنو رو! میں تم سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم مرد ہو۔ تم یہ کام بہتر طریقے پر اور آسانی سے کر سکتے ہو۔“

”آخر یہ کیسے فرض کر لیا ہے تم نے؟“

”تم انکار نہیں کر سکتے رفیق! تم کرتے رہے ہو یہ کام۔ تم جانتے ہو یہ کام کون لوگ کرتے تھے یا کرتے تھے۔ اس وقت کسی کو راستے سے ہٹانے والوں کی منزل تھی سیاست۔ ان کا جذبہ اتنا قوی تھا۔ وہ اپنی خواہش اور طلب کی شدت میں کسی بھی انتہا تک جانے کو ضروری سمجھتے تھے۔ تم ان کے متعقد سے اختلاف کر سکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ سیاست میں جمہوریت کا اصول چلنا چاہیے۔ مگر محبت میں سب جائز ہے۔ آں از فیضان لوانینڈ وار۔ کیا یہ غلط ہے..... یولو؟“

”میری مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ فریال کے دلائل مجھے ابیل کر رہے تھے۔ میں نے نفی میں سر ہلادیا۔“

”دیکھو رو! زرن اور زمین کے لیے یہ دنیا کی تاریخ میں سارے قتل ہوئے۔ ہمیں آف ٹرائے کے لیے ایک جنگ لڑی گئی۔ نور جہاں کے لیے جہانگیر نے کیا نہیں کیا۔ اس کے شوہر کو شیر افکن کا خطاب دیا اور مردوایا۔ آج زمانہ لیلی جنوں کے عشق کا نہیں ہے کہ تم جنگیں اور محرمیں لیلی لیلی پکارتے پھر دو اور جان دے دو۔ لوگ ہمیں گمے کے کیا بے وقوف آدی تھا۔ ابے نکال کے لے جاتا اسے اگر اتنی ہی محبت تھی تو..... سارے پرانے قصے اب منہمکہ خیز لگتے ہیں۔ پرغوی راج کیسے نکال کے لے گیا تھا۔ ”تجوکن کو۔“

میں نے کہا، ”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے فری!“

”کیوں؟ تم کیا اتنے گمے گزرو ہو صفر سلطان مرزا کے مقابلے میں۔ وہ تمہیں مار سکتا ہے۔ تمہاری محبوبہ کو قتل کر سکتا ہے اور تم صرف ڈر سکتے ہو۔ مقابلے کا نہیں سوچ سکتے۔ کیا ہے اس کے پاس جو تمہارے پاس نہیں ہے۔“

تمہارے پاس تو زیادہ مضبوط اور معقول وجہ ہے۔ محبت آج کی دنیا میں مانگنے سے کیا ملتا ہے نہ آزادی نہ انصاف اور نہ اپنا حق۔“

”شاہد تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... میں نے کہا۔“

”وہ کیا شعر پڑھتے تھے تم انکے وصال یا رنظہ آرزو کی بات نہیں۔“

”واقعی اس کے لیے آرزو سے زیادہ..... بہت زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ محض آرزو کرنے سے کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ کوئی چنگیز نہیں بنا۔ کسی کا میانی نہیں ملی۔ سوچو کہ یہ کتنا درمیان سے کیسے نکالا جاسکتا ہے۔ ایسے کہ سناپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ تم کہو گے کہ یہ کسی عورت ہے جو قتل پر اکساری ہے۔ بالکل سچی بات ہے۔ میں تمہیں اکساری ہوں۔ تمہارا حوصلہ بھاری ہوں۔ اپنے دشمن کا خاتمہ کر دو۔ یہی شرط ہے کا میانی کی اور اگر تم نے پھر بھی بزدلی دکھائی تو میں کروں گی یہ کام۔“

”فریال! مجھے سوچنے مجھے کا سوچ دو۔“

”میرے پاس نہ عقل ہے نہ تجربہ۔ میں پلان تو کر سکتی ہوں مگر تمہاری طرح نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کرائے کے قاتل بھی ہوتے ہیں اسلحہ بھی کرائے پر ملتا ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہاں؟ اگر تم پاکستان چارے ہو تو مجھو میدان جنگ ہے جہاں تمہیں چار بیسے میں دشمن کو نیست و نابود کرنا ہے۔ اس طرح کہ تم پکڑے نہ جاؤ۔ یہ واحد راستہ ہے ہمارے سامنے۔ تم مرد ہو تم نے جو زبانیں ہیں لیکن تو مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں ایسے نہیں مردوں کی رو دو! میں اسے مار کے مردوں گی۔ انجاس سے میں نہیں ڈرتی یا تم یا موت۔“

”ایسا تم کہہ فری!“ میں نے اسے اپنی ہاتھوں میں پھریا۔ ”تم کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم میری ہوا تمہیں مجھ سے کون جھین سکتا ہے۔ کوئی نہیں کوئی نہیں۔“ میں اسے چومتا رہا۔

”اتنا عرصہ بعد مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ بات ابھی صفر سلطان مرزا نہیں جانتا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں کس انتہا تک جا سکتی ہوں۔ جانتے ہو؟“ اس نے مجھے جھنجھوڑ کے سوال کیا، ”چار بیسے ہیں تمہارے پاس پھر میں کچھ کروں گی۔“

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ لندن میں اس سے آخری ملاقات نے میری محبت کو میرے لیے متعقد حیات بنا دیا تھا۔ آرزو کو یقین میں بدل دیا تھا۔ اب میں جانتا تھا کہ مجھے کیا

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ لندن میں اس سے آخری ملاقات نے میری محبت کو میرے لیے متعقد حیات بنا دیا تھا۔ آرزو کو یقین میں بدل دیا تھا۔ اب میں جانتا تھا کہ مجھے کیا

کرنا ہوگا۔

جو متعقد میرے والدین نے میرے سامنے رکھا تھا اس کے اسباب اچانک پیدا ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا ہی لگتا تھا۔ لیکن میری داہنی بھی بے سبب نہیں تھی۔ اسباب قدرت نے بہت پہلے طے کر دیے تھے۔ ایک وقت پر وہ سامنے آ گئے۔ میں نے کہا، ”چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

اس نے سکر کے میرے گال کو چوما۔ ”میں جلی جاؤں گی۔“

اس نے مجھے شب بخیر کہا۔ جیسے ہمیشہ کہتی تھی۔ خدا حافظ یا اللہ! اس نے کہا، ”ہم جدا ہو جاتے ہیں۔ تم سامنے نہیں ہوتے تو خیلوں میں ہوتے ہو۔ خوابوں میں ہوتے ہو۔ عجیب باگل لڑکی تھی..... اور اس نے اپنے باگل پن میں مجھے بھی اسیر کر رکھا تھا۔“

میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ میرے دل میں اب کوئی چھپتا ہوئی غلطی نہیں تھی۔ کوئی ملال نہیں تھا۔ میں مطمئن اور پر اعتماد تھا کیونکہ میرے پاس چار بیسے تھے۔

☆ ☆ ☆

جیسی رک گئی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے مجھے یاد دلایا، ”آپ نے یہی چاہتا تھا سراسر!“

میں چونک کے نیچے اترا، ”تھک یو سردار جی!“ میں نے اسے ایک نوٹ تھما دیا۔ ”اگر میں اس کی تلاش لیتا تو اس کی جیب میں سے ایسے دس نوٹوں کی پیچ بڑھ آتی ہوتی مگر یہ بہت سے ڈرائیوروں کا مخصوص انداز تھا۔ داؤ چل جائے تو دارے نیارے۔ جب میں نے کہا کہ پلیز کیپ دی پیچ تو اس کی باجھیں کل پھیں۔ جو رول میں نے چھوڑ دی تھی وہ تقریباً کرائے کے برابر تھی۔ ایسی فاضی کا مظاہرہ عوامی کرتے تھے جو ٹیٹے میں ہوں یا جو ٹیٹے میں سیڑوں یا غڈ زبٹ گئے ہوں۔“

”اللہ آپ کو خوش رکھے جی۔!“ اس نے سلیوٹ کے انداز میں اپنی چوڑی کو پھوڑا اور فرار ہو گیا جیسے اسے ڈر ہو کہ میرا ارادہ نہ بدل جائے۔ میں نوٹ واپس لے کر کہوں کہ ایک منٹ ٹھہر دو میں کسی سے پیچ لیتا ہوں۔

میری لینڈ لیڈی نے دروازہ کھولتے ہی بڑی ناراضی کا اظہار کیا، ”اتنی دیر سے آ رہے ہو۔ چاہے وقت کیا ہوا ہے؟“

”مارتھا..... ابھی دس بجے ہیں۔ ابھی تو کوئی بھی نہیں۔“

”سب آتے ہی ہوں گے۔“ اس نے کچن کی طرف

واپس جاتے ہوئے کہا۔

”تم ابھی تک پکانے میں لگی ہوئی ہو؟“ میں نے کہا۔
”رہیں! زرداد کھجور پلاؤ کیا بنائے اب تم کسی کو بتانا نہیں۔۔۔۔۔ میں نے دوبارہ تیار کیا ہے۔ پہلی دفعہ خراب ہو گیا تھا۔“

میں نے ہنس کے کہا ”وہ کیسے؟“ اب تو بہت پریکٹس ہے جنہیں۔ تم دوسروں کو پکانا سکھائی ہو۔“

”تم واقعی ایسا سمجھتے ہو یا مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟“ اس نے ایک کوکنگ پاٹ کا ڈھنکا بنایا۔ لیکن پلاؤ کی خوشبو سے بھر گیا۔

میں نے کہا ”کیا زبردست خوشبو ہے۔ مار تھا تمہارے پلاؤ کو انٹرنیشنل کوالٹی ٹھیک لے سکتا ہے۔“

”ایسے نہیں! کچھ کے دیکھو۔ کیا یہ کھانے کے قابل ہے؟“ اس نے خوش ہو کے مجھے ایک گچھ دیا ”ایسا نہ ہو تمہارے دوست بھوکے رہ جائیں میری وجہ سے۔“

میں نے ایک گچھ چاول نکال کے چھلے ”دس ازو ڈر فل مار تھا! کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بازار سے نہیں آیا ہے۔ کیا بیانی چیزیں آگئی ہیں؟“

اس نے کھانے کی میز کی طرف اشارہ کیا ”سب کچھ آگیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سب بہت زیادہ ہوگا۔“

”مجھے بتاؤ کون لوگ آ رہے ہیں۔ کل کتنے لوگ ہوں گے۔“

میں نے اسے گمن کے بتایا ”تم سب کو جانتی ہو؟“
”اس کا مطلب ہے وہ تک چڑھی لڑکی نہیں آ رہی ہے۔ لاڈلارنٹ کی بیٹی اٹی شا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نہ آتی؟ پہلے وہ ایسا تھی۔ اب وہ عاقل ہے اور وہ تک چڑھی ہرگز نہیں ہے۔“

مار تھا نے اصرار کیا ”وہ تک چڑھی ہے لیکن وہ خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کر دیا

تمہارے لیے۔ بے شک یہ بہت گناہ کی بات ہے لیکن خداوند مجھ اسے معاف کرے گا۔ افسوس کہ تم نے مجھ بھی اس سے شادی نہیں کی۔ تمہیں شرم آتی چاہیے۔“

میں نے کہا ”مار تھا۔ کیا تم جانتی ہو کہ ہم چار شادیاں کر سکتے ہیں۔ اس کی اجازت کیوں ہے۔ کیونکہ دل کے پارخانے ہوتے ہیں میں ایک اس کے لیے ہمیشہ خالی رکھوں گا۔“

”اوگاؤ! کیا واقعی تمہاری چار بیویاں ہوں گی نہیں!“ یہ

تصور کرنا بہت مشکل ہے میرے لیے۔“

میں نے کہا ”کیوں۔۔۔۔۔ تمہارے بھی تو چار شوہر تھے۔“

اس نے میری کمر پر چھپ مارا ”ایک وقت میں نہیں بد معاش! تمہیں ہمدردی ہونی چاہیے ایسی عورت سے جو تین بار بیوگی کا صدمہ جھیل چکی ہے اور اب دیکھو دن رات آسٹن کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ کیا پتا کب اسے مار تھا کی یاد آئے اور وہ واپس آ جائے۔ تم جانتے ہو میں کس روز کی شوک ہوں ورنہ طلاق لے کر اب تک اپنی تہائی دور کر سکتی تھی۔“

میں نے کہا ”مار تھا۔ اب تو جہاں جا رہا ہوں۔“

”ایسا کیا کچھ ہے۔؟“

میں نے کہا ”تم قسم لے لو مجھ سے میں پولیس کو بالکل نہیں بتاؤں گا۔ آسٹن کو تم نے کہاں غائب کر دیا۔ کل تو خبر پہلے بھی تھی کہ کیا تھا۔“

”یورائل! اس نے مجھ کو چھپا رکھا تھا میں غوطہ مار کے نکل گیا۔“ میں بتاتی ہوں جنہیں۔ بیچ دیتی ہوں آسٹن کے پاس۔ تم بھی پاکستان نہیں پہنچو گے۔“

آسٹن اس کا چوتھا شوہر تھا جس نے صرف چھ مہینے مار تھا کے ساتھ گزارے اور پھر فرار ہو گیا۔ اب بتائیں یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میری۔ وہ ہم سب کو ہنس کے بتاتی تھی۔ ”دراصل وہ بڑی بڑی بیوگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس کا

سارا خرچ اٹھاؤں میں نے کہا کہ آسٹن نے تمہاری ذمہ داری ہے کیونکہ شوہر تم ہو۔ اس کے پاس کچھ پیسا تھا۔ بتا نہیں کتنا۔ لیکن وہ خرچ نہیں کرتا تھا۔ بیمار ہو جاتے تو دو ایک نہیں لاتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے لوش دے دیا کہ تم ایسے نہیں رہ سکتے۔ یہ کوئی نتیجہ خاندان نہیں ہے۔ اپنا خرچ تو

جنہیں دینا ہی پڑے گا اور تم جانتے ہو میں کیا جارج کرتی ہوں۔ ایک اضافی سہولت جنہیں ملے گی کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ سو سکتے ہو۔ اگر وہ تمہاری درخواست منظور کرے۔ بس اس کے بعد وہ چلا گیا کچھ بتائے بغیر۔“

مار تھا کے پہلے شوہر نے اس کے ساتھ چار سال گزارے۔ دوسرے نے سات سال۔ تیسرا نو سال زندہ رہا۔ مار تھا ان سب کو یاد کرتی تھی اور سب کی ازدواجی

رفاقت کے واقعات ایسے سناتی تھی کہ ہم سب جو اس کے پیچھے گیسٹ تھے مار تھا کو چھڑتے تھے ”بڑی ہی الم ناک کہانی ہے مار تھا۔ جنہیں لگے لگائے کے بجائے انہوں نے موت کو گلے لگایا۔ ہم ان کی جگہ ہوتے تو یہی کرتے۔“

ویسے تو ہر شوہر اس کے لیے کچھ نہ کچھ جھوڑے راہی

ایک عدم ہوا تھا مگر اس کے کہنے کے مطابق دوسرے شوہر کی موت تو ایک لاشی کے ٹکٹ پر دو انعام جیسی تھی۔ یہ مکان اسی کا تھا جو میرے لیے سر جھپانے کا ٹھکانا بنا۔ وہ حادثے میں مار گیا تھا چنانچہ انشورنس کی رقم مجھے دینی ہوئی تھی۔“

ہم میں سے کوئی شرارت سے پوچھتا ”ایسی ڈنٹ تم نے کیسے بھانپا کیا تھا مار تھا؟“

وہ ہنستی ”تم سے پہلے پولیس کے سراغ رساں بہت سرکھپا چکے ہیں۔ بالآخر یہی ثابت ہوا کہ ان کی قصدا آسٹن تھی۔ میرا بالکل کوئی تصور نہیں تھا۔ ایک اخبار نے آسٹن سے میری شادی کے وقت خبر لگادی تھی۔ اب جوتھے کی باری ہے۔ میرے دیکھنے اسے لوش بیچ دیا۔ میں ہزار پاؤنڈ خرچ ہرجانے کا کس تھا۔ اس نے عدالت کے باہر پانچ ہزار پاؤنڈ زدے کر اپنی جان بچوائی اور معافی شائع کی۔“

ہر وقت سننے اور بھانسنے والی مسز آسٹن اندر سے واقعی ایک دلگی عورت تھی۔ اس کا اندازہ ہر نئے بے انگ گیسٹ کو اس کے گھر میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ہوتا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں وہ گوشت کا چٹا چمرا پھاڑ بن گئی تھی اور اس کا وزن دوسو پچاس پاؤنڈ ہو چکا تھا۔ اس کی عمر کی لاکھوں عورتیں فٹ اور سلم رکھ کے اور حسن و شباب کی حفاظت کے اصولوں پر عمل کر کے چوبیس سال کی جوان لڑکی نظر آنے میں کامیاب تھیں اور ایک آزاد معاشرے میں خوش رہنے کے تمام مواقع سے مستفید ہو کے لائف کو انجوائے کر رہی تھیں۔

ایکسر سائز تو دور کی بات تھی وہ مگر کے اندر بھی کم سے کم اصل و حرکت کی قائل تھی۔ اندر ضرورت کے سوا کہیں آتی جاتی نہیں تھی اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی۔

مسز آسٹن کے بجائے مار تھا کھلونا اسے زیادہ پسند تھا۔ آدمی کا اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا اسے حکومت کی طرف سے الاؤنس ملتا تھا۔ ایک شوہر کی انشورنس کی رقم کو اس نے بچت کی ایک منافع بخش اسکیم میں لگا رکھا تھا اور مگر کو اس نے غلیٹ ہوم بنایا تھا۔ آدمی کے مقابلے میں اس کے اخراجات بہت کم تھے۔ سب ایک ساتھ بیٹھے تھے تو کھانے کی میز چھوٹی تھی اور فریڈا کرتی تھی لیکن وہ کارپینٹر کو کہیں بلاتی تھی۔ ہمیں شرمندہ کرتی تھی کہ تم کیسے تو جوان لوگ ہو۔ کسی دن وقت نکال کے اس میں چار نکلیں نہیں ٹھوٹک سکتے۔

کریاں بھی پرانی تھیں۔ ایک گیسٹ کو کرسی چھپنے کر کے جھولنے کی عادت تھی۔ کرسی دو ٹانگوں پر کب تک ٹھم سکتی۔ ایک دن کرسی ٹوٹی تو جھولنے والا چھپے گا اور اس کا سر دیوار پر لگا۔ ٹھوڑی دیر کے لیے وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہم سب اسے

اسپتال لے جانے کے لیے دوڑے جہاں ڈاکٹرز نے اسے چوبیس گھنٹے آہر دینا پر رکھ کے واپس بھیج دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ مار تھا نے فوراً اسے لوش دے دیا کہ کرسی تمہاری ہے ہودہ عادت کی وجہ سے ٹوٹی۔ اسے پھر قابل استعمال بنانے کی ذمہ داری بھی تمہاری ہے۔ میرے ہاتھ روم کا ٹھکانا مسلسل بہتا تھا۔ مار تھا نے اس کا یہ علاج کیا کہ ٹوٹی

میں ایک ربر کا بگ لگا دیا۔ جب ضرورت ہو ربر نکال لو۔ ٹوٹی بدلنے کی فضول خرچی غیر ضروری ہے۔

کلفات شکاری اور کجوسی میں اس کے نزدیک چنداں فرق نہ تھا۔ وہ ہم سب کو وقت بہ وقت لکچر دیتی رہتی تھی۔ چپا چپاؤ بیک من! دنیا میں اب رشتے کام نہیں آتے چپا کام کرتا ہے۔ چپا مشکل سے آتا ہے اور آسانی سے جاتا ہے۔ در سے آتا ہے اور ٹھہرتا نہیں ہے۔ جب یہ آتے تو اسے پکڑتھیر کر لونا پنا غلام بنالو۔

مار تھا کے بچے نہیں تھے۔ اس کی ساری ذمہ داری وہ اپنے چار شوہروں پر عائد کرتی تھی۔ ”سوچو ذرا! جب چار مرد کچھ نہیں کر سکتے تو میں ایسی عورت کیا کر سکتی تھی۔ میں نے تو بہت ٹائم دیا انہیں۔ ایک کو چار سال! دوسرے کو سات سال! تیسرا ایک بار سال کو کشن کرتا رہا۔ آسٹن کو بھی چھ مہینے بہر حال

ٹھہرے۔ میری ماں کہتی تھی وہ شادی کے دوسرے دن حالمہ ہو گئی تھی۔ صرف ایک شوہر تھا میری دادی کا! گیارہ بچے پیدا کیے اس نے۔ اب کسی چیز کا معیار ہی نہیں رہا۔ ہر چیز کی کارکردگی خراب ہو گئی ہے۔ اب تم اس ریڈیو کو دیکھو دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا ہے اور صرف ایک بار خراب ہوا تھا۔ جرجل تقریر کر رہا تھا۔ اچانک اس کی جگہ چوہے کی آواز آنے لگی۔ پھر وہ بھی بند ہو گئی۔ میں تو خوف سے قہر نہ کھینچنے لگی کہ ضرور

جاپانیوں نے کچھ کیا ہے۔ برطانوی وزیر اعظم کو چا بنادیا ہے یا اس کی آواز بدل دی ہے۔ مگر میرا دوسرا شوہر بہت بہادر تھا۔ اس نے ریڈیو کو پیچھے سے کھولا اور ایک اچھا خاصا بڑا چوہا دم سے پکڑ کے نکال لیا۔ بے شک اسے چوہے نے

کرٹ بھی مارا۔“

اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے مار تھا نے گھر میں چار بے انگ گیسٹ رکھ لیے تھے۔ اس دمنزلہ گھر کے اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ لیکن اور لاؤنچ ملا کے اس نے چوتھا کمر بنایا۔ اور دو ہاتھ روم تھے۔ ایک کو اس نے ٹائلٹ بنادیا اور دوسرے کو واش روم ”آخریا ضرورت ہے سب کو ایک ساتھ ٹائلٹ استعمال کرنے کی۔ اپنی عادتیں درست کرو۔ جو پہلے اٹھتا ہے یا جیسے پہلے جانا ہوا اسے پہلے

اٹھنے کی اجازت ہے۔“

اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے مار تھا نے گھر میں چار بے انگ گیسٹ رکھ لیے تھے۔ اس دمنزلہ گھر کے اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ لیکن اور لاؤنچ ملا کے اس نے چوتھا کمر بنایا۔ اور دو ہاتھ روم تھے۔ ایک کو اس نے ٹائلٹ بنادیا اور دوسرے کو واش روم ”آخریا ضرورت ہے سب کو ایک ساتھ ٹائلٹ استعمال کرنے کی۔ اپنی عادتیں درست کرو۔ جو پہلے اٹھتا ہے یا جیسے پہلے جانا ہوا اسے پہلے

اٹھنے کی اجازت ہے۔“

اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے مار تھا نے گھر میں چار بے انگ گیسٹ رکھ لیے تھے۔ اس دمنزلہ گھر کے اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ لیکن اور لاؤنچ ملا کے اس نے چوتھا کمر بنایا۔ اور دو ہاتھ روم تھے۔ ایک کو اس نے ٹائلٹ بنادیا اور دوسرے کو واش روم ”آخریا ضرورت ہے سب کو ایک ساتھ ٹائلٹ استعمال کرنے کی۔ اپنی عادتیں درست کرو۔ جو پہلے اٹھتا ہے یا جیسے پہلے جانا ہوا اسے پہلے

اٹھنے کی اجازت ہے۔“

اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے مار تھا نے گھر میں چار بے انگ گیسٹ رکھ لیے تھے۔ اس دمنزلہ گھر کے اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ لیکن اور لاؤنچ ملا کے اس نے چوتھا کمر بنایا۔ اور دو ہاتھ روم تھے۔ ایک کو اس نے ٹائلٹ بنادیا اور دوسرے کو واش روم ”آخریا ضرورت ہے سب کو ایک ساتھ ٹائلٹ استعمال کرنے کی۔ اپنی عادتیں درست کرو۔ جو پہلے اٹھتا ہے یا جیسے پہلے جانا ہوا اسے پہلے

اٹھنے کی اجازت ہے۔“

اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے مار تھا نے گھر میں چار بے انگ گیسٹ رکھ لیے تھے۔ اس دمنزلہ گھر کے اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ لیکن اور لاؤنچ ملا کے اس نے چوتھا کمر بنایا۔ اور دو ہاتھ روم تھے۔ ایک کو اس نے ٹائلٹ بنادیا اور دوسرے کو واش روم ”آخریا ضرورت ہے سب کو ایک ساتھ ٹائلٹ استعمال کرنے کی۔ اپنی عادتیں درست کرو۔ جو پہلے اٹھتا ہے یا جیسے پہلے جانا ہوا اسے پہلے

موقع دو۔ ورنہ آدھا گھنٹا پہلے اٹھ جاؤ۔“

نیچوہر خود رہتی تھی۔ ایک لوگ روم تھا جہاں تھوڑا بہت وقت سب ہی گزار لیتے تھے۔ وہاں لی وی نہیں تھا۔ وہ کبھی تھکی کئی لی وی دیکھنا سے تو اپنے کمرے میں رکھو۔ ایک لی وی پر سب اٹھاپنہ کدے پر مگر ام نہیں دیکھ سکتے۔ اخبار پڑھتا ہے میوزک سنا ہے۔ سب اپنے کمرے میں۔ یہاں بیٹھو تو کپ شپ کرو۔

گیسٹ ہوم کے مستقل باسی چار تھے جو عام طور پر
نوجوان طالب علم ہوتے تھے۔ انڈین اور پاکستانی طلبہ اکثر
اس کے پاس پرانے حوالوں سے آتے تھے اور مایوس جاتے
تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ صرف سوپاؤنڈز میں وہ جتنی
کھولتیں دیتی تھی اتنی اس زمانے میں لندن جیسے شہر میں ڈیڑھ
سوپاؤنڈز میں بھی نہیں مل سکتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ
اپنے گیسٹ ہاؤس کو کھلی ہوم بھی کہتا تھا اور اس میں ایک گھر جیسا
ماحول رکھنے کی قائل بھی۔ وہ یہی کہ نہیں محبت کی بھوک بھی۔ وہ
سب نوجوانوں کا خیال کسی ماں کی طرح رکھتی تھی اور بدلے
میں یہ چاہتی تھی کہ اسے ماں جیسی عزت اور توجہ ملے۔ کوئی
اس سے محبت نہ کرے۔ اسے بے وقوف نہ بتائے۔ کبھی
کبھار اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سن لے اور شرافت سے
رہے۔ ظاہر ہے ایسی سوچ صرف انڈیا پاکستان کے عام
گھروں سے آنے والے لڑکوں کی ہو سکتی تھی۔ یورپی ممالک
سے آنے والے ایسی خاندانی اقدار کو سمجھنے کی نہیں تھے جس
میں بزرگ انہیں بالغ مانتے ہوئے انہیں کھلی بھئی دے دیں
اور ان کے اخلاق و کردار کی نگرانی سے دستبردار ہو جائیں۔

مارتھا لڑکیوں کو بھی جگہ نہیں دیتی تھی۔ انہیں بھی اس مشکل میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ایک لڑکی ہوگی تو اس کے تین عاشق تو یہیں موجود ہوں گے۔ میں کس کس پر نظر خرابا بھی ہو سکتا ہے۔ پھر وہ باہر سے کسی کا بچہ لے آئی پیٹ میں تو میں کیا دوائف بنوں گی اس کی؟ ایک ایرانی نوجوان صاحب نے ایک بار بڑی کوشش کی کہ غالی ہونے والا ایک کمرہ اس کی بہن کو مل جائے۔ وہ اس کی بنک چلی کی ضمانت دینے اور اس کی عمرانی کی ذمہ داری بھی قبول کرنے کو تیار تھا مگر مارتھا کے اصول بہت سخت تھے۔ وہ تمہاری بہن ہے، باقی سب کی بہن نہیں ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ صاحب سخت مایوس ہوا۔ اس کے باپ نے شاہ ایران کے خلاف انقلاب میں جیسی کا ساتھ دیا تھا مگر وہ بھائی بہن اب جیسی کا تختہ الٹ کے تمہارا کو بھرپور

بنانا چاہتے تھے۔ وہ سابق شاہ پرستوں کی کسی تحریک کے سرگرم رکن تھے جو سب مغرب پرستی کے علمبردار تھے۔ اس تحریک کو یورپ اور امریکا سے حمایت اور مالی امداد بھی فراہم ہوئی تھی مگر انہیں پاسداران انقلاب کے ڈر سے چھپ کر رہنا پڑتا تھا۔

میں اس کے ساتھ دو سال سے تھا۔ جب میں آیا تو اس نے میرا بہت سخت انٹرویو کیا تھا "کس نے بھیجا ہے کہیں۔" میں نے کہا "شاہ محمد نے۔" جب وہ طالب علم تھا تو دو سال یہاں رہا تھا۔ امریکا میں وہ میرا روم میٹ تھا۔"

”تمہارے پاس اتنا اچھا جا ب ہے۔ تم زیادہ پیسے خرچ کرنے کی ہوں پا کر اے کے اپارٹمنٹ میں بھی رہ سکتے ہو۔ اگر تم کفایت شعار ہو تو اچھی بات ہے مگر مار تھا کا گیٹ ہو تمہیں کیوں پسند ہے؟“

میں نے کہا: ”کیونکہ یہاں سب ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں اور میں اپنی فیملی کو بہت مس کرتا ہوں۔ خصوصاً اپنی ماں کو۔“

یہ آخری جملہ کارگر ہوگا۔ مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ اب مارتھانے گیٹ ہوم کے قواعد و ضوابط بتانا شروع کیے "میں کٹر رومن کی توکل اور مذہبی ہوں۔"

”میں بھی پانچویں وقت نماز پڑھتا ہوں۔“

میں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا ”توبہ..... توبہ!“
 ”راتوں کو غائب تو نہیں رہے۔“

”نہ میں جادوگر ہوں اور نہ بھوت۔“
اس نے مجھے ڈانٹا ”میں آدمی رات کے بعد کسی کے
لے دروازہ نہیں کھولتی۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں کھڑکی کے راستے آ جاؤں گا۔
 سب سے جڑھ کے۔ دوسری چابی بنالوں گا۔ میرا مطلب
 ہے کبھی ایسا ہوا تو۔ ویسے میں دس بجے سو جاتا ہوں۔“

”کبھی کبھار کی کوئی بات نہیں“ اس نے اطمینان کا
 مانس لیا ”یہاں تم جو انہیں کھیل سکتے۔ گرل فرینڈز آ سکتی
 ہیں مگر صرف دیکھ ایڈ پر۔ ان بے تم صرف لوگ روم میں

ہاں کہتے ہو۔ ابھیں کمرے میں نہیں لے جاسکتے۔ رات کو کمرے میں کوئی مہمان نہیں ٹھہر سکتا۔ سوائے تمہارے ماں پاپ کے۔ اگر کبھی وہ لندن آئیں تو تم مجھے پہلے سے آؤ گے۔ سگریٹ پوکر باجر۔“

ظاہر ہے، اپنی پابندیوں کے ساتھ رہنا ہر ایک کے بس
 کی بات نہیں ہوتی۔ عام طور پر ایشیائی مسلمان اس ٹیسٹ میں

اس ہو جاتے تھے لیکن جو کرالما اس میں چار سال تک ایک
معاذ دینی راجن چکرورتی رہا تھا۔ مارقا اسے بہت یاد کرنی
تھی۔ عی وازاے پر فیکٹ چٹلین۔ اب یہ بات مذاق بن گئی
تھی۔ ہرنا معقولیت کے مظاہرے پر ہم ایک دوسرے کو یاد
دلاتے رہتے تھے کہ تم ایک پر فیکٹ چٹلین نہیں ہو۔

میرے علاوہ وہاں حیدر آباد کن کا محل حیدر تھا۔ جو بی بی کی ہی ملازم تھا۔ وہ ذہین اور انقلابی سوچ رکھنے والا شخص ملک دوم رنگ و دل اور ذہب و ملت کی کسی حد بندی کو عملاً قبول نہیں کرتا تھا۔ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم ایک ہی وقت میں چینی والے انسان ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مگر اس روشن خیال روشن ضمیر کے ساتھ جو وہ ایسا ہی تھا جیسے خوشبوؤں کا سوداگر کسی کنٹرول میں ڈوب کے مر جائے۔ وہ رات کو پروگرام کر کے لوٹ رہا تھا کہ اسے نئے میں دھت چار نسل برست سمجھوں یعنی اسکن ہیڈز نے گھیر لیا۔ اس پلہند اور نرم خواد دی نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ ایک اور چار کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اُن کے پاس فولادی زنجیریں تھیں اور بازوؤں کی درزش میں کام آنے والے اسپرنگ وارڈز تھے۔ انہوں نے مارا کرے۔ اسے پہلپا کر دیا۔ رہا تھا آج بھی اسے یاد کر کے روئی تھی۔ ایرانی خاد صانع نے بڑی کوشش کی کہ خالی ہوئے والا کمرہ اس کی بہن کو مل جائے مگر اس میں بالآخر خلی کا کیپوٹرا جیمیز مرشد آیا۔ ذہنی طور پر وہ خود بھی ایک کیپوٹرا تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی اور وہ کمرے میں اپنا سارا وقت کیپوٹر کے سامنے گزار رہا تھا۔ ہم سب اسے کیپوٹر صاحب کہتے تھے۔

میری زیادہ دوستی پاکستانی ڈاکٹر بشیر چوہدری سے رہی جو میری طرح لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ بخیر و برکت حراج تھا اور لندن پہنچا کر نے آیا تھا لیکن وہ بطحا رنگین حراج تھا اور لندن کے رد بان پرور ماحول میں ایسا کم ہو گیا تھا کہ نہ اسے ڈگری لینے کی فکر تھی اور نہ وہاپس جانے کی۔ وہ بار بارش ہر وقت خوش رہنے والا زور زور سے قہقہے لگانے والا شوقین حراج آدمی تھا اور بیک وقت ایک درجن عشق چلاتا تھا تو ان میں سے نصف تو جو ان طرح دار لڑکیاں ہوتی تھیں۔ ان کے لہجے و زور اور تحائف کے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ کچھ مہنت خود سے لے کر عمر کی یا بد صورت عورتوں سے بھی کرتا تھا جو دولت مند ہوں۔

جب میں نے اپنی رواجی کا اعلان کیا تو ہمیشہ کی طرح مارا تھا کا صدرے سے برا حال ہو گیا۔ وہ طبعاً اتنی نیک دل اور ہمدرد و غور تھی کہ سوائے کمپیوٹر صاحب کے ہم سب اسے اپنی

$\frac{1}{2} \cdot \frac{1}{2} = \frac{1}{4}$

ہر بات اسی طرح بتا دیتے تھے جیسے اپنی ماں کو بتاتے۔ اس میں ایک خوبی رازداری کی بھی تھی چنانچہ وہ میرے تمام حالات سے باخبر تھی۔ وہ میرے اور فریال کے سارے معاملات جانتی تھی۔ گیسٹ ہوم کے کسی بھی سامعہ کے سامنے میں نے بھی فریال کا نام نہیں لیا تھا چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ دل لگی کے لیے میں بھی موسم کے سب سے گرل فرینڈ زہرا رہتا ہوں۔ لیکن لارڈ ارنسٹ کی دولت مند مفرد اور انتہائی حسین بیٹی الینا کے ساتھ میرا اوجان یو احم کا انصر ہے ورنہ وہ اتنا بد اقدام کیسے اٹھائی۔ میری خاطر وہ ماں باپ کا گھر، عیش و عشرت کی زندگی، اپنا مذہب اور ملک سب چھوڑنے پر تیار تھی۔

پہلے تو مارتھانے مجھے روکنے کے لیے جد باقی دلائل کا سہارا لیا ”تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو رفیق!“

”ایک فلسفی کا قول ہے کہ ہم پیدا ہو کے سب سے بڑی غلطی کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مذاق مت کرو۔ جس حویلی اور جاگیر کی خاطر تم
واپس جا رہے ہو۔“

میں نے کہا ”اس بیان میں صحیح ضروری ہے۔ میں والدین کے حکم پر واپس جا رہا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان دونوں کا کیا ہوگا؟“
”کون دونوں؟“

”رفیق! واپس جا کے تم فریال سے شادی نہیں کر سکتے۔ وہ جو تمہارا دشمن ہے..... مرزا، وہ تمہیں مرڈر کر دے گا۔“

”ایسا ہی کرنا چاہیے اے..... اصولاً۔“ میں نے کہا۔
 ”فریال سے تم یہاں شادی کر سکتے تھے۔ لندن میں
 اس کی بد معاشی نہیں چل سکتی تھی۔“

”ہم یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔“
 ”کیوں نہیں رہ سکتے؟ لاگوں پاکستانی ایسے ہی رہے
 ہیں۔ لیکن فرض کر دو کہ کوئٹہ کے مسئلہ پر پیش ہو۔ تو سب

سے آسان حل ہے کہ اس لارڈ کی بیٹی عائشہ سے شادی کرلو۔"

”اور برطانوی شہری ہونے کے بعد فریال سے شادی کرلوں۔ ایک چھین ری ایجنٹیشن کے طور پر اسے بھی برطانیہ کی شہریت حاصل ہو جائے۔ تم بھی ایک ایسا شہر کیڑا ہو۔“

”جب تمہارے مذہب میں ایک سے زیادہ شادیوں
کا اہاز ہے۔“

”ایسا کرنا ہوتا مارتھا ڈارلنگ تو دو سال پہلے کر چکا

مرنے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملے ضرور آنا۔“
میں نے کہا ”مارتا..... ایسی باتیں مت کرو میں
ضرور آؤں گا۔“

”سب ایسا ہی کہتے تھے جو چلے گئے۔ صرف راجن
چکرورتی وعدے کا پکا ثابت ہوا۔ ہی واڑ اے پرنیک
جنگلیمن! تم بھی اچھے لڑکے ہو رفیق۔ اپنی شادی کی تصویروں
ضرور بھیجنا مجھے۔ بلکہ ڈیو فلم۔ شادی کے بعد اپنی بیوی کو مجھ
سے ملوانے ضرور لانا۔ ہو سکے تو بعد میں اپنے بچوں کو بھی۔“
میں نے کہا ”میں تمہیں اپنی شادی میں ضرور بلاؤں
گا۔“

”فریال بہت پیاری لڑکی ہے۔ میں ہر روز تمہارے
لیے دعا کروں گی۔ خداوند یسوع مسیح تمہاری مشکلات دور
کرے گا۔ خیر بہت دل چاہتا ہے کسی دھوم دھام والی شادی
میں شرکت کروں۔ اسے دیکھو وہ لال برائینڈل ڈریس
میں ہاتھوں پر مہندی لگا کے اور ڈھیر سارا زور پٹن کے کسی
گتے سے لیکن میں کیسے جاسکتی ہوں اپنے دوسرے بچوں کو
چھوڑ کے۔ وہ کیا کریں گے میرے بغیر۔ کون خیال رکھے
گا ان کا۔“

اب میری رواجی کا وقت آ گیا تھا۔ مارتا سخت اداس
تھی لیکن پہلے کی طرح اس نے مجھے بھی خوش دلی سے رخصت
کرنے کے لیے ایک الوداعی پارٹی کا بندوبست کیا تھا۔ اس
کے ساتھ رہنے والے بھی بھی شوقیہ اپنے علاقے کی کوئی
روایتی ڈش تیار کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی ماہر نہ تھا مگر
لندن آ کے سب پکانے لگتے تھے۔

لاہور کا چوہدری بشیر چھلی فرانی کرتا تھا تو کہتا تھا ”اے
بھئی ماسی! اسے لہور کا پتا ہے نا، جارج ٹیٹ نے اور کوئی عیان
نے بھی ادھر چھلی کھائی ادھر مرگ چکی میں تو کہا کہ واقعی
لہور لہور ہے۔ اپنا ایک ہٹام ہے ادھر بشیر۔ کیا چھلی بناتا ہے
ماسی! بندے کو لائن میں لگتا پڑتا ہے۔ تمہارا شہزادہ چارلس
جائے تو اسے بھی باری سے ملے گی اور لائن پتا ہے کدھر تک
جانی ہے اپنے غیلے گنبد تک۔ غیلے گنبد کا پتا ہے نا
بلیوڈوم۔ تو ماسی! مارتا میں نے استاد بشیر آف دارالملاہی
کے گوڑے پکڑ لیے۔ گوڑے یعنی سمکٹے..... اس
طرح..... میں نے کہا استاد جب تک چھلی کے سائے کا نسخہ
نہیں بتاؤ گے نسخہ وہ نہیں جو ہم جیسے ڈاکٹر لکھتے ہیں
فارمولہ۔ تب تک چھوڑو گا نہیں۔ میں بھی ادھر بیٹھا ہوں
آپ کے ساتھ۔ لوتی گوڑے چھڑاتا تو وہ خود مگر کیسے جاتا۔
اس نے کہا کہ اچھا ادھر لا اپنا کان..... پھر میرے کان میں

ہوتا۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تھا اور پہلی نظر میں تم پر فریفتہ
ہو گیا تھا۔“

اس نے ایک دم میرا کان بکڑ لیا ”میں سیریس بات
کر رہی ہوں اور تو مذاق کر رہا ہے۔“
میں نے ڈاؤن کیا ”ارے میرا کان کھل جائے گا۔ اسی
سے سنتا تھا میں دوسرا فون کے اڑانے کے لیے تھا۔“
اس نے میرا کان چھوڑ دیا۔ ”میں تمہارا بھلا چاہتی
ہوں رفیق! مجھے تمہارے فادر سے بات کرنی ہوگی۔“
میں نے کان ہلا کے کہا ”کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بہرے
ہیں صرف اپنے مطلب کی بات سنتے ہیں۔“

”ان کو سوچنا چاہیے۔ تم کو جس مجرموں کے گروہ سے
 نکال کے باہر بھیجا تھا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ طاقتور ہے۔
یہ تم نے ہی بتایا تھا مجھے۔ پرانے آسب بھی پیچھا نہیں
چھوڑتے۔ تم خوش قسمت تھے کہ جان بچانے میں کامیاب
رہے تھے۔ کیا گارنٹی ہے اس کی کہ جب تم واپس جاؤ گے تو وہ
پھر تمہیں استعمال نہیں کریں گے۔“

”وہ بات پرانی ہوئی۔ پرانے لوگ مرکب گئے۔ میرا
اب ان سے کوئی تعلق نہیں۔ رسک نہ ہونے کے برابر ہے۔“
”مگر ہے..... کیا ضرورت ہے رسک لینے کی۔
تمہارے والدین کو یہاں آ کے سیٹل ہو جانا چاہیے۔ یہ جو
حوالی اور جاگیر ملی ہے انہیں۔ اسے چھوڑیں اور سارا پیسہ لے
کر یہاں آ جائیں۔ جہاں ایک شاندار مستقبل ہے..... اگر
وہ تمہاری نہیں سنتے تو میں بات کروں گی ان سے۔“

اس نے بات کی۔ ہر حوالے اور دلیل سے۔ ”یہ سات
سمندر پار کی کال اسے میرے تین ماہ کے کرائے سے زیادہ
مہنگی پڑی اور رائیگاں گئی۔ جذبات کے آگے دلیل دیے بھی
کون سنتا ہے۔“

فون رکھ کے وہ روتے لگی ”کوئی نہیں سنتا میری۔ میں
ہوتی بھی کون ہوں تمہیں روکنے والی۔ کیا حق ہے میرا تم
پر۔“

میں نے اسے گلے لگا کے بہت تہلی دی ”ایسا مت کہو
مارتا۔ یہاں تم نے مجھے ماں جیسی محبت دی حالانکہ میں ایک
بچی تھا۔“

”رفیق! مائی سن! پورا مارتا کو بھلا مت دینا۔ مجھے خط
لکھتے رہتا اور فون ضرور کرتا۔ کمرس پر اور نئے سال پر مجھے
دش ضرور کرتا۔ میری برتھ ڈے یاد ہے نا تمہیں۔ کارڈ بھیجنا
مت بھولنا۔ یہ ای میل وغیرہ میں نہیں جانتی۔ خوبصورت کارڈ
بھیجنا۔ میں انہیں سنہال کے رکھوں گی..... اور ہاں! میرے

اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ تم لوگوں کی زبان ایک لباس
ایک کھانے دی موسیقی دی صرف مذہب الگ ہے تو تم
لوگ لڑتے کیوں ہو؟ یہاں تو نہیں لڑتے۔ ظاہر ہے یہ بات
آسانی سے اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی چنانچہ ہم مذاق
میں ٹال دیتے تھے۔

میں نے اپنے سات دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ ان میں
سے تین لڑکیاں تھیں۔ اتنے لوگوں کے لیے کھانا بنانا ایکلی
مارتا کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ صرف چکن پلاؤ بنا رہی تھی
باقی چیزیں میں نے ایک مشہور پاکستانی ریسٹورنٹ سے
منگوائی تھیں۔

بچن سے کھل کے اس نے کرسی پر مگر تے ہوئے اپنا
پسینہ صاف کیا ”او گاڈ! میں کتنی تھک گئی ہوں لیکن خدا کا شکر
ہے سب تیار ہے۔“

میں نے کہا ”مارتا ڈارلنگ! جاؤ اب تم خود تیار
ہو جاؤ۔“

”او ہوائے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں وہ مضحکہ خیز
لباس کیسے پہنوں گی!“ اس نے فریاد کی۔

میں نے کہا ”آخر تم ساری باندھنا چاہتی ہو۔“
”وہ تو بس چھ گز سیدھا کپڑا ہے۔ میں لپٹ لیتی تھی کسی
نہ کسی طرح۔ اس کا ناپ تو ٹھیک ہے لیکن نیچے کا حصہ..... کیا
بولتے ہیں اس کو گھر مگر۔“

میں نے جس کے کہا ”غراری.....!“
”وہ تو عجیب چیز ہے۔ جیسے دو اسکرٹ جوڑ دیے
جائیں۔ ایک دائیں ٹانگ کے لیے۔ ایک بائیں ٹانگ کے
لیے..... ہاؤسل!“

میں نے کہا ”مارتا یہ براؤنڈل ڈریس ہے۔ ہماری
دہنیں پہنتی ہیں۔ میری شادی ہوگی تو دلہن پہنے گی۔ میری
ماں نے اور اس سے پہلے دادی نے بھی یہی پہنا تھا۔ ڈونٹ
کال ایٹ سلی! کتنی اچھی لگتی ہیں ہماری دہنیں۔ تم نے ویڈیو
فلیس دیکھی ہیں۔“

”یہ اتنا لمبا کیوں ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے میں قبضی
کر اسے نیچے سے کاٹ دوں۔ مجھے ڈر ہے کہیں پیرا لہجہ گیا
تو میں منہ کے بل گروں گی۔“

میں نے کہا ”جو عروسی لباس تمہاری دہنیں پہنتی ہیں اور
تم نے بھی پہنا ہوگا۔ وہ کتنا لمبا ہوتا ہے۔ وہ مضحکہ خیز نہیں لگتا
تمہیں ڈانٹا کا ڈریس دیکھا تھا..... وہ خود پادری کے پاس
پہنتی تھی کتنی اس کے ڈریس کا پچھلا حصہ چرچ کے وسط میں
تھا۔“

نہ جاتے مجھے قسم دی بہت بڑی ایک یہ کہ مرنے دم تک نسخہ
کسی پر ظاہر نہیں کروں گا! اپنی گھر والی پر بھی نہیں۔ عورت
ذات جیسے محل نہیں چھپا سکتی ایسے ہی بات نہیں چھپا سکتی۔
میں نے کہا استاد جی! اپنے بیوہ پڑ نہیں جو جو پولیس بھی مجھ
سے کچھ پوچھ سکے۔ بے شک تیرہ نمبر سے وہ روز منج شام
چھڑ کر میں چھڑ کر لڑکا پتا ہے نا.....؟“

عاس حیدر سے ہر شخص کہتا تھا کہ حیدر بادی بیٹن کھلاؤ
کسی روز۔ اسے اڈا ابا لہجہ نہیں آتا تھا۔ کرنا خدا کا یوں
ہوا کہ لندن میں ہی اس کا ایک حیدر بادی خاتون سے
انچھو ہو گیا۔ انہوں نے اور کچھ سکھایا نہیں مگر حیدر بادی
بیٹن پکانا سکھا دیے۔ وہ بار بار کی پریکٹس کے بعد عاس حیدر
نے اپنا شمار ماہرین میں کرنا شروع کر دیا اور فوراً ایک بنگلہ
عاس لی۔ وہ ریس گلے بھی اچھے بنانے لگا۔ زندگی نے وفانہ
کی درنہ کسی دلی والے سے تو مراد اور راجی والی سے سندھی
برائی کے علاوہ بہت کچھ سکھنا اس کے پروگرام میں شامل
فانہ کہتا تھا بار خواہ خواہ علم کے چکر میں پڑ کے سمجھتی بنے۔
دولت کے چکر میں بار پتی جنا آسان تھا۔ آج لندن میں
انہا کی ریسٹورنٹ ہوتا۔

مرشد نے صرف ایک بار غصہ کا تو رحمہ بنایا اور پھر کبہ
دبا تھا کہ آئندہ جسے بنانا ہو نسخہ اور طریقہ کیپوٹر پر دیکھ لے۔
پلے امر کی اور اب لندن میں مجھے چکن پلاؤ میں اعزازی
ڈاکٹر کی ڈگری دی گئی تھی۔ یہ عجب بات تھی کہ لندن میں
سب کچھ اسی طرح ملتا تھا جیسے لاہور دہلی یا کراچی میں بلکہ
کواٹی میں بھی بہتر لیکن اس کے باوجود اپنے ہاتھ سے پکا کے
کھانے کا شوق سب کو تھا۔ شاید اس طرح وہ گھر کے کچے
کھانے سے وابستہ اپنا پتے کے احساس کو تازہ کرتے تھے۔
ہوٹوں میں کھانا ہم سب کی معاشرت میں آج بھی اسے گھر
کے ہونے کی غفلت جگاتا تھا۔ ڈانٹنے سے زیادہ یہ سکون
غور اور اعتماد و اطمینان کی بات تھی جو اپنی کار میں بیٹنے
والے کو ملتا ہے۔ فیکسی میں سفر کرنے والے کو کہیں۔

صرف ایرانی لڑکیوں جو ان صاحب بالکل نکلتا تھا۔ وہ کچھ بھی
نہیں پکا سکتا تھا مگر کھانے میں سب سے آگے رہتا تھا۔
معاملات کام دہن میں وہ شرمی حدود کو بہت پہلے عبور کر چکا
تھا۔ ظاہر ہے اس کا آج کے ایران میں گزرا لیکن نہ تھا اور
مجھے اس کے خوابوں کا انقلاب محض خود فریبی نظر آتا تھا۔

مارتا نے ہم سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا اور الوداعی
دعوت میں وہ خود داعین کھانے بناتی تھی۔ ہم انہیں پاکستانی
نرا دیتے تھے۔ بہت سی دوسری باتوں کی طرح یہ بات بھی

”رفیق! میں دلہن نہیں ہوں۔ ذرا اس کا شوخ لال رنگ دیکھو! کونجھ پر نہیں گئے۔“

”لوگ خوش ہوں گے۔ سب بچے ہیں تمہارے۔ پھر تمہارے ساتھ تصویریں بنوائیں گے۔ میں پاکستان جاؤں گا تو سب کو دکھاؤں گا۔ میں نے سب کو بتا دیا ہے کہ میری فرمائش پر تم میری لباس پہن رہی ہو۔ تم نے میری ماں کی شادی والی تصویر دیکھی ہے نا۔ جس میں میرے فادر بھی گلے میں پھول ڈالے کھڑے ہیں۔“

”ان کے چہرے کیا نظر آ رہے تھے۔ سر کے سامنے پھولوں کی چادر لگی ہوئی تھی۔“

میں نے کہا ”اے ہم سہرا کہتے ہیں۔ انہوں نے شادی کے پچیس سال بعد اپنی شادی کی سطور جو تلی پر وہی لباس پھر پہنا تھا۔“

”کیسے پہنا تھا“ مار تھا نے اعتراض کیا ”وہ تو بہت چھوٹا بڑا ہوگا۔“

میں نے کہا ”یہ واقعی عجیب بات ہوئی۔ میری ماں شادی کے وقت کچھ موٹی تھی۔ اب سہم ہے۔ اب تھوڑا سا پھلے تھے۔ شادی والی میں پچیس گئے۔ تقریب کے مہمان جتنے خوش تھے اتنے حیران۔ بعد میں اب کو شیر والی سے رہائی ملی تو انہوں نے کہا کہ میرا سانس بند ہو چکا تھا نا ڈگو۔“

”اوکے اوکے سنی۔“ وہ بہت کر کے اٹھی۔

”تمہارا امیر اسٹائل میں بناؤں گا اور پھر دوپٹا سیٹ کروں گا۔“

اس نے بے بسی سے ہاتھ ملائے کہ اب جو ہوسو ہو۔

میں اپنے کپڑے بدل چکا تھا۔ جب تھکنی بنی اور میں اپنے پہلے مہمان جوڑے کو اندر لے آیا۔ وہ میرے ساتھ کام کرنے والے سزا اور سزا ایلیٹ تھے۔ جب ان کا مشتق چل رہا تھا تو وہ سزا اور سزا ایلیٹ بٹ کھلاتے تھے۔ نظارہ جیت کے سوانا میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ جاپانی نژاد سوشی دیکھنے میں ایک سیدھی سادی نازک اندام لڑکی تھی مگر اس کے پاس مارکینگ کے شے کا شاندار تجربہ تھا۔ جاپانی اپنی اصل عمر سے بہت لم کے نظر آتے ہیں۔ سوشی اگر خود کو پائیس جوئیں کا بتاتی تو لوگ یقین کرتے مگر اس کی عمر پچیس سال تھی جو اس نے کبھی نہیں چھپائی۔ اس کے پاس فرانس کی سو پورن یونیورسٹی کی ڈاکٹریت تھی۔ دو سال اس نے ایک ریسرچ آرگنائزیشن کے لیے کام کیا۔ پھر انکیشور ایک ہوم اپلانس بنانے والی ایک کمپنی کے ساتھ چھ سال گزارے۔ اصولی اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دیا لیکن حریف کمپنی میں دگنی تنخواہ پر

اجما عہدہ بھی اصول پرستی کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ اب وہ اسی کمپنی میں مارکینگ کے شے کی ڈائریکٹر تھی جہاں میں دو سال گزار چکا تھا۔ میں اس کا ماتحت تھا اور سزا ایلیٹ میرے ماتحت تھے۔ سزا ایلیٹ بھی خاموش بیٹج اور اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ ان کے عشق کی کوئی کڑی بھی نہ ہوئی۔ وہ آفس سے باہر لوگوں کو ایک ساتھ بیٹج اور ڈر کرتے نظر آتے تو بات چلی۔ انہوں نے بڑی سادگی سے اعتراف کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔ ایک دن انہوں نے کسی کو بتائے بغیر شادی کر لی اور اس سے اگلے دن معمول کے مطابق آفس آئے۔ مجھے اس کی سادگی اور صاف گوئی بہت پسند تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور خوش اخلاق بھی۔ اپنی صلاحیت اور اسے اچھے عہدے کی مالک کوئی اور لڑکی ہوئی تو اس کا داغ خراب ہو جاتا۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ میں بہت سی انٹرن اور پاکستانی لڑکیوں کو جانتا تھا جو معمولی عہدوں پر ترقی کرنے کے بعد کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے ایسے خاموشی سے شادی کیوں کی تو اس نے کہا کہ اس میں ڈھول پیٹنے والی کون سی بات تھی۔ نئی مومن کے سوال پر اس نے کہا کہ وہ کام چھوڑنے کو نہیں جاسکتے۔ جب ان کی سالانہ چھٹیاں ملیں تو چلے جائیں گے طبیعا سزا ایلیٹ ایک درویش تھے۔ قناعت پسند پرسکون ایماندار اور سب کے خیر خواہ۔ ان کی بیوی میں مجھے ایک مثالی شریعت عورت کے تمام اوصاف نظر آتے تھے۔

میں نے انہیں بٹھا کے درمیان میں ڈرکس رکھے ”میں کچھ مار تھا کی مدد کرنا چاہتا ہوں“ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت اندر سے مار تھا کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ وہ نہ جانے کس پر خفا ہو رہی تھی۔ ”کیا مطلب ہے آخر تمہارا اس فضول بات سے۔ کیا چاہتے ہو؟“ دیکھو یہاں کوئی ڈرنے والا نہیں ہے تم سے بد معاش۔ میں ابھی بتاتی ہوں پولیس کو۔“

جب میں گیا تو اس نے فون کا ریسور رکھ دیا۔ وہ غرارہ سوٹ پہن چکی تھی۔ کچھ اس لباس کا اثر تھا کہ مار تھا کے چہرے پر لالی دکھائی دیتی تھی تو کچھ غصے کا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں فکر و تردد کے ساتھ خوف کی پرچھائیاں بھی نظر آئیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بالکل خنڈا تھا۔ ”واٹ

ازراج مار تھا! کیا تم نے پھر آفسن کا بھوت دیکھ لیا ہے؟ یہ کال کس نے کی تھی تمہارے کسی سابقہ شوہر نے؟“

”اوہ ڈیر!“ وہ کا پتچ آواز میں بولی ”گھوٹی میرے ساتھ ایسا بے ہودہ مذاق نہیں کر سکتا۔ وہ بہت سیریس تھا۔ یہ واقعی بڑی پریشانی کی بات ہے۔“

میں نے کہا ”کیا ہوا۔۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ۔ کس نے فون کیا تھا؟“

”معلوم نہیں“ دیٹ باسٹر۔۔۔۔۔۔ اس نے نام نہیں بتایا۔

”اٹنا۔“

میں نے فون کا شیٹن دبا کے دیکھا۔ اس پر کال کرنے والے کا نمبر موجود تھا۔ ”یو کسی فون تھو کا نمبر ہے غالباً؟“

مار تھا نے سر ہلایا ”جب میں نے اسے پولیس کو بتانے کی دھمکی دی تو وہ ہنسا تھا۔ اسے کال ٹریس ہونے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔“

”کیا کہا اس نے تم سے؟“

”وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ راسل دھمکی دے رہا تھا۔“

میں نے کہا ”پرسکون ہو جاؤ مار تھا! مجھے بتاؤ کیا دھمکی دی تھی اس نے۔“

”اس نے مجھ سے پوچھا کہ رفیق آج کس سے ملے گیا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم باہر کون کس سے ملتا ہے؟ نہ کوئی مجھے بتاے جاتا ہے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”صحیح جواب دیا تم نے۔“

”اس نے پوچھا کہ کیا وہ کسی لڑکی کے ساتھ گیا تھا۔ اور کیا وہ ایک پاکستانی لڑکی تھی؟ میں نے کہا کہ یہاں سے وہ اکیلا گیا تھا لیکن ان سوالات کا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جھوٹ مت بول قاتل بڑھیا! ہم سب جانتے ہیں۔“

”اوہ گاڈ! ایسا کہا اس نے تم سے؟“

”میں نے کہا کہ تم کو شرم آتی چاہیے۔ فون پر مجھے گالیاں اور دھمکیاں دے رہے ہو۔ میں تمہاری ماں کے برابر ہوں۔۔۔۔۔۔ اور تم جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ مار تھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔“

میں نے اس کے سر کو سینے سے لگا کے تھپکا ”وہ بد معاش نلے میں ہوں گے مار تھا۔ ان کی بات کو اہمیت مت دو“

”اٹ ایڑی!“

”نہیں رفیق! وہ نلے میں بالکل نہیں تھے۔ اور دو تھے۔ پیچھے سے دوسرا مسلسل کھواس کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس چڑیل سے پوچھو کہ کیا وہ کسی لڑکی کے ساتھ نہیں گیا تھا؟“

”اس کا مطلب ہے انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔“

”میں نے پوچھا کہ کون لڑکی! یہاں سے وہ اکیلا گیا تھا لیکن وہ امرار کرتا رہا کہ رفیق کے ساتھ ایک پاکستانی لڑکی تھی۔ ضرور وہ تمہاری اور فریال کی بات کر رہا تھا؟ کیا تم اس کے ساتھ تھے؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا ”لیکن وہ میرے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ ٹاور برج پر مجھ سے ملنے آئی تھی اور وہاں اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوتا تو میں ضرور دیکھتا۔“

میں وہاں ایک کھنے پہلے سے موجود تھا۔ میں ریسٹورنٹ کے اندر تھا اور میں نے شیٹوں میں سے دیکھا تھا۔ وہ اپنی گاڑی بھی نہیں لائی تھی۔“

”وہ اس کی کسی کے تعاقب میں ہوں گے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا ”وہ گھر سے اپنی پاکستانی دوست ڈاکٹر شائستہ کے کلیکٹ گئی تھی۔ اگر کوئی اس کے پیچھے جاتا تو یہی سمجھتا کہ وہ مشورے کے لیے آئی ہے۔ ڈاکٹر شائستہ سے اس نے گاڑی لی اور اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی۔“

”پھر کسی نے اسے ڈاکٹر کی گاڑی میں بیٹھے دیکھا ہوگا۔“

”نہیں۔ اس کی کار اپنے گھر کے کیراج میں ہوتی ہے۔ اور اس کے سیاہ شے ہیں۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔“

”وہ خود تو اس وقت مریضوں کو دیکھتی ہے۔“

”ہاں۔ مگر کار اس کے شوہر یا اس کے بچوں میں سے کوئی لے سکتا ہے۔ یہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ ایک مریضہ گاڑی لے گئی۔“

”اور معلوم ہے اس نے کیا کہا؟“ مار تھا بے حد خوف زدہ تھی اور کانپ رہی تھی ”اس نے پوچھا کہ تمہارا وہ ہے اب تک گیسٹ کب واپس جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ صبح کو وہ بیرون پر چل کے ورنہ۔۔۔۔۔۔ ورنہ ہم اسے تاوت میں روانہ کریں گے۔ اس کا ساز ہمارے پاس ہے۔ اومانی گاڈ! وہ سیریس تھا۔“

”پھر تو ہمیں ضرور پولیس کو بتانا چاہیے یہ قتل کی دھمکی ہے۔“

اس نے کہا ”مٹھر جاؤ رفیق! ابھی تمہارے دوست آرہے ہیں۔ وہ بھی آپ سیٹ ہوں گے۔ ڈونٹ اسپاکی دی فن۔ پولیس آئے گی تو پھر مشاطے کی پوری کارروائی ہوگی۔ وہ سب کا بیان لے گی۔ اوداوی تقریب غارت ہو جائے

گی۔ اگر اس نے پھر فون کیا تو ہم ضرور رپورٹ کر دیں گے۔“

میں نے کہا ”اس کے علاوہ صبح میں جا ہی رہا ہوں۔ اس کی دھمکی کو بے مقصد کیوں سمجھنا چاہیے۔“

”لیکن میں نے اس بائزر ڈکویا نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کوئی تم سے ڈرتا نہیں ہے۔ وہ جب چاہے گا جائے گا۔“

میں نے اسے تسلی دی ”حالا کہ فریال نے مجھے بہت روکا کہ میں چھ ہفتے کے لیے ریک جاؤں۔ پھر وہ دو ہفتے تک میری روائی ملتی کرانا چاہتی تھی مگر میں نے کہا کہ میرا فیصلہ فائل ہے۔ کیا دھمکی دینے والا کوئی پاکستانی تھا؟“

”نہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے لیے پھر غور کیا تھا۔ وہ لندن کا رہنے والا نہیں ہو سکتا۔ وہ لوہروں کی زبان بول رہا تھا۔ وہ یقیناً اسکاٹ تھا۔ میں لہجہ کا فرق بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ خیر پولیس معلوم کر لے گی۔ اس نے پھر ریسورٹ کیا تھا۔“

میں نے ریسورس کے ہاتھ سے لے لیا ”کوئی فائدہ نہیں رہا تھا بات کو بڑھانے کا۔ صبح تو میں جا رہا ہوں۔ اگر اس خیال سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں اس کی دھمکی سے ڈر کر بھاگ گیا۔ تو چلو اسے خوش ہونے دو۔“

”یہ بہت سیریس بات ہے سنی!“

”جب میں خوف زدہ نہیں ہوا تو تم کیوں پریشان ہو۔ تاؤ کم آن! مہمان آرہے ہیں۔ لاؤ میں تمہارے بال ہٹا دوں۔“

اس نے کہا ”رفیق! کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ جوزف فریال کا منگیتر ہے۔ مرزا!“

”وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا؟“

”رفیق! وہی دے سکتا ہے ایسی دھمکی۔ آخر آل وہ تمہارا جانی دشمن ہے۔ اس نے تمہیں فریال کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا۔“

”وہ لندن میں نہیں ہے۔“

”سات گھنٹے میں کوئی بھی لندن آ سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”اوکے۔ میں دعوت کے بعد معلوم کر لوں گا۔“

”کیسے معلوم کر لوں گے؟“

میں نے کہا ”اگر وہ یہاں ہوتا تو کیا فریال کے علم میں نہ ہوتا۔ وہ بتا سکتی ہے مجھے۔ ورنہ پاکستان میں میرا ایک دوست اخباری رپورٹر ہے۔ اسے سب کے بارے میں علم

ہوتا ہے کہ کون کہاں ہے؟ وہ اسلام آباد میں بیٹھا ہے جہاں سارے سیاست داں ہوتے ہیں۔“

”اچھا تو پھر اسے ابھی فون کرو۔“

”پہلے فریال سے پوچھ لوں۔“

”نہیں! یہ رسک کیوں لیتے ہو۔ کہیں وہ مشکل میں نہ پڑ جائے۔ پاکستان میں اپنے دوست سے معلوم کر لو۔“

میں نے کہا ”مارتھا دیر ہو رہی ہے سب انتظار کر رہے ہیں۔“

”پانچ منٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

میں نے کہا ”مجھے تمہارے بال اور دوپٹا سیٹ کرنا تھا۔“

”وہ بگڑے لگیں! مہاڑ میں گئے بال اور دوپٹا۔“

پاکستان میں شام کے چھ بجنے والے تھے۔ میں نے راجا کے اخبار کے دفتر فون کیا۔ نیوز روم میں رپورٹر بھی سات بجے کے بعد ہی آتے تھے۔ تمہیں بہت دیر بچتی رہی پھر کسی نے ریسورٹ اٹھایا اور میری بات سننے ہی ”راجا ابھی نہیں آیا“ کہہ کے رکھ دیا۔ میں نے اس کے کھفون کیا جہاں وہ اکیلے رہتا تھا لیکن اس وقت راجا کے کمر پر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آخری چانس کے طور پر میں نے پریس کلب میں کوشش کی۔ کوئی اسے تلاش کرنے گیا۔ اس نے راجا کو دیکھا تھا۔

راجا کی آواز پانچ منٹ بعد آئی ”نیکے پتر! خیر تو ہے۔“

یوسف کی وجہ سے اب ہر دوست مجھے اسی طرح مخاطب کرتا تھا۔ میں نے کہا ”مہاراجا! ایک بات پوچھنی تھی تجھ سے۔“

”پوچھ۔ پوچھ!“

”مجھے کچھ معلوم ہے! میرا وہ کالے کروت اور کالے منہ والا دشمن کہاں ہے؟“

”وہ ہنسا“ سالے گورے! ویسے تو میں بھی اس تعریف پر پورا اترتا ہوں۔“

میں نے کہا ”ابے۔ تجھے مندر سلطان مرزا کا کچھ پتا ہے؟“

”ہاں بتا ہے۔ مگر بات کیا ہے؟ اس نے قتل کر دیا ہے تجھے بالآخر!“

میں نے کہا ”ابھی تک تو نہیں کیا مگر کر دے گا۔“

”انشاء اللہ“ راجا نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا ”اسے کب دیکھا تھا تو؟ آخری بار؟“

”ابے وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟ ابھی گزشتہ ہفتے

اس نے صحافیوں کو اظہار پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ اب رمضان شریف میں ہم نیکے بھوکوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ سب زکوٰۃ خیرات دینے کے لیے جلا لیتے ہیں۔ روزہ ایک اظہار یاں ہیں چار بھی ہو جاتی ہیں۔“

میں نے کہا ”خیرے باپ نے بھی روزہ رکھا ہے بھی؟“

”وہ بے شرعی ہے ہنسا“ جو بلا ہے ہیں وہ اور جو آتے ہیں سب سالے ڈراما کرتے ہیں جیسے بھوک پیاس سے دم نکلتے والا ہو۔ دراصل اظہار یاں سیاسی ڈنڈ ہو گئی ہیں۔ پریس کانفرنس تو بڑی رکی چیز ہے۔ اظہار پارٹی میں بڑا دوستانہ درمائی اور غیر رکی سامانچل ہوتا ہے۔ جس سے جو کہنا ہو رازداری سے کہہ دیا۔“

”تو کیا تھا اس کی پارٹی میں! تھا اس سے؟“

”نہیں! یار! اسی دن گورنر صاحب نے بھی مدعو کر لیا تھا۔ ظاہر ہے میں نے اسے ترجیح دی۔ کچھ کام کرانے تھے لوگوں کے اور اپنی جیب بھی خالی تھی۔ اچھا خاصا بھاری لفافہ ملا بیوی میں۔“

میں نے کہا ”مہاراجا! اتنی بے غیرتی سے تو اعتراف کر رہا ہے۔ سالے منیر کہاں گیا تیرا جس پر تجھے اتنا غرور تھا؟“

اس نے ایک آہ بھری ”منیر صاحب“ تو اب پاکستان میں کہیں بھی نہیں۔ کچھ کہتے ہیں ان کی یہاں کوئی شنا نہیں تھا۔ وہ چلے گئے امریکا جہاں امریکا کو اٹھتے بیٹھتے گالیاں دینے والوں کی اولادیں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جاتی ہیں۔ مگر تو بتا! مندر سلطان مرزا کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔ یہ بتاؤ لندن میں ہے یا نہیں آج کی تاریخ میں؟“

”نازیم وٹو ق سے نہیں کہہ سکتا۔“

”دیکھ! یہ معلوم کرنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ کسی سے پوچھ کے بتا“ میں نے کہا۔

”پر اہم تو یہی ہے کسی اور کو معلوم ہوتا تو مجھے بھی ہوتا۔“

میں نے کہا ”کیوں وہ درویش یا منور ہے؟“

”کچھ ایسا ہی سمجھ لے۔ تو جانتا ہے اس کی ایک خاندانی بیوی تھی۔ جیسے کہ ان سب فحشوں والا زندگی ہوتی ہے۔ کوئی عم زانو!“

”ہاں۔ کیا ہوا اسے؟“

”وہی جو ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اگر اپنے مجازی خدا کی بیش و عشرت اور بدکرداری ان کی قوت برداشت سے باہر ہو جائے۔ بدقسمتی سے وہ ایک بڑھی لمبی عورت تھی۔ وہی کہتی ہوگی جو کل کو مجھے میری بیوی کے لیے کہ مصروفیت کا تو بہانہ ہے۔ مجھے پتا ہے تمہاری راتیں کہاں گزرتی ہیں اور کس کے ساتھ۔ میں بیوی ہوں تمہاری یا کنیز جسے تم نے گھر میں قید کر رکھا ہے اور خود باہر رنگ لیاں مناتے پھرتے ہو۔“

”یا ر فضول کیواس بھگر بھی کرنا۔ میرے گھر میں مہمان بیٹھے ہیں۔ کام کی بات بتا۔“

”اس خاندانی بیوی نے خودکشی کر لی۔ کہا تو یہی گیا کہ وہ بیمار ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ لیکن اس اچانک ہونے والا جان لیوا بیمار کی تفصیلات میں بہت تضاد ہے۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ اس پر جن آتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ نفسیاتی مریض تھی اور اس نے خودکشی کر لی۔ کسی نے اس پر غلطی علم کرادیا“

غیرہ وغیرہ۔ لیکن اصل بات وہی ہے کہ اسے قتل کر دیا مندر سلطان نے۔ وہ بھی خاندان کی لڑکی تھی۔ باپ نے تو کچھ نہیں کہا۔ ماں کو بھی خاموش کر دیا ہوگا۔ مگر اس کا ایک بھائی امریکا میں رہتا ہے۔ وہاں پڑھنے گیا تھا دستور کے مطابق اور لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ وہ پاکستان میں تھا! ایسے ہی آیا ہوا تھا۔ اس نے ہنگامہ کر دیا! پوسٹ مارٹم کے لیے اصرار کیا۔ آئی جی اور گورنر تک کو لکھ دیا۔ اس کے کہنے کے مطابق مندر سلطان نازیم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

میں نے کہا ”یہ نازیم کون ہے؟“

”تو نہیں جانتا۔۔۔۔۔ مگر کیسے جانے گا؟ لندن میں بیٹھا ہے۔ یہ بڑی سنسنی خیز چیز ہے۔ نووارد ہے لیکن کچھ ہی دن میں ہر طرف تھلک مچا دیا ہے۔ پہلے ماڈل تھی! انڈیا کے اشتہاروں میں نمودار ہوئی کیونکہ یہاں تو زنانہ چیزوں کے اشتہار میں بھی کپڑے پہنتے پڑتے ہیں۔ وہاں خامی جمہوری آزادی ہے۔ ڈانسر بہت اچھی ہے۔ اس کا ایک ویڈیو کیسٹ دیکھا تھا میں نے۔ کسی پرائیویٹ ٹیلیفون کی پرفارمنس تھی! مگر تو ویسی ہی ہے شامی جیسے مگر ٹیکل ماڈرن ہے۔ ابرکلاس کی محفلوں میں نظر آتی ہے۔ شاہ لندن سے بڑھی ہوئی ہے۔ خیر! اپنے مندر سلطان مرزا نے اس کے لیے ایک فلم فوراً اناؤنس کر دی تھی! نازیم اس کی ہیروئن تھی۔ اس کا مہبوت بھی ہوا تھا تین مہینے پہلے مگر اس کے بعد شروع ہوئی دوسری لوانسوری۔ اور اس کا انجام بہت زیادہ غیر متوقع نہیں سمجھا جا سکتا۔“

”بیوی کا قتل تو فوڈل سیٹ ماپ میں ہو جاتا ہے۔ کوئی

نازنین بھی بعض اوقات اتنی ذہین ثابت ہوتی ہے کہ داشتہ سے بڑھ کر ذہن کے باعزت سمجھ جانے والے مرتبے پر قافز ہو جاتی ہے مگر ایک تو خاندانی بیوی ان معاملات سے بے نیاز اپنے گھر میں راج کرنے کی پالیسی میں خوش رہتی ہے۔ دوسرے شوہر فرار نہیں ہوتے۔

اس نے کہا ”خوابی غالباً اس لیے ہوئی کہ نازنین نے نصف جائیداد اپنے نام کرنے کا مطالبہ کیا اور مصفر سلطان کی آنکھوں پر اس نے ایسی پٹی باندھ دی تھی کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ آدمی خاندانی جائیداد سے کہ نازنین کو حاصل کرنے کا سوا اسے سستا لگا۔ اس پر جائیداد کے مالکوں کو اعتراض ہوا۔ قائد حزب اختلاف ہوئی خاندانی بیوی۔ نتیجہ یہ کہ اپنی جان سے لگی مگر اس کے بھائی نے خاموش رہنے سے انکار کر دیا۔ وہ اب مصفر سلطان کے خلاف قتل عہد کا مقدمہ درج کرانے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے اسے مخالفت کا سامنا ہے۔ یعنی کہ سرال سے بھی اور خود پولیس سے بھی۔ عام آدمی ہوتا تو اب تک اسے چپ کرادیا جاتا یا غائب کر دیا جاتا۔ مگر وہ ہے امریکن دنیا کی سپر پاور کا نمائندہ۔ اس نے امریکی کونسلٹ کو بھی بتادیا ہوگا کہ وہ غیر محفوظ ہے اور اب حکومت کی مشنری خود اس کی حفاظت پر مجبور ہو گئی۔“

”مطلب یہ کہ اس کا کچھ نہیں کہاں ہے؟ پاکستان میں یا ترکمانستان میں۔ یا انگلستان میں۔“

”آف کورس۔ وہ انگلستان میں بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیلا“ کیونکہ نازنین بہر حال اب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ نہ خدا ماند وصال نہ۔ تو ذرا تھکا ہوا جا۔“

لوگ روم سے سنائی دینے والے باتوں کے شور سے اندازہ ہوتا تھا کہ سب مہمان آچکے ہیں۔ مارقا نے کہا ”ایک تو تم بھی عورتوں کی طرح بہت ہی بات کرتے ہو۔ کیا پتا چلا یہ لوجوڑیاں۔۔۔ یہ بھی پیتا ہے جاؤ۔“

میں نے اسے مختصر آتا دیا ”وہ پاکستان سے بھاگا ہوا ہے یا وہ ہیں درپوش ہے۔ اس نے ایک عورت کے چکر میں بیوی کو لٹ کر دیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ لندن میں ہو۔“

جب میں لوگ روم میں گیا تو میرے دوستوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کیا۔ ”یہ کیا۔۔۔ تم ابھی تک کھانا پکا رہے ہو؟“

میں نے کہا ”سوری فرینڈز! پاکستان سے ایک ارجنٹ کال آگئی تھی۔ کھانا تو بالکل تیار ہے بس عائشہ آجائے۔“

”ہاں۔۔۔ کھانا اسی سے مشروط ہے۔ وہ نہ آئی تو کیا

ہمیں بھوکا دابہیں جانا پڑے گا۔“ سز بریڈلے نے اچھا کیا۔

اس کی موصالیہ کی رہنے والی سیاہ فام گرل فرینڈ نے مسکرا کر کہا ”اگر میں نہ آئی تو کیا تم کھانا کھا لیتے؟“

”میں تمہارے حصے کا بھی کھاتا۔۔۔ مجبور میں۔“ بریڈلے بولا۔

اسی وقت عائشہ آگئی۔ میں ہی نہیں اسے دیکھ کر سرب کچھ دیر کے لیے مسکرا کر بہت رہ گئے۔ اس خصوصی تقریب کے لیے اس نے پاکستانی لباس کا انتخاب کیا تھا۔ ظاہر ہے میری خاطر تھا مگر شلوار قمیض اور دھننے میں وہ بالکل ایک پاکستانی لڑکی نظر آ رہی تھی اور اس کے حسن کا تاثر قیامت خیز تھا۔

”سوری فرینڈز!“ اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ چھوٹوں کا گلہ نہ سمجھ دیا ”مجھے کچھ دیر ہو گئی۔“

”میرا خیال ہے کہ اب کھانے میں مزید دیر مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے لڑکوں اور لڑکیوں؟“ مارقا نے بھی اسی وقت ایک ڈرامائی انٹری دی۔

اس کے لباس عروسی پر بہت شور مچا۔ خواتین نے چیخیں ماریں اور حضرات نے تالیاں اور سیٹیاں۔ مارقا شرم سے لال ہوئی تو زیادہ مہنگے ذخیرہ نظر آنے لگی مگر وہاں موجود لوگ آداب اور شائستگی کے قائل تھے۔ سب کو اندازہ تھا کہ مارقا کے اس بہرہ پر کا ڈسے دار میں ہوں اور مارقا کی یہ جذباتی حرکت میری خوشی کے لیے ہے۔ پاکستان میں ہونے والی بہت سی بیویوں کی شادی میں سترہ سال عمر کے دادا دادی کو کا پتھی ناگوں کے ساتھ ڈانس کرتے ہیں یہ خود دیکھا تھا۔

سب نے مارقا کے گلے لگ کر اس کے گالوں پر پیانا تھے پر عقیدت سے بوسا دیا اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ وہی طور پر والدہ کی تقریب کی ادائی ختم ہو گئی۔ وہ بہت خوش نظر آنے لگی۔ میری ایشیو ایک اسٹریٹ چندرا تھی۔ اس نے کہہ دیا۔

”ایک تمہاری ماں لگ رہی ہے دوسری اس کی بہو۔“

یہ تیرہ ایک عام خواہش کی ترجمانی کرتا تھا کہ کاش ایسا ہوتا۔

اس نے عائشہ کو کھت میں جٹا کر دیا تو مجھے نہ امت میں۔ عائشہ سال بھر پہلے ایذا ارنسٹ تھی۔ اس کا باپ لارڈ ارنسٹ اسی کمپنی کا چیف ڈائریکٹر تھا جہاں میری ملازمت کو دو سال پورے ہو چکے تھے۔ وہ کاروباری طور پر کامیاب اور سیاسی حلقوں میں خاص اثر رسوخ رکھنے والا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کے مقابلے میں وہ فراخ دل اور خاصا غیر متعصب شخص

تھا۔ بھی دجھی کہ اس کی کمپنی میں گورے کالے اور ہر ملک کے باشندے ایک باعزت ماحول میں کام کر کے مطمئن تھے۔ وہ بیک وقت ایک اچھا منتظم، باصلاحیت ٹیم لیڈر، بے تکلف دوست اور شفیق دھیر د انسان تھا۔ انٹرویو کے وقت میں اس کے مثبت اور حوصلہ افزا رویے سے متاثر ہوا تھا۔ انٹرویو کے فوراً بعد اس نے مجھے بتادیا تھا کہ میں مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہوں اور مجھے وہی تنخواہ دی جائے گی جس کا میں نے اپنی وی سی میں مطالبہ کیا تھا۔ تاہم آنے والے تین ماہ میں مجھے اپنی کارکردگی کا عملی مظاہرہ کرنا ہوگا۔

عائشہ اپنے باپ کی کمپنی میں ایک سٹریٹریٹیو کے شعبے کی ڈائریکٹر تھیں لیکن اس میں فشارش بابا کے اثر رسوخ کو قطعی دخل نہ تھا۔ اس نے سوزیئر رینڈ سے پبلک ریلیشن کے ساتھ ہوسٹ ریپورس میں ڈگری لی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ تین مختلف اداروں میں بہترین پرفارمنس دے چکی تھی اور دو سال کے مختصر عرصے میں اپنی ذہانت سے ثابت کر چکی تھی کہ وہ کسی باپ کی بیٹی ہے۔ باپ کے بڑے نام کی رعایت اسے کہیں نہیں ملی تھی۔ وہاں کام اور کاروباری خاندانی حوالے کا تصور ہی نہیں۔ جب بالآخر باپ نے اسے دھمے محاذ سے پروڈیوٹس کی پوسٹ آفر کی تو نہ باپ نے بیٹی پر احسان کیا اور نہ بیٹی نے باپ پر۔ دونوں طرف سے یہ قطعی غیر جذباتی قسم کا کاروباری فیصلہ تھا۔

عائشہ کو خدا نے حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا۔ حسب نسب پر غور کرنا زمانہ اب انگلستان میں بھی نہیں رہا۔ خود شاہی خاندان میں روایات کی پابانی نے قدامت پسندوں کو خاصا مایوس کیا۔ دنیا کو گول دیج بنانے کی حامی نسل نے جرم کے تقرقات اور تکلفات کو طاق نسیاں پر مائل کر دیا۔ اس کے باوجود عائشہ اپنے حسن اپنی اعلیٰ تعلیم یا عہدے کے باعث احساس برتری میں مبتلا ہو گئی تھی لیکن وہ جتنا بھی متکبر مزاج اور فطرتاً لڑکی تھی۔ اس حد تک کہ اس کی دوستانہ مسکراہٹ اور بے تکلفی عموماً غلط فہمیاں پیدا کر دیتی تھی۔ بول شاعر میں جسے پیار کا اندازہ سمجھ بیٹھا ہوں۔ یہ تبسم یہ تلمذ تری عادت ہی نہ ہو۔

ابتداء میں یہ غلط فہمی مجھے بھی ہوئی مگر کچھ عرصے میں جب میں نے عائشہ کی فطرت کو سمجھ لیا تو میرے اور اس کے درمیان ایک بہت اچھی ورنگر ریلیشن شپ بن گئی۔ کمپنی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہی تھی۔ وہاں ایک جیسی ذہنی رخ رکھنے والے لوگ تھے جو اشتراک جانتے تھے۔ ان کے درمیان مقابلہ نہ تھا۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے۔ تنخواہوں

سے اور مالکوں کے رویے سے مطمئن تھے۔ چنانچہ کمپنی ایسے آگے بڑھ رہی تھی جیسے ایک اچھی کار آگے بڑھتی ہے تو اس کی کارکردگی میں تمام پڑے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

عائشہ اپنے مزاج اور فطرت میں اپنے باپ کی ساری صفات رکھتی تھی۔ حسن صورت میں اس نے ماں کی میراث حاصل کی تھی اور نتیجے میں پرفیشن حاصل کر لی تھی۔ طبعا اس کی ماں جہالت کی حد تک نسل پرست اور مغرور تھی۔ وہ خود خطاب یافتہ باپ کی بیٹی تھی اور اسے دعویٰ تھا کہ شاہی خاندان کے داروں کی کبھی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہے۔ درود بزرگ دن رادی۔ یہ فہرست سوائفرا پر مشتمل تھی۔ عائشہ مذاق میں کہتی تھی کہ اگر پہلے کھانا توے وارث نہ رہیں تو میرا نا انا یا تو دور ڈھم کے نام سے بادشاہ انگلستان ہو سکتا ہے۔

عائشہ سے میری دوستی کب شروع ہوئی اور کب در پردہ مراحل طے کرتی محبت بن گئی اس کا مجھے پتا ہی نہ چلا اور جب حقیقت مجھ پر عیاں ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شاید ایک میں ہی تھا جو بے خبر رہا۔ باقی سب لوگ دیکھ رہے تھے۔ بائیں کر رہے تھے اور پیش گوئیاں کر کے شریک لگا رہے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں محصور ہو گیا ہوں اور میرے لیے نہ بچ کر نکلتا ممکن ہے اور نہ بچھے بٹنا۔

میں اس کی محبت سے جذبات کی کمان ہنوز قفل کے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے جب خود سے سوال کیا کہ یہ محبت ہے یا جنسی کشش تو جواب ہمیشہ ایک ہی ملا کہ یہ محبت ہے۔ یہ ہوس کی آگ ہوئی تو بہت پہلے شعلہ بن کر ہمارے جذبات کو خاکستر کر چکی ہوئی اور اب تک سرد پڑ جاتی۔ لندن جیسے شہر میں ہمارے تعلق کی راہ میں کسی اخلاقی، سماجی یا مذہبی حد کی دیوار حائل نہ تھی۔ قانون تو ہمارے تعلق کو محفوظ فراہم کرتا تھا کہ ایک بالغ مرد اور عورت آپس کی رضامندی سے جیسے تعلقات چلیں اسٹوار کریں وہ شادی کے بغیر ساتھ رہیں، بچے پیدا کریں، مشترکہ خاندان بنالیں۔ کسی ہم جنس سے شادی کر لیں۔ یہ اسی طرح ان کا ذاتی معاملہ ہے جیسے اپنی مرضی کے پیرے پہننا یا اپنی پسند کے گانے سننا۔ سوسائٹی کو بھی ذاتی فیصلوں سے کیا۔ شخصی آزادی کا تقدس سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

شاید میری یہی ادا عائشہ کو بھانپ گئی کہ میں رشتوں کے تقدس میں شریک روایات پر کاربند تھا۔ جب ہم آفس کے باہر ملے لگے تو غلط میں ایسے ان گنت مواقع آئے جب وہ میرے بہت قریب آگئی۔ کئی بار لچ باڈز کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میں نے اسے اپنے گھر دعویا۔ ہم نے

ایک ساتھ سڑکیا۔ کبھی دوسرے شہر اور کبھی دوسرے ملک کے کسی ہوٹل میں قیام کیا لیکن چارے کمرے ہمیشہ الگ رہے اور کبھی جذبات عشق کی وارنٹی نے عائشہ کو خود ہمدردی کے مرحلے تک پہنچا دیا تو میں نے اعتماد کی دیوار کو گرنے نہ دیا۔ عائشہ حیران بھی ہوئی اور مایوس بھی لیکن جب میں نے اسے اپنی ذاتی تربیت کے مطابق دیکھا دیا کہ میرے نزدیک محبت کی آمد کیا ہے اور بے آمدی کیا تو وہ میرے کردار کی عظمت سے مسحور ہو گئی۔ محبت میں جسمانی تعلق سے گریز اس ماحول میں ابھار دینے کی دلیل تھی۔ میں نے اگر عائشہ کی قربت سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ شرعی روایات کی ایک احقانہ "شرافت" تھی جس کا مغرب میں کوئی تصور نہ تھا۔ اسے نامرد ہونے کے مترادف قرار دیا جاتا تھا۔

عائشہ کو میری یہ غیر مردانہ صفت ہی میرے فرشتہ سیرت ہونے کا وہ ثبوت تھی جس نے اس کے لیے میرے حصول کو مقصد حیات بنادیا حالانکہ میں ایک عام خطا کار انسان تھا جس کا دامن گناہوں کے داغوں سے پاک نہ تھا۔ جب میں امریکا پہنچا تھا تو میری حالت اس فائدہ زدہ قیدی جیسی تھی جس پر آزادی کے ساتھ دنیا کی ہر نعمت کے دروازے کھول دیے گئے ہوں اور وہ سب کچھ بھول کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے عائشہ کو بہت سمجھایا کہ ہم زندگی ساتھ نہیں گزار سکتے۔

"کیوں ساتھ نہیں گزار سکتے؟ تم کیا سمجھتے ہو میں جذبات کی رو میں بہہ جانے والی کم عمر اور کم عقل لڑکی ہوں؟"

"میں..... میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ تمہاری ذہانت اور قابلیت کا معترف ہونے کے باوجود۔"

"تم ایک دقیانوسی ذہن سے سوچ رہے ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے باوجود؟"

"ایسا۔ یعنی حقائق کبھی نہیں بدلتے۔"

"کون سے زمینی حقائق۔ زمین سب ایک ہو گئی ہے۔ اور ہمارے حقائق بھی ایک ہیں جو زندگی کی ضرورت ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟ میری ذات میں کوئی خالی ہے؟ تمہیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر یا خود پر؟ یہ ڈر ہے کہ کل کو میں نہ بدل جاؤں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟ تم فریال سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں" مگر میرے چاہنے سے کچھ ہو نہیں

سکتا۔ وہ مجھے نہیں ملے گی..... میں جانتا ہوں۔"

"پھر بھی امید سے دامن باندھے رکھنا چاہتے سکتی غیر عملی بات ہے" اس نے مایوسی سے کہا۔

"ایسا ڈارلنگ! عقل کے فیصلے کو سامنے رکھو"

اس سے لاکھ درجے بہتر ہو۔ وہ نہ ملی ہوتی تو جہیں پاک

دھننا خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھتا۔

میری زندگی میں شامل ہے اور میں اس سے کیے ہوئے

دفا کو خود کیسے توڑ سکتا ہوں..... امید کو ابھی سے کیسے ختم

ہوں۔"

"یعنی مجھے انتظار کرنا ہوگا" امید کے ساتھ۔ قطار

میرا ہمبر اس کے بعد ہے۔"

میں نے کہا "ایسا کیوں سمجھتی ہو؟ میری نظر میں اور

مسائل ہیں۔ شرق اور مغرب کی دوری ہے۔"

"وہ صرف سات آٹھ گھنٹے کی دوری ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "کیا میں ریڈیو کبلیٹنگ کا

دہراؤں..... کہ شرقی شرق ہے اور مغرب مغرب یہ دور

کبھی ملے ہیں اور نہ میں گئے۔"

"وہ پچھلی صدی میں کہا تھا اس نے۔ اب تم لندن

رہتے ہو اور میں بھی لاہور میں رہ سکتی ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ناممکن۔ ہمارے درمیان

ماحول کا فرق ہے۔ طبقاتی خلیج ہے ہمارے خاندانوں

سوچ الگ ہے۔"

"لیکن یہ زندگی ہماری ہے۔ صرف میری اور تمہاری

یہ سارے فرق اس پراثر انداز نہیں ہوتے۔"

"ہوتے ہیں۔" میں نے کہا "ہم سب سے کٹ

اکیلے نہیں رہ سکتے اور نہ اپنے بچوں کے ساتھ مریخ پر پنی

آباد کر سکتے ہیں۔"

"یعنی فریال جہیں نہ ملے" اس کے بعد بھی تم مجھ سے

شادی نہیں کر دو گے" جہیں صرف فرق نظر آرہے ہیں" میرا

محبت محسوس نہیں ہوتی؟"

"ایلیشا" زندگی فلم نہیں ہے جو دو گھنٹے میں ختم ہو جاتی

ہے۔ ایک طویل مدت ہے مجھے بتاؤ یہ شادی ہو جائے

ہمارے بچے کیا سمجھیں گے خود کو؟ گورایا کالا؟ پاکستانی؟

برطانوی؟ کرکچن یا مسلمان۔ کتنے پکلیس ہوں گے انہیں۔"

"نہ ہب میرے لیے ذاتی معاملہ ہے۔ میں مسلمان

ہو جاؤں گی اور یہ مت سمجھتا میں بحث ہار گئی تو میں نے ہار مان

لی۔"

اگلے دن وہ مسلمان ہو گئی۔ اس نے اسلام کی سنٹر میں

کسی سے رابطہ کیا اور سارے قانونی قاعدے پورے کرنے کے بعد مجھے مطلع کیا کہ میرا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا ہے۔ میں بوجھ بکا رہ گیا۔

میں نے فریال کو بتایا تو وہ خفا ہونے لگی "اس کے دین اور دنیا کی خرابی کے ذمے دار تم ہو۔"

"کیوں..... میں نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔"

"بات کو اتنا بڑھانے کی کیا ضرورت تھی! مگر تمہاری مردانہ انا کو بہت سکین مل رہی ہوگی تاکہ یک نہ شد و شد۔ پہلے ایک پاگل تھی اب دو ہیں..... اور لڑکی بھی ایسی....."

میں نے کہا "فریال! میں ہاتھ مار دوں گا۔ مجھے بتاؤ" میں کیا کروں؟

"دبی جو میں کہتی رہتی ہوں۔ ابھی اس سے شادی کرلو۔ پھر مجھ سے کر لیتا۔ دو کی گنجائش رکھنا! زندگی بڑی لمبی ہے..... اور تم باشا اللہ ایسے پنڈت مہر واد شہر اور گنگا مہر واد ایٹھو پیرا سے بھی آئے گی کچے دھاگے سے بندھی انجینا جولی بھی....."

اگلے دن ایٹھ یعنی عائشہ کی ماں کا فون آ گیا "میں تم سے فوراً ملنا چاہتی ہوں گاڑی بھیج رہی ہوں۔"

میں نے کہا "لیڈی ارٹسٹ! گاڑی ہے میرے پاس..... اور نہ ہوئی تو لندن میں ٹیکسی مل جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ مجھے کسی بھی وقت طلب کیا جاسکے ہے؟"

"اوکے! کب آ سکتے ہو تم؟" اس کی نخوت کچھ کم ہوئی۔

میں نے کہا "اگر متعدد ملاقات..... عائشہ....."

"اس کا نام ایٹھا ہے۔"

"آپ باخشی میں رہنا پسند کرتی ہیں تو آپ کی مرضی۔ میں عائشہ ہی کہوں گا اسے جو کہ وہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتی ہیں یا کوئی وضاحت مقصود ہے؟ تو میں معذرت چاہتا ہوں آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں جو پوچھنا ہے۔"

"اس کو خراب کرنے کے ذمے دار تم ہو؟" وہ برہمی سے بولی۔

میں نے کہا "اپنی اولاد کے بارے میں آپ کی رائے خراب ہے تو یہ سوال خود سے کریں کہ تربیت اور پرورش میں آپ سے کیا کوتاہی ہوئی۔ دیے اسے سب اچھا سمجھتے ہیں..... مجھ سمیت۔"

"تم کیا سمجھتے ہو خود کو آخر..... بد معاش! میں تمہارا

دماغ درست کرادوں گی۔" وہ چلانے لگی۔

"ناحق اپنا وقت اور انرجی ضائع کریں گے آپ..... میرا دماغ ٹھیک نہیں ہو سکتا خاتون!" میں نے فحش کے گہوارے فون بند کر دیا۔

لیکن اس سے عائشہ کی ماں کا غصہ کم نہیں ہوا۔ وہ ایک دن میرے آفس پہنچ گئی۔ میں اس کی زبان نہیں بکڑ سکتا تھا۔ کان میں روٹی ٹھونس کے بھی نہیں چپٹھ سکتا تھا۔ میں ڈاک آؤٹ کر گیا۔ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی کیونکہ میں "ابھی آتا ہوں ایک منٹ میں" کہہ کے گیا تھا۔ چندہ میں منٹ بعد اسے بتایا گیا کہ فیض صاحبہ تو چلے گئے ہیں۔

چند دن بعد وہ مارٹھا کے گیسٹ ہوم میں آدھمکی۔ میں طے کر چکا تھا کہ اس کی کسی بات پر مشتعل ہو کے جواب نہیں دوں گا مگر مارٹھا نے میرے منہ سے کہنے کے باوجود اس پر چڑھائی کر دی اور اس کی لیڈی شپ کی کمال فلیٹج کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ جب وہ رو پڑا تو اسے اور دھمکیاں دے کر چلی گئی تو مارٹھا نے لارڈ ارٹسٹ کو فون کیا اور اسے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی "تمہاری بیوی کا سارا خرد اور بد معاشی نکل دوں گی میں۔ اس سے کہنا پھر میرے منہ نہ لگے۔"

لارڈ ارٹسٹ نے مارٹھا سے معافی مانگی۔ اس نے مجھ سے بھی بات کی مگر میں نے اسے مطمئن کر دیا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ عائشہ بالغ اور خود مختار ہے۔ اس معاملے کے اچھالنے سے اس کی اپنی عزت جانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن عائشہ کی ماں کا غصہ کم نہ ہوا۔ ایک دن مجھے تین بد معاشوں نے گھیر لیا۔ انہوں نے عائشہ کا حوالہ دے بغیر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں واپس پاکستان نہ گیا تو میرا سر میرے کندھوں پر نہیں رہے گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک سال پہلے میں لندن پہنچا تھا تو رنگ دار ایشیائی تارکین وطن کے خلاف نسل پرست دہشت گرد گھونٹوں یعنی SKIN HEADS بہت ایکٹو تھے۔ ان کی غنڈا گردی کا خصوصی نشانہ پاکستانی تھے جن کو وہ بڑی نفرت اور خفا سے پاکی کہتے تھے۔ وہ پاکستانیوں کے اسٹورز میں گھس کے توڑ پھوڑ کرتے تھے۔ انہیں اکیلا پکے سڑک پر گھر لیتے تھے اور بڑی بے رحمی سے مارتے تھے۔ وہ مہلک ہتھیار استعمال نہیں کرتے تھے۔ ڈنڈوں یا کیوں! فولادی زنجیروں اور تاروں سے حملہ کرتے تھے اور اتنی بے رحمی سے مارتے تھے کہ زخمی کا چہرہ مڑ جاتا تھا اور وہ میمنوں بستر پر ڈال دیتا تھا۔ ان کی ہر ہتھوڑا کارروائی کے نتیجے میں کچھ اموات بھی واقع ہوئی تھیں۔ بعد میں انہوں نے

ورڈوں کو بھی نشانہ بنایا تو پاکستانی کمیونٹی میں سراسیمگی پھیل گئی۔ پولیس الٹ ہو گئی۔ بہت سے گھنے گزرا بھی ہوئے مگر پاکستانیوں میں ایک رومل کے طور پر خود حفاظتی کی تدابیر اٹھانے کے لیے تحریک شروع ہوئی۔ لاہور کے ڈاکٹر بشیر نے ایک دن مجھے مطلع کیا کہ قریب ہی ایک مارشل آرٹ انڈی می ہے جہاں جاپان کا ایک جیونٹن بلیک بیلٹ جودو کرائے کی تربیت دیتا ہے اور دیسے تو جاپان سے بلیک بلیٹ کے لیے کوئی فانی کرنے میں کسی برس لگ جاتے ہیں مگر اس کا خود حفاظتی کا شارٹ کورس چھ مہینے کا ہے اور یہ کریس ہر گرام مکمل کرنے کے بعد بندہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان بد معاشوں کیوں کو ٹکڑا لولا بھی کر سکے۔ ہم نے ایک ساتھ انڈی می جوائن کی مگر صرف دو ہفتے بعد ڈاکٹر بشیر کو احساس ہوا کہ اس کی ٹریننگ شاموں کا خود فراموشی پر دگرام چو پٹ ہو رہا ہے تو خود حفاظتی پر دگرام غیر اہم ہو گیا۔ میں نے ٹریننگ جاری رکھی اور چھ مہینے میں اپنی گن سے اتنا سیکھ لیا جو بقول استاد جزم لوگ ایک سال میں نہیں سیکھ پاتے۔

جب ان تین گھنٹوں نے مجھے دھمکی دی تو میں نے کہا "اپنے ہیملٹ اتار دو۔ پھر دیکھتے ہیں کس کا سر کہاں رہتا ہے؟"

ایک نے غرا کے کہا "کون سے ہیملٹ؟"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "اوہ..... معاف کرنا" یہ تو تمہارا اور جمل سرے کی پشیل آلو جیسا ہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ مشتعل ہو کے اپنی جارحانہ کارروائی کا آغاز کرتے میں نے غولہ مار کے سرخند کے پیٹ میں ٹکر ماری اور اسے سر کے اوپر سے پیچھے اچھال دیا۔ دوسرے کو ایک ایڑھی پر محوم کے لات رسیدی جو اس کے سینے پر لگی تو اس کا سانس رک گیا اور وہ لوکڑا کے گرا تو تیسرے کی زخمیں آگیا جو مرنے کیل کی طرح میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ منہ کے بل گیا تو میں نے اس کی پسیلیوں میں پے در پے ٹھوکریں ماریں۔ اتنی دیر میں پہلا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے لگا تو میں نے پیر پیچھے اٹھا کے اس کی ٹانگوں کے درمیان ٹنگ ماری اور پھر خود بھاگ کھڑا ہوا۔ میں پولیس کی کسی کارروائی سے دور رہنا چاہتا تھا۔ انہوں نے میرا تاقب نہیں کیا کیونکہ انہیں اپنے حریف کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

مجھے شک تھا کہ ان حملہ آوروں کو عائشہ کی ماں نے میری کوشاں پر مامور کیا تھا۔ تصدیق کے لیے میں نے ایک قریبی پبلک کال آفس سے اسے فون کیا اور آواز بدل کے کہا

"لیڈی! آپ کا کام تو ہو گیا..... مگر ایک گزبڑ ہو گئی۔" اس نے کہا "دبی..... اس پاکستانی کو واپس بھیجے گا۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا "مگر بڑبڑا ہو گئی؟"

"وہ مگر کیا..... ہم نے زیادتی نہیں کی تو کہہ کر دو تھا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" اس نے سخت پریشانی میں کہا "ایک منٹ روکو۔"

میں نے اپنا لہجہ اور آواز بدل کے بات کی تھی پھر بھی اسے کچھ شک ہو گیا تھا۔ چند منٹ بعد کسی نے غرا کے کہا "کون ہو تم؟ یہاں فون کیوں کیا ہے؟"

میں نے ہچکا کے کہا "وہ..... دراصل..... وہ خود بھاگ گیا۔"

"جونہی بھاگ گیا۔ بھاگ کے کہاں جائے گا وہ۔ میں نے اسے منع کیا تھا کہ فون پر بات نہ کرے۔ تم جونہی کو کیسے جاتے ہو یہ خبر تم نے کہاں سے حاصل کیا؟"

میں نے فون رکھ دیا۔ میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لیڈی ارٹسٹ نے غالباً اپنے کسی ملازم یا گاڑے سے کہا ہوگا کہ اس پاکستانی کا لندن میں رہنا مشکل کر دو۔ اس نے جونہی نام کے کسی بد معاش کو اس کا خیر کا ٹھیکہ دیا ہوگا مگر یہ کام آنے والے پر اہور است لیڈی ارٹسٹ سے فون پر بات کیے کر سکتے تھے۔ گھبراہٹ میں اس کے منہ سے جو بات نکل گئی، اس سے بھاطر اچھوٹ گیا۔ پھر اس کے مستند نے جونہی کا نام لے کر میرے شبہات کی تصدیق کر دی۔ اگر میں چاہتا تو پولیس کے پاس جاسکتا تھا مگر میں نے انتظار کیا۔ ایک دن میں اچانک لیڈی ارٹسٹ کے سامنے چلا گیا۔ وہ بدحواس ہوئی۔

میں نے کہا "مائی ڈیر لیڈی! میں ابھی پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

اس نے بولکھلا کے کہا "یہ..... یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس کے علاوہ..... اب میں اپنے ساتھ بھرا ہوا ریوالور بھی رکھتا ہوں۔ جونہی کو کتنے کی طرح شٹ کر دوں گا۔"

"تم ننٹے میں سے رو دبا بول رہے ہو؟" اس نے کہا اور میرے سامنے سے ہٹ گئی مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ڈر گئی ہے۔

آج فون پر مجھے پھر دبی دھمکی دی گئی تھی جو ایک سال پہلے تین گھنٹے حملہ آوروں نے دی تھی۔ پارٹی کے دوران مجھے بار بار انہی کا خیال آتا رہا۔ خود مارٹھا اپنی پریشانی کو کٹاہری

خوش اخلاقی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صرف میں اس فرق کو محسوس کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ عائشہ کو شک نہ ہو۔ ابھی تک میں نے اسے نہ خود پر ہونے والے حملے کے بارے میں بتایا تھا اور نہ اس کی ماں کے شکوک روپیے کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔

الوداعی دعوت میں شریک ہونے والے سب مہمان میرے لیے تحائف لے کر آئے تھے۔ سوائے عائشہ کے وہ صرف بھول لائی تھی۔ سب مہمان آدمی رات کے بعد باری باری رخصت ہونے لگے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرا فیصلہ کتنا اکل ہے اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ مجھے لوٹ کر لندن آنے کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے اور اپنے والدین کو بھی قائل کرنا چاہیے کہ ایسا کرنا ہی بہتر ہوگا۔

آخر میں صرف عائشہ رہ گئی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میری فلائٹ میں چار گھنٹے باقی تھے۔ میں نے اپنے سامان کو کم سے کم رکھا تھا۔ میرے کمرے میں ذاتی استعمال کی جتنی چیزیں تھیں وہ میں مار تھا کے لیے چھوڑ کے جا رہا تھا۔ ان میں میرا دی وادریج بھی شامل تھے۔ یہ میرے کمرے میں آنے والے کے لیے ایک نایاب پاکستانی دوست کا تحفہ ہوتا۔

مار تھا اتنی تھک گئی تھی کہ اس میں لباس تبدیل کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ بید کی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اچانک اس نے عائشہ کو مخاطب کیا ”کیا بات ہے عائشہ! تم صرف بھول لاؤ گی؟“

میں نے جلدی سے کہا ”حقیقی جذبات کی ترجمانی پھولوں سے بہتر کون کر سکتا ہے؟“

عائشہ مسکرائی ”میں نے ایک خاص جتنے کا انتظام کیا تھا مگر معلوم نہیں کیوں وہ تم کو نہیں ملا۔ خیر کل مل جائے گا۔“

مار تھا نے پوچھی ”پوچھا، ایسی کیا چیز تھی؟“

”ایک ویکٹورین اسٹائل ڈاننگ سیٹ تھا۔ برتنوں کا نہیں ایک گلاس ٹاپ میبل اور آٹھ کرسیاں۔“

مار تھا کا منہ جھرنی اور خوشی سے ٹھکرا رہا تھا ”انتا ہنگا تھو۔۔۔۔۔ میرے لیے؟“

”وہ تمہیں ہمیشہ رفتی کی یاد دلائے گا اور اس تعلق کی جو تمہارے درمیان رہا۔“ عائشہ نے کہا۔

مار تھا اتنی جذباتی ہوئی کہ عائشہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔ ”یہ بہت بھول لڑکا ہے۔“

میں نے اسے ٹوکا ”مار تھا۔ ہم نے کس بات پر اتفاق کیا تھا؟ کوئی انودامی ڈاننگ نہیں بولے گا۔ ڈرامائی سین نہیں

ہوگا۔ رونا دھونا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ رائے!“

”میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتی۔“

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے بھر مونس پر بٹھادیا ”میں آتا جاتا رہوں گا مار تھا۔ ہوسکتا ہے وہاں جا کے مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑے۔ ابھی کچھ دن میرا کمر اگالی رکھا۔ اب میں عائشہ کو چھوڑ آؤں۔“

اس نے آنسو پونچھ کے سر ہلایا ”عائشہ آج خودی گاڑی چلا کے لائی تھی ورنہ رات کو کہیں دیر تک رکنا ہوتا خوش اس کے ساتھ آتا تھا جو اس کا پرسنل باڈی گارڈ بھی تھا۔“

باہر آ کے عائشہ نے کہا ”جو تھو میں تمہارے لیے لائی تھی وہ سب کے سامنے دیتا نہیں چاہتی تھی۔“

میں نے کہا ”کسی جتنے میں چھپانے والی کیا بات ہو سکتی ہے؟“

اس نے اپنے بیگ میں سے سرخ غلغل کی ایک چھوٹی سی ڈبیا برآمد کی ”بس۔۔۔۔۔ میں خود کو مزید تماشنا بنانا نہیں چاہتی تھی۔“

میں نے کہا ”یہ کیا ہے؟“

اس نے ڈبیا سے ایک مہیرے کی انگوٹھی نکالی ”یہ مہی کی انگوٹھی ہے۔ اسے پہن لو اپنا ہاتھ لا۔۔۔۔۔ میں پہنا دوں۔“

میں بھونچکا رہ گیا ”عائشہ!“ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

”یہ کوئی شادی کا بزم نہ تو نہیں۔ نہ کوئی قانونی حیثیت رکھنے والا حلقہ نامہ ہے۔ صرف ایک انگوٹھی ہے جسے تم جب چاہو اتار کے پھینک سکتے ہو۔“

میں نے کہا ”یہ کیا پاگل ہیں؟“

”میں نے سوچا تھا۔۔۔۔۔ کہ تم مان جاؤ گے تو سب کے سامنے کسی تقریب میں پہناؤں گی“ اس نے ایک قطرہ اشک کو انگلی سے جھٹک دیا۔

”مگر یہ تو لڑکا بنانا ہے۔“

وہ ادا سی سے مسکرائی ”کیا فرق پڑتا ہے اگر لڑکی پر دبوڑ کرے اور لڑکا یاں کہہ دے۔ کیا تم نے مجھے حضرت خدیجہؓ کی مثال نہیں بتائی تھی۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ کیا فائدہ اس کا۔۔۔۔۔ جب شادی کا نہ ارادہ ہے نہ کوئی امکان۔“ میں نے بہتر سمجھا کہ اس کے دل میں باقی رہ جانے والی امید کی آخری کرن کو بھی بجھا دوں۔

یہ بھوت بھی نہیں تھا فریال کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت بالآخر باقی نہیں رہی تھی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ چار مہینے کے اندر اندر وہ زنجیر توڑ دوں گا جو برسوں سے اس کے

چروں میں پڑی ہوئی تھی۔

اس نے میرا ہاتھ چلا لیا ”ہر بات میں فائدہ نہیں دیکھنا چاہیے رفتی! بس میرا دل رکھنے کے لیے اسے پہن لو۔ نہ جانے کیوں میرا یہ اعتقاد رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور واپس آؤ گے۔ تمہیں آنا پڑے گا۔۔۔۔۔ صرف میرے لیے۔“

میں نے بڑے افسوس سے سر ہلایا ”عائشہ! یہ ظلم مت کر داپنے ساتھ۔ خدا نے اتنی خوبصورت زندگی دی ہے جنہیں۔۔۔۔۔ صورت کی اور حسرت کی۔ شرافت اور نجابت کی۔ یہ خوشحالی اور کامیاب زندگی جو قدرت کا تحفہ ہے اسے ایسے مت ٹھکراؤ۔ ایک آدمی ہوں میں ایک انجینیئر۔ مسافر۔ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر تمہاری ایک نظر کمر کے لیے چشم براہ ہیں۔“

”چھوڑو۔ یہ باتیں تو ہم کی بار کر چکے ہیں۔“ اس نے کہا اور انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی۔ ”دیکھتے ہیں کس کا یقین درست ثابت ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”بے وقوف لڑکی! میں نہیں آ سکتا۔ یہاں سے جانے کے چار مہینے بعد میں فریال سے شادی کر رہا ہوں۔“

”میں تمہاری شادی میں ضرور آؤں گی۔ تم بلاؤ یا نہ بلاؤ۔۔۔۔۔ لیکن ابھی یہ انگوٹھی تمہیں یاد دلاتی رہے گی کہ تم میرے ہو۔ میں کوئی زبردستی نہیں کر سکتی تھی تمہارے ساتھ لیکن تقدیر بعض اوقات زبردستی کرتی ہے۔ دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم آؤ گے تو مجھے یہ انگوٹھی دیکھ کر خوشی ہوگی کہ ایک مرحلہ تو میں نے طے کر لیا تھا۔ شادی سے پہلے ہی۔ دوسرا تم کو کرنا پڑا۔ انگوٹھی کی طلسماتی قوت تم کو واپس لے لائی۔“

میں نے ایک گہری سانس لی ”او کے۔ لیکن فرض کرو“ ایک لمحے کے لیے مان لو۔۔۔۔۔ کہ میں نہ آ سکا۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔“

”پھر یہ فریال کو پہنا دیا۔ اگر وہ برانہ مانے۔ اور چاہو تو میرے جانے کے بجائے اتار دیتا۔ پھینک دیتا کہیں“ وہ ایک دم ہلکی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں بے بسی سے دیکھتا رہا پھر میں آگے بڑھا۔

میں نے کہا ”عائشہ! ہو سکتے تو مجھے معاف کر دیتا۔“

اس نے اپنے آنسو پونچھے ”سوری! میں نے وعدہ کیا تھا تم سے نہ رونے کا۔“

میں نے کہا ”ایرپورٹ پر مجھے اپنی وہ مسکراہٹ دینا جو میرے ساتھ رہے۔“

”کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟“

میں نے کہا ”کاش یہ ممکن ہوتا۔“

”ممکن تو ہے۔ میری سیٹ محفوظ ہے۔ میرے پاسپورٹ پر بڑا انگ چکا ہے۔“

”ہاں۔ اگر آخری لمحے میں تمہارا فیصلہ میرے حق میں ہو جاتا تو میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاتی۔ میں نے کوئی چانس نہیں لیا تھا۔“

”تم واقعی پاگل ہو۔“

”ایرپورٹ میں صرف تمہارے ساتھ جانے کے لیے آ سکتی ہوں۔ تمہیں سی آف کرنے کے لیے نہیں۔ میں معجزات پر بڑا یقین رکھتی ہوں حالانکہ یہ معجزوں کی صدی نہیں ہے۔ اگر تم چاہو تو مجھے پک کر لیتا جاتے ہوئے“ میں تمہیں تیار ملوں گی“ اس نے کار کو ایک دم آگے بڑھا دیا۔

جب اس کی گاڑی کی ٹیکل لائٹس بھی تائب ہو گئیں تو میں پلٹا۔ وہاں مار تھا دروازے میں کھڑی پچیس پچیس رو رہی تھی۔

میں نے کہا ”اڈگا! اب تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”کتنی پیاری لڑکی ہے۔ افسوس کہ یہ زندہ نہیں رہے گی۔“

میں اسے اندر لے گیا ”کیوں زندہ نہیں رہے گی؟ کوئی غیب کا فرشتہ بتا گیا ہے تمہارے کان میں؟“

”مجھے پتا ہے وہ خود کشی کر لے گی۔“

میں نے دل پر جبر کر کے ایک معنوی قہقہہ لگایا

”مار تھا۔ یہ سب ایک رومانٹک ڈرامے کے کلائمکس میں ہوتا ہے۔ میرے جانے کے صرف دو دن بعد تم اسے دیکھنا۔ وہ نازل ہوگی۔ صرف ایک مہینے بعد وہ مجھے بھول چکی ہوگی۔ چھ مہینے بعد وہ ایک نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈانس کر رہی ہوگی اور سبکی ڈاننگ پھول پر رہی ہوگی۔“

مار تھا نے مجھے سخت ملامت بھری نظروں سے گھورا مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے شرمندہ کرنے والے الفاظ کے تیروں کا نشانہ بنائی ”کال تیل تھی۔“

میں نے گھڑی دیکھی ”اس وقت کون آ گیا؟“

”شاید کسی کو اب فرصت ملی ہو تم سے آخری ملاقات کی۔“

میں نے کہا ”آخری ملاقات ہوتی ہے ان کی جن کو صبح پچائسی دی جا رہی ہو“ اور دروازے کی طرف بڑھا۔

مار تھا نے جوتا اٹھا کے میری طرف پھینکا مگر میں بچ گیا۔ دروازہ کھولے ہی میرے ذہن کو شہید جھٹکا لگا۔

ہے۔ میں منع کروں گا تو مان جائے گی۔“
”پورٹ کر کے میرا کیا بگڑے گی، مشکل میں تم پڑ جاؤ گے۔“

میں نے کہا ”وہ تو تم نے بھی ڈال دیا ہے مجھے۔ اب میری کچھ میں ہے نہیں، آتا کہ جو لوگ پاکستان میں میرے لیے جہم براہ ہیں انہیں مطمئن کیسے کروں گا۔ کیا وہ بتاؤں گا کہ میں نے پروگرام کیوں بدل دیا؟ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ میں کب جاؤں گا۔“

”ابھی تو تم کہہ سکتے ہو کہ فلائٹ بس ہوئی۔ بعض اوقات ایک ہفتے تک کراچی کی فلائٹ پر جگہ نہیں ملتی۔ اگر اس سے زیادہ رکتا پڑے تو کوئی قائل کرنے والا جھوٹ بول دیتا۔ جھوٹ بولنا تمہارے لیے کیا مشکل ہے؟“ اشرف چپے نہ کہا۔

”ہاں آج بولنا مشکل ہے“ میں نے غنڈی سانس لی۔
”سب کے لیے ہوتا ہے بار!“ اس نے مجھے تسلی دی۔
میں نے مار تھا کی طرف دیکھا ”آج کے بعد شاید تم مجھے یہاں رکھنا پسند نہیں کرو گی۔ میرے بارے میں تم نے اپنی رائے بدل لی ہے یا تم؟“

اس نے رکھائی سے کہا ”اس میں میری کیا غلطی ہے۔ رات کا وقت نہ ہوتا تو میں کہتی کہ اپنا سامان اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنا لا حاصل ہو گا لیکن مار تھا میری درخواست ہے کہ اس بارے میں کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن تم مان لو گی کہ میرا تعلق کسی گینگ سے نہیں تھا۔ میں واقعی شریف آدمی تھا۔ جیسا کہ تم نے دو سال تک دیکھا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”میری کچھ مجھ میں نہیں آتا۔ ایسا نہ ہو بعد میں میرے لیے کوئی مشکل پیدا ہو جائے۔ تمہارے کسی معاملے میں پولیس لوٹ ہو جائے اور سراغ لگائی ہوئی یہاں آ جائے۔“

میں نے لجاجت سے کہا ”یقین کرو ایسا نہیں ہو گا مار تھا۔“

اس نے کہا ”آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“

”ایک ذاتی معاملہ ہے۔“

”ہو گا۔۔۔ لیکن یہ اس طرح میرے گھر میں طے ہو تو پھر میرا معاملہ بھی ہو جاتا ہے۔ آخر کیا جاتا ہے یہ شخص؟“
میں بڑی مشکل میں پر دیا۔ میں اپنی زندگی کی کتاب کے ورق بہت پیچھے تک پلٹ کے آٹھ سال پہلے ہونے

والے واقعات کی تفصیل بتاتا پھر میری مار تھا کی کچھ میں پکڑ آتا۔ وہ سیاہی، مذہبی اور لسانی بنیادوں پر استوار معاشرے میں دوست اور دشمنی کے اسباب کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ طبقاتی فرق کے ساتھ وہاں صوبائی تعصب بھی تھا۔ ذات برادری کا نظام تھا۔ دیہی اور شہری امتیاز تھا اور فرقہ پرستی کے جنون کے ساتھ لسانی اختلافات تھے اور میں سازشوں کی سیاست یا سیاست کی سازشوں میں الجھے رہ گیا تھا کہ سوائے جلا وطنی اور روپوشی کے میری جان بچنے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ میرے جیسے نیکروں ہزاروں تھے جو ملک سے فرار ہو گئے تھے۔ کچھ نے سیاسی پناہ حاصل کر لی تھی کچھ تعلیم اور روزگار کے بہانے باہر مقیم تھے تو کچھ غیر قانونی طور پر مختلف ممالک میں گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے اور اپنے ماضی کے آسیب سے پیچھا چھڑانے کے لیے کوشاں تھے۔

مار تھا ایک ترقی یافتہ ملک کے مہذب معاشرے میں رہتے ہوئے میرے مسائل کو مجھ ہی نہیں سمجھ سکتی تھی چنانچہ میں نے اپنی جھوٹ بولنے کی خدا اور صلاحیت اور ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے صرف ذاتی اور خاندانی دشمنی کے اسباب پر مبنی ایک ایسی کہانی کا تانا بانا کیا کہ جس کی بنیاد رزق اور زمین کے ازلی اور آفاقی اصولوں پر تھی۔ یہ کہانی میں نے نیکروں فلوں کہانیوں اور حقیقی واقعات کی اس لائبریری سے اخذ کی تھی جو میرے دماغ میں موجود تھی۔

مار تھا سیدھی سادی عورت تھی۔ میرے جذباتی انداز بیان اور درد بھرے واقعات کو اس نے بڑی دلچسپی آمیز تشویش اور ہمدردی کے ساتھ سنا اور یقین کر لیا۔ صرف یقین ہی نہیں کیا آخر میں وہ اتنی جذباتی ہو گئی کہ دکھ سے سر ہلانے لگی اور غنڈی آہیں بھرے لگی۔ اس نے کئی بار رنجیدہ لہجے میں کہا ”اوہ مائی گاڈ!“ میرے سر پر ماتا بھرا ہاتھ پھیرا اور آنکھیں بند کر کے اپنے رومن کیٹھولک عقیدے کے مطابق خداوند یسوع مسیح سے میرے لیے سلامتی مانگی۔

اشرف چپتا صرف مسکراتا رہا اور میری بے بسی کے احساس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے کام میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک ڈسے دار یاں پوری کر چکا تھا۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ سینئر تھا اور اس کی وفاداریاں غیر شرط تھیں۔ اس وفاداری کے بدلے اسے شاہانہ انداز میں جینے کی ہر سہولت حاصل تھی تاہم وہ اپنی کسی جوئیں گھٹنے خطرات کے سمندر میں رواں رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسا جواری تھا جو ہر داڑھی اپنی زندگی لگا جاتا تھا اور غلابر ہے بے حد خوش قسمت تھا کہ بارے محفوظ تھا۔ یہ تقدیر کا سمجھ

میں نہ آنے والا کھیل تھا۔ میں نے پیدائشی اور ازلی وابدی پنجیب بھی دیکھے تھے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ (پیدا ہونے کے سوا) انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا اور اس کی پاداش میں تمام عمر ہر خوشی اور کامیابی سے محرومی پر روتے رہے۔ اشرف چپتا ان کے برعکس تھا کہ اس کی خوش نصیبی کا کوئی ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اسے دیکھ کے جو خیال آتا تھا وہ بھی برعکس ہی ہوتا تھا کہ وہ نہ ہوتا تو دنیا میں میرے جیسے آن ممت لوگ کتنے کتنے ہوتے۔

میرے لیے اس کی آمدنی ہی غیر متوقع اور تباہ کن تھی جتنی کسی ہستی ہستی آبادی پر سیلاب اور طوفان جیسی آفات کا زلزلہ۔ اس نے میری پرسکون زندگی اور خوشوار مستقبل کے خوابوں میں زلزلہ برپا کر دیا تھا اور میں ہر طرف سے اندیشوں میں گھر گیا تھا۔ میری کچھ میں نہیں آتا تھا کہ اب میں ان سب کو کیسے مطمئن کروں گا جو میری داپسی کے لیے چشم براہ ہیں۔ میں کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اشرف چپتا میری راہ میں حائل ہو گیا ہے اور ابھی خود مجھے بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ کل کیا ہو گا؟ میری داپسی کب ہو گی؟ ہو گی یا نہیں ہو گی؟ ایسے کسی سوال کا جواب دینا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ مجھ پر یقین کوئی نہیں کرے گا؟ نہ میرے بچ پر نہ جھوٹ پر۔ سمجھا ہی جائے گا کہ میں بغاوت اور فریادی پر آمادہ ہوں۔ کسی نے مجھے ہکا بکا دیا ہے خود میرے شیطانی خیالات نے یا شیطان کے روپ میں مجھ پر غلبہ پانے والی کسی فرنگی حسینہ نے۔ میرا چچا فرامین گے اچھی نہیں تو پہلے ہی ہمارے موکلوں نے خبردار کر دیا تھا۔ خالو عنایت اپنا ٹوکا لگائیں گے کہ یہ تو ہوتا ہی تھا۔ عدم آباد اور دلایت جانے والوں میں سے کون لوٹ کر آتا ہے۔ اور دادی جونی اتار کے اٹھ کھڑی ہوں گی کہ اس نمونے کی یہ مجال! میں خود لاتی ہوں اسے کان سے پکڑے۔ لیکن پہلے میں فون پر بات تو کر لوں اس کے بعد ٹیلی فون کا لڑکا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گا۔ سب بولیں گے میری کون سنے گا!

دوسری طرف لندن میں آن ممت لوگ ہیں جن کو میرے نہ جانے سے سخت حیرت کا شاک لگے گا۔ فریال! فائزہ میرے ساتھ رہنے والے آفس کے لوگ! میں کیا دفعت کروں گا کتنا جھوٹ بولوں گا؟

میرے ذہن میں نفرت کا آتش فشاں بھی دھواں دے رہا تھا اور مجھے ناقابل عمل خیالات بھی اکسائے تھے کہ میں صرف سوچنے کے بجائے کچھ کروں۔ چپے کا کام تمام کر دوں

یا اس کے ساتھ جا کے چیف کو کوئی مار دوں تاکہ میرے ساتھ دنیا کو بھی ان کے شر سے نجات ملے ورنہ میں ساری عمر بلیک میل ہوتا رہوں گا۔ ان کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے غلط اور خطرناک راستے پر چلا رہوں گا اور اپنے لیے کسی کچھ نہ کر پاؤں گا۔ ترقی خوشحالی اور محفوظ مستقبل کے سارے خواب ٹھٹھل خواب ہی رہ جائیں گے اور یہ سب اس لیے ہو گا کہ میں ڈرتا ہوں۔ مجھے اپنی بزدلی پر بھی شرم آتی تھی۔ آخر مجھ میں کچھ کر گزرنے کا مجاہدانہ جذبہ کیوں نہیں ہے۔ جو ڈر کیا، سو مر گیا۔ اور یوں ڈر ڈر کے اور عمر کے جینے سے تو بہتر ہے۔۔۔۔۔

مگر جو ناممکن ہے وہ ناممکن ہے۔ میرے ایک احمقانہ قدم کا نتیجہ ان دنوں سب کو بھی جھکتا پڑتا جن سے میرا جذبات کا اور خون کا۔۔۔۔۔ پارکا اور ادراپائیت کا رشتہ تھا۔ میں ان کے ساتھ دشمنی کیسے کر سکتا تھا! اس کے علاوہ میں خود بھی تو زندہ رہنا چاہتا تھا۔

میں نے خود کو قابو میں رکھا اور یہ سوچا کہ تاامیدی لا حاصل ہے۔ ممکن ہے چیف سے ملنے میں خطرے کی کوئی بات نہ ہو۔ وہ مجھ سے صرف ملنا چاہتا ہو کچھ ہو چھٹا چاہتا ہو یا وہ میرے سپرد کوئی ایسا کام کرے جس سے میرا مستقبل متاثر نہ ہو۔ مجھے کل پرسوں یا ہفتے دن بعد جانے کی اجازت مل جائے۔ چیف بے وقف بہر حال نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کسی کی قوت برداشت کی حد کہاں ہو گی۔ میں اسے دلیل سے نہ سکتی، منت سماجت سے قائل کر سکتا ہوں۔ میں نے اس پر غور کیا مگر پھر مجھے خود ہی یہ خیال احمقانہ محسوس ہوا۔ اگر رعایت کی کوئی بات ممکن ہو سکتی تو وہ اشرف چپتا کو اس طرح میرے پاس نہ بھیجتا۔ چیف سے بات نہ کرنے میں ہی عقل مندی تھی۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر رضامندی کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اشرف چپتا کے ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

میں نے مار تھا سے کہا کہ میں جا رہا ہوں اور امید ہے فلائٹ پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اگر مقتول وجہ بتائی جائے تو ذرا ہکھٹا پہلے پہنچنے والوں کو بھی پور ڈنک کارڈ جاری کر دیا جاتا ہے۔

”بس اب جہیں کسی گھر میں جلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جا رہا ہوں اور یہ جو تھوڑی سی پریشانی جہیں ہوئی اس کی تم سے معافی مانگتا ہوں۔ امید ہے تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟ میں سب کو بتاؤں گی اور کیوں نہ

بتاؤں آخر جب اس میں نقصان کوئی نہیں۔ کیوں بلاوجہ ایک راز کا بوجھ اٹھاؤں جس کی کوئی اہمیت نہیں میرے لیے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ سب میں نہ کھنسی۔ تم چلے جاتے کھنسی خوشی اور میرے جذبات تمہارے لیے وہی رہتے جو دو سال تک تھے۔ اور یہاں سے جانے کے بعد کچھ بھی ہوتا۔ مجھے معلوم نہ ہوتا اور میں نہیں صرف محبت سے یاد کرتی۔“

”کیا اب تمہیں نفرت ہوگئی ہے مجھ سے؟“ میں نے بڑے دکھ سے کہا۔

”نفرت؟۔۔۔ نفرت کا تو کچھ یقین نہیں مجھے۔ لیکن میں مایوس ضرور ہوں اور کچھ خوف زدہ بھی۔۔۔ کہ تم پوری طرح وہ نہیں تھے جو میں سمجھتی رہی۔ دراصل مجھے یقین نہیں کہ جو کچھ تم نے مجھے بتایا وہ کس حد تک سچ تھا۔ آج کل جو ان بڑی آسانی سے جھوٹ بول سکتے ہیں اور اسے گناہ بھی نہیں سمجھتے۔“ اس نے آنکھوں میں آنے والے ایک قطرہ اشک کو انگلی سے جھک دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا رہا تھا۔۔۔ پلےز!“

اس نے سر ہلایا۔ ”جاؤ“ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔“

اشرف جیتے بے بڑا سوٹ کیس ایسی گاڑی کی ڈکی میں رکھا۔ دوسرا میں نے پیچھے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ مارچا نے میرے باہر آئی عی دروازہ بند کر دیا تھا مگر اس کا بے حد دھکی چہرہ ابھی تک میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتار آنے والے ایک قطرہ اشک نے میرے جذبات کے الاؤ کو بڑھا دیا تھا۔

”یہ بڑھیا تو پاگل ہے۔“ اشرف چیتے نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک دم اسے دبوچ لیا۔ ”یہ سب تیری وجہ سے ہوا کتے کے بچے! کیا ضرورت تھی تجھے ریوالور نکالنے کی۔۔۔ تیری اور میرے چف کی تو۔۔۔“

میری دیوانگی میں ایسی دھشیا نہ تو تھی کہ اشرف اپنی گردن نہ جھڑا سکا۔ وہ خاصا تندہرست اور قوی تھا مگر میرے ہاتھوں کی گرفت کی قہقہے کی طرح تھی اور اسٹیزنگ دھکیل کے پیچھے اس کی مدافعت محدود ہوگئی تھی۔ وہ ڈیش بورڈ کے نیچے ٹائپس چلا سکتا تھا اور اپنے جسم کو تھوڑا بہت دائیں بائیں مت دے سکتا تھا مگر اپنے دونوں ہاتھوں کی قوت سے مجھے دھیس نہیں سکتا تھا۔ اس نے بائیں بازو کی ہتھی میرے پیٹ میں ماری اور دائیں ہاتھ سے میرے بال بھی پکڑے مگر مجھے اشتعال کی شدید لہر نے بالکل پاگل کر دیا تھا۔ گالیاں دینے

کے ساتھ میں اس کے سر کو اسٹیزنگ دھکیل پر مارتا رہا۔ اچانک وہ ساکت ہو گیا۔ اس نے مزاحمت ختم کر دی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تو میں نے خود کو روکا۔ جب میں نے اپنے ہاتھوں کو اس کی گردن سے الگ کیا تب بھی وہ اسٹیزنگ پر سر رکھے پڑا رہا۔

کیا میں نے اسے مار ڈالا ہے؟ میں نے دہشت سے سوچا اور فوری طور پر اس کا ہاتھ پکڑ کے ہنسی کو محسوس کیا۔ ہنسی کی رفتار سست تھی لیکن وہ چل رہی تھی۔ اشرف چیتا صرف بے ہوش ہوا تھا۔ سانس رک جانے سے یا شاید سر کی کپا چوٹ سے۔ وہ مرا نہیں تھا اور یہ میرے لیے اطمینان کی بات تھی۔

میں نے سرگھما کے آگے پیچھے دیکھا۔ کئی میں بہت دور لپ پوسٹ کے نیچے ایک مرد اور عورت کا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ سامنے آخری حصے میں ایک شخص مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اشرف جیتے کے ساتھ ہونے والی چند منٹ کی لڑائی کسی نے نہیں دیکھی تھی اور نہ کسی نے کوئی آواز سنی تھی۔ فوری طور پر میں نے اشرف کو کھینچ کر اپنی جگہ پر بٹھایا اور سیٹ کو اتار پیچھے کر دیا کہ وہ نیم دراز نظر آنے بھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

اچانک مجھ پر بغاوت کا خیال غالب آ گیا۔ اس وقت میری بہت اور بے خونی کا گراف آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں نے مستقبل کے سارے اندیشوں کو اور چف کے احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے لندن سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک اندر کی آواز میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ یہی موقع ہے نکل جاؤ۔۔۔ دہشت گردی کے چنگل سے ورنہ مارے جاؤ گے۔ آٹھ سال کی جلا وطنی تم نے اس لیے تو قبول نہیں کی تھی کہ باقی عمر بلیک سیل ہوتے رہو۔ یہ تو بھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔ یہ لوگ تمہیں پھر دلدل میں پھینچتا جاتے ہیں۔ ان سے ڈر کر پیچھے ہٹنے سے تو یہ تمہیں دیوار سے لگا دیں گے اس لیے مقابلہ کرو۔ لوٹے کو لو با کا فتہ ہے۔ لا قانونیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اگر تمہیں بھی لا قانونیت کا ہتھیار اٹھانا پڑے تو اٹھا لو۔ خدا اور بقا کی جگہ میں غلط کچھ نہیں جو جیتا وہی سکندر۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ فلائٹ ٹائم میں اب بھی سو دو گھنٹے باقی تھے۔ اگر میں طوفانی رفتار سے گاڑی چلاتا تو آدھے گھنٹے میں ایر پورٹ پہنچ سکتا تھا مگر اس میں ٹریفک پولیس کا میرے پیچھے لگ جانا یقینی تھا۔ ایک مسئلہ اشرف جیتے کا بھی تھا۔ اس کی گاڑی کو میں پارکنگ ایریا میں چھوڑ سکتا تھا۔ گاڑی میں لیٹا ہوا وہ کسی کو فوراً نظر نہ آتا۔ میں اپنے

سیٹ کیس نکال کے باہر نکلتا اور پورٹر کے پیچھے چل پڑتا۔ ہنسی جیتے کے ہوش میں آنے یا بے ہوش پائے جانے سے پہلے جازاؤ جاتا۔

چلنکس میں نے رسک کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ہڈی کو سرسک کے کنارے کھڑا کیا۔ سوٹ کیس اٹھا کے کچھ دور گیا اور پھر پہلی کھنسی کو روک لیا۔ میں نے کہا ”میری گاڑی خراب ہوگئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ میں فلائٹ مرس کر دوں گا۔ اگر تم مجھے آدھے گھنٹے میں پہنچا دو۔۔۔“

سکھنسی ڈرائیور نے سر ہلایا۔ ”اوجی پہنچانے کو میں میں منٹ میں پہنچا دوں لیکن میرا ٹکٹ کٹ جائے گا۔“

میں نے کہا ”فرض کرو جرمائے کی رقم بھی میں ادا کر دوں؟“

”پھر فرض کیا کرنا جی! سمجھو لو آپ پہنچ گئے۔“ اس نے بڑے عزم سے کہا اور گاڑی کو یوں دوڑانے لگا جیسے اسے کار میں کا مقابلہ جیتنا ہے۔ اتفاقات خوشگوار بھی ہوتے ہیں۔ تیز رفتاری کے جرم میں اس کا چالان نہیں ہوا اور مجھے صرف کرایہ دینا پڑا۔

ایک خوش مزاج اور خوش شکل لڑکی نے میری وضاحت سکرانے ہوئے قبول کی اور مجھے بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا۔ اس کے بعد کے مراحل رکی تھے۔ فرانزٹ لاؤنچ میں پہنچ جانے کے بعد یہ ڈر ختم ہو گیا کہ اشرف چیتا یا اس کا بھوت میرے عزائم کو کام نہ بنانے کے لیے ”پکڑو پکڑو“ چلاتا ہوا میرے پیچھے نہ آجائے۔ جہاز کی پرواز کا وقت قریب تھا اور مسافروں سے اتھارسی کی جاری بھی کہ وہ جہاز کی طرف روانہ ہوں۔ میں رکے بغیر ان میں شامل ہو گیا۔

جہاز میں میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی اور میں ہتھوڑا پر پورٹ کی ساری ایکٹیوٹی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لندن ایئرکیشن پولیس کے اختیارات کیا ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ کسی بھی فلائٹ سے فرار کی کوشش کرنے والے مجرم کو جہاز کے اندر آ کے گرفتار کر سکتے تھے لیکن مجھے یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اشرف چیتا ہوش میں آجائے تو میرے خلاف رپورٹ درج کرانے اور پولیس اس کی درخواست کو رد خور اٹھنا سمجھتے ہوئے مجھے جہاز سے اتارنے کے لیے دوڑے۔ لہذا میں تو کیا وہ معمولی زخمی بھی نہیں تھا۔ اگر وہ بھلا تے ہوئے یہی بھی زبان میں کاٹا نہ ملے کی تفصیل پیش کرتا تو پولیس شاید پہلے یہ ٹیٹ کرانی کہ الپس کی چوٹ کا اثر ہے یا وہ نلے میں ہے؟

وہ ہوش میں نہ آتا اور پولیس دیکھ لیتی تو اسے پہلے

اسپتال پہنچایا جاتا اس کے باوجود اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ میں نے ہی اسے ناک آؤٹ کیا تھا تو یہ الزام اتنا سنگین بہر حال نہ تھا کہ اس کے لیے جین الا قوامی پرواز سے کسی مسافر کو آؤٹ لوڈ کیا جائے۔ اشرف چیتا کی ایک اور مشکل یہ تھی کہ وہ صرف حکم کا کلام تھا۔ اسے اپنی مرضی سے ذاتی معاملات طے کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ میرے سامنے ملے میں وہ چیف سے پوچھنے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

چنانچہ یہ معاملہ رفت کر شت ہو گیا تھا۔ ایک آواز اب مسافروں سے سیٹ بیلٹ باندھنے کی درخواست کر رہی تھی۔ جب ہتھوڑا پر پورٹ کا منظر پیچھے ہٹنے لگا تو مجھے گیا کہ جہاز ٹیک آؤٹ کرنے کے لیے چل پڑا ہے۔ میں اپنے پر دگرام کے مطابق لندن سے روانہ ہو گیا تھا۔ چیف اور اس کا پیغام بر اشرف چیتا مجھے روکنے میں ناکام رہے تھے۔ وقتی طور پر ان کی اس شکست سے مجھے بڑی طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔

آگے کیا ہوگا؟ یہ ابھی میں سوچنا بھی نہیں جانتا تھا۔ میں باہر دیکھتا رہا۔ لندن شہر کی روشنیاں آسمان کے تاروں کی طرح ہوگئی تھیں۔ میرے ارد گرد آؤٹ خراب کا اندھا میرا ہاتھ جو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ گزرے ہوئے چھ سالوں کی ہر یاد ہنوز میرے ساتھ تھی اور باہر تاریکی میں میرے تصور کے تراشے ہوئے سارے بیکر میرے سامنے ستر کر رہے تھے۔ جہاز کی رفتار سے اس کے متوازی اور میری کھڑکی کے بہت نزدیک پرواز کرتے جا رہے تھے۔ سب سے قریب عائشہ کی وہ پاگل لڑکی جس کے عشق نے الف لیلوی داستانوں سے آج کے دور کی فلموں تک مجھ کی ہر روایت کو غیر حقیقی کر دیا تھا اور مجھے دائمی شرمندگی کی آذیت میں مبتلا کر دیا تھا کہ مرد اور بڑا روایت شکن ہیرہ ہونے کے باوجود میں کتنا کم ہمت بزدل اور بے بس تھا۔

جہاز کی کھڑکی سے نظر آنے والا اس کا چہرہ اداسی اور دل شکنگی کی وہ تصویر تھی دینا کا کوئی معور کیوں پر نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ سکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے کہا ”رونی۔۔۔ میں نے آخری وقت تک تمہارا انتظار کیا۔ میں اپنا سوٹ کیس قریب رکھے کپڑے جو تے یکن کے بالکل تیار بیٹھی کال بیل کی خطرہ رہی۔ میں ناامید ہونا نہیں چاہتی تھی۔ میں یہی سوچتی رہی کہ تمہارا ارادہ بدل جائے گا۔ دنیا میں نامکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایر پورٹ جاتے ہوئے تم مجھے لے جانے کے لیے رک جاؤ گے۔ فلائٹ ٹائم ہونے تک میں نے آس نہیں چھوڑی۔ اس وقت جب تمہارا یہ طیارے نے ٹیک آؤٹ کیا ہوگا میں

محبت برقی اور اس سمت میں دیکھ رہی تھی جدھر جمیں جاتا تھا۔ شرع کی طرف لیکن وہاں سے نظر کیا آتا؟ بس میں تصور میں جمیں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری فلائٹ بس ہو جائے یا تم خود اپر پورٹ سے واپس آنے پر مجبور ہو جاؤ۔ میری محبت تمہیں مجبور کر دے، محبت مجھ سے کی طاقت رکھتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں! میں تمہارے ساتھ ہوں اور رہوں گی۔ تمہارے دل میں تمہارے خیالوں میں اور خوابوں میں جب تک ممکن ہوا۔

پھر فریال نے اسے پرے دھکیل دیا۔ ”یہ لڑکی بالآخر باگل خانے پہنچ جائے گی۔ نکھو الو مجھ سے اور اس کو ٹھکانے کا ٹھکانہ عظیم تمہارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔ تمہارے لیے تمہیر کی تلاش سے چھکارا پانا اتنا آسان نہیں ہوگا رومیو! تم نے اچھا نہیں کیا۔“

میں نے کہا ”اور کیا کرتا میں؟“
”اسے لے جاتے اپنے ساتھ اور کیا کرتے۔ وہ تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہی تھی؟“

”وہ مجھ سے مجھے مانگ رہی تھی۔“
”پھر کیا ہوا؟“

میں نے کہا ”وہ شادی کرنا چاہتی تھی مجھ سے۔“
”تو کر لیتے۔“

”پھر تمہارا کیا کرتا؟“
”میرا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بعد میں مجھ سے بھی کر لیتے۔“

”لاحول ولا قوۃ۔ ایک میان میں دو کلواریں۔“
وہ ہنسی ”محبت تو کلواریں سے تعبیر مت دو۔ گلاب سے دو۔

ایک شاعر نے کہا دو گلاب نہیں کھل سکتے۔ محبت کی جگہ دل میں ہوتی ہے اور یہ تمہارا نہیں میرا اور عائشہ کا معاملہ تھا۔ ہم گزرا کر لیتے۔ محبت میں تمہارا تو نکالنی ہی پڑتی ہے۔ دو بھوکے اگر کہیں اور خود غرض نہ ہوں تو ایک روٹی کے دو حصے کر کے کھا لیتے ہیں۔“

”دوبارہ لاحول ولا قوۃ۔ نہ میں روٹی ہوں اور نہ ڈبل روٹی۔“

وہ ہنسی ”بس میں آ رہی ہوں تمہارا سینڈوچ بنانے۔ چار بیسے ہیں تمہارے پاس۔“

میں نے کہا ”شٹ اپ!“
ایر ہو سس کا صدمہ اور غصے سے برا حال ہو گیا ”سز“

میں نے تو صرف کافی کے لیے پوچھا تھا۔“
میری وہ حالت ہوئی جیسے مجھ پر گرم پانی کے شاور سے

اچانک بج بست پانی پڑ گیا ہو ”آئی ایم سوری! ریلنگی دیری سوری۔ میں نے تم سے کچھ نہیں کہا۔“

وہ مطمئن ہو کے مسکرائی اور مجھے کافی کاگ تمہارے گلے گئی تو میں نے اپنے ستر کے پردے پر غور کیا۔ وہ نورانی چہرے اور دو چار سالہ برائی سیاہ چمکی داڑھی والا طویل قامت دلا پتلا نوجوان تھا جس کی ٹوپی کے نیچے گردن تک پہنچتے والے بالوں کے پنے جنیشلی کے ٹیل میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سر سے کی مقدار دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ جہاز کے بجائے وہ کراچی کی کسی دھنگن میں کبڑا بن کے ستر کر رہا ہوتا تو سرمہ اس کے رخساروں پر بہنے لگتا۔ اس کے چہرے پر سفید لہا دے اور شانے پر بڑے ہوئے سفید رومال کو دھک کر اپنے قوی جھنڈے کا خیال آتا تھا جو کسی کے سوگ میں سرخوش ہو۔ ایر ہو سس قریب ہی تھی تو وہ ایسے سمت کر میری طرف ہو گیا تھا جیسے اس نے غلطی سے بھی بھولیا تو اس پر غصہ واجب ہو جائے گا۔ اس نے پہلے شربت بادام طلب کیا پھر پوچھا ”لے گی اور واپس ہو کے جائے قبول کی بشرطیکہ وہ ملائی والی ہو۔ پھر وہ کسی دغلیے میں منہمک ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد بھی جہاز کے باہر آغاز سحر کے کوئی آثار تک نہ تھے۔ اچانک کھڑکی کے اسکرین پر ہاتھ کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے کہا ”یوکی بوائے! اس کے باوجود کہ تمہارے رخصت ہوتے وقت ایک افسوسناک بلکہ شرمناک واقعہ رونما ہوا میں تمہارے لیے اداس ہوں۔“

”مجھے امید ہے تم نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔“

اس نے ٹکی میں سر ملایا ”تم کو بہر حال اداس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم رات سے سب کی طرف جارہے ہو۔ تمہارے ملک میں اس وقت سورج چمک رہا ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور لوگ کسی جی کے منو بھجوں پر تاؤ دینے ہوئے ڈکاریں مار رہے ہوں گے یا آتش فشاں تہاکی کھا کے کانوں سے دھواں نکال رہے ہوں گے۔ میں لندن کے لیے اداس ہوں۔“

”تم ایک اچھے مستقبل کو بالو گے جس میں تمہارے لیے ہی نہیں۔ سب کے لیے خوشی ہے۔ اصل بات یہی ہے جو صرف اپنی خوشی کے لیے سوچتا ہے اسے اگر خوشی لے ڈالو جوری مٹی ہے اور عارضی۔“

میں نے ایک بج بست آج بھری ”میری خوشی ایسی ہی ہے ماز تھا! اس کو مجبور کیا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خوشی مکمل جب ہوتی ہے جب مجھے مرضی کے خلاف واپس نہ جانا پڑتا۔ جب ایک رقیب رومیا کو جہنم رسید کیے بغیر مجھے فریال مل جاتی

جب عائشہ کی اور پرفریٹ ہوتی۔“
”اور تم پاکستان کے وزیر اعظم ہوتے۔ وہ طرے سے بولی۔

میں نے کہا ”بد دعائیں کیوں دیتی ہو۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں اس ازلی وابدی شلٹ میں جکڑ گیا ہوں۔“
”کون سی ازلی وابدی شلٹ؟“

”دو۔۔۔۔۔ دوسرا دیکھو روت۔۔۔۔۔ دو عورتیں ایک مرد۔ جس کے بغیر کوئی کہانی ہی نہیں بنتی۔ نہ فلم کی نہ ناول کی اور نہ ڈرامے کی۔ پہلے تو یہاں بڑی آسانی تھی۔ دوسرے دیکھو اس سونٹ کے سامنے آ جاتے تھے اور خاتون بڑی دلچسپی سے فائٹ دیکھتی رہتی تھیں اور شہید محبت پر لعنت بھیج کے لمبی خوشی فارغ کی ہو جاتی تھیں۔ نہ قانون کو اعتراض ہوتا تھا نہ معاشرے کو۔“

”اب ہم منہمک ہو گئے ہیں۔“
”ہاں۔۔۔۔۔ اس کر لیتے ہیں یا دوسرا عشق شروع کر دیتے ہیں مگر ہم بے چارے شرق کے رہنے والے۔۔۔۔۔“
”تم کیا کرتے ہو؟“

میں نے کہا ”ہماری فلموں کے آخری سین میں بڑی خوش اسلوبی سے معاملہ منٹ جاتا ہے۔ دن کو گنتی ہے ایسی پیمپٹی کہ وہ کان پکڑ کے ناک سے فرش پر گریں کھاتا ہے اور تو یہ کرتا ہے۔۔۔۔۔ کہ ہائی زندگی اللہ اللہ کرتے گزارے گا۔ خواتین دو ہوں تو ایک راجہ عشق میں قربان ہو جاتی ہے یا کر دی جاتی ہے۔“

”مگر تمہاری زندگی فلم نہیں ہے۔“
”رائٹ۔۔۔۔۔ یہی تو میرا ایہ ہے۔ اس بات کے امکانات خاصے روشن ہیں کہ میرا انجام دن جیسا نہ ہو۔ وہ بن جائے ہیرو۔ اور محبت کا جنازہ جا رہا ہو! اور وہ سہرا باندھے گا۔ ہر سواری بیٹا باجے کے ساتھ ہیرو دن کو لے جا رہا ہو! مصافحہ کرتا مجھے رونما آ رہا ہے۔“

وہ بولی ”اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔“
میں نے کہا ”مار تھا۔“ بڑی کمپلیکسڈ جوشن ہے۔ شلٹ کا ایک ضلع ختم کرنا ہو تو تم کیسے کر گئی؟ مجھے تو نکالا نہیں جاسکتا ورنہ بعد میں دونوں خواتین کیا گٹل کے روئیں گی میرے مرقہ پر۔ فریال اور عائشہ میں سے کسے قربان کیا جاسکتا ہے؟“

اس نے سوچ کے کہا ”میں تو سمجھتی ہوں جمیں پر کینیکل ہونا چاہیے۔ قربانی کی ضرورت ہے۔ جب تمہارا مذہب اور معاشرہ دو کی اجازت دیتا ہے۔“

”پلیز۔۔۔۔۔ شٹ اپ!“
”آخر کیا بات ہے سزا“ ایر ہو سس نے برہمی سے کہا ”میں نے خالگ کی تو واپس مانگا ہے؟“
”شرمندگی سے میری حالت خیر ہو گئی میں نے ہلکا کے کہا۔۔۔۔۔ ریلنگی سوری۔۔۔۔۔ میں نے واقعی آپ سے نہیں کہا۔“

”دھم لے کر مجھے گھورتی ہوئی چلی گئی۔ اسے یقین ہوگا کہ میں نے جہاز پر چڑھنے سے پہلے ہی بہت چڑھائی تھی۔ میرے معطر پردے نے مجھے دکھ سے دیکھا۔“ آپ نے مجھے شٹ اپ بولا تھا بھائی جی؟“
”ابھی تک تو نہیں بولا بھائی جی! میں نے کہا۔“
”وہ مزید دنگی ہو گیا۔“ آپ میری نقل اتارتے ہو بھائی جی!“

”میں آپ کی کوئی چیز نہیں اتار سکتا بھائی جی!“ میں نے اس کی ٹوپی سے جوتی تک دیکھا ”آپ کچھ اتار سکتے ہو؟“
”کیا مطلب بھائی جی؟“ وہ ہنسی سے بولا۔

میں نے رازداری سے کہا ”آپ جن اتار سکتے ہو؟“
جہاز اتار سکتے ہو میرا قرض اتار سکتے ہو۔“

”میرے پیر صاحب سب اتار سکتے ہیں۔“ اس نے بڑی عقیدت سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو سامنے تھیں قطاریں چھوڑ کے کونے میں خالی سیٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی عظیم قوت کے باعث وہ ایک بہت بڑا منکا نظر آتا تھا جس پر مٹی کا پیلا اونڈھار کھدایا گیا ہو۔

میں نے کہا ”اچھا۔۔۔۔۔ یہ پیر ہیں؟“
اس نے مؤذبانہ کہا ”ہاں بھائی جی!“
”اگر یہ پیر ہیں تو مشکل اور بد کہاں ہیں؟“ میں نے کہا۔

اگلی سیٹ پر ایک خاتون کو اس مکالمے نے اتنا منظور کیا کہ وہ کلکٹلا کے پس بڑی۔ بھائی صاحب غیظ و غضب سے تھر تھر کانپنے لگے اور مجھے یوں گھورتے رہے جیسے اپنی نظروں کے جلائی لیزر ہے میرے دل کے ٹکڑے کر دیں گے اور جگر کو چھلنی کر دیں گے۔ ظاہر ہے اس کے بعد ہمارے تعلقات انڈیا پاکستان جیسے ہو گئے۔

میرا بانی ہنر سکون سے گزارا۔ میں پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور اس بار اسکرین پر اشراف چیتا نمودار ہوا۔ اس نے کہا ”نیچے پڑا ہے تم نے بہت بھوکا کیا۔“
میں نے کہا ”تم کون سی اچھائی کر رہے تھے میرے

“ساقی”

”فرار ہو کے تم کہاں جا سکتے ہو قاتل! تمہیں پھانسی ضرور ہوگی۔“

میں نے فوراً تردیدی بیان جاری کیا ”میں نے تمہیں قتل نہیں کیا۔“

”پھر کیا جارج بش نے کیا؟ لندن پولیس میری لاش دریافت کر چکی ہے اور تمہارا سراغ بڑی آسانی سے لگا لے گی۔“

”بکواس بند کرو نہ میرا ایسا ارادہ تھا اور نہ تم مرے تھے“
تم صرف بے ہوش تھے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔“

”چیف سخت متعطل ہے۔ اس کو احکامات کی خلاف ورزی بالکل پسند نہیں اور بغاوت کرنے والوں کی کیا سزا ہوتی ہے؟ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”میں نے مزید بیک میل نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“
وہ ہنسا ”اور چیف اس فیصلے کے آگے سر جھکا دے گا۔
اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے“ کراچی پہنچے ہی معلوم ہو جائے
گا۔“

میں نے کچھ تشویش کے ساتھ کہا ”کراچی پہنچ کے کیا ہوگا؟“

”کارکن آئیں گے تمہارا استقبال کرنے۔“ بھولوں کے ہارے کڑچیف کی طرف سے جنہیں تھمہ جرات دیا جائے گا۔ بڑی شاندار تقریب ہوگی تمہارے والدین بھی مدعو ہو گئے۔ جنہیں اپنا بھائی یاد تو ہوگا۔۔۔ وہ بھی بہت بہادر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اتفاقاً رائے سے اس کی قبر پر نام کے ساتھ شہید لکھوا دیا تھا۔“

میں نے کہا ”تم مجھے خوف زدہ کر رہے ہو؟“
 ”تمہارے ماں باپ زیادہ خوف زدہ ہیں۔ کسی نے
 کچھ دیر پہلے انہیں فون کر کے کہا تھا کہ میت منہ بہر ساڑھے
 تین بجے کراچی پہنچے گی، وصول کر لیں۔“
 ”تم؟ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

وہ شیطانی انداز میں ہنسا ”ہم نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کفن تیار رکھیں اور اپنے پہلے شہید بیٹے کی قبر کے ساتھ ہی دوسرے کے لیے بھی جگہ رکھ لیں۔“

میں چلایا "نہیں... یہ ظلم مت کرو۔ ان کا دنیا میں اور کوئی نہیں" بہت دکھ اٹھائے ہیں انہوں نے زندگی میں وہ جوڑھے ہیں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "تت تت یہ تو تمہیں کوئی احسانہ قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا نیکی

“!”

”سٹاپ!“ میں نے غرا کے کہا۔

ایر ہو سنس نے کہا ”آپ نے دیکھا..... پہلے بھی دوبار
یہ سوری کہہ چکے ہیں.....“

اس کے ساتھ آنے والے اسٹیو مڈ نے کہا ”آخر آپ کی پر اہلم کیا ہے سر! اس نے یہی تو پوچھا تھا آپ سے کہ آپ بریک فاسٹ کیا لیں گے؟“

میں نے اپنا سر پکڑ کر کہا "اب میں کیا بتاؤں کہ میری پرانی باتیں سچ تھیں۔ کوئی ایک ہفتہ بتاؤں..... تم اسے ایک نفسیاتی مسئلہ سمجھ لو۔ میں خود کا ہی کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو شٹ اپ کہا تھا میں نے پہلے بھی۔"

اسٹیو رڈ نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا ”اس سے مسائل تو دوسروں کے لیے پیدا ہوتے ہیں سر! خیر“ فرمائیے
 ناشتا کیا لیں گے آپ؟“

میں نے اپنے پڑوسی کی طرف دیکھا ”وہی جو بھائی جی
 لیں گے۔“

”انہوں نے تو لاہوری ناشتا مانگا تھا۔ سری ہائے آپ
 انگلیش لیس گے یا کانٹی نینٹل؟“ ایری ہوٹس نے ناگوار سے
 کہا۔

میں نے کہا ”آپ ٹاس کر لیں“ چاند تارا ہو تو انگلیش
 رنر نہ کانٹی نینٹل اور سکھ کھڑا ہو جائے تو دونوں۔“

وہ چلی گئی۔ اس کے لیے یہ تجربہ نیا نہیں تھا۔ زیادہ تر پاکستانی مسافر بین الاقوامی پرواز پر بھی ایر ہوسنس سے پھنجر جہاز کو اپنا قومی فریئر سمجھتے ہیں۔ صورتِ شکل اور لباس سے وہ بھی تعلیم یافتہ یا غلط آتے ہیں ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو لندن میں رہ کر انگریزی بولنا بھی سیکھ جاتے ہیں لیکن انگریزی بڑھ نہیں پاتے۔ میرے پیشِ ہم وطنوں نے ہمارے یہ جہتی شروع کر دی تھی کیونکہ مفت کی بھی اور اب ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

بھائی جی سے میرے تعلقات میں مزید کشیدگی آ گئی۔ اسے جبر صاحب سے جدائی بھی تیار ہی تھی۔ ناشائستہ نے پہلے ہی اس نے مسافر خانہ - غارت کاری کے عمل سے ایسا انتظام کر لیا کہ اسے جبر صاحب کے ساتھ والی سیٹ مل گئی۔ جبر صاحب کے ساتھ درمیان والی سیٹ پر ایک مسلسل اور بولنے والا جین تھا۔ آخری کھڑکی والی سیٹ پر اسی کی پرسنل سے تعلق رکھنے والی مگر شراب حینہ تھی جو کسی بات پر ہمیشہ سے تھپڑ رسید کر چکی تھی۔ جینی خود تخت سے بچنے کے لیے سیٹ بدلنا چاہتا تھا۔ جبر صاحب نے اس کی جگہ لے لی اور

لو جو ان مرد کو اپنی جگہ بنایا تاکہ حسین کا کالا جادو اس کے اٹھانے کے بعد دوبارہ اثر انداز نہ ہو۔ جیسی نے میرے ساتھ بیٹھنے کے بجائے پچھلے حصے کی ایک خالی نشست کو ترجیح دی جہاں سے دوش دردم فربہ تھا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بھائی جی کی ٹھنکی برداشت کی جاسکتی تھی، کسی شرابی کی کبواس نہیں۔ شاید اس کو دوسرا بھینس میں رسید کرنا۔

نہ آتا تھا کسی ہوئی کی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہماری سرکری روایات کے مطابق صبح کا ب اور صبح صادق کا تکلف کے بغیر سورج نے پہلو کیسے میں درپیش لگائی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ماحول میں کسی بھی لڑکے کو اکتھار عشق سے شب و صبح تک کی مسافت طے کرنے میں مہینوں اور بعض اوقات برسوں لگ جاتے ہیں، دیارِ مغرب میں پہلی ملاقات سہراہ ہوتی ہے تو چوبیس گھنٹے بعد جملہ عروسی میں ان کے درمیان اختلافات اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ صبح وہ طلیعہ کی اختیار کرتے ہیں اور رات ہی اپنی راہ لیتے ہیں۔ برق رفتاری کے اس دور میں ہر چیز بہت فاسٹ ہے۔ فاسٹ فوڈ، فاسٹ میوزک، فاسٹ ٹریول، فاسٹ زندگی اور فاسٹ موت۔ وقت بھی دگنی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ غلام کا دورانیہ تو ساڑھے سات گھنٹے تھا لیکن ساڑھے تین بجے لندن سے اُڑ کے میں ایک بجے کراچی میں نہیں اُڑ سکتا تھا۔ وہاں جہاز کی آمد کا وقت چھ بجے تھا نہ پنجہ میری گھڑی کو ساڑھے سات گھنٹوں میں ساڑھے بارہ گھنٹے آگے بڑھنا تھا۔

دن چڑھنے کے بعد جذبات کی دھند صاف ہوئی تو محفل کی روشنی میں بہت سے اندیشے میرے حواس پر یلغار کرنے لگے اور خطرات بن کے میرے خیالات پر یوں غالب آنے لگے جیسے اقل سے اعلیٰ والا بادل دیکھتے دیکھتے گھٹا بنے اور مارے آسمان کو ڈھک لے۔ میں نے تصور میں فریال کو بھی دیکھا تھا اور عاشق کو بھی۔ مار تھا سے بھی باتیں کی تھیں اور اشرف چیتے سے بھی۔ وہ میرے خیالوں کی بازگشت تھی جو ان کی باتوں میں سنائی دیتی تھی۔

☆☆☆

اشرف چیتے کی آمد میرے لیے ایک وارننگ کی طرح تھی۔ بے شک تنظیم سے میری عملی وابستگی چھ سال پرانی بات ہے مگر بات پرانی ہونے سے تعلق ختم نہیں ہوتا۔ مجھ پر آج بھی ان کا کنٹرول ہے۔

تنظیم اپنے کارکنوں پر ایسے ہی کنٹرول حاصل کرتی تھی۔ چلیں اگر پانچ دہن رکھنے والے لو جو ان کو پرنسپل فزول یا اتھنل سے غلام بنایا جاتا تھا۔ لالچ سے آگے

بڑھایا جاتا تھا اور برین واش کیے جانے والے بے یو جوائن تنظیم کے مقامی کے حاضر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ انہیں بھی بتایا جاتا تھا کہ ایک خوش حال مستقبل کی جدوجہد ایک جہاد ہے۔ اصل اہمیت مقصد کے حصول کی ہے اور اس کے لیے قربانی ناگزیر ہے۔ دنیا میں عزت سے جینے کا حق مانگنے سے نہیں ملتا۔ یہ حق چیمپنا پڑتا ہے۔ فائدہ کی جگہ میں اطلاقیات کے اصول، امن پسندی اور شرافت و انسانیت کے نعرے دھوکا ہیں۔ طاقتور اور عیار دشمن کے وہ ہتھیار ہیں جو وہ حریف کو کمزور بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

لاکھوں نوجوان کارکن ترغیب کے اس جال میں گرفتار ہوئے۔ ہزاروں نے قیادت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جان تک قربان کر دی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہٹلر نے نسلی برتری کے غرور میں جتلا کر کے پوری جرمن قوم کو دنیا پر حکومت کے جنون میں جتلا کر دیا تھا۔ میرے جیسے نوجوان تمام اخلاقی اور قانونی حدود کو بھلا گئے۔ انہوں نے تنظیم کی قوت کے لیے جائز و ناجائز ذرائع سے مالی وسائل فراہم کیے۔ ان دشمنوں پر حملے کی جن کی تنظیم نے نشاندہی کی۔ سیاسی حربوں کو نفل کیا اور ان کی الماک تباہ کیں۔ یہ سب ایک زہریلے نفرت انگیز پروپیگنڈے کا سر تھا کہ وہ انکھوں پر پٹی باندھ کے اپنی قیادت کے اشاروں پر سب کچھ کرتے رہے۔ کچھ عیار اور موقع پرست نوجوان مالامال ہو گئے۔ زیادہ ہوشیار جیسے معدود پر فائز ہو گئے۔ وہ خوف اپنا مستقبل تباہ کر بیٹھے۔ وہ بلیک میل ہوئے، ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ان کے خاندان برباد ہو گئے۔ تنظیم ایک ایسی مافیائی جو نہ روگردانی برداشت کرتی تھی اور نہ غداری۔

میرا بھائی ایسی ہی دوسری خطرناک عظیم کال کار بن گیا تھا جو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی منافرت کے جذبات کا سہارا لیتی تھی اور اپنے فریق کے سوا تمام مذاہب اور تمام عقائد کے ماننے والوں کے خلاف جہاد پراکسیا تھی۔

ہر سال جب اکیس فروری کی تاریخ آتی تھی تو ہمارے گھر کو ایک سوگوار کی گھبراتی تھی۔ ابا خاموش اور ذہنی طور پر غیر حاضر محسوس ہوتے تھے۔ وہ بھول جاتے تھے کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے یا اخبار پڑان کی نظر ایسے ہی ٹھہر گئی ہے جیسے کلاک میں سیکنڈ کی بڑی سوئی چلتے چلتے رک جاتی ہے اور وہ پڑھ کچھ بھی نہیں رہے ہیں۔ اماں سنہ پھیر کے بھانے بھانے دوپٹے سے آنکھوں کو صاف کرتی تھیں۔

دوپہر تک چھت پر درد دھیا چاند نیاں بچھ جاتی تھیں۔

حادثے کے چھ ماہ بعد ایک رات ڈاکو اس کی ماں کو اٹھالے گئے۔ قدرے ایک رشتے کے بچانے گھر کی ہر چیز پر قبضہ کر لیا اور قدرے کے ساتھ ایسا خالنا نہ سلوک کیا کہ ایک رات وہ گھر سے فرار ہو گیا۔ وہ لاہور آ گیا اور دورا میں اس نے داتا صاحب کے لنگر سے پیٹ بھر کے گزاریں۔ دن بھر وہ لاہور میں آوارہ گردی کرتا تھا اور کام تلاش کرتا تھا لیکن کسی جان پہچان اور تعارف کے بغیر کوئی اسے رکھنے کو تیار نہ تھا۔ اسے کوئی کام آتا بھی نہ تھا۔ اگر کسی ہوٹل یا کیراج میں کام مل جاتا تو اس کے رہنے کا ٹھکانا بھی ہو جاتا۔ سب سے آسان کام اسے بھوکہ مارنا تھا لیکن اس میں ہمت نہ تھی کہ کسی کے سامنے غرور کرے اور ہاتھ پھیلائے۔ تیسری رات وہ پھر اپنی جگہ پر سونے پہنچا تو ایک بٹے کئے شخص نے اسے مارا اور باہر نکال دیا۔ ”روز آ جاتا ہے یہاں جیسے اس کے باپ کا بیٹا روم ہے۔“ اس نے کہا اور قدرے کو روٹ دیکھ کے بولا ”دس روپے لیتا ہوں میں۔ تو پانچ دے سکتا ہے تو سو جاو نہ بھٹ اُدھر سے۔“

تیسری رات قدرے مینار پاکستان والے گراؤٹ کے باہر فرش خاک پر لیٹا جہاں لاتعداد بے گھر بڑے تھے۔ وہ دن بھر بھٹکتا پھرنے سے سخت تھکا ہوا تھا۔ اسے فوراً نیند آ گئی۔ صبح کسی نے غصہ مار کے اسے جگا دیا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھا تو اسے آس پاس بہت سے لوگ اور کچھ پولیس والے نظر آئے۔ پھر اس کی نگاہ اسے قریب سوئے ہوئے لوگوں پر پڑی تو خوف سے اس کی آنکھیں پھرا گئیں۔ تین افراد اپنے ہی خون میں لتھڑے ہوئے بڑے ترقی سے اٹلے سیدھے بڑے تھے۔ ان سب کے سر پھٹے ہوئے تھے اور زمین ان کے لبو سے لال ہو رہی تھی۔ کسی نے سوتے میں ان کے سروں کو بھاری پتھر مار کے چل دیا تھا۔

دو دن دروازہ اور اذیت سے چلائے ہوں گے لیکن قدرے کی نیند اتنی گہری تھی کہ اس نے کچھ نہیں سنا۔ آس پاس کے دوسرے لوگ شاید اٹھ کر بھاگ گئے تھے یا ان کے قریب کوئی بھی نہیں تھا۔ پولیس قدرے کو پکڑ کے تھانے لے گئی اور دونوں تک اس سے پوچھ گچھ کرتی رہی۔ نہ وہ مرنے والوں کو جانتا تھا اور نہ اس نے مارنے والوں کو دیکھا تھا مگر پولیس یہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ اسے دھشتانہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ قدرے نے بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ تیسری رات اس کا رشتے کا چچا آ گیا۔ قدرے نے سوچا کہ اب تھانے سے اس کی گلو خلاص ہو جائے گی۔ باہر نکل کے وہ چچا کو بتا دے گا کہ وہ وہاں اس کے ساتھ گھر جانے کے لیے تیار نہیں لیکن اسے

نہیں اور کچھ برف کی وجہ سے گاڑی کی رفتار پوری طرح کنٹرول میں نہ آئی۔ ڈرائیور نے دیکھ لیا تھا کہ سڑک پر کوئی چیز نہیں ایک بچہ پڑا ہوا ہے۔ بریک لگانے سے پہلے تو رک جئے لیکن کار آہستہ آہستہ چلتی گئی۔ آخری وقت میں بچے کو بچانے کے لیے ڈرائیور نے کار کا رخ بدلا اور اسے دائیں جانب کے پیار سے ٹکرا دیا۔ اس سے کوئی بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا صرف سپر اور ہونٹ نیچر ہا ہو لیکن بچے کی جان بچ گئی۔

وہ کوئی بہت غریب سا اور کمزور بچہ تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ سڑک پر اتنی برف باری میں کیسے آ گیا تھا اور کیوں بے ہوش پڑا تھا۔ ابا نے ڈرائیور کے ساتھ مل کے بچے کو گاڑی میں ڈالا اور سہل میں لیٹ دیا۔ گاڑی کی ہینڈلش میں سے ایک نوٹ کے بند ہو گئی تھی۔ باہر ڈرائیور نے صرف ایک ہینڈلش پر راولپنڈی تک کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کیا۔ اس بچے کی زندگی بھی کہ ڈرائیور نے اسے بردت دیکھ لیا اور بجائے میں بھی کامیاب رہا۔ اگر وہ سائیڈ میں کہیں پڑا ہوتا تو شاید نظر بھی نہ آتا اور وہیں پڑے پڑے اکڑ کے مرجاتا۔ ابا اس رات کے سڑک کو یاد کر کے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ صرف اس بچے کی نہیں، ہر سب کی زندگی خدا کو منظور نہ ہوئی تو کار حادثے کا شکار ہو جاتی۔

راولپنڈی پہنچنے ہی ڈرائیور اس بچے کو ہولی فمیلی اسپتال لے گیا۔ ابا اور امان رات بھر آئی سی یو کے باہر بیٹھ کر بیٹھے رہے۔ میں بھی اسی بیچ پر کسٹل میں لیٹا ہوتا۔ صبح ڈاکٹر نے بتایا کہ بچے کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ اس کے جسم پر کپڑے ناکافی تھے اور وہ خوراک کی کمی کا شکار تھا۔ شام تک اس کی حالت مزید بہتر ہوئی۔ اگلے دن اسے وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔

ابا کے ایک دوست گورڈن کالج میں ٹیچر تھے اور وہیں سیٹل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا اور بڑی بھاگ دوڑ کی۔ تین دن بعد وہ بچہ بھی ان کے گھر آ گیا۔ یہ بچہ قدرے تھا۔ اس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ وہ مری کے علاقے کا رہنے والا نہیں تھا جہاں پٹوہاری زبان بولی جاتی ہے جو غالباً پنجابی کی سب سے مشکل بولی ہے۔ وہ لاہور فضل آباد کے علاقے کی زبان بولتا تھا۔

جو کہانی اس نے سنا دی وہ انتہائی لرزہ خیز تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام قدرے احمد ہے۔ اس کا باپ ایک ٹرک ڈرائیور تھا وہ ایک سال پہلے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اسی

دکھ سمجھنے والے بھائی نے یہ ساری ذمے داری قبول کی اور 1974ء میں میرے والدین کو یارک بھیجے۔ وہاں دو سیٹے تک ٹیٹ ہوئے۔ پھر ابا کو واپسی کی اجازت مل گئی اور انہوں نے ڈیوٹی جوائن کر لی۔ امان کا علاج شروع ہوا تو سب سے فعال کردار خود بھائی نے ادا کیا۔ کسی کامیابی کی پیش گوئی نا ممکن تھی۔ چھ ماہ بعد امان بھی لوٹ آئیں۔ میری ممانی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر حالات سازگار نہ ہوتے تو وہ ایک بار ماں بن سکتی ہیں۔

حالات کو سازگار رکھنے میں مشیت ایزدی شامل رہی اور 1976ء میں میری پیدائش ہوئی۔ امان پاکستان میں تھیں لیکن ان کی تمام پرورش باقاعدگی سے نیویارک ارسال کی جارہی تھیں۔ میری پیدائش سے ایک ماہ قبل ماموں اور ان کی بیوی پاکستان آ گئے اور انہوں نے ڈیوری کا یہ کس اپنی نگرانی میں کیا۔ میری پیدائش بالکل نارمل طریقے سے ہوئی مگر جاتے وقت ماموں نے یہ کفرم کر دیا کہ یہ میڈیکل سائنس کا انجازِ سیمانی نہیں رحمت پروردگار کا کرشمہ ہے اور ایسے کس تو ہزاروں ہوتے ہیں لیکن کامیابی برسوں میں ایک ملتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میری پرورش جتنی احتیاط اور جان سوزی کے ساتھ ہوئی اس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ مجھے بتایا گیا۔ دسمبر 1980ء میں ہم برف باری دیکھنے مری گئے۔ میری عمر اس وقت صرف چار سال تھی۔ تین دن مری میں قیام کے بعد ابا کا خیال آگے تھپکا کل تک جانے کا تھا اور پھر تھپکا کل سے ایبٹ آباد کے راستے پنڈی واپس پہنچنے کا مگر برف باری اتنی زیادہ ہوئی کہ تھپکا کل سے آگے راستے بند ہو گئے۔ ابا نے واپسی کا فیصلہ کیا اور کرائے کی ایک کار لے لی۔ روانہ ہوتے ہوئے شام ہوئی۔ اس زمانے میں راولپنڈی تک دور دراز سڑک اتنی اچھی نہیں تھی جتنی آج ہے۔ اندھیرا ہو جانے کے بعد آمدورفت بھی کم ہو جاتی تھی۔ ڈریہ ہوتا تھا کہ برف باری شدید ہوئی تو رات کا سفر خطرناک ہو جائے گا۔

مکلی بکلی برف مری سے روانہ ہوتے وقت بھی پڑ رہی تھی اور آسمان ابراؤد تھا مگر مری کا رہنے والا ڈرائیور بہت تجربہ کار تھا۔ اس نے نسل دی کہ ٹرک کی کوئی بات نہیں۔ ٹھوڑا کھلی پہنچے تک برف باری میں اضافہ ہو گیا مگر ڈرائیور نے گاڑی نہیں روکی۔ اس نے کہا کہ آٹھ دس میل بعد کم بلندی پر موسم اتنا خراب نہیں رہے گا۔

ایک ہینڈلش کی روشنی میں ڈرائیور کو سڑک کے عین درمیان کوئی چیز دکھائی دی۔ اس نے بریک لگائے مگر کچھ

نمازِ ظہر سے پہلے برائی نرودے کی دیگ آ جاتی تھی۔ پھر مدرسے کے مولوی صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ نمودار ہوتے تھے۔ وہ فاتحہ خوانی کرتے تھے۔ ابا مگم ٹوٹی اڈھے غلام میں گھورتے رہتے تھے۔ امان کی آنکھوں سے آنسو رخساروں پر بہتے جاتے تھے اور جب مولوی صاحب کلمہ شہادت پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیرتے تھے تو وہ ہچکچوں سے روتے ہوئے اٹھ جاتی تھیں۔ کھانے کے بعد مدرسے کے طلبہ عصر تک قرآن خوانی کرتے تھے۔ پھر میں ابا کے ساتھ قبرستان جاتا تھا۔ ہم قدرے احمد شہید کی قبر پر بھول ڈال کے اور اگر قبریں لگا کے دعا مانگتے تھے اور گھر لوٹ آتے تھے۔ رات تک اس باقی فضا کا اثر کچھ زائل ہونے لگتا تھا اور امان اباندری کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ وہ کیا تھا؟ کیسا تھا؟ آج ہوتا تو یوں ہوتا اس کی بیوی ہوتی۔ بچے ہوتے۔ اگلا دن معمول کے مطابق نذر تھا۔ زینت چودہ سال سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ قدرے مری میں مجھ سے صرف چھ سال بڑا تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کی عمر پچیس سال ہوتی لیکن انہیں سونوے میں اس کا قتل ہو گیا تھا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی اور قدرے کی تیس سال۔ میں عالم شباب میں وہ مریا۔ بے شک اس وقت تک امان ابا نے اس کی شادی کے بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا تھا لیکن ان کا یہ دکھ اپنی جگہ تھا کہ اٹھائیس سال کی عمر میں وہ بھولانے کے ارمان پورے کرتے تو آج شاید وہ خنسنے سے بچوں کی گفتاریوں سے بے گھر آباد ہوتا۔ ایک پوتا اور ایک پوتی ان کے تصور میں جنم لینے سے قبل ہی بے وجود ہو گئے تھے۔

یہ شخص اتفاق ہے کہ اس کا نام ہمارے خاندان کے ناموں جیسا تھا۔ قدرے احمد نہ میرا سا بھائی تھا اور نہ سوتیلا۔ میرے والدین کی شادی 1965ء کی جنگ کے فوراً بعد ہوئی تھی۔ دس سال تک وہ اولاد سے محروم رہے اور ظاہر ہے اس دوران دوادارو سے دم در دوادارو جاتک جو کچھ ان کے اختیار میں تھا سب کیا مگر قدرت کے فیصلے کے آگے کسی کی نہ پہنچی۔ میرے ایک ماموں عمرہ دراز سے امریکا میں تھے اور گائیکو کولمبی میں اچھی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی شادی ایک امریکن ڈاکٹر سے ہوئی جو اسی شعبے میں بڑی کامیاب سر جھن تھی۔ انہوں نے میرے والدین کے علاقے کی فائیں منگوا لیں اور یہ کس ڈاکٹروں کے ایک ہینٹل کے سامنے رکھا۔ ہینٹل نے کسی واضح یقین دہانی کے بغیر انہیں امریکا بلوایا۔ ابا کی چھٹی نہیں لے سکے تھے اور آمدورفت یا علاج کے اخراجات بھی ان کی استطاعت سے باہر تھے۔ بہن کا

قدیر نے کنفیوز ہو کے پوچھا ”کیا چلا رہے ہیں جی؟“
پاکستان نے کہا ”وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔ تم ایک
ذہین اور باہمت لڑکے ہو۔ انشا اللہ بہت ترقی کرو گے۔ میں

تم سے رابطہ رکھوں گا۔“

”آپ ٹیکم صاحبہ سے کیا کہیں گے کہ پستان صاحبہ؟“
”اس کی تم فکر مت کرو۔ عورت کی فطرت کو میں سمجھتا ہوں۔ اور وہ تو یہی ہے میری جیسے پورا یقین ہے کہ زویورات اسی کے سوٹ کس میں مل جائیں گے اور وہ بڑی معصومیت سے سر پر ہاتھ مار کے کہیں گی کہ میں بھی تو ہلکوں ہوں خود ہی احتیاط سے کپڑوں کے نیچے رکھے ہوں گے اور بھول گئی۔ لیکن ایسا ہمارے واپس کراہی جانے کے بعد ہوگا۔ ابھی تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر آیا ہوں۔ میں اس بے قصور ویر کو بھی رہائی دلا دوں گا اور ہم آج ہی واپس چلے جائیں گے۔“
قدیر خاموش ہو گیا۔ خود اس کی سمجھ میں یہ بات۔۔۔۔۔ آ رہی تھی کہ دریا میں رہ کر مجھ سے بیر نہیں رکھا جاسکتا۔ کہ پستان کی بیوی نہیں چاہتی تو اس کے گھر میں رہنا خطرناک ہوگا۔

کیپٹن نے اپنے کزن کے نام مختصر سار قد لکھا اور اس کے پیچھے نام بتا کر کہ قدیر کے حوالے کر دیا۔ ”راولپنڈی میں اس کو تلاش کرنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔“
قدیر نے وعدہ لے لیا۔ ”آپ فون تو کر دیں گے ناں؟“
”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ اور میں تم سے بھی فون پر بات کرتا رہوں گا۔“ کہ پستان نے کہا اور جب سے اپنا ہوا نکالا۔ ”اس وقت میرے پاس صرف چار ہزار روپے ہیں۔ یہ رکھ لو یہاں کسی سے بچھو لینا بس کاڈا کھر ہے اور جو دین تیار ہو اس میں بیٹھ جانا۔ ٹھیک ہے خدا حافظ!“
قدیر نے گاڑی کو موڑ کاٹ کے غائب ہوتے دیکھا اور پھر بس کے اڈے کی طرف چل پڑا۔ اڈے سے ایک دین تک نکل رہی تھی۔ ایک شخص نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ ”پنڈی جانا ہے کا کا؟“

قدیر صورت سے ہی بہت پریشان اور خوف زدہ لگتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”دوسری دین تک جائے گی؟“
”اس کی سواریاں پوری ہونے میں دیر لگے گی۔ کیا پتا رات ہی ہو جائے۔ جلدی جانا ہے تو میری گاڑی میں بیٹھ جا۔ میں پنڈی جا رہا ہوں مگر منت میں نہیں لے جاؤں گا؟ پیسے ہیں ناں۔“

قدیر نے سرخ رنگ کی خیر کار کو دیکھا اور سر ہلایا۔ ”کتنے پیسے ہوں گے کی؟“
”چل تو دین کا کرایہ ہی دے دینا۔ تو آگے بیٹھ جا۔“
تین بندے پیچھے ہوں گے۔“

قدیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دس کے بجائے میں منٹ گزر گئے۔ ڈرائیور بدستور آوازیں لگا رہا تھا۔ ”چلو ایک سواری پنڈی!“ جبکہ اسے تین مسافر درکار تھے اور شام ہو جانے کے بعد پنڈی جانے والوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔ جو کہ گاڑی کو مسافر آتے تھے وہ بس میں بیٹھ جاتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد قدیر نے بے چینی سے کہا۔ ”اور کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا کی؟“

وہ قدیر کو گھر کے بولا۔ ”بہت جلدی ہے تو دھائی سو کال میں تجھے لے جاتا ہوں۔“

قدیر نے چار میں سے ہزار کا ایک نوٹ الگ کر کے ڈرائیور کی طرف بڑھادیا۔ ”ٹھیک ہے اب تم چلو۔“
نوٹ دیکھ کے ڈرائیور کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوئی تھی اسے نہ قدیر نے دیکھا اور نہ وہ اس کو خطرے کی علامت سمجھ سکتا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اشارت کی اور بولا۔ ”پنڈی میں کہاں جانا ہے کا کا؟“

قدیر نے کہ پستان کا دیا ہوا پرچہ اسے دکھایا۔ ”اگر تم مجھے اس پرچے پر پہنچا دو تو بڑی مہربانی۔۔۔۔۔“
ڈرائیور نے ایڈریس دیکھا۔ ”یہاں تو میں بھی رہتا ہوں کا کا کی؟“ ہم تو پڑوسی ہیں۔ بھی دیکھا نہیں تجھے۔“
قدیر نے کہا۔ ”یہ میرا گھر نہیں ہے۔“

ڈرائیور نے اس کے خوف زدہ لہجے پر غور کیا اور پھر اس کی صورت پر نظر آنے والی بحرمانہ گھبراہٹ کو دیکھا۔ اسے وال میں کچھ کالا نظر آیا۔ عموماً گھر سے فرار ہونے والے لڑکے ایسے ہی سب کی نظروں میں آ جاتے ہیں۔ دس بارہ سال کا ایک لڑکا جو مری کار بنے والا بھی نہیں تھا اور جس کی جب میں چار ہزار روپے بھی تھے فرار ہو کے کہاں جا رہا تھا؟ شاید وہ کسی ٹورسٹ فیکٹری کا ملازم تھا جس کو چار ہزار کی رقم چوری کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی اور اب وہ پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا تھا۔ اس نے بڑے دوستانہ اور ہمدرد لہجے میں دوبارہ سوالات کیے تو قدیر نے سب اٹھل دیا۔

ڈرائیور نے اندر اچھل جانے کے بعد گاڑی کو ایک ہوٹل کے سامنے روک دیا جہاں آنے جانے والے اپنی گاڑیاں دھو اتے تھے اور کتنی دیر میں وہ چائے پیتے تھے۔ کام کرنے والے لڑکے پہاڑی چشموں کے پانی سے گاڑی چمکا دیتے تھے۔ مگر یوں میں پنڈی سے آنے والی گاڑیاں غنڈی کی جاتی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد وہ پھر روانہ ہوئے تو پہاڑوں پر رات

آہستہ آہستہ اندر اچھل چکا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی اور زینک بالکل موقوف ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے ڈکی سے مکمل نکالا اور اڑھانے کے بہانے قدیر کو تباہ کرنے کے لیے اس پر بال کی طرح پھینکا دیا۔ قدیر اس کا مقابلہ یوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک غصہ ڈرائیور نے گاڑی کو بونٹ اٹھا کے کھڑا کیا اور قدیر کو ایک چٹان کے پیچھے لے گیا۔

چندہ منٹ بعد وہ قدیر کو بے ہوش چھوڑ کے اور اس کے ہار ہزار جب میں ڈال کے واپس لوٹ گیا۔ قدیر کو کچھ دیر بعد ہوش آیا تو وہ گرتا پڑتا سڑک تک پہنچا اور کسی گاڑی کے انظار میں بیٹھ گیا۔ سخت ترین سردی میں جب برف باری شروع ہوئی تو اپنی جسمانی بدحالی کے باوجود اس نے راولپنڈی کی طرف پیدل چلنا شروع کر دیا مگر دو چار کلومیٹر کے بعد اس کی قوت برداشت ختم ہو گئی اور وہ سڑک پر ہی گر پڑا۔ جہاں سے ہم نے اسے اٹھایا۔

قدیر کو اسپتال سے ابائی کے دوست کے گھر لانے کے بعد یہ ساری صورت حال سامنے آئی تو پریشان بی بی پیدا ہو گئی کہ اب قدیر کو کہاں بھیجا جائے؟ اس کے پاس وہ پرچہ بھی نہیں تھا جس پر وہ نام پتا درج تھا۔ وہ ابیں قیقل آباد جانے کے لیے گرتا پڑتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ پولیس کے نام سے بھی وہ زور دے ہو جاتا تھا۔ ابائے اسے پولیس کے پر کرنے کی اور پورٹ لکھوانے کی تجویز یکسر مسترد کر دی۔ لاکھ دوست نے تجویز دی کہ اسے عظیم خاندان اسکول کی انجمن تفس الاسلام بھیج دیا جائے لیکن اس کی اماں نے شدید جذباتی مخالفت کی۔ بالآخر ابائے اسے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا اور قدیر سے پوچھا گیا تو اس نے بھی آمادگی کا اظہار کیا۔ اس نے چند روز میں ہماری تار داری اور بے غرض ہمدردی دیکھ لی تھی۔

کراچی آنے کے بعد چند روز قدیر کو صحت کی بحالی کے لیے آرام کرنے اور گھر کے ماحول سے مانوس ہونے کا موقع دیا گیا۔ ابائے اسے اعتماد اور اماں نے پر تحفظ شفقت کا احساس دلا یا اور ایک ہفتے بعد وہ ہماری فیکٹری میں شامل ہو گیا۔ اس کے نئے کپڑے بنائے گئے۔ نئے جوتے بہت اور کتنا میں لے کر وہ اسکول جانے لگا۔ اسے اور مجھے ایک ہی بیڈروم میں اٹھا کر دیا گیا اور میں اسے بھائی کہنے لگا۔ ابائے معاملے میں سادہ عقائد تھے کہ کسی بھی معاملے میں مجھے اور سوتیلے اور اپنے ہائے کے جذبات کا خفیہ مسافر بن بھی محسوس نہ ہو۔ میرے ساتھ چاہے زیادتی ہو جائے قدیر کو اس کا احساس بھی نہ ہو۔ اگلے تین برسوں میں قدیر نے حیرت انگیز نتائج حاصل

کیے۔ اس نے میٹرک میں اے دن گریڈ حاصل کیا اور اس کی خواہش پر ابائے اسے کمارس کالج میں داخلہ دلوا دیا حالانکہ اماں تو روایتی انداز میں اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔ قدیر ایم بی اے کرنا چاہتا تھا یا چارٹرڈ اکاؤنٹ بننا چاہتا تھا۔ ہم آپس میں اچھے دوست بھی تھے اور بھائی بھی۔ قدیر ایک خوش مزاج اور مہذب لڑکا تھا۔ اسے فٹنس کے مطابق کپڑے پہننے اور بال پٹانے کا شوق تھا جو اس کی عمر کے لحاظ سے ایک فطری بات تھی۔ وہ باپ میوزک سنتا تھا اور کرکٹ کھیلتا تھا۔ اس کے دوست بھی بہت تھے۔

وہ انٹر کا امتحان دے چکا تھا اور سولہ سال کا تھا جب اس کی زندگی کا دھارا اچانک بدل گیا۔ اس کے خیالات و نظریات میں بڑی انقلابی تبدیلی رونما ہوئی اور یہ سب ان تین ماہ میں ہوا جب وہ فارغ تھا اور نتائج کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا کوئی دوست یا واقف اسے دین کی تبلیغ کے نام پر ایک مخصوص فرنیچر کے عقد کا درس دینے والی جماعت میں لے گیا۔ اس نے درس سنے اور اس جماعت کا لٹریچر پڑھا۔ فرقہ پرستی کے جذبات کو ہوا دینے والوں نے قدیر کے ذہنی جھکاؤ کو تازہ کیا تھا۔ وہ ناچنے ڈنوں کو اپنی راہ پر لگانے کا ہنر جانتے تھے۔ چند ہفتوں میں انہوں نے قدیر کی برین واشنگ کر دی۔

ظاہر ہے اس تبدیلی سے ابائے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کے سمجھانے کا اٹنا اثر ہوا۔ قدیر نے صاف کہا کہ ہم سب گمراہ ہیں اور اگر وہ راہ راست پر جا رہا ہے تو اسے روکنے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ وہ گھر چھوڑ کے چلا جائے گا۔

قدیر کی یہ دھمکی جذباتی بلک میلنگ کے مترادف تھی۔ اماں اور ابائے اچھا سمجھتے تھے۔ ”نہ لے“ تاہم ابائے کی تشویش پر قرار رہی۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ قدیر کو اس راہ پر لگانے والے کون ہیں مگر نہ ان سے بحث کی جاسکتی تھی اور نہ انہیں قانونی طور پر روکنا جاسکتا تھا۔ جب انٹر کا رزلٹ آیا تو ایک بار پھر قدیر نے بہترین نمبر حاصل کیے مگر اس وقت تک وہ چارٹرڈ اکاؤنٹ بننے یا ایم بی اے کرنے کا خیال ترک کر چکا تھا۔

ابائے کیا کرتے انہوں نے قدیر کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لے۔ بے شک ایم بی اے نہ کرے بلکہ اسلامیات میں ایم اے کرے مگر وہ ناکام رہے۔ میرے کمرے میں بی بی دی تھا اور کمپیوٹر تھا۔ ٹیک تھا اور لہو دھب کے دیگر اسباب تھے۔ تصویروں والے رسالے تھے اور انتہائی غیر شرعی بلکہ کفرانہ ماحول تھا چنانچہ اس نے اپنا

عروسی جہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں لمبی نالی والا پرانے دتوں کا ایک ریوالتور تھا۔ پھر دوسری طرف کے دروازے سے فریال نمودار ہوئی۔ وہ بھاری سرخ عروسی جوڑے اور زیورات میں لدی پھندی ہوئی تھی مگر اس کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی لمبی نال والا ریوالتور تھا۔

میں چلا کے کہتا ہوں "یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟" اچانک آج پر میرا دوست یوسف کی داڑھی ٹوٹی اور لباس شرعی میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نکاح رجسٹر ہے اور دوسرے میں سیٹی۔ وہ سیٹی بجا کے کہتا ہے "نیکے پتر.....! اضطرب مت کر۔ آج فیصلہ ہو جائے گا۔ ایک ہوگی حیرتی منکوحہ..... دوسری مرحومہ۔"

میں کہتا ہوں "یہ کیسا فیصلہ ہے؟" "دعویٰ جو مرد کرتے تھے۔ جب ایک عورت کے لیے ڈوئل ہوتا تھا تو ایک مارا جاتا تھا، دوسرے کی شادی ہو جاتی تھی۔ یہاں دو عورتیں ہیں اس لیے فیصلہ روائی طریقے پر ہوگا۔" وہ پھر سیٹی بجاتا ہے "چلو بھئی! اپنے اپنے نشان پر..... خواتین! دل آف دی گیمز معلوم ہیں ناں آپ کو؟ دونوں کو اس نشان سے پلٹ کے دس قدم دور جانا ہے اور پھر ایک ساتھ پلٹ کے فائر کرنا ہے رائف.....! اب میں کتنی شروع کرتا ہوں دن..... نو..... ٹھہری..... فور..... فائیو....." میں چلاتا ہوں "یوسف! کیا تو پاگل ہو گیا ہے؟" یوسف کتنی جاری رکھتا ہے "سکس..... سیون..... ایٹ..... ٹین....."

میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ میرے دل کی دھڑکن رک جاتی ہے۔ سانس رک جاتی ہے۔ ان میں سے کون شہید محبت ہوگی؟ کون میری شریک حیات ہوگی؟ فریال یا عائشہ؟ آف..... کاش میں نے اس کر لیا ہوتا۔" میں انتظار کرتا ہوں مگر دھماکا سنائی نہیں دیتا۔ بہت دیر بعد میں آنکھیں کھول کے دیکھتا ہوں۔ نکاح خواں آج پر اکیلا کھڑا ہے۔ وہاں نہ عائشہ ہے اور نہ فریال۔ میں کہتا ہوں "یوسف! وہ کہاں ہیں؟"

یوسف افسوس سے سر ملاتا ہے۔ "نیکے پتر! فریال کو لے گیا مفدر سلطان مرزا۔ عائشہ کو لے گئی اس کی ماں تو بھی گھر جا۔ جاہلی حضراتوں پر آنسو بہا کے سوا۔ اسی لیے کہتا تھا تجھ سے کہ دونوں سے شادی کر لے۔ ایک پاکستانی! ایک دلاچی۔ ایک لاہور میں! ایک لندن میں۔ ایسی زبردست بیویاں ہوتیں تیری کہ زباندہ شک کرتا مگر تو نے نہیں مانی اب تو لوٹ جا اپنی اس عہد آزادی کی طرف جو تیرے نصیب میں لکھی تھی

تجھ سے کہتا ہے "یہ میں کیا بنا سکتا ہوں۔ اپنی کوتاہی اور بانی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے کوئی ڈراما کیا ہوگا۔" میں پتہ میرے جھوٹ پر کتنا دلاؤ لگا کرے گا؟ یہ سوچ کے میں ہنسنے لگا ہوں۔ میرے قریب آ کے سوال کیا "آپ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں سر؟" میں نے اپنی پسند بتادی "سب سے زیادہ سرسوں کا پھل"۔ "نئی کی روٹی اور مکھن۔ اس کے بعد....." اس کی مسکراہٹ ایک توری میں بدل گئی "میرا مطلب تو یہ تھا کہ میں نے پاکستانی کھانے پیش کیا ہیں؟" میں نے سوچ کے کہا "کیا چینی کھانے سے پیٹ بڑھتا ہے؟"

"آف کورس! اینڈ یو دل لائیک اٹ۔" "اوکے۔ ایک پاؤ چینی لے آؤ اور ایک چمچ۔ میں چینی کھاؤں گا؟" وہ بعد میں مجھے شوگر ہو جائے۔" اس نے اپنی لمبی کور کو رکھ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد مجھے پانی پونڈے لگے جو بھینا بہت اچھا تھا اور مجھے بول کی بہت تھی۔ کھانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر کے قیلولہ فرمانے کی کوشش کی مگر میرے خیالات کے کورے بے مہار ہو کر ہرست میں دوڑ رہے تھے۔

غیم غود کی کے عالم میں میرے اندیشے بڑے اوٹ بدایات لگتی ہیں کی کہ بغاوت، حکم عدولی اور غداری۔ اب تک تنظیم ہائی فائیو کی خواب بن کے سامنے آئے تھے۔ پہلے سین میں کلکاشی دربار تھا۔ چیف تخت شاهی پر شہنشاہ الگبر کی طرح رہا۔ وہ حکومت کی تصویر بنایا تھا اور ایک گلاب کے بھول کو دیکھتا تھا۔ دو جھنڈی غلام لگی تھواریں اٹھاتے مجھے چھینٹے ہوئے اٹھتے ہیں۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں اور ہاتھوں میں لکڑی۔ تمام اہل دربار یہ عبرت آموز منظر سکوت کے عالم چیف کو قائل کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا کہ میرے حالات بہتر ہیں۔ اب مجھے تنظیم کے لیے خدمات سرانجام دینے کی اجازت دے دیجئے۔ کیا تادوا قائل ہو جاتا۔

میں سخت اطمینان میں تھا کہ اب تنظیم کی پالی کمان کے سامنے اپنے طرز عمل کی کیا وضاحت پیش کروں گا۔ پانچ سال میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ کیوں نہ میں مانا مگر جاؤں کہ اشرف چیتا مجھ سے ملا ہی نہیں۔ اگر وہ ایسا ہے تو بکواس کرتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چیف مجھے غلام کرے اور میں نہ جاؤں؟ مجھے اس کا کوئی پیغام نہیں ملا تھا۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق لندن سے پاکستان کے روانہ ہو گیا۔ اشرف چیتا کو کس نے ناک آؤٹ کر کے سزا

گئی تھی کہ میں ایک مافیا کا آلہ کار بن چکا ہوں اور میرے لیے اس کی حالت کے جال سے رہائی ممکن نہیں رہی۔ نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کی اور مافی کو بہت جیسے چھوڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب سے کسی برائی زنجیریں زنجیر خوردہ ہو کے ٹوٹ چکی ہیں اور میں مستقبل کے فیصلے کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ خود میرے والدین کو یقین آ چکا تھا کہ اب میری واپسی منکوحہ سے پاکستان میں وہ میرے لیے کوئی بڑا کام دیکھ سکے تھے۔ میں عزت شہرت اور دولت کے سارے خوابوں کی تعمیر کر لیکن اشرف چیتا کی آمد نے میرے خوابوں کی تعمیر کے شیش محل پر ایک چٹان لڑھکا دی تھی۔

جہاز نے نصف سے زیادہ مسافت طے کر لی تھی۔ لندن بہت پیچھے رہ گیا تھا اور جیسے جیسے کراچی قریب آ رہا تھا اطمینان پر یہ احساس غالب آ رہا تھا کہ یوں لندن سے ہو کے میں نے کوئی مفکندی نہیں کی۔ بے شک لندن میں اشرف چیتا کو ناک آؤٹ کر کے میں نے یہ ثابت کر کے کوشش کی تھی کہ میں ایک آزاد ملک کا آزاد شہری ہوں۔ مجھے قول و فعل کی خود مختاری حاصل ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ یقین ایک سراب ثابت ہو رہا تھا۔ اصل خطرہ تو پاکستان میں درپیش تھا۔ اب تک تنظیم بدایات لگتی ہیں کی کہ بغاوت، حکم عدولی اور غداری۔ اب تک تنظیم ہائی فائیو کی خواب بن کے سامنے آئے تھے۔ پہلے سین میں کلکاشی دربار تھا۔ چیف تخت شاهی پر شہنشاہ الگبر کی طرح رہا۔ وہ حکومت کی تصویر بنایا تھا اور ایک گلاب کے بھول کو دیکھتا تھا۔ دو جھنڈی غلام لگی تھواریں اٹھاتے مجھے چھینٹے ہوئے اٹھتے ہیں۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں اور ہاتھوں میں لکڑی۔ تمام اہل دربار یہ عبرت آموز منظر سکوت کے عالم چیف کو قائل کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا کہ میرے حالات بہتر ہیں۔ اب مجھے تنظیم کے لیے خدمات سرانجام دینے کی اجازت دے دیجئے۔ کیا تادوا قائل ہو جاتا۔

میں سخت اطمینان میں تھا کہ اب تنظیم کی پالی کمان کے سامنے اپنے طرز عمل کی کیا وضاحت پیش کروں گا۔ پانچ سال میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ کیوں نہ میں مانا مگر جاؤں کہ اشرف چیتا مجھ سے ملا ہی نہیں۔ اگر وہ ایسا ہے تو بکواس کرتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چیف مجھے غلام کرے اور میں نہ جاؤں؟ مجھے اس کا کوئی پیغام نہیں ملا تھا۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق لندن سے پاکستان کے روانہ ہو گیا۔ اشرف چیتا کو کس نے ناک آؤٹ کر کے سزا

کمر الگ کر لیا۔ مگر میں کوئی فاضل بیڈروم نہیں تھا۔ اس نے اٹھا ٹھکانا اسٹور میں بنایا۔

پھر ایک بار ہم نے اسے ایک احتجاجی جلوس میں آگے آگے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں لاکھی تھی اور وہ اپنی عمر کے نو جوانوں کے ساتھ گزرتی ہوئی گاڑیوں پر لاکھی بارہا تھا اور ان کے شیشے توڑ رہا تھا۔ یہ احتجاج ایک عالم کے قتل کے خلاف تھا۔ وہ رات کو لوٹ کر گھر نہیں آیا تو باپ اس کو تلاش کرنے گئے اور وہ بالآخر ایک تھانے کی حوالات میں ملا۔ ابانے بڑی بھاگ دوڑ اور رشوت دے کر اسے چھڑا دیا۔ ابانے پاس ایک چسما بھی حرام کی آمدی کا نہیں آتا تھا مگر حرام کھانا ان کی مجبوری تھی۔

قدر اتنا سرکش اور برعزت تھا کہ اسے روکنا ٹوکناسی پاگل کتے کی دم پر پاؤں رکھتے سے کم خطرناک نہ تھا۔ اماں اب سخت بے بسی ہو گئے تھے۔ شاید میں ایسا کرتا تو وہ مجھے گھر سے نکال دیتے مگر قدر چلا جاتا تو ان کی ساری محنت پر پانی بھر جاتا۔ وہ ایک امید پر سب برداشت کر رہے تھے۔

لیکن یہ امید لا حاصل رہی اور بالآخر ان کی نیکی ہی ان کی سزا بن گئی۔ قدر اس انجام کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے تصور سے ان کے حواس کم ہو جاتے تھے مگر یہ ناگزیر تھا۔ بالآخر ایک دن وہ نامعلوم دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ تین موٹر سائیکلوں پر آنے والے نقاب پوشوں نے اسے ہر طرف سے گھیر کر بھون ڈالا۔

میری وجہ تھی کہ جب چار سال بعد میں ایک انقلاب پسند تنظیم کے جذباتی نغزوں سے متاثر ہوا تو میرے والدین گھبرا گئے۔ والدین بڑے معصوم اور بے خبر لوگ ہوتے ہیں اور اپنی اولاد کے بارے میں ہمیشہ خوش گمانی کا شکار رہتے ہیں۔ میرے بارے میں بھی انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ قلندہ اور نعرے مختلف سہی لیکن میں قدر کا انجام دیکھنے کے باوجود خود بھی ایسے ہی راستے پر چل پڑا ہوں۔ وہ اپنے یقین کو دین سمجھتا تھا اور میرے سامنے دنیاوی کامیابیوں کا پرکشش جال پھیلانے والے سیاست کے بازگیر تھے۔ انہوں نے میری آنکھوں میں خوشحال مستقبل کے خواب بھر دیے تھے اور جدوجہد کے راستے پر مجھے آگے بڑھا دیا تھا۔ جب تک میرے والدین کو کچھ معلوم ہوتا، میں بھی اسی راستے پر اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ میرے لیے واپسی اپنے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ابانے بلاناخر انتہائی قدم اٹھایا اور مجھے اپنے گھر ماحول معاشرے اور ملک سے کاٹ کے جلا وطن کر دیا۔ اس وقت تک خود میری سمجھ میں یہ بات آنے

کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ داپس آ گئے۔“
میرے دماغ میں خطرے کی تھنی گونجنے لگی ”تمہیں اس
میں کون سی اچھائی نظر آتی ہے؟ کون ہو تم آخر.....؟“

اس وقت تک ہم کسم پاش میں پہنچ گئے تھے۔ اس نے مسکرا کر کہا ”کیا والدین کے پاس اور اپنے وطن لوٹ آنا اچھی بات نہیں ہے رفیق صاحب!“ پھر دہیزی آے آگے بڑھ گیا۔ ہمارے درمیان بہت سے دوسرے مسافر حائل ہو گئے اور میرے لیے اس کا راستہ روکنا ممکن نہ رہا۔ اس کے پاس اضافی سامان کو کوئی نہیں چھوٹا چھوڑ دے بلے بلے ڈگ بھرتا باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اپنے سامان کے احتیاط میں رکنا پڑا۔

کشم کے ایک خزانہ نظر آنے والے افسر نے بڑے معنی خیز لہجے میں سوال کیا ”صرف دو سو کس ہیں آپ کے؟“ میں نے کہا ”ابھی تو بھیج آیا ہے نہیں“ آپ نے دیکھ لیا؟“

”ہمیں بہت کچھ پتا ہوتا ہے سر! چھ سال باہر رہ کے آئے ہیں آپ!“

میں نے کہا ”پھر آپ کے خیال میں میرے پاس کتنے سوٹ کیس ہونے چاہئیں؟ کوئی فارمولا ہے آپ کا؟ جو چھ سال باہر رہے اس کو جو ضرور دلانے چاہئیں۔“

پیچھے سے ایک شخص نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا
 ”آپ اس کہینے شخص کے منہ نہ لگیں۔ چڑ گیا تو آپ کو بہت
 پریشان کرے گا۔“

”کیسے پریشان کرے گا؟“ میں نے اناڑی پن سے پوچھا۔ ”موسٹر تھے ہوتے ہیں جی ان کے پاس۔ سب سے پہلے تو آپ کا سارا سامان کھلوائے گا۔ ایک ایک چیز باہر کھانے کو دے گا۔“

مجھے کچھ پریشانی ہوئی ”میں نے تو بڑی مشکل سے پیک
 کیا تھا سارا سامان دوسوٹ کیسوں میں۔“

اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”آپ کے سامان میں کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں ہے نا؟“

میں نے کہا ”ہیر وئن یہاں سے جاتی ہے۔ لندن سے کوئی کیا لا سکتا ہے۔“

”آپ نہیں جانتے.....منوعہ اسباب کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اگر انہوں نے کچھ نکال لیا۔“

میں نے برہی سے کہا ”کہاں سے نکال لیا“ جب ہوگا
 ہی نہیں۔“

”ان کے پاس تو ہوتا ہے ناں سر! آپ کیسے انکار کریں

پچیس سال کی درمیانی عمر کا دراز قد اور صحت مند شخص تھا جو
ظاہر چوبیس گم چبانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

اپنی سیٹ پر دوبارہ بیٹھ جانے کے بعد مجھے یہ خیال
آئے گا کہ وہ شخص لندن سے میرے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔
بلکہ وہ میرے بھی بعد آیا تھا۔ حالانکہ میں مقررہ وقت کے کافی
پروردہ بعد پہنچا تھا۔ وہ میری طرف اسی وقت دیکتا تھا جب
ایر ہوٹل میرے پاس آئی تھی لیکن اس سے پہلے یا اس کے
بعد بھی امروہہ یاہ جنسنے کے پیچھے سے مجھے گھورتا رہا تو مجھے
معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بالکل فارغ تھا۔ اس نے نہ کوئی
خبر اٹھایا تھا اور نہ رسالہ۔ شک کرنے کی کوئی وجہ بھی مقول
نہ تھی لیکن میں عجیب سی بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ شک کے
گلے مرھلے میں مجھے اس کی صورت بھی مانوس محسوس ہونے
لگی اور میں سوئے گا کہ ایسا کیوں ہے؟

اس وقت کوئی جواب میری کچھ میں نہیں آیا مگر کچھ دیر بعد یہ ثابت ہوا کہ دینی غلطی مجھسی حس کی وارنک خواب میں الہام سب کے جیسے کچھ ہونا ضرور ہے۔ ماہرین انبیات کے نزدیک لاشعور سے بھی بیخودت الشور ہے۔ تاریک خانہ میں میں تمام عمر کے وہ تجربات محفوظ رہتے ہیں جن کو بظاہر ہم بھول جاتے ہیں۔ مجھ اپنا ک کوئی لائن بل اٹھے تو کوئی جہرہ کوئی نام کوئی بات کوئی احساس شعر فقر یا خوشبو چاک ذہن میں یوں آ جاتے ہیں جیسے پرانی الہام اٹھاتے ہوئے کوئی تصویر نکل کر گر جائے۔

میراثک بھی ہے سبب نہیں تھا۔ کراچی پہنچنے کے بعد سبب میں جہاز سے اتر کے اپنے برف کیس اور شوولڈر بیگ کے ساتھ مسافروں کی ایک لمبی قطار میں چل رہا تھا تو وہ پیچھے سے قدم بڑھاتا ہوا آیا اور میرے ساتھ چلے لگا۔ اس کے کندھے پر بھی ایک بیگ تھا جو میرے بیگ سے ٹکرایا اور نیچے لڑنے لگا تھا کہ میں نے سنہال لیا۔

”آئی ایم سوری!“ اس نے رسماً کہا۔

میں نے بھی رسی جواب دیا ”کوئی بات نہیں۔“

”آپ رفیق احمد ہیں ناں...؟“ اس نے کہا۔

میں چونکا ”ہیس..... لیکن آپ کون ہیں“ میں پہچانا
 ”میں۔“

وہ مسکرایا ”کیسے پہچان سکتے ہیں۔ شاید ایک بار ہی اوقات ہوئی تھی۔ دسے میں اکثر آپ کو دکھاتا تھا۔“

میں نے کہا ”کہاں..... پاکستان میں“ امریکا میں یا
 لندن میں.....؟“

اس نے میرے سوال کو زیادہ اہمیت نہیں دی ”جگہ سے

”ارے شہسوار مجھ کو بھی اتنا ہو سکتا ہے تمہارا بیٹا جو راجا ہوتی۔“

میں نے طنز سے کہا ”ہاں..... دس ہزار کی رقم کو“

”وہ بلا معاوضہ بھی سب کچھ کرا سکتے ہیں۔“
میں نے کہا ”تم اپنے ماضی کی کس غلطی کو بھگت رہے ہو؟“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "نہیں۔ غلطی میرے بھائی نے کی تھی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

مجھے اس کی بے بسی پر ترس آیا۔ بہنوں کی وجہ سے مجھ کو اکثر ٹھیک مہل ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ الٹا معاملہ تھا۔ بھائی کے اعمال کی سزا بہن کو بھی پڑ رہی ہے۔ وہ دو مسافروں نے شاید مجھ پر رشک کیا ہو کہ انھیں کھاس نہ ڈالیں اور ان پر ہوس میرے پاس آ کے بچھ کر بیٹھی اور انہوں نے فرض کر لیا ہو گا کہ وہ میری کنزن ہے یا میرے اس کے بھائی سے ناجائز مراسم ہیں۔ اس کی اور میری پریشانی کو کون کچھ تھا جو وہ سنا سنا ہی تھی۔

کراچی تک صرف ایک گھنٹے کی پرواز باقی رہ گئی تھی میرے لیے اجا یک خطرناک جنگل شروع ہو گیا تھا۔ بہ محتاط اور لائق کے انداز میں واٹس روٹ تک آتے جا۔ میں نے تمام مسافروں کی صورتوں کو دیکھا کہ کس کی صورت پر میری حالت میں دلچسپی کے آثار ہیں اور کون اپنی بہانہ پڑا کر تے ہوئے میری بے چارگی کے تماشے سے لطف اندوز ہو رہا ہے؟

معلوم نہیں کیوں مجھے ایسی ہیئت میں مخالف سے
کھڑکی کے ساتھ بیٹھ ہوئے تھے۔ میں ہلک ہو گیا کہ سیاہ چٹا
کے پیچھے سے اس کی نگاہیں میرا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔
اس ہلک کی واحد وجہ سیاہ چشمہ نہیں تھا۔ جہاز کے اندر
وجہ نہیں تھی اور وہ فلک کا چشمہ بھی نہیں تھا۔ کچھ لوگ کہتے
کی خاطر فوٹو سٹوڈیو یا فوٹو رازن لینز والے چشمے استعمال کر
ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کم روشنی میں اور ان
دو شفاف رہتے ہیں اور باہر جاتے وقت چشمہ بدلنا پڑتا ہے۔
چند سیکنڈ میں شفاف چشمے سیاہ ہو جاتے ہیں۔

اس شخص کا حلیہ چلی قدرے عامیانه تھا۔ سرخ
لی ڈھیلی سی ٹی شرٹ، جس پر آنچائی مارن منرو ایک
اور سنسنی خیز پوز میں نظر آ رہی تھی۔ جینز اور جیکٹ، ہینر اسٹ
میں اس نے شاہ رخ خان کو کالی کیا تھا حالانکہ اس کا
روپ اور چہرے کے نقوش جانی لیور جیسے تھے۔

تھی، مونی کالی بھینس.....“

میرے ساتھ والی سیٹ پر سے ابرہوٹس نے مسکرا کے کہا "آپ کو سوری کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ غائب کوئی موروثی بیماری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ مگر ٹکیر سے بھی یہی کہہ دیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ نہ جانے کب اور کیوں میرے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھی تھی۔ ”وہ..... دراصل مجھے نیند میں پونے کی عادت ہے..... اور چلنے کی بھی۔“

”جہاز کا دروازہ بند نہ ہوتا تو آپ بحرِ اکاٹل میں اتر جاتے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کرتے کیا ہیں؟“

میں نے کہا ”عموماً وہ سب جو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔“

وہ مسکرائی ”میرا مطلب تھا آپ کوئی ایکٹر ہیں یا ماڈل..... ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی دیکھا ہے؟“

میں نے کہا "اس کے دو بہترین اور مقبول عام جوابات ہیں۔ ایک یہ کہ شاید ہم جھپٹے جنم میں ملے تھے۔ دوسرا یہ کہ ہم خوابوں میں مل چکے ہیں۔ اصولاً یہ سوال مجھے کرنا چاہیے تھا۔" اس نے میری طرف جھک کے کہا "مجھے ایک پیغام دینا تھا۔"

میں نے کہا "..... یہ بھی مجھے کہا تھا۔ پیغام ہمیشہ
لو کے کسی طرف سے دیا جاتا ہے۔"

"دل پولیٹیزسٹ اپ" اُس نے مسکراتا جاری رکھا "جو
بات میں کہنے دالی ہوں وہ سن کے تم چوکو گے نہیں۔ تم میری
طرف دیکھتے رہو گے۔"

”آٹھ گھنٹوں میں آٹھ گھنٹوں ڈال کے۔“
 ”اس فلائٹ پر کوئی شخص ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون
 ہے۔“
 ”بچ کے بعد جب میں ٹرائی پر خالی تھے لے کر گئی تو
 ایک ٹرے میں برتوں کے نیچے سے مجھے ایک پیغام
 ملا۔۔۔ اور میں ہزاروں کے کا ایک چیک!“

میں نے اسے غور سے دیکھا ”پیغام میرے لیے تھا؟“
 ”نہیں۔۔۔ اور چپک میرے لیے۔“ وہ بولی۔
 ”کہاں ہے وہ پیغام؟“ میں نے کہا۔

”وہ میں نے ضائع کر دیا... کیونکہ مجھے اس کی تائید تھی۔ مضمون اس کا یہ تھا کہ فرار ہو کے تم کہیں نہیں جا سکتے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں“ کراچی میں چیف کا انتظار کرو۔“

”آئی سی...“ میں نے کچھ دیر بعد کہا ”تم بھی ان کے لیے کام کرتی ہو؟“

ایک اور شخص نے کہا کہ وہ جیسے ہی اس کے پاس پہنچا، اس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ”یہ وہی ہے جس نے تم کو اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔“

گئے کہ وہ آپ کے سوٹ کس میں سے نہیں نکلا اور ثابت کرنے میں آپ کو شام ہو جائے رات ہو جائے۔ سارے مسافر نکل جائیں گے آپ کو گھر لیں گے یہ سب مل کے۔ ایک نہیں یہاں دس قسم کے ڈاکو بھر رہے ہیں۔ آپ کی پراہم میں ختم کر سکتا ہوں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

اور جب مجھے یاد آیا کہ میں لندن کے ریسٹورنٹ پر نہیں، بفضل خدا مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قائد اعظم انجینئر ابرو پورٹ پر ہوں جہاں ان کی تصویر دیے تو ہر سرکاری افسر کی کرسی کے پیچھے سے سب دیکھتی رہتی ہے مگر اصل مشکل کشادہ ہی تصویر ہے جو ہر کرسی نوٹ پر نظر آتی ہے۔ قوی بے غیری کی انتہا یہ ہے کہ سو کے نوٹ والی تصویر کو رشوت کی اکائی بنادیا گیا ہے۔

میں نے ہر جگہ دے کے لیے نمودار ہونے والے فرشتے غیب یعنی ایجنٹ سے پوچھا ”کیا نذرانہ پیش کرنا ہوگا مجھے اس کا خیر کیا؟“

اس نے پلک جھپکائے بغیر پانچ انگلیاں دکھائیں۔ ”پانچ قائد اعظم! پانچ منٹ میں سامان کی تر ہو جائے گا۔“ میرے پاس پاکستانی کرنسی نہیں تھی۔ ایجنٹ نے پانچ پاؤنڈ بڑی خوشی سے بول کے اور چند منٹ میں میرا اسباب باہر آ گیا۔ ایجنٹ نے بڑے خلوص سے ہاتھ ملا کر کہا ”میرا نام یاد رکھیے گا جناب! اسلام راہی“ آپ کا خادم! میرا کارڈ رکھ لیں اس پر میرا موبائل نمبر بھی ہے۔“

میں نے کارڈ لینے سے انکار کر دیا ”اسلم راہی۔۔۔۔۔ آئیہ ہم دوزخ میں ہی ملیں گے۔“

اس کی شکل پر بارہنہ گئے ”جی ہاں!“

”ہاں جی۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی اور جواس پر یقین نہ رکھو کہ وہ کافر۔“

اپنے ٹریول ایجنٹ کی تاہلی کے باعث مجھے کراچی سے لاہور جانے والی پہلی فلائٹ پر جگہ نہیں ملی تھی۔ لاہور میں تبلیغی جماعت کے اجتماع میں جانے والوں کا انتظار تھا کہ آئیہ ہمیں دن تک جاس پڑھی سیٹ دستیاب نہ تھی۔ تاہم اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کوئی چکر چلائے گا اور اس نے ٹائٹ کوچ میں میرے لیے جگہ نکال لی تھی۔ اب مجھے آٹھ نوٹھنے ایر پورٹ کے نزدیک ہی ہوئی میں گزارنے تھے۔

میں ٹرائی کوڈ چھٹی اور کسی والوں کی یلغار کا مقابلہ کرتے باہر آیا تو میری نگاہ اس شخص کو تلاش کرتی رہی جس نے مجھے میرا نام بتا دیا تھا مگر اپنا نام بڑی ہوشیاری سے بول کر یہ تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم نے اچھا کیا واپس آگئے یہی بات

کسی نے مارتھا کو فون کر کے بھی کہی تھی۔ اس سے میرے شک کو تقویت حاصل ہوئی تھی کہ وہ لندن سے میرے پیچھے آیا ہوا تھا اور میری واپسی کو یقینی بنانے کے شش پر مامور تھا۔ آخر کون تھا وہ؟

اس نے راہ چلنے ایک ایسی جگہ مجھ سے بات کی تھی جہاں میں اس کا گریبان پکڑ کے سوال نہیں کر سکتا تھا کہ آخر یہ کیا چکر ہے؟ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو اور کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے کیوں گریز کر رہے ہو؟ اس سرگ جیسے راستے پر میں اس سے بھڑکا کرتا تو خود تماشا بن جاتا۔ وہ انجان اور معصوم بن کے کہتا کہ میں نے تو آپ سے صرف کسی ایسے ہوٹل کا نام پوچھا تھا۔ معلوم نہیں تو ناراض کیوں ہوتے ہو؟

اب وہ غائب ہو چکا تھا اور میرے پاس اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا صرف ایک راستہ تھا جو بہت مشکل تھا۔ میں اس کی سیٹ نمبر کے حوالے سے ہینجز لسٹ دیکھوں اور کوئی چکر چلائے اس کے شاشی کارڈ نمبر یا پاسپورٹ سے اس کا نام پتا حاصل کروں۔ کوئی ایجنٹ میری یہ مشکل بھی آسان کر دیتا مگر فوری طور پر میں اس چکر میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

لاؤنچ کی ایرکنڈیشنڈ فضا سے باہر آ کر مجھے پسینہ آنے لگا۔ یہ نومبر کا مہینا تھا مگر کراچی میں دن کے وقت باقاعدہ گرمی تھی اور بہت زیادہ رطوبت میں پسینہ آتا ایک فطری بات تھی۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا تو میری انگلیاں کاغذ کے کسی پرزے سے ٹکرائیں۔ میرے ذہن میں ایک سوائیڈ نشان بن گیا کیونکہ میں نے اس جیب میں کوئی ایسی چیز نہیں ڈالی تھی۔

میں نے اس پرزے کو نکالا۔ یہ چھوٹا سا نوڈل کیا ہوا سفید کاغذ تھا جس پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ ”دو بارہ لندن کا رخ کیا تو تمہیں ون دے گت پر دوسری دنیا میں بھیج دیا جائے گا۔“

میں نے اس جملے کو کئی بار پڑھا حالانکہ وہ مجھے پہلی نظر ڈالتے ہی آزر ہو گیا تھا۔ اس کے معنوں میں کوئی پیچیدگی یا کچھ میں نہ آنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اسے بہت دیر تک گھورتا رہا۔ میری نظر میں اس شخص کا چہرہ تھا جس نے اپنے جیک کو میرے شولڈر جیک سے ٹکرایا تھا اور بھینسا اسی وقت جب تراشوں کی طرح ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے یہ پیغام میری جیب میں منتقل کر دیا تھا۔ نہ میں نے کچھ محسوس کیا تھا نہ کسی تیسرے شخص نے کچھ دیکھا تھا۔ تاہم غور طلب بات یہ

تھی کہ خبری طور پر مجھے وارننگ دینے کے بعد اس کو مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ تم نے اچھا کیا پاکستان آگئے۔ کیا وہ مجھ پر اپنی موجودی ظاہر کر کے مجھے ہراساں کرنا چاہتا تھا؟

قتل کی اس کھلی دھمکی کا منہ میرے ذہن میں الجھن کا سبب بن گیا تھا۔ یہ دھمکی کس کی طرف سے تھی؟ جن پر میں جی کر سکتا تھا ان میں پہلا نام صفدر سلطان کا تھا لیکن اسے دھمکی دینے کے لیے یہ نراسر اطر یقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ مجھے براہ راست میرے سامنے آ کے یا فون کر کے بھی دھمکی دے سکتا تھا۔ میرا لوٹ کر لندن جانے کا قلعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ بات میں نے ہر جگہ سب سے کہی تھی اور اپنے مستقبل کے پلان کو بالکل واضح کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ چار ماہ بعد فریال کو خود بھی پاکستان لوٹ کر آنا تھا۔ ایسی صورت میں میرے لندن جانے سے صفدر سلطان کو کیا پڑیانی ہو سکتی تھی؟

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ایک قیسی ڈرامیور جو باقی سب سے میرا سامان چھین لینے میں کامیاب ہو گیا تھا بہت دیر سے منتظر ہے کہ میں تشریف رکھوں۔ اس نے میری اجازت کے بغیر ہی سامان ڈکی میں رکھ دیا تھا۔

میں نے کہا ”دیکھو۔ مجھے ٹائٹ کوچ سے لاہور جانا ہے اس لیے قریب ترین ہوٹل لے چلو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”سب ہوٹل تک ہیں سر جی! لیکن پی سی میں میری ڈے داری۔ اور ٹائٹ کوچ کی آپ فکر مت کریں میں خود آپ کو لینے آ جاؤں گا۔“

وہ غالباً ہوٹل کے کسی ایجنٹ کا ایجنٹ بھی تھا اور پی سی کا مشورہ اس نے محض زیادہ فاصلے کا زیادہ کرایہ وصول کرنے کے لیے دیا تھا۔ ایرکنڈیشنڈ قیسی میں بیٹھ کے مجھے کچھ سکون ملا۔ قیسی شاہراہ فیصل کی ٹریفک سے گزرتی تھی اور میں اپنے دو طرفہ عذاب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک اور ایک ہی وقت میں میرے دو دشمن سامنے آ گئے تھے۔ ایک گن پوائنٹ پر مجھے لندن میں روکنا چاہتا تھا دوسرا دھمکی دے رہا تھا کہ میں نے لندن نہ چھوڑا تو مجھے دنیا چھوڑنی پڑے گی۔ ایک مجھے آگے دھکیل رہا تھا دوسرا پیچھے۔

ہوٹل پہنچے کے میں نے کوٹ اور تاہلی سے نجات حاصل کی اور جوتے اتارے بغیر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ روم سروس سے کافی طلب کرنے کے بعد میں نے پھر وہ کاغذ کا پرزہ نکالا اور اس کی خبر کو گھورتا رہا جیسے شراک ہومز کی طرح اسی سے میں ہر راز نگاہوں کا۔ اس معاملے میں اب میرے لیے شک کی

کوئی بات نہیں رہی تھی کہ میرے ساتھ لندن سے جہاز پر سوار ہونے والا وہ شخص اسی خدمت پر مامور تھا کہ میری لندن سے واپسی کو یقینی بنائے اور کراچی پہنچنے کے رپورٹ ارسال کرے کہ ریشم کی طرف سے پڑیانی کوئی بات نہیں رہی۔

کافی پیچھے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قسم کی رپورٹ سے صرف ایک فرک وہ نہیں ہو سکتی تھی۔ عائشہ کی ماں لیڈی سیلیا ارنٹ کو۔ وہ شخص بھینسا کی داؤچ ڈوگ تھا۔ اس کی دھمکی مجھ تک پہنچانے کے بعد وہ لندن واپس چلا جائے گا اور لیڈی سیلیا ارنٹ کو اطمینان دلانے کا کہہ کر فکر کی اب کوئی بات نہیں رہی۔

مجھے پاکستان پہنچانے کا بندوبست بھی بہت پہلے ہی کیا گیا ہوگا۔ عائشہ کی ماں نے کچھ ہوئی کہ خواہ مخواہ جی کوٹل کرنا پڑے یا مجھے مگر وہ اپنی عالی نسبت خالص انگریز بیٹی کی شادی ایک کالے اور پاکستانی مسلمان سے ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ گیارہ تمبر کے بعد حالات بھی سازگار ہو گئے تھے۔ اگر میں عزت و آبرو کے ساتھ نہ جاتا تو اس بات کا انتظام کیا جاسکتا تھا کہ مجھے دہشت گردی کے شبہ میں ملک بدر کر دیا جائے۔ میں برطانوی شہری نہیں تھا کہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکتا اور محض پاکستانی مسلمان ہونے کی بنا پر عائد کیے جانے والے الزام کو عصب اور ذاتی عناد کا نتیجہ قرار دے سکتا۔ ہوم آفس کا ایک فیصلہ مجھے ڈی پورٹ کرانے کے لیے کافی ہوتا اور ہم آفس۔۔۔۔۔ لیڈی سیلیا ارنٹ کو بھی مایوس نہ کرتا۔

عائشہ نے قانونی خود مختاری اور باپ کی حمایت سے بغاوت کا علم تو بہت پہلے بلند کر دیا تھا اور ماں بیٹی اپنی فتح دھگت کو ان کا مسئلہ بنائے آئے سانسے تھیں مگر میرے ساتھ پاکستان بھاگ جانے کا فیصلہ عائشہ نے مکمل رازداری کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے تو مجھے یہ بات آخر میں بتائی تھی لیکن اس کا ارادہ بد دوستی میرے ساتھ آنے کا بہر حال نہیں تھا ورنہ وہ مجھ سے پہلے جہاز میں موجود ہوتی۔

لیکن درون خانہ لیڈی سیلیا ارنٹ کے کسی ہمدرد یا مددگار نے عائشہ کی تیاری کا راز فاش کر دیا ہوگا اور چالاک ماں نے ہنگامی طور پر ایسے انتظامات کر لیے ہوں کہ عائشہ میرے ساتھ پاکستان نہ جانے پائے۔ ممکن ہے اس نے عائشہ کو بھی زبردستی روکنے کی پوری تیاری کی ہو۔ جہاز پر عائشہ کی سیٹ خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے لیے ایک ٹکٹ خوار کو نہ مزدور دیا گیا اور جاس پڑنے والی سیٹ آخری وقت میں اسے دے دی گئی۔ لیڈی سیلیا ارنٹ کے اثر و رسوخ اور دولت کے دائرہ اختیار میں سب کچھ تھا۔

سوائے چیف کے وہ کسی کو آپ نہیں کہتا تھا۔ میں نے کہا "آپ نے دھت کی یہاں آنے کی۔"

اس نے کہا "مجھے آنا پڑا..... چیف نے کہا تھا کہ میں خود آپ سے ملاقات کر کے صورت حال واضح کروں۔ اگر آپ چیف سے مل لیتے تو دین بات ہو جاتی اس سلسلے پر۔"

میں نے کہا "کون سا مسئلہ؟ اور چیف سے میں کیسے ملتا۔ مجھے دہاں آنا تھا۔ میرا پروگرام طے تھا۔"

اس نے کہا "ہاں! یہ بات ہمیں دیر سے معلوم ہوئی۔ پھر بھی کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کچھ دن اور لندن میں قیام کی مدت بڑھا دیتے۔"

اس کا یہ مؤدب اور عاجزانہ لہجہ میرے اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں فحش تھا کہ کسی بھی لمحہ وہ اتنی ہی شرافت سے اور نرمی سے بات کرتے کرتے کہے گا کہ رفیق صاحب! آپ تو جانتے ہیں تنظیم میں حکم عدولی ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے۔ چیف کے احکامات کو نظر انداز کرنے کے علاوہ آپ نے یہ پیغام پہنچانے والے اشرف کو مارا اور لندن سے بھاگ اٹھے۔ اب آپ کو مرنے پڑے گا۔"

"روم سرور کا دھڑکا لایا تو میں نے اسے ایک کپ بنا کے پیش کیا۔" سوال یہ ہے شہاب صاحب کہ لندن میں مجھے کوئی ایسا کام نہیں تھا پھر میں وہاں کیوں رکا؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا مگر آپ کا چیف سے ملنا ضروری تھا۔ آپ کا یوں فرار ہونا قطعی نامناسب بات تھی۔"

"فرار ہونا۔ لاجول دلا تو۔ شہاب صاحب میں بہت پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آیا ہوں۔"

اس نے کچھ سوچتے ہوئے خود کلا کی کے انداز میں کہا "اس کا یہ مطلب ہے کہ..... اشرف چیتا آپ سے نہیں ملا؟"

اس کے شک دھبے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ "کیا وہ ایسا کہتا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ تو کچھ کہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

میں نے غامبی بے نیازی سے پوچھا "کیا مطلب؟"

شہاب نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی "دماغ کی چوٹ سے اس کی یادداشت اور گویائی متاثر ہوئی ہے۔"

میرے لیے یہ ایک خوش خبری تھی کہ اشرف چیتا مرا نہیں تھا اور مجھ پر کل کا کوئی الزام نہیں تھا۔ میں نے اس کا سر بڑے انتہائی جذبے کے ساتھ اسٹیرنگ ویکل پر مارا تھا۔ اس کا

شیطان دماغ اندر سے الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ میرے دل پر دعا لگی کہ خدا کرے اس کی یادداشت روٹھ کے نیکے والی بیوی کی طرح کچھ عرصے بعد واپس نہ آئے۔ طلاق کر جانے والی بیوی کی طرح بھی نہ آئے۔

اب میں نے زیادہ اعتماد کے ساتھ اداکاری کی اشرف چیتا..... یہ وہی تو نہیں ہے جو پہلے چیف کا باڈی گارڈ تھا؟ وہ زندہ ہے؟"

شہاب الدین نے سر ہلایا "دو سال سے وہ بھی لندن میں تھا۔ چیف نے اسے تمہارے پاس بھیجا تھا۔"

"اچھا..... میں نے جرنالی کا اٹھارہ کیا؟" "کب؟"

"کل رات..... آج صبح پولیس نے اسے اپنی گاڑی میں بے ہوش پڑا ہوا پایا اور اسپتال پہنچا دیا۔ کسی نے اس بڑی بے رحمی سے مارا۔"

میں نے کہا "چیتا تو خود بڑا خونخوار تھا۔ اسے کس مارا؟"

"یہ تو وہ خود ہی بتائے گا۔ پولیس نے اس کے ہوش آنے کا انتظار کیا لیکن چار گھنٹے بعد اندازہ ہوا کہ اس کا تو ازن بگڑ گیا ہے۔ اس نے کسی کو پہچانا نہیں اور اپنا نام نہیں بتا سکا۔"

میں نے واجبی سی دلچسپی سے کہا "وہ ایکٹنگ تو بڑا کر رہا تھا۔"

شہاب الدین نے کہا "آؤں تو اسے ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر ایکٹنگ چلتی بھی نہیں ڈاکٹر کچھ جا ہیں۔"

"اچھا ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔ اس کی ایسی حالت کہ تک رہے گی؟" میں نے کہا "یہ پاگل پن عارضی ہے مستقل؟"

"فی الحال کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اچانک ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اور ٹھیک ہونے میں اسے تیار وقت بھی لگ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "چھ سال بعد چیف کو میرا خیال کیسے آئے گا؟ کیوں بھیجا گیا تھا اشرف کو میرے پاس؟"

شہاب الدین نے پہلو بدلا اور جب سے سگریٹ کال کے اخلاقی سوال کیا "آئی ہو پوڈونٹ مائنڈ..... ایک میری طرف بڑھا۔"

میں نے کہا "تھینکس! میں نہیں چیتا لیکن آپ جا رہے ہیں۔"

شہاب الدین نے سگریٹ کا ایک سس لے کر دھواں

آہستہ آہستہ خارج کیا "آپ نے تنظیم کے لیے بڑے جوش اور دلولے سے بہت اچھا کام کیا تھا لیکن پھر آپ اچانک ہر کا پلے گئے۔"

میں نے کہا "جی..... والد چاہتے تھے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "آپ نے ہارڈ سے ایم بی اے کیا ہے۔ گزشتہ دو سال سے آپ لندن میں تھے۔ آپ کو تنظیم میں اعلیٰ عہدہ دیا جاسکتا تھا۔ آپ لندن میں چیف کے شہر اعلیٰ ہو سکتے تھے۔"

میں نے کہا "اب میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ میرے والدین کی عمر کافی ہے اور ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ میرے سوا ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ لندن میں رہ سکتے تھے اور نہ امریکا میں۔ اسی لیے مجھے واپس آنا پڑا۔ حالانکہ وہاں میرے لیے ترقی کے بہت اچھے مواقع تھے۔"

شہاب الدین نے سر ہلایا "میں آپ کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ خود چیف آپ کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔ ہم ہرگز آپ کے لیے کوئی مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتے لیکن ایک کام ایسا تھا جو آپ ہی کر سکتے تھے۔"

میں نے ہمت کر کے کہا "شہاب الدین صاحب! آئی ایم سوری اپنی اہمال میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں تنظیم کو وقت دوں۔"

"یہ کام ایسا نہیں..... میرا مطلب ہے آپ کو پرائلم

کوئی نہیں ہوگی۔" شہاب الدین نے کہا اور پھر کچھ دیر سوچتا رہا "لندن میں آپ کی ایک دوست ہیں جو پہلے ایٹا ارنسٹ تھیں اب مسلمان ہونے کے بعد عائشہ خاتون ہوئی ہیں۔"

میں نے عائشہ کے نام پر اپنے اضطرابی رد عمل کو چھپانے کی پوری کوشش کی "آپ کی انفارمیشن درست ہے۔"

وہ مسکرایا "ہماری معلومات کے مطابق وہ آپ کے ساتھ ہی پاکستان آنے والی تھیں اسی فلائٹ سے۔"

"یہ بھی ٹھیک....."

"چیف کو آپ کے اور عائشہ کے قریبی تعلق کا علم اچانک ہوا اور آخری دن..... اس وقت یہ ضروری ہو گیا کہ آپ کو روکا جائے۔"

"اشرف اسی لیے گیا تھا۔ مگر جیستی سے آپ تک پہنچ نہیں پایا..... اس عائشہ کیوں نہیں آئیں؟ آپ کے ساتھ؟"

میں نے کہا "کیا یہ جانتا آپ کے لیے ضروری ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "جہیں" ہماری معلومات کے مطابق عائشہ نے آپ کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا۔"

"وہ سوچ مجھ کے مسلمان ہوئی تھی۔"

شہاب الدین نے میری بات کو قابل غور نہیں سمجھا "وہ آپ سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے والدین راضی نہیں تھے۔ ہماری انفارمیشن مکمل ہے رفیق صاحب! مگر میں یہاں آپ کے لوفاہیر پر بات کرنے نہیں آیا ہوں۔"

شہاب الدین نے اچانک پیٹر بدل لیا تھا۔ میں نے حتماً طو کے کہا "پھر آپ ہی فرمائیے بات کیا ہے؟"

شہاب الدین نے کہا "عائشہ کے والد لارڈ ارنسٹ کا نرطانی ہوم آفس میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ وہ خارجہ تعلقات کی کمیٹی کے مشیر برائے ساؤتھ ایشیا بھی ہیں۔"

مجھے اس تنہید کے ساتھ ہی صورت حال کی ایک تصویر نظر آنے لگی مگر میں نے شہاب الدین کو بولنے دیا۔

"ایک زمانے میں برطانیہ جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بہت سے لوگوں نے مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر سیاسی پناہ بھی حاصل کر لی تھی مگر اب بڑی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔"

میں نے کہا "کیا چیف کے لیے کوئی پریشانی پیدا ہو گئی ہے؟ برطانوی حکام ان کی سیاسی پناہ کی مدت میں توسیع نہیں کر رہے ہیں؟"

اس نے کہا "چیف کو کوئی پرالہم نہیں۔ اسے تو برطانوی شہریت دینے پر بھی غور ہو رہا ہے۔ مسئلہ ہے تین افراد کا۔ ان میں ایک میں ہوں ایک پنجاب کا موجودہ صوبائی آرگنائزر

تاہید سلطانہ اختر کے شہداء کا نام سے ایک ٹیلی ویژن شو

زندگیاں میں پھول

ماہیاریہ صورت ہے جو کتاب کی پھر میں سے کسی زیادہ مدد دے

لحہ بہ لہہ بصر بہ سطر بہ سطر تجر تجر اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک مادہ کے تئیں میں ہاپ کی بہت سے عرصہ ہو کر وقت اور حالات کی تبدیلی سے ہمیں یہ کتاب پڑھانی ہے

میں نے اپنی زندگی میں لکھی ان کے ساتھ ساتھ

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

ہے گے شاہ اور تیسرا ہے اشرف۔“
میں نے کہا ”اشرف کو اب پولیسکل سے زیادہ شاید
مینٹل ASSYLUM کی ضرورت ہوگی۔“

”ہاں اگر وہ ٹھیک نہ ہوا۔“

”اسے کیا فرق پڑے گا اگر باہل خانہ دلا جی نہ ہو۔“

شہاب الدین نے کچھ دیر بعد کہا ”ہم ایک بہتر آپشن پر
بھی متفق ہیں۔ ایک باہل کو اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ وہ
زندہ ہے یا مردہ؟ یا محل خانے میں ہے یا قبرستان میں۔ ہم
اسے جگہ ضرور پہنچا دیں گے۔ نہ اس کے لیے پر اہم رہے
گی نہ ہمارے لیے۔“

سفاحی شہاب الدین کی بے رحم فطرت کی عکاسی کرتی
تھی۔ وہ ایسا شخص تھا جو ظاہر میں انتہائی مہذب نظر آنے کے
باوجود اپنے باطن میں کسی خوفناک درندہ سے کم نہ تھا۔ وہ ایسا
شخص تھا جو تاش کی بازی کھیلتے ہوئے یا پہلی کے ساتھ ذرا خیال
سے دو سنت کے لیے اٹھ کے جاسکتا تھا اور کسی کے سر میں گولی
مار کے واپس آتے ہی بچے اٹھا کے بازی یا اسی خوشگوار موڈ
میں کھانا جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اشرف جتنا
ٹھیک نہ ہوا تو اسے لٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ وہ انسان نہیں
تاجدار کی ایک مشین تھا جو خراب ہو جائے تو اسے بچک
یا رڈ میں پھینک دینا چاہیے۔ یہ کیا سوچتا کہ اس مشین نے کتنا
عرصہ کیا خدمت سر انجام دی تھی۔

”پھر پر اہم رہ جائے گی میری اور گارے شاہ کی۔ ہم
دونوں کی درخواست سال بھر سے زیرِ غور ہے اور اگر فائل کو
آگے بڑھانے کے لیے دھکا نہ لگایا گیا تو وہ دہیں رکھی رہے
گی۔ خطرہ یہ بھی ہے کہ ٹیلیویرمیا کرس کے ساتھ واپس کر دی
جائے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں؟“

اس نے اپنی بات جاری رکھی ”اس کے متوازی دوسرا
مسئلہ ہے ہمارے دو سیاسی حریفوں کا۔ ان کے لیے بھی سیاسی
پناہ پر غور ہو رہا ہے اور شاید زیادہ ہمدردی کے ساتھ۔ کچھ
رپورٹس ہیں انٹیلیجنس کی اور ایک نیوز رپورٹر کی۔ انہوں نے
الزام عائد کیا ہے کہ ہم نے اقتدار میں آنے کے بعد سرکاری
مشینری کی مدد سے ان کے خلاف انتقامی کارروائی کی، اس
میں بڑا منافع ہے۔“

”یہ میڈیا والے آخر سمجھتے کیوں نہیں کہ ہمارے کلچر کی
ایسی ہی روایات ہیں۔ خود ہمارے ساتھ انہوں نے یہی کیا
تھا۔ آج ان کی باری آگئی ہے تو ہوتا رہے گا۔“
شہاب الدین نے میرے تبصرے کو نظر انداز کر دیا

”ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے حریفوں کی درخواست
مسترد کر دی جائے۔ پھر حکومت کے پاس چار پچیس صرف
کس رہ جائیں گے۔“

”کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہوگا کہ دو کس بھیں
کر دیے جائیں۔“ میں نے کہا۔

”ہم کوشش کر رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہ روپوشی
چلے گئے ہیں۔ اب ساری چیونٹیں سامنے آگئی ہے تو میر
آپ کے اس سوال کا جواب دوں گا کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔
ظاہر ہے براہِ راست تو کچھ نہیں کر سکتے آپ۔ یہ کام کرنا
لارڈ ارنسٹ کو۔“

”وہ ایک انتہائی مضبوط کردار کا آدمی ہے۔“

”مضبوط کردار والے آدمی کی کوئی کمزوری ضرور ہوتی
ہے۔“ شہاب الدین مسکرایا ”لارڈ ارنسٹ کی کمزوری یہ
اس کی اکلوتی بیٹی۔“

میں صدمے اور غصے پر قابو پانے کی کوشش میں کچھ
خاموش بیٹھا رہا۔ پھر میں نے دس ٹھک گنا اور اٹھ کر پانی پیلا
میں شہاب الدین کو گامگیاں دے کے اور جو تے مار کے کھانے
کی وہ غلطی نہیں کرتا جانتا تھا جو میرے مستقبل کو تباہ کر دے۔
بالآخر میں نے کہا ”آپ چاہتے ہیں میں عائنہ کو بھجور
کردوں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ دوست ہے تمہاری۔۔۔۔۔ بلکہ دوست سے
بھی زیادہ۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور ایک بار پھر روم روڑ
کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد کہا ”شہاب الدین! شاید آپ
کو پوری صورت حال کا اندازہ نہیں۔ آپ کی سیکرٹریٹ روم
یقیناً بہت فعال تھی۔ میرا خیال تھا کہ انہیں کچھ بتائیں مگر۔۔۔

میرے شبِ درد کے ہر لمحے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ کسی حد
تک انہیں میرے نجی معاملات کی خبر بھی ہوگی لیکن اصل
صورت حال مختلف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عائنہ نے اس لیے
اسلام قبول کیا تھا کہ اسے مجھ سے محبت تھی۔ وہ مجھ سے شادی
کرنا چاہتی تھی۔“

”اس کے جذبات تو آج بھی وہی ہیں؟ وہ بولا۔

”رائٹ۔۔۔۔۔ لیکن میں نے ایسا بھی نہیں چاہا۔ نہ بھی

سوچا۔ میں نے ہمیشہ عائنہ کو سمجھایا کہ میں اس سے شادی
کیوں نہیں کر سکتا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی اور انا مجھے یقین
دلاتی رہی کہ وہ میرے ساتھ پاکستان میں خوش رہے گی خواہ
میرے گھر، خاندان اور معاشرے کا باخول کتنا ہی مخالف کیوں
نہ ہو۔ خواہ میں دوسری تیسری یا چوتھی شادی بھی کر لوں۔“

ایک باہل اور جذباتی لڑکی ہے۔ میں نے اسے صاف کہہ دیا
تاکہ میں ایک ہی شادی کروں گا مگر اس کے لیے میں کسی اور
کے ساتھ جذباتی عہد کر چکا ہوں۔ بے شک عائنہ سے ابھی
لوکی میرے نزدیک کہہ ارض پر موجود نہیں مگر یہ مسئلہ میرٹ پر
اچھا کا کبھی نہیں ہوتا۔ یہ تو ذاتی پسند کا معاملہ ہے۔ عائنہ
ان دلائل اور حقائق کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ کسی کی نہیں سنتی۔ اس
کی ماں میری دشمن ہو رہی ہے جیسے میں اس کی بیٹی کو درغلانے
کا ذمے دار ہوں۔ مجھے دھمکیاں ملتی ہیں اس کی طرف سے
اب بھی۔ حالانکہ میں عائنہ کو چھوڑ آیا ہوں اور میرا کوئی ارادہ
نہیں ہے کہ اس سے کسی قسم کا تعلق رکھوں۔ عائنہ یہ ابھی
مرحہ چاٹنی ہے کہ میری شریکِ حیات کون ہوگی لیکن اس کے
باہل بن کر میں کیا علاج کروں؟ وہ تو میرے ساتھ آنے کے
لیے تیار بھی تھی۔ آپ جانتے ہیں اس کی سیٹ ٹیک کنفرم
تھی۔ مگر میں اسے چھوڑ آیا۔ مجھے خدا سے پوری امید ہے کہ
پانچ فردہ مایوس ہوئے میرا خیال چھوڑ دے گی۔ وقت ہر زخم کا
علاج کر دیتا ہے۔“

شہاب الدین نے سر ہلایا ”اور ہمارا کام اس وقت سے
پہلے ہی ہو سکتا ہے۔“

روم سردس کے دیر نے کافی لانے کی اجازت طلب
کی۔ اس کے واپس جانے تک مجھے اپنے خیالات کے انتشار
پر قابو پانے کا موقع مل گیا۔

کافی کا پہلا گھونٹ لے کر میں نے کہا ”شہاب الدین
صاحب۔ اگر عائنہ میری بیوی ہوتی۔۔۔۔۔ بائیر اس کے ساتھ
جذباتی رشتہ ہوتا تو اور بات تھی؟ آپ یہ سمجھنے کی کوشش کیوں
نہیں کرتے؟“

”سمجھنے کی کوشش آپ کریں رفیق صاحب! آپ یقیناً
اس پوزیشن میں ہیں آج۔۔۔۔۔ اور نہیں ہیں تو آجائیں آپ
اس تعلق کو بحال کریں۔ عائنہ کو یقین دلانے کے لیے عقل
استعمال کریں کہ آپ کے خیالات بدل گئے ہیں یا حالات
بدل گئے ہیں۔ اب آپ اس سے شادی کر سکتے ہیں۔“

میں تنگ کدھر سے میز پر کھڑک دیا ”یہ نامکن ہے۔“

”یہ بہت آسان ہے رفیق صاحب!“ وہ سکون سے
بولا۔

میں نے کہا ”نو۔۔۔۔۔ میں اس کو دھوکا نہیں دے سکتا۔
اس سے اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

یو جھل خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں شہاب
الدین کافی چٹا رہا۔ کافی ختم کر کے اس نے سگریٹ جلانی
”مسٹر رفیق! یہ فیصلہ اتنی جلدی میں نہیں کیا جاسکتا“ آپ سوچ

لیں۔

”مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے براہی سے
کہا۔

”اچھا“ مجھے صرف پانچ منٹ دیں اپنی بات مکمل کرنے
کے لیے۔ آپ کی فلائٹ کا وقت بھی ہونے والا ہے اور مجھے
بھی جانا ہے۔ درمیان میں آپ نہیں بولیں گے۔ عملی زندگی
میں ہر شخص جو بھی فیصلہ کرتا ہے اپنے اور دوسروں کے نفع
ونقصان کو عقل کی ترازو میں تول کے کرتا ہے۔ یہ تو سوچنا ہی
پڑتا ہے کہ دو ناقابلِ قبول خرابیوں میں سے بکے قبول کیا
جائے۔ آپ ایک جھوٹ بول کے یا دھوکا دے کے اپنے
عائنہ کے اور دوسرے بہت سے لوگوں کی زندگی اور ان کے
مستقبل کو بچانا پسند کریں گے یا اپنے اصولی موقف پر قائم
رہیں گے؟ آپ کے نزدیک کیا بہتر ہے وہ سچ جس میں خرابی
ہی خرابی ہے۔۔۔۔۔ یا وہ جھوٹ جس میں سب کا فائدہ ہے؟“

میں نے کہا ”یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فائدہ کیا ہے اور
نقصان کیا؟“

”آپ خود۔۔۔۔۔ یہاں آپ کا مستقبل ہے۔۔۔۔۔ اس کے
ساتھ آپ کے والدین کی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں۔ آپ کی
ازدواجی زندگی کی خوشیاں وابستہ ہیں۔ اگر آپ نے یہ کام نہ
کیا تو کیا ہوگا؟ یہ آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔“

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“

”ہیں۔۔۔۔۔ یہ دھمکی ہے۔ آپ کے لیے آپ کے
والدین کے لیے۔ عائنہ کے لیے اور رزیاں کے لیے۔“ اس
نے جذبات سے عاری سرد لہجہ میں کہا۔ ”آپ جانتے ہیں
کہ پاکستان کے حالات کیا ہیں۔ ان حالات میں ہم کیا
کر سکتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔“

میرا خون سرد پڑنے لگا۔ مجھے اپنی بے بسی کا اندازہ
ہو رہا تھا۔ میری حیثیت جو بے دان میں چھنے ہوئے چوہے
جیسی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ میں ان لوگوں کی طاقت کا مقابلہ
کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کی دہشت گردی کی دس سالہ تاریخ
بڑی لرزہ خیز تھی۔

شہاب الدین بولتا رہا ”لیکن آپ نے ہمارا کام کرا دیا
تو مجھے چیف کی طرف سے آپ کو تحفہ کی پوری ضمانت فراہم
کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ آپ اپنی زندگی بے خونگی کے
ساتھ اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ یہ
چیف کا ذاتی وعدہ ہے جس پر آپ اعتبار کر سکتے ہیں۔ آپ
ہماری مدد کریں گے اور ہم آپ کے کام آئیں گے کیونکہ ہم
احسان فراموش لوگ نہیں ہیں۔“

ہوتا ہے۔ وہ بسم اللہ، بسم اللہ کرتے آگے بڑھے ہی تھے کہ پیچھے سے رشتے کے چچا نمودار ہوئے۔ وہ کسی زمانے میں پہلوانی کرتے تھے لیکن اب چربی اور گوشت کا چلنا پھرتا پہاڑ بن چکے تھے۔

خلافت کو پہلوان چنے مگر مجھے بازو پھیلا کے
یوں ایک طرف کر دیا جیسے بلند زرا ہمارا ساتھ ہوتا ہے۔ انہوں
نے زانی بڑی مہجوں کو ہلاتے ہوئے نعرہ لگایا "گیا میرا
فیما کٹر! اوئے گمراہی سے میرا شیر" اور مجھے تنگ جیسی
توند پر دبا کے اپنی طرف کھینچا۔ ان کے گلے گٹنے کے لیے
مجھے تقریباً رکوع کی حالت میں جاتا پڑا اور میرا سانس رکنے
لگا۔

خالو عنایت سخت خفا ہوئے ”بھئی پہلوان! یہ کیا بد اخلاقی ہے گویا۔ اکھاڑا سمجھ رکھا ہے“ یہاں سے بھی دھچک مٹتی۔“

پہلوان چٹا کی شفقت سے جانبر ہو کے میں نے پوری طرح سانس بھی نہیں لیا تھا کہ نہ جانے کہاں سے نکل کے چمکی داڑھی والے ایک سوکھے بانس جیسے ماموں مجھ سے مختلطیں کی طرح چٹ کئے۔ خالو ثناءت کی بھرپور تلمی ہوئی۔ ان کو سینارانی میں جو تھے نمبر پر کر دیا گیا تھا اور ان کا مد سے برا حال تھا۔ "ابھی جو نم کھان سے نکل آئے اس پہلوان کی ٹانگوں میں سے۔" انہوں نے برہمی سے کہا اور اپنی تیسری کوشش میں کامیاب رہے۔ ہارے میں ڈال کے انہوں نے بیٹے سے لگا کے دعا سیں دینے کی رسم پوری کی۔ وہ پستہ قد تھے اور بالوں سے بے نیاز ہو جانے والے سر کو کسی نہ کسی طمسائی نچنے والے امیر آغل میں ڈبو کے رکھتے تھے اور ایک امید پرست کی طرح ہر روز اپنے سر کی خنجر کا بغور جائزہ لیتے تھے کہ کہیں کوئی بال ضرور چھوٹا ہوگا۔ داڑھم ہوتو بیٹی بہت زرخیز سے ساقی۔ بڑی محنت سے انہوں نے سارا درغن میری قیصر برل دیا جس میں سے چائیس جڑی بوٹیوں کی بو ایسے آ رہی تھی جیسے تین دن کے مردہ جو پہے کوکثر سے نکال کے دارمیر کے عرق میں اچالا لگا ہو۔

اگلے امیدوار نذر پوچھا تھے جو ایک کوالی فائیز اور مارکیٹ ویلو کے اعتبار سے خاصے کامیاب پیر ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ یہ قیمت تھا کہ انہیں میرے خیر مقدم کے لیے کوئی ایک گز لمبا منظم سپانامہ پڑھنے کا خیال نہیں آیا۔ تاہم انہوں نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھ کر اور آنکھیں بند کر کے کوئی وظیفہ پڑھا اور دم کرنے کے لیے پھونک ماری تو میرے چہرے پر ان کے تھوک کی ایک پھواری پڑی جس

قانون کی کنٹرول کرتی ہے۔ میں نے سوچا کہ میرا یہ رد عمل مجھے کمزور کر رہا ہے اور اس ردیے کے ساتھ میں اپنے حقوق کی جنگ میں کامیابی کی دعوت دے رہا ہوں۔ میری پشت چابی کرنے والی امریکا یا اسرائیل جیسی کوئی طاقت نہیں اور نہ کوئی افغان کے میں جہاں چاہوں اپنا میدان کارزار منتخب کر لوں۔ میں نے کسی پائے خان کا سالہا میں اور نہ پتھانی فلوں کا کشٹوں کے پشتے کا پنے والا مجھ پر معاش۔ میرے پاس نہ سیاست کی طاقت ہے نہ دولت کی۔ اگر کچھ ہے تو ٹھوڑی سی خدا داد ذہانت اور یہ تو قانون فطرت ہے کہ خدا اور بھائی ازل وابدی۔ جہد میں حاکمیت صرف دماغ کے لیے ہے۔

چنانچہ مجھے مسئلے سے قوت حاصل کرنا ہوگی۔ برہنہ مسجوحے کے اٹھانا ہوگا۔ اچھی بات یہ تھی کہ مجھے مہلت مل لی تھی ورنہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ جیتے جیسا کوئی جانور اب تک مجھے چرہ ہاز چکا ہوتا۔ چیف نے ایسے بہت سے خونی درندے کا قور کر رکھے تھے۔ بغاوت اور حکم عدویٰ پر مجرموں کو وضاحت کا موقع دینے بغیر مزے اسوت دینا ذابکن پر قرار کرنے کے لیے ایک انتظامی ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ چیف نے اپنی غرض سے مجھے ایک آفر کی تھی۔ یہ مشکل آزمائش ضرور تھی لیکن آنے والے دن سے امید کی جاسکتی تھی کہ ڈھائی ویسلہ پیدا کر دے کہ میں بچ جاؤں۔

اس خیال نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ کراچی سے لاہور تک صرف ڈیڑھ گھنٹے کی فاصلہ تھی، جس میں مجھے یہ موقع مل گیا کہ میں والدین اور استقبال کے لیے آنے والوں کے سامنے رونمائی کروں تو پریشان اور بدحواس نظر نہ آؤں۔

مجھے ریسو بکرنے کے لیے سارا خاندان ایک جھومکی صورت میں موجود تھا۔ تفریحی عزیمتوں کا آرمی رات کے وقت وہاں ہونا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے والوں میں دور دراز کے ایسے چائے باے اور ان کے لواحقین شامل تھے جن سے پہلے ملاقات ہوتی تھی تو کسی کے موسم، جہلم پر یا برات دینے کے اجتماع میں۔ ابا بہت قہر مند تھے۔ میں نے زندگی میں کبھی انہیں رو تے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے گلے لگاتے ہوئے وہ شدید جذباتی ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی مگر وہ مسکرا رہے تھے۔ ابا کے آنسو بونٹھنے میں مجھے درگھی۔

اس کے بعد خیر مقدم کا مقابلہ شروع ہوا تو پر دتو کو ل کو نظر انداز کر دیا گیا۔ خالو عنایت کے ہاتھوں میں نٹوں کا ایک ہاتھ تھا جس میں زرق برق کلیاں اور پھندے نے اور سجاوٹ کا خاصا سامان تھا جو عام طور پر رثوں کی آرائش میں استعمال

سب اور اس سے کہیں زیادہ اس معاشرے میں ہوتا ہے جہاں صرف جنگل کا قانون نافذ ہو چکا ہے اور طاقت عمل کر (نعوذ باللہ) خدا مان لیا گیا ہے۔

وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد بھی میں نے اسے صاف بالکل منتشر ہو چکے تھے اور میرے ذہن میں آندھیاں ہی چل رہی تھیں اور میرا وجود خنقا و غصہ کی آگ میں جل رہا تھا۔ میرا بچا پتا تھا کہ چیف اور شہاب الدین جیسے تمام شیطانوں کو نیست و نابود کر دوں جو اس ملک کے شریف انسانوں کے لیے خوش اور خوشحالی کے خواب کو غائب کر رہے تھے۔ امن و سلامتی کی خواہش کو ان کا شایں گرامر ہے تھے۔ میرے وطن میں جنگل کا قانون نافذ کرنے والے یہی درندے تھے۔ کاش میرے پاس کوئی ایسی جہتانی طاقت ہوتی کہ میں ایک رات میں ایسے تمام انسانیت کے مجرموں کو موت کی نیند سلا سکتا۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ اس وقت میرے پاس کوئی ریو الوور نہیں تھا ورنہ شاید ایک جنوبی کیفیت میں میرے ہاتھوں شہاب الدین کا خون ہو جاتا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں نہ جانے تھی دراصل
 بھڑتا اور اپنی بے چارگی کی اذیت میں مبتلا رہا۔ مجھے ہوش
 اس وقت آیا جب میرے فون کی گھنٹی بجی اور آپ پر پڑنے لگے
 دودل لایا کہ مجھے ایرپورٹ لے جانے والی گاڑی آگئی ہے۔
 رانیہ رو دھو کے مطابق نہ آتا تو شاید میں اپنی فلاح نہ
 سکتی رہتی۔

میں نے سوچا تھا کہ ہوٹل سے سب کو نون کر دوں گا۔ صرے والدین کو یقیناً میرے فون کا انتظار ہوگا۔ فلائٹ ملوگواؤں؟ انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ میں کراچی پہنچ گیا ہوں۔ اب وہ زیادہ بے چین ہوں گے۔ یہ میرا فرض تھا کہ ن کے انتظار کی بجائے قراری کو کچھ کم کرتا۔ میرا ارادہ فریال سے عائشہ اور مارتھا سے بات کرنے کا بھی تھا مگر شباب الدین نے میرے سامنے بددگرام کو کبھی نہیں کر دیا تھا۔

تاہم اس کا آنا غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ نہ آتا تو کسی دوسرے نام سے چیف کا کوئی اور نامہ بر آتا اور مجھ پر واضح کر لیتا کہ لندن سے فرار ہو کے میں نے اپنے پاؤں پر کس طرح کھڑی ماری ہے۔

جہاز میں بیٹھ جانے کے بعد میں نے اپنے مندر
یالات کو اسی طرح منظم کیا جیسے پولیس لائیں پارک سے

میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میں منجمد بیٹھا اسے پک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

”آپ کا طریقہ کار بہت آسان ہوگا۔ آپ عائشہ کو یقین دلانیں کہ آپ اس سے شادی کر کے اسے پاکستان لانا چاہتے ہیں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فریال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس کے ہونے والے شوہر صفدر سلطان کی بیوہ ہے۔ آپ اس کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ ایسا کہیں یا کچھ اور۔“ پس اس سے غرض نہیں۔ عائشہ کو یقین دلانا آپ کے لیے بالکل مشکل نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے اس کے والدین پریشان ہوں گے۔ والدہ زیادہ پریشان ہوں گی۔ مجروحہ اپنے شوہر کو پریشان کرے گی۔ آپ اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیں کہ شوہر سے ہمارا کام کرادے تو آپ عائشہ کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ اب یہ جموٹ ہے یا دھوکا ہے..... تو مجبوری ہے۔ عائشہ کو ایک مدممہ اور ہوگا مگر جیسا کہ آپ نے کہا وقت سب کا علاج کر دیتا ہے۔ وہ روئے گی آپ کو مکاڑ دھوکے باز کہے گی اور بالآخر صبر کر کے خاموش ہو جائے گی۔ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ کے سارے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ جو مستقبل میں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں نے اپنی بات واضح کر دی ہے اب میں چلا ہوں۔“

میں نے کہا ”جیف کو بتادینا کہ میں اپنے انکار پر قائم ہوں۔“

وہ مسکرایا ”اگر کو اقرار میں بدلے دیے نہیں لگتی۔ آپ کے پاس سوچ بچار میں ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو ہوم آفس سے ہمارے مفادات کے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے اور آپ کو تمام عمر افسوس رہے کہ آپ نے جذبات کی روم میں بہہ کے یہ سوچ گویا۔ نقصانات فوراً ہی آپ کے سامنے آ جائیں گے۔ آپ کو اتنا غیر عملی اور خود غرض نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے ساتھ دوسروں کا مستقبل بھی داؤ پر لگا دیں۔ ان کا آپ سے رشتہ اور تعلق ہی ان کی بدبختی ہو جائے۔“

شائستہ لہجہ اور مہذب الفاظ میں یہی دھمکی کوئی جاہل بدعاش دیتا جب بھی مطلب یہی ہوتا کہ جب ہم اس بڑے چاہے میں تمہاری ماں کو وحشی درندوں کے حوالے کر دیں گے اور تمہارے باپ کی لاش کے ٹکڑے کھڑے کتوں کے سامنے ڈال دیں گے تب تمہیں سمجھ آئے گی۔ جس دن عائشہ اور فریال کی آبرو کے لیے سے ایک داستان ہجرت شہر کی دیواروں پر لکھی جائے گی، تب تمہیں اپنے انکار کی قیمت معلوم ہوگی۔ یہ

میں باں کارنگ بھی شامل تھا۔ صبح میں نے کارل پر سرخ ذرات دیکھے تو انا سر پٹ لیا۔ یہ بالکل نئی قمیص میں سے ہیرڈ سے اسی پاؤں میں لی تھی۔

تقریباً نصف درجن بزرگ فارغ ہوئے تو ایک درجن کزن مجھے پھونڈے آئے۔ ان کے پیچھے خواتین کا اجتماع تھا جس میں سات سے ستر سال تک کی رشتے دار شامل تھیں جو تصور میں اپنی کسی نہ کسی بنی کا جوڑ ایک ولایت پلٹ دادا دے ملا رہی تھیں اور میری نیمری میڑ میڑ نوں پاس میڑک فعلی عم زادوں کو اپنی طرف سے جدید ترین فیشن کے ڈریس میں یوں بنا سنوار کے لائی تھیں جیسے ایک نظردیکھنے ہی سب پر فریفتہ ہو جاؤں گا تو بیک وقت چار عقد کرلوں گا۔ مجھ سے فرابت داری کا ایسا بڑبوش مظاہرہ اس وقت بھی دیکھنے میں نہ آتا تھا جب میں عظیم کارسمر کارکن تھا اور سب کو میرا مستقبل اپنے بھائی جیسی تہرکی طرح تیار کیا نظر آتا تھا۔

بالآخر ہا مجھے ان خیر خواہوں کے نرنے سے نکالنے میں کامیاب رہے اور ایک جلوس کی شکل میں میری روانگی ہوئی تو ایپورٹ پر استقبال کا یہ منظر دیکھنے والے شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں حج یا عمرے کی سعادت حاصل کر کے لوٹا ہوں تو اپنے ہمراہ اسٹائل اور صلیب سے پوپ منکر کیوں نظر آتا ہوں؟

جب میرے لیے ایک جگہ ہوئی گاڑی لائی گئی تو میرا حوصلہ جواب دے گیا ”ابا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ کی گاڑی کہاں ہے؟“

ابا نے مجھ پر کا اظہار کیا ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ تمہارے بچے نے تمہاری دادی سے کہا اور ان کے داغ میں بیٹھ گئی۔ میں سب کو منع کر سکتا تھا انہیں کیسے سمجھاتا وہ سننی ہیں کسی کی؟“

میں نے کہا ”دادی اماں کی خواہش ہے تو پھر ٹھیک ہے ابا۔ وہ تو اگر گھوڑا اور بیڑ بھی بھیج دیتیں تو مجھے برات کی صورت میں جانا پڑتا وہ آئیں نہیں؟“

”وہ کیسے آئیں؟“ اماں نے کہا ”اب تو چلنا پھرنا بھی دھکیل چہیز ہوتا ہے۔ اس میں بھی حاکم جاتی ہیں۔ تم میرے ساتھ بیٹھو۔“

ابا ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گئے ”عمر بھی تو لوے سال سے زیادہ ہو گئی ہے۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے ایسی کوئی بیماری نہیں۔ نظرنیک ہے اور داغ تو ان کا ہمیشہ سے ہی قابل رشک تھا۔ آج بھی برات کی گمراہی تک فوراً اٹھ جاتی ہیں۔ حافظہ ماشا اللہ کچھ بڑھ گیا ہے۔“

میں نے کہا ”ان کا دم قیمت ہے ابا۔ ان کا وجوہ ہمارے لیے رحمت کا سایہ ہے۔“

میں دادی کی قدم بوسی کے لیے جھکا تو انہوں نے کڑی سے اٹھ کے مجھے گلے لگایا۔ ”تو آگیا نمونے۔ بہت اچھا کیا میری آس نہیں توڑی“ پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے ایپورٹ آنے والوں میں سے بیشتر وہیں سے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ مگر میں اس وقت بھی پندرہ سولہ فریبی جہاز موجود تھے۔ وہ سب اتنے جذباتی تھے کہ کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ یہاں تک کہ دادی نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ نمونہ آجائے پھر اسی کے ساتھ کھاؤں گی۔ میرے کچھ نہ کھانے کی وجہ بالکل مختلف تھی۔ شہاب الدین نے میری نیند بھوک سب آزادی تھی۔ لندن کی فلاح میں بچ کے بعد میں نے صرف کافی پر گزارا کیا تھا۔ کافی کی عادت مجھے امریکا میں پڑی تھی وہاں چائے نہیں ملتی تھی۔

رات دو بجے دسترخوان بچھا اور میری پسند کے وہ سب کھانے بڑے اہتمام سے پنے گئے جو امی نے بطور خاص میرے لیے بڑے پیار سے بنائے تھے۔ اس دعوت میں مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ ہم مشرق کے رہنے والوں کی جذباتیت تھی۔ ہم اپنی محبت کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں۔ باہران جذباتی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ بالغ ہونے کے بعد بیٹے اپنی دنیا الگ بسا لیتے ہیں۔ ماں باپ یا بھائی بہن سے تعلق اتنا ہی رہ جاتا ہے جتنا کہ پرانے پڑوسی سے۔

میرے والدین کی خوش بیان سے باہر تھی اور یہ ایک فطری بات تھی۔ میری زندگی کی سلامتی کے لیے انہوں نے دل پر پتھر رکھ کے مجھ سے دوری برداشت کی تھی۔ گزشتہ چھ برسوں میں ایک بار بھی میں پاکستان نہیں آتا تھا۔ ایک بار وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر امریکا آگئے تھے مگر وہاں وہ نہیں رہ سکے تھے۔ میرے واپس آ جانے سے ان میں پھر سے جینے کی اہمک پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے سارے خواب پھر سے جاگ اٹھے تھے اور ان کی آنکھوں میں غرور بن کے سامنے تھے کیونکہ میں کامیابی کا تاج سر پر سجائے لوٹا تھا اور میں نے بڑی سعادت مندی سے ان کے خوابوں کو تعبیر دینے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

لندن کے حساب سے پانچ مہینوں کے فرق کو اپنے معمولات میں شامل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ جب یہاں

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو تو وہاں ناشتے کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت لندن میں رات کے نو بج چکے تھے اور میں عام طور پر اسی وقت کھانا کھاتا تھا۔ چنانچہ مجھے بھوک لگی اور میں نے ڈنٹ کر کھایا تو امی خوش ہو گئیں۔ باقی سب لوگ بہت سی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے مگر دادی نے سب کو ڈانٹ لگائی کہ رات کو سوئے دو۔ باتیں کرنے کو عمر پڑی ہے۔

اپنے پرانے بیڑوں میں آکر مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ جیسے وقت نے پھر مجھے آٹھ سال پہلے کی دنیا میں دھکیل دیا ہے۔ میں نے لندن کے بارے میں سوچا تو وہ مجھے اپنے تصور سے بھی دور لگا۔ میرے اور عائشہ کے اور فریال کے اور مارٹھا کے درمیان اور گزشتہ دو برسوں کی آن گشت یادوں کے درمیان ایک سمندر حاکم تھا اور دہندہ بیوں کی دوری حاکم تھی۔ میرے مستقبل کے مقاصد حاکم تھے۔

میں سونے کی کوشش میں جاگتا رہا۔ میرا ذہن ایک بار پھر پریشان کن خیالات کی طوفانی یلغار کا شکار تھا۔ ہر طرف سوائے نشانات یوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے جیسے میں ہر طرف سے بند دیواروں کے حصار میں ہوں اور فرش پر کھلانے والے بیکروں سانپ اپنا چھن اٹھا کے پھکانے لگے ہوں۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور سکون کے لیے نیند کی پناہ چاہتا تھا۔ میں نے نیند کی گولی کی ضرورت پھر محسوس کی۔ چھ سال پہلے بھی ایک دور میری زندگی میں ایسا آتا تھا جب میں سکون آور اور پھر خواب آور گویاں کھانے لگا تھا اور جب اس عادت کو چھوڑا تھا تو میرے اعصاب کی بحالی میں بہت دشواری ہوئی تھی۔

ہارمان کے میں نے سونے کی کوشش ہی ترک کر دی۔ لندن سے آتے وقت میں نے اپنا موبائل فون ساتھ رکھا تھا لیکن یہاں وہ بے کار تھا۔ اسے پاکستان کے نیٹ ورک پر لانے کے لیے نئی سم کارڈ تھی۔ جب میں گیا تھا تو ہمارے پاس نیلی فون کا ایک کنکشن تھا۔ پہلے نیلی فون سیٹ لاؤنچ میں رکھا ہوا تھا پھر دوسرا سیٹ خرید کر ڈرائنگ روم میں بھی رکھ دیا گیا۔ بعد میں ایک بار کوئی کیبل ٹاٹ ہونے سے فون مہینا بھر سے زیادہ ڈیڑھ ماہ اور مجھ سے رابطے میں دشواری ہوئی تو اب میں نے ایک نیا کنکشن حاصل کر لیا۔ دوسرا فون اوپر کی منزل پر تھا اور نیچے لاؤنچ میں رکھا ہوا فون ابانے اپنے بیڑوں میں لگایا تھا۔

میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو مجموعی صورت حال اطمینان بخش نظر آئی۔ گلی منزل پر تین بیڑوں تھے۔ میرا بیڑوں اور ڈرائنگ روم محقق تھے۔ لاؤنچ کے بعد پھر

دو بیڑوں تھے۔ ان میں سے ایک دادی کے لیے تھا اور دوسرا میرے والدین کا تھا۔ دادی کورات کے وقت بھی اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا چنانچہ ابا نے درمیان والی دیوار میں سے دروازہ نکال لیا تھا جو رات کے وقت کھلا رہتا تھا۔

اور وہی منزل کا بھی یہی نقشہ تھا۔ پہلے اس میں کرائے دار تھے۔ گریاے سے ایچ بی ایف کی قرض کی مابہ نہ قسط ادا ہوتی تھی۔ جب مجھے لندن میں ملازمت مل گئی تو میں نے باقی رہ جانے والے قرض کی یکمشت ادائیگری کر دی۔ اوپر رہنے والے کرائے دار دو بار تبدیل ہوئے۔ پہلے شریف اور خیال رکھنے والے لوگ تھے مگر بعد میں آنے والوں نے ابا کے لیے بہت مسائل پیدا کیے۔ جب بالآخر انہوں نے گھر خالی کیا تو میں نے ابا سے کہا کہ اب کسی کو کرائے دار مت رکھیں۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اوپر کی منزل پر نذر بچا شفٹ ہونے کے لیے راضی ہو گئے تھے۔ یہ ابا کے لیے بھی خوشی کی بات تھی اور دادی کے لیے بھی کہ ان کے دونوں بیٹے پھر ایک ہی گھر میں اکٹھے رہیں۔ نذر بچا نے اپنا مکان کرائے پر دینے کا مشورہ بھی مان لیا تھا۔ ابھی خوش تھے۔ اس انتظام میں واحد خرابی کی صورت یہ تھی کہ دادی کی چھوٹی بہو سے بالکل نہیں جتنی تھی اور کسی وجہ کے بغیر ہی وہ لڑ سکتی تھیں۔

آج رات قیام کرنے والوں کے لیے اوپر کی منزل کے دو بیڑوں میں سب سے بڑا بچا دیے گئے تھے۔ اوپر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن نیچے خاموشی تھی۔ میں نیم تارک لاؤنچ سے دے پاؤں گزرا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو کے دروازہ بند کر لیا۔

یہاں ڈائریکٹ ڈائنگ روم صرف ملک کے اندر تک محدود تھی۔ بین الاقوامی کال کے لیے ایپریٹ سے رجوع کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسے مارٹھا کا نمبر دیا اور اس منٹ انتظار کرتا رہا۔ سبھر دوبارہ درخواست کی تو اس نے نہر فوراً مل دیا۔ مارٹھا کے لیے میری کال بہت غیر متوقع تھی۔ عام طور پر وطن واپس جاکے لوگ اسے ٹکس بھلا دیتے تھے۔ ”یونانی بوائے“ اتم پاکستان سے بول رہے ہو یا دوسری دنیا سے؟“ میں نے کہا ”دوسری دنیا سے تو میں محبت بن کے آؤں گا ہر روز۔“

”اس کا مطلب ہے تم زندہ سلامت پہنچ گئے؟“ میں نے کہا ”جہیں تک کیوں ہے؟“ وہ بولی ”تمہیں اس موت کے فرشتے نے کیسے چھوڑ دیا جو تمہیں گن پوائنٹ پر لے گیا تھا؟“

لب اور خاندانی ریس لڑکی سے سب کچھ تو جھین چکے ہو۔ اس کا مذہب، ہم سے رشتے..... کیا اس کی زندگی لوگھے؟“

”لیڈی سیلیا! اپنی فضول بکواس بند کرو۔“

”یہ فضول بکواس نہیں ہے، حقیقت ہے۔ تم ایسا جیسی خوبصورت اور گوری لڑکی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ تم اس کے باپ کے تنخواہ دار ملازم کاروبار کے مالک بننا چاہتے تھے۔ خاندانی بکلائے کے خواہش مند تھے۔ تم نے پاگل کر دیا۔ اے۔ ضرور تمہارے پاس کسی پراسرار کالے جادو کی طاقت ہے۔“

میں نے کہا ”یہ طاقت ہوتی میرے پاس تو میں نے سب کا نہیں اپنی باتوں کی بنا کے تمہارے بھونکنے والے گلے میں پٹا ڈال دیا ہوتا۔“

ظاہر ہے، اس عزت افزائی کے بعد وہ مجھ سے بات جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ میری قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور مجھے اس عورت سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے عائشہ کے اسپتال میں ہونے کی خبر دے کر مجھے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس اندیشے نے میرے ذہن کو جکڑ لیا تھا کہ ہونہ ہو معاملہ سنگین ہے۔ عائشہ کل تک ٹھیک تھی۔ چانک کسی عام بیماری میں مبتلا ہو کے وہ اسپتال نہیں پہنچ سکتی۔ ضرور اس نے مایوسی اور ڈپریشن کی انتہائی کیفیت میں اپنی جان لینے کی کوشش کی ہوگی۔ ایپورٹ آتے ہوئے میں اس کو ساتھ لانے کے لیے نہیں گیا تھا۔ وہ پاگل لڑکی حقیقت سے سمجھوتا کرتا ہی نہیں جانتی تھی۔ وہ آخری وقت تک امید کے سارے چراغ روشن کیے برپا انتظار رہی ہوگی۔ اسے پورا یقین ہوگا کہ میں آؤں گا۔

اس یقین کی شکست نے اسے مار دیا۔ جذباتی موت کے بعد اس نے اپنے جسم کو قید حیات سے آزاد کرانے کے لیے کوئی انتہائی قدم اٹھانے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کا فیصلہ شاید وہ پہلے ہی کر چکی ہوگی کہ بغرض محال..... بغرض محال۔

مجھ صورت حال معلوم کرنے کے لیے میں نے لاڈل ارٹس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا مگر آپریٹر نے کہا کہ موبائل نمبر کی کال تک نہیں ہو سکتی۔ معلوم نہیں وہ مجھے ٹال رہی تھی یا مگر ایسا ہی تھا۔ مجھ پر سخت جھنجھلاہٹ سوار ہوگی۔ یہ اس ملک کی پسماندگی کا خمیازہ تھا۔ مجھے اب آئی ایس ڈی فون لینا پڑے گا لیکن اس سے پہلے صبح اپنے موبائل فون کو کم اور کارڈ سے قابل استعمال بنانا مسئلہ کا فوری حل ہے۔

میں نے بہت سے دوستوں کا سوچا پھر مجھے مارا تھا کا

شہاب الدین کی بات کا میرے ذہن پر کوئی اثر نہ تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے مجھ سے مطالبہ کیا جاتا کہ میں اپنے مذہب کو چھوڑ دوں۔ والدین بدل لوں یا پاکستان میں نہ رہوں۔ جو نامکن تھا وہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں عائشہ کے ساتھ جذباتی استحصال کا شرمناک ڈراما نہیں کر سکتا تھا۔ ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ میں اس سے مکمل لائق اختیار کر لوں اور اسے اپنی زندگی کے نفسیاتی مسائل سے نمٹنے کے لیے تھا چھوڑ دوں اور خود غرضانہ بے حس اور سفاکی کے ساتھ اپنی خوشی کو اہمیت دوں لیکن یہ بھی میرے بس میں نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے۔ حقیقت پسندانہ انداز میں زندگی سے سمجھوتا کرے اور ہمیشہ یاد رکھے کہ میں نے ایک مخلص دوست کی طرح اس کو سہارا دیا۔

دوسری ٹریک کال ملنے میں بالکل دیر نہیں ہوئی لیکن میری بدقسمتی کہ دوسری طرف سے ریسپور عائشہ کی ماں نے اٹھایا۔

”تم.....“ اس نے میری آواز پہچانتے ہی گالی دیے کے انداز میں کہا ”کیا کیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا ”میں عائشہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تم سے بات نہیں کر سکتی۔“

میں نے کہا ”اس کے لیے ضروری ہے کہ تم ریسپور سے دو۔“

اس نے جملہ کے کہا ”آخر تم ہمیں اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“

میں نے کہا ”یہ ایک فلسفی نے کہا تھا کہ اکیلا صرف شیطان ہوتا ہے یا نور۔“

وہ چلانے لگی ”پورا اسکل! میں سمجھتی تھی کہ تم سے ہمارا بیچا جھوٹ گیا۔ تم دفع ہو گے ورنہ میں ضرور تمہیں قتل کر دیتی۔“

”تم صرف دھمکیاں پہنچاتی رہی ہو لیکن میں نے بھی اسکاٹ لینڈ یارڈ کو مطلع کر دیا تھا کہ میری وفات کے اسباب پراسرار ہوں تو فوراً اور تفتیش کا تکلف کیے بغیر لیڈی سیلیا کو ایک مشترک جیٹر پر بھادیا جائے۔ کیا اب تم عائشہ کو بلاؤ گی؟“

”نہیں! آئی سٹی عائشہ! وہ بیچ کر بولی“ وہ یہاں نہیں ہے۔“

”جہر کہاں ہے؟“

”وہ اسپتال میں ہے۔ داخل ہے تمہاری وجہ سے۔“

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا ”کیا ہوا ہے؟“

”تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ کینے کالے آدمی! ہوں پرست لاپچی انسان! تم نے اسے برباد کر دیا۔ تم ایک عالی

”ارے مارا تھا۔ وہ تو مذاق کر رہا تھا۔ دوست بے تکلفی میں بعض اوقات حد سے بڑھ جاتے ہیں۔“

”شٹ اپ! ایسا خبیث صورت شخص تمہارا دوست ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کی آنکھوں سے شیطان بھاٹک رہا تھا۔ تم نے اس سے کیسے جان چھڑائی آخر؟ کیا تم نے اسے قتل کر دیا؟“

”شش..... آہستہ بولو۔ دراصل پہلے میں نے اس کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ قتل کرنا ہے تو کسی اور کو کرو۔ یو! کم سے کم دو لڑکیاں جو مجھ پر جان دیتی ہیں شادی سے پہلے ہی بیوہ کر دی گئیں تو جیج اپنی جان دے دیں گی۔ مارا تھا کا انتخاب بالکل صحیح ہوگا جو چار شادیاں کر چکی ہے اور جیج کے کیا کرے گی؟“

اس نے ایک اہمیری ”یہ تو جیج کہا تم نے۔“

”ارے مارا تھا۔ مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ ابھی تو تم چار شادیاں اور کرو گی اگر بھٹیکو کی طرح۔ تم کیا اس سے کم ہو۔“

”اب یہاں مجھ سے ایسی باتیں کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ مجھے فون کرتے رہنا نہیں۔“ وہ اداس ہو گئی۔

میں نے کہا ”تم کو میں کبھی بھول سکتا ہوں مارا تھا۔ ابھی میں نے اسے فون کیا ہے کہ تمہیں اپنی خیریت کی اطلاع کر دوں۔ فکر کی بالکل کوئی بات نہیں رہی جیٹر اپ!“

”تم مجھے بتاؤ گئیں کہ وہ شخص کون تھا؟“

میں نے کہا ”تفصیلات جان کے تم کیا کر دگی مارا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ مجھ سے نو جوانی میں کچھ غلطیاں سرزد ہو گئیں تھیں۔ آٹھ سال بعد کسی نے مجھے بلک میل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ معاملہ ایسے ختم ہو گیا کہ آئندہ بھی کسی خرابی کا امکان نہیں۔ دراصل لندن میں میری پوزیشن مختلف تھی۔ میں برطانوی شہری نہیں تھا اور مجھے ڈرنا پڑتا تھا۔ یہاں بیچنے کے میں طاقتور ہو گیا ہوں۔“

”وہ کیسے..... کیا تم نے اس پاکستانی ڈاکٹر سے..... کیا نام ہے اس کا..... کیڑا اس سے کوئی انٹیم خبر لیا ہے؟“

میں نے کہا ”ارے یہاں تو بچہ بچہ انٹیم ہم بنا سکتا ہے میزائل بھی گھر گھر بیٹے ہیں۔“

پانچ منٹ کی ایک کرائی ہوئی کال کا وقت ختم ہوتے ہی کسی دارنک کے بغیر لائن کٹ گئی۔ دوبارہ کنگ کے طریقہ کار سے گزر کے رابطہ کرنا مجھے فوری طور پر اتنا ضروری نہیں تھا۔ بس کچھ دیر سوچتا رہا کہ عائشہ سے بات کروں یا نہ کروں؟

خیال آیا۔ وہاں اور لوگ بھی تھے جن کے ساتھ میں دو سال رہا تھا۔ فریال بھی میری مدد کر سکتی تھی لیکن وہاں مندر سلطان خود مل سکتا تھا ورنہ اس کا جاسوس لوٹ کر لینا کہ رفیق نے پاکستان سے کال کیا تھا۔ مجھے فریال کو یہ بتاتے ہوئے جھجک جھجک محسوس ہوئی کہ عائشہ نے میرے لیے لیا جذباتی مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔

بالآخر میں نے سوچی سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا جو سسر ایلین تھی اور عائشہ کے باپ کی کینسر میں ڈائریکٹر مارکیننگ کے عہدے پر فائز تھی۔ وہ میری باس بھی تھی مگر اس سے زیادہ دوست تھی اور طبعا ایک فرشتہ سیرت لڑکی تھی۔

میرے فون پر وہ جتنا حیران ہوئی اتنی خوش ہوئی ”رفیق! سب ٹھیک ہے نا؟“

میں نے کہا ”سوش! ایسا نہیں ہے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔“

”بولو میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”دیکھو..... ابھی مجھے لیڈی سیلیا ارٹس نے ایک بری خبر دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عائشہ اسپتال میں داخل ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ سوچی پریشان ہو گئی۔

”یہ اس نے نہیں بتایا۔ اب تم لاڈل ارٹس کو فون کر دو اس وقت وہ گھر نہیں ہوگا۔ اس سے موبائل فون پر بات کر دو۔ یہاں کچھ ٹیکنیکل پراپلم ہے۔ میں اس سے بات نہیں کر سکتا۔ تم اس سے عائشہ کے بارے میں معلوم کر دو اور پھر فون کر کے مجھے بتاؤ۔“

”اوکے۔ اپنا نمبر لکھواؤ۔“ وہ بولی ”میں تو خود بہت تشریف میں مبتلا ہوئی ہوں۔“

ریسیور رکھ کے میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ راجا عام طور پر اس وقت تک فارغ ہو کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ اخبار کی آخری کاپی پریس میں جانے کے بعد اس کے لیے کوئی کام نہیں رہتا تھا لیکن اخبار کے دفتر سے وہ پریس کلب جا کے بیٹھ جاتا تھا جہاں دوسرے اخباروں میں کام کرنے والے بھی ٹھکے ہارے بیٹھتے تھے۔

وہ گھر پہنچا ہی تھا۔ اس کی بیوی کے جواب میں ”میں نے کہا“ ”الو! کیا آئی شہانے میں؟“

وہ بولا ”الو! کچھ بھلا بھی آ گیا داپس۔“

میں نے کہا ”کیا کر رہا ہے تو کون سے تیرے ساتھ؟“

”کوئی نہیں یا! کیا تو نے کوئی زمانہ آواز نہ کی تھی؟ کچھ لے کر دئی دی پر ڈراما چل رہا تھا“ وہ خباثت سے ہنسا۔

میں نے کہا ”دیکھ اپنا ڈراما ختم کر۔ میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

”اے سمجھا کر..... ڈرامے کا آخری سین رہ گیا ہے“ وہ آہستہ سے بولا ”بارہ ہفتے چلا ہے..... فل آف رولس اینڈ سسٹنس!“

میں نے کہا ”تیرا دوسرا ڈراما شروع ہو جائے گا اس کے بعد۔ میں بہت پریشان ہوں مہاراجا!“

وہ غما ہونے لگا ”وہ تو ہمیشہ سے ہے تو“ پیدا ہوئی ہے۔ پریشان نہ ہو تو تیرا ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔ پہلے وہاں پریشان تھا اب پریشانی کا نوکرا اٹھا کر یہاں آ گیا ہے ہمیں پریشان کرنے۔ نیچے جڑ اپنا ٹھکانا پریشان کر لے ریش احمد پریشان۔“

میں نے کہا ”اچھا دوست۔ میں آ جاتا ہوں تیرے ڈرامے کی آخری قسط میں ولن بن کے ابھی دس منٹ میں۔“ اس نے جلدی سے کہا ”اے نہیں یا! میں آ رہا ہوں نا“ بس ایک گھنٹے کے اندر اندر..... بائے.....“

میں نے ریسپور رکھا ہی تھا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور مجھے اباجی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

”کیا بات ہے بیٹا تم سوئے نہیں؟“ انہوں نے کہا۔ میں نے کہا ”جی..... وہ کچھ دیر سوئے کی عادت تھی لندن میں اور پانچ گھنٹے کا فرق بھی ہے آپ کیوں جلدی اٹھ گئے؟“

”جلدی کہاں؟ اسی وقت اٹھتا ہوں نماز کے لیے۔ ڈرائنگ روم میں روشنی نظر آئی“ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سیلے کے مقابلے میں وہ گزرو ہو گئے ہیں۔ وہ زیادہ بوڑھے اور تھکے ہوئے بھی لگ رہے تھے۔

”غینا پلے جیسی نہیں رہی کم آتی ہے“ وہ بولے۔ میں نے کہا ”صحت کی طرف سے کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“

انہوں نے نفی میں سر ہلایا ”اللہ کا احسان ہے۔ دو الیتا رہتا ہوں۔ اس سے ملڈ پریشر کنٹرول میں رہتا ہے۔“

”احتیاط نہیں کرتے آپ؟“

”احتیاط بھی کرتا ہوں۔ آج نہیں گیا ورنہ نماز کے بعد آدھا گھنٹا ٹیبل کے آتا ہوں۔“

میں نے کہا ”رات کو آپ نے سب کچھ کھایا۔“

وہ نے ”بھئی کبھی کبھار کی بد پرہیزی کی تو ڈاکٹر نے بھی اجازت دے رکھی ہے۔ ہاں تمہاری ای کچھ نہیں کرتیں۔ نہ خوراک کم کرتی ہیں اور نہ چٹنا پھرتا ہے۔ وزن زیادہ ہو گیا

ہے پہلے سے تو جوتوں میں بھی درد رہنے لگا ہے۔ شوگر بڑھ جاتی ہے مہی۔“

”وہ سوری ہیں؟“

”نہیں نماز کے لیے ساتھ ہی اٹھتی ہیں۔ میں مسجد چلا جاتا ہوں۔ واپس آتا ہوں تو باہر بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔ دن ایسے ہی گزارتے ہیں کوئی کام مصروفیت تو ہے نہیں۔“

اسی وقت امی چائے کی ٹرے کے ساتھ اندر آئیں۔

”کافی ہے تمہارے لیے۔ کریم پاؤڈر بھی ہے“ انہوں نے کہا۔

میں نے کہا ”میں اس کے بغیر ہی بیوں گا۔“

”کیا..... کافی اور وہ بھی کافی..... صحت کا ستیا ناں!“

میں نے مسکرا کر کہا ”وہاں یہی پیتا تھا۔ کیا میری صحت خراب لگ رہی ہے آپ کو؟“

انہوں نے اپنی چائے کا کپ اٹھالیا ”صحت تو خیر ہے اچھی ہے مجھے تو اتنی خوشی ہے تو واپس آ گیا۔“

میں نے کہا ”کیسے نہ آتا۔ ایسے کب تک چل سکتا تھا کہ آپ یہاں رہیں اور میں لندن میں رہوں۔ اب تو حکم تھا آپ کا۔“

اباجی نے کہا ”ہم تو سوچنے لگے تھے کہ لندن چلے جائیں تمہارا مستقبل کیوں خراب کریں۔ صرف اسی لیے کہ یہاں ہم اکیلے ہیں تم کو آنے پر مجبور کریں امریکا میں واقعی مشکل تھا لیکن لندن تو سنا ہے کراچی لا ہو جیسا ہے۔“

”بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ اس کے کچھ حصے واقعی اے سی نظر آتے ہیں۔ لاکھوں انڈین اور پاکستانی ہیں۔ دی پچھ نظر آتا ہے۔“

”اپنی جاب کا کیا کیا؟“ ابانے کہا۔

میں نے کہا ”میں ہفتے تک کام چلا سکتے ہیں وہ لیکن اس کی مجھے کوئی فکر نہیں۔“

”اس کی اب ضرورت بھی نہیں۔ تمہارے ٹیلنٹ کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے کہ تم کیا کر سکتے ہو اور کیا بن سکتے ہو۔ ایک بزنس مین یا انڈسٹریلسٹ۔“

”یہ جو ملی اور زمین کا قصہ کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”قصہ تو بہت لمبا ہے۔ سو سال کی تاریخ ہے اور ریسرچ کا موضوع ہے۔ واقعات کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے بعد پیش آئے تھے۔ موع ملاتو سب کو ترتیب سے اٹھا کر کے کوئی کتاب لکھوں گا۔ ابھی تو مختصر اتم اتنا ہی سمجھو کہ اب تک کسی دعوے کے بغیر میں ایک بہت بڑی جاگیر مل گئی ہے۔ جیسے کسی کو مدون خزانہ مل جائے!

میں نے کہا ”میں کروڑوں کی کاٹری کل آئے۔“

”آپ کروڑوں کی بات کر رہے ہیں۔“

ابانے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ ”شروع میں تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا اور یقین ہی نہیں آتا تھا مگر اب کوئی شک نہیں رہا۔ میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں تھا۔ تمہارا وہ دوست ہے نا راجا..... اس نے ایک لافرم کا حوالہ دیا۔ وہ مختلف مالیاتی معاملات میں قانونی مشاورت کرتے ہیں۔ ان کا ایک شپ اسٹنٹ منیجمنٹ کا بھی ہے۔ وہ بڑے کام کے لوگ ثابت ہوئے۔ ملکیت کی منتقلی کے عدالتی امور کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ایک ماہر بشارت علی زیدی نے تفصیلی جائزہ لے کر ایک ویڈیو پیش کی ہے۔ یہ اس منٹ خامی مارکیٹ ریسرچ کے نتیجے میں سامنے آئی ہے اور ان کے کہنے کے مطابق اس میں دس سے چودہ فی صد کی تیش کا امکان ہے۔“

”یعنی پچاس فوٹے فی صد تک ان کا اندازہ درست ہے؟“

ابانے سر ہلایا ”ہاں“ یہ اندازہ کرنا بھی ہمارے لیے تو بالکل ہی ناگنن تھا۔ اس میں ایک تو دی قدیم حویلی ہے جس کا صرف ایک حصہ سلامت ہے۔“

”یہ حصہ دیکھا ہے آپ نے اندر؟“

”ہاں وہ کسی میوزیم کی طرح ہے جس کی دیکھ بھال نہ کی گئی ہو تاہم اسے رہائش کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ باقی حصہ خراب لگتا ہے کہ بوسیدہ دیواریں کسی بھی وقت گر سکتی ہیں مگر وہ برسوں سے ایسے ہی کھڑی ہیں۔ یہ حویلی تقریباً چار ایکڑ ہے۔“

”میں ہزار مربع گز.....“

”مجھے حویلیاں اور مل تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چاروں طرف باغ تھا جو نہ جانے کب سے اجڑا ہوا ہے۔ ملازموں کی رہائش گاہیں اور اصطل وغیرہ ہیں۔ اب اس کی مالیت کوئی کہے تا سکتا ہے۔ حویلی کے اندر جو سامان ہے وہ اٹھیک میں ٹھار کیا جاسکتا ہے۔ حویلی کے پیچھے ہزار ایکڑ زمین ہے۔“

میں اچھل پڑا ”دس ایکڑ..... یادیں ہزار ایکڑ!“

”دس ہزار ایکڑ“ ابانے لگے ”اور وہ سب جنگل ہے جس میں زیادہ درخت شیشم کے ہیں۔ تم جانتے ہو اس کی گولی فرنیچر بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔“

میں نے کہا ”میں نہیں جانتا۔“

”شیشم کو کھیر میں ہی استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ شیشم کی ادا لائی ہے جو اعلیٰ قسم کا فرنیچر بنانے میں کام آتی ہے۔ اب

سارے درخت گن کر ان کی مالیت کا حساب کرنا ظاہر ہے مشکل تھا۔ اس علاقے میں زمین کی ویڈیو کیا ہے؟ یہ سب دیکھنے کے بعد بھی بتایا گیا کہ یہ شاید ساڑھے تین کروڑ مالیت کی جاگیر ہوگی۔“

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ ”مجھے یہ کوئی الف لیلو کی کہانی لگتی ہے۔“

”ہمارے دیکھوں نے بڑی محنت کی۔ دستاویزات اور زمینوں کا ریکارڈ لینڈ ریکوریو والوں کی فائلیں جھگڑے اور لینڈ سرورے والوں کا ریکارڈ۔ یہ سب ہم کہاں دیکھتے۔ ساری عمر دھکے کھاتے رہے۔ بشارت فاروقی کو سارے طریقہ کار کا علم تھا اور اس کا رابطہ بھی تھا۔“

میں نے کہا ”اباجی! یہ کام رشوت کے بغیر تو نہیں ہوتے۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ دس لاکھ تو اس فرم کی فیس ملے ہوئی تھی۔“

”دس لاکھ۔ جو قانونی اور مالیاتی مشیر تو پہلے فیس وصول کرتے ہیں۔ کم سے کم پچاس فی صد۔“

ابانے سر ہلایا ”طریقہ تو یہی ہے۔“

”پھر آپ نے کہاں سے دیے؟“

وہ مسکرائے ”میں کہاں سے دیتا ہر خوردار۔ ان کے ساتھ ایک ایگریمنٹ ہو گیا ہے۔ تمام معاملات طے کرانے کے بعد وہ دس فی صد کے حصے دار تسلیم کیے جائیں گے۔“

”جمہوری مالیت کا دس فی صد..... یعنی بیٹیس لاکھ وصول کریں گے“ میں نے کہا ”مگر کیسے؟“

”اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم براہ راست دس فی صد ان کے نام کر دیں۔ ایک حصہ انہیں دے دیں جس کی اتنی مالیت ہو دوسرا یہ کہ ہم انہیں کاروبار میں ساڑھے بارہ فی صد کی پانزن شپ آفر کریں دس سال کے لیے۔“

”ابھی وہاں کون سا کاروبار ہے؟“

”اس کی ٹیڈر بلی یعنی قابل عمل ہونے کی رپورٹ بن رہی ہے۔ ایگریکلچرل یا انڈسٹریل پروجیکٹ کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے لیے سرمایہ کی فراہم ہو سکتا ہے۔ وہ کتنے منافع بخش ہو سکتے ہیں اور انہیں کیسے مختلف سٹوں میں پھیلا یا جاسکتا ہے۔ میں سیدھا سادا سول سرونٹ“ ان ٹیکنیکل معاملات کو کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ یہ تمہارا کام ہے اور اس لیے میں نے تمہیں مجبور کیا کہ سب کچھ چھوڑ کے یہاں آ جاؤ۔ دیکھو سمجھو اور سننا لو۔“

میں نے کہا ”ابھی تو میری عقل اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔“

”ایک پہنچ ہے تمہارے لیے۔ میں نے کہا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم آج کے ساڑھے تین کروڑ کو اگلے دس برسوں میں دس لکھ کر لو۔ سب تمہاری محنت اور محنت پر منحصر ہے۔“

”اور قسمت پر“ ای نے کہا۔

”وہ تو ہے ای! یہ سب قسمت ہی سے تو ملا ہے۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔ آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا راجا جانے کچھ نہیں بتایا۔“

”فون پر کیا بتاتے اور کتنا بتاتے۔ اب تم خود جاؤ گے تو دیکھو گے۔ معاملات کا کنٹرول سنبھالو گے تو سب سمجھ میں آئے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا ”آپ دعا تو کر سکتے ہیں ابھی اکی کھدا مجھے ہمت دے۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی سب ہوا ہے آج تک“ میں نے گھڑی دیکھی۔

”یہ تم بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا ”ایک تو مجھے لندن سے کسی کے فون کا انتظار ہے۔“

ای نے معنی خیز سوالیہ نظروں سے اپا کی طرف دیکھا مگر مجھ سے نہیں پوچھا کہ وہ فون کس کا ہے؟ انہیں عائشہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ جاننے سے کہ فریال لندن میں ہے اور غالباً یہ شک بھی کرتے تھے کہ میرے امریکا سے لندن آ کے ملازمت اختیار کرنے کی وجہ بھی وہی ہے۔

میں نے کہا ”راجا نے بھی آنے کے لیے کہا تھا۔“

ای نے اٹھتے ہوئے کہا ”میں ناشتے کا کچھ کروں۔“

عائشہ کی طرف سے میری توثیق بڑھتی جا رہی تھی۔ سوٹی کو میں نے ایک گھنٹا پہلے فون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عائشہ کے باپ سے بات کر کے مجھے صورت حال سے مطلع کرنے میں اسے دس منٹ لگیں گے۔ اس میں کچھ تاخیر کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیا پتہ لاؤڈ ارنسٹ کہاں ہو۔ وہ کسی بینک میں شریک ہو جہاں وہ کال نہ ریسیور کر سکتا ہو یا اس کا سیل فون بند ہو۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ یکٹھ میرے لیے انتہائی ضروری ہو گیا تھا کہ مجھے عائشہ کی خبریت معلوم ہو۔ اب اسے منگھو کے دوران میں یہ ممکن نہیں تھا کہ میں بھر سوٹی سے بات کرنے کے لیے لندن کی کال تک کر اؤں۔

طبیعت کی کسل مندی دور کرنے کے لیے میں نے غسل

کیا اور کپڑے بدل کر ناشتے کے دسترخوان پر پہنچ گیا جہاں اب باری باری سب اٹھ کر آ رہے تھے۔ باتوں کا ایک ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس کا تعلق لندن میں میرے قیام کے بارے میں سوالات سے شروع ہو کے میرے مستقبل کی منصوبہ بندی پر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا خاندان ایک خوشگوار فیزی خیزی میں مبتلا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ رات کو میرے غیر متوقع کے لیے پہنچنے والوں کے جذبات کیا ہوں گے۔ ان کی اکثریت حسد کی آگ میں جل رہی ہوگی۔ ولایت میں میری اعلیٰ تعلیم ہی کم نہ تھی کہ قسمت نے میرے نام کروڑوں لاٹری نکال دی۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔

تاہم وہ سب جو کہ میں تھے اور دسترخوان پر موجود تھے ان کے غلوں اور خیر خواہی کے جذبات پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مذہر چچا کا بڑا بیٹا جسے امریکا جانے کا جنون تو سب سے زیادہ سوالات کرتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت پر امید ہے کہ میں اسے اپنے ترقیاتی منصوبوں میں ضرور شریک کروں گا اور پھر شاید اسے امریکا جانے کی اپنی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ مجھے بار بار ہر طرح تعاون کا یقین دلا رہا تھا۔ خالو عنایت کا بیٹا کچھ شرمیلا اور کم کو تھا۔ اس کی بھرپور دکالت خود خالو فارہ ہے تھے۔ یہ ایک خواہش کا فانی رجحان تھا کہ میری ترقی میں غیروں سے زیادہ ایڈوں کی شرافت ہو اور خوشحالی کا دریا خاندان کو سب سے زیادہ سیراب کرے۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے میرے بارے میں بھی خاندان والوں کی رائے بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ بچپن میں مجھے گول گیا کہا جاتا تھا کیونکہ میں کچھ ضرورت سے زیادہ صحت مند تھا۔ تعلیم میں میرا ریکارڈ بھی قابل رشک نہ تھا۔

میں کھیل کود بزرگوں کی خدمت اور کام کاج چالاک اور بد معاشری میں بھی دوسروں سے پیچھے تھا۔ جب میں ہارڈ پائیکس میں پڑ گیا تو مزید بدنام ہوا۔ میرا مستقبل روشن تو کی گویا نظر نہ آیا تھا پھر باقاعدہ تاریک نظر آنے لگا۔ لوگ! کی بد قسمتی پر افسوس کرنے لگے۔ ایک انڈیا وہ بھی گندا۔

آٹھ سال بعد صورت حال ڈرامائی طور پر بدل گئی۔ تبدیلی معجزاتی تھی۔ آج میرے پاس اعلیٰ تعلیمی ڈگری تھی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ میں نے نفل کر کے لی ہے۔ امریکا اور برطانیہ میں قیام کے دوران میں میرا رنگ روپ بدل گیا تھا۔ میری صحت اچھی ہو گئی تھی۔ باقاعدگی سے جوگ کر کے اور جتنا لازم جانے سے میرا جسم متناسب اور مضبوط ہو گیا تھا۔ میرا لباس اور میرے انداز و اطوار سب میں نفاس آ گئی تھی۔

میں نے کہا ”ابھی تو میری عقل اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔“

”ایک پہنچ ہے تمہارے لیے۔ میں نے کہا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم آج کے ساڑھے تین کروڑ کو اگلے دس برسوں میں دس لکھ کر لو۔ سب تمہاری محنت اور محنت پر منحصر ہے۔“

”اور قسمت پر“ ای نے کہا۔

”وہ تو ہے ای! یہ سب قسمت ہی سے تو ملا ہے۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔ آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا راجا جانے کچھ نہیں بتایا۔“

”فون پر کیا بتاتے اور کتنا بتاتے۔ اب تم خود جاؤ گے تو دیکھو گے۔ معاملات کا کنٹرول سنبھالو گے تو سب سمجھ میں آئے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا ”آپ دعا تو کر سکتے ہیں ابھی اکی کھدا مجھے ہمت دے۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی سب ہوا ہے آج تک“ میں نے گھڑی دیکھی۔

”یہ تم بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے ہو؟“

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

ایر میری خود اعتمادی حیران کن تھی۔

میں نے اس سے اتفاق کیا "اور تیرے گناہوں کا بھی" تو مجھ دھنٹ میں تیار ہو جاؤں چائے پیے گا؟
"چائے وہ تیری عمر زاد رابعہ لاری ہے بڑی محبت ہے۔" اس نے دانت نکالے "آج تو سارے گناہ لگ رہی ہے بالکل۔"

میں نے کہا "مہاراجا! اس کے ساتھ بھی تو نے کوئی بریل تو شروع نہیں کر دیا ہے؟"
"ہوسکتا ہے کیونکہ وہ صدق دل سے چاہتی ہے لیکن کوئی پرانا سیریل ختم ہو۔ ابھی تو میں بہت مصروف ہوں۔"
"اچھا بھئی" ابھی بتاتا ہوں شہناز کو۔ تو اسے دھوکا دے رہا ہے۔ میں نے کہا۔

راجا نے ایک آہ بھری "یہ دنیا ایک دھوکا ہے نیکیے پتر۔ یہاں جو ہے سب دھوکا ہے۔ نظر کا دھوکا، عقل کا دھوکا۔"
"کسی دن شہناز دھوکے سے تجھے کوئی انگشتن ایسا لگا دے گی کہ چودہ بھٹی روشن ہو جائیں گے۔ تو کیسے آیا ہے؟ اپنی اسی دوسری جنگ عظیم والی پھٹ پھٹی پر۔ جو تو موت کے کنوئیں میں چلاتا تھا؟"

"نہیں یار۔ شہناز سے گاڑی مانگ کے لایا ہوں کہ رفتی کو لے کر آتا ہوں۔"

"گویا اب پہلے وہاں حاضری لگانی ہوگی؟"
"اتنا سیریں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو جھوٹ بولا تھا گاڑی کے لیے۔ وہاں گئے تو وہ کھول لے گی رجسٹرکاتیا۔ چلتے ہیں پریس کلب۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں ہوگا۔ دوپہر کو تو میرے اعزاز میں ظہرانہ دے گا شیرن میں۔"

ہم پریس کلب جا بیٹھے۔ میں نے راستے میں اپنے بیل فون کے لیے ایک سم خریدی اور دوپہر والا کارڈ لوڈ کر کے مطمئن ہو گیا کہ اب میں بے رابطہ نہیں رہا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے اصل موضوع چھیڑا۔

"راجا! تو نے کبھی نہیں بتایا کہ سال بھر سے یہاں کیا چکر چل رہا ہے۔ تجھے سب معلوم تھا تو نے ہی ابا کو بشارت فاروقی کی فرم کے بارے میں بتایا تھا۔"

"بتایا تو تھا۔" وہ سر کھاکے بولا "لیکن اس کے بعد میری کسی سے بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ فاروقی کوئی میرا دوست تو ہے نہیں۔ میرا کلاس فیلو تھا دس سال پہلے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ کیا کرتا ہے اور آدی بہر حال بھروسے کا تھا۔ جب تیرا فون آیا تو اس سے کچھ دن پہلے ہی انکل نے مجھے طلب کیا تھا۔ ان سے تفصیل پتا چلی۔"

"ہائے آج مجھے سب بتایا۔"
"کیسی عجیب بات ہے بالکل افسانوں، فلوں اور ٹائولوں والی۔ کسی کو خزانے کا نقش مل گیا۔ کسی کا والد رشتہ دار کرڈوں چھوڑ کے مر گیا۔ فقیر ہو گئے راتوں رات شہر اڑے۔"

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا۔"
"مجھے بشارت فاروقی نے پوری اسٹوری سنائی تو مجھے بھی چکر آ گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے نیکیے پتر کہ حسد کی آگ میرے جل کے کوئلہ ہو گیا تھا۔ میں۔ اپنے کینے دوست کو معاف کر دے۔" اس نے گلو کی لپہ ہٹایا۔

میں نے اسے تسلی دی "میں جانتا ہوں تیری فطرت کو راجا۔ دیکھی موت ہوتا۔ کتا اگر معافی مانگے کہ وہ بھونکتا ہے۔" راجا نے افسوس سے سر ہلایا "کیسی نا انصافی کی بات ہے کہ راجا میرا نام ہے اور خزانے کے مالک ہیں نیکیے۔" میں نے کہا "تو نے دیکھی ہے وہ جگہ میرا بچشم پیل اور شاہی جاگیر؟"
"دیکھی ہے بالکل مجھے ساتھ لے گئے تھے۔"

"دیکھی جگہ ہے؟"
"جگہ ایسی ہی ہے۔" وہ سوچ کے بولا "جیسے کوئی پہاڑ جس میں سونے کی کان ہو یا زمین جس کے نیچے تیل ہو۔ نکالنے والے کی ہمت پر ہے۔ اور محنت پر۔"

"قسمت پر نہیں؟"
"نہیں۔ قسمت کا کھیل تو سامنے آ گیا۔ تیری قسمت پر کون شک کر سکتا ہے؟ آگے تیرا کام ہے چاہے تو کچھ نہ کر سب سچ کے مال سمیٹ اور کبھی تان کے سو جا۔ زندگی فراغت بلکہ عیاشی سے گزر جائے گی یا چلتی بول کر لے تیرے پاس وقت ہے مواقع ہیں۔ اور ملاحیت ہے۔"

میں نے کہا "یہاں آنے سے پہلے میں بے یقینی کا شکار تھا۔"

"اور اب؟"
"اس نے مجھے غور سے دیکھا۔" میں نے چنچ بول کر چکا ہوں۔

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "مجھے تو پتا تھا اور میں نے انکل سے بھی کہا تھا کہ بس اب وہ بے فکر ہو جائیں۔ رفتی کو میں جانتا ہوں وہ ہم جو ادھر خطرات پسند ہے۔ وہ ہنسنے لگے کہ میں بھی تو جانتا ہوں آخر میرا بیٹا ہے۔"

میں نے کہا "اکثر والدین ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اسی خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ انہوں نے پیدا کیا ہے اور پردہ نش کر کے اتنا بڑا کیا ہے تو وہ اپنی اولاد کو سمجھتے ہیں۔"

"ہاں یار! میرے ابا بھی سمجھتے تھے کہ ملاحیت موروثی ہے اور میں ڈاکٹر ضرور بنوں گا۔ میں نے انہیں بہت سنا دیا۔ روپیہ کے قمر ڈویرن لی۔ قمر ڈکلاس قمر ڈا۔ مجھے داخلہ نہیں ملا۔ یہ لیکل کالج میں تو میں سمائی بن گیا۔ انہیں صحافت اور ادب کے جراثیم مجھ میں بھی نظر نہ آئے۔"

"مہاراجا! جی جی نہیں گپ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔
"دوپہر کے بعد راجا نے ایک مرغا چھاس لیا۔ اس کے ہاتھ پر کوئی کال آئی۔ اندر کنگل خراب تھا۔ وہ باہر گیا اور باہر سے آیا تو مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا "نیکیے! تیرے بچے گئے اور اپنا بھی کچھ دال دیا ہو گیا۔ چل اٹھ پانی پی چلتے جا۔"

میں نے راستے میں لندن کال کی۔ عائشہ کانون بند تھا۔ وہی وقت آفس پہنچی تھی۔ اس نے کہا "سام سے میری ابھی بات ہوئی ہے۔ وہ کچھ اپ سیٹ تھا جی کے معاملے میں۔ کچھ ہاتھ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"
"وہ غائب ہے۔ گھر سے کل رات چلی گئی تھی مگر پھر پتا نہیں کیا۔ اس کے دوست بھی کچھ نہیں جانتے یا بتائیں رہے ہیں۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہوا میں تمہیں فون کروں گی۔" وہ نے کہا۔

فریال کانون بھی بند تھا جس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سلطان وہاں موجود ہے۔ اپنی بیوی کو ٹھکانے لگانے کے بعد سے وہ لاپتا تھا تاہم اس کے لندن میں ہونے کا پتا نہیں تھا۔ تاہم یہ ہو سکتا تھا کہ اس نے کسی دوسرے نام کے پاسپورٹ سے سفر کیا ہو۔ فریال عام طور پر ہیکل نہیں مٹتی تھی۔

کچھ پر مدعو کرنے والا خشیات کے خلاف کوئی این جی او تھا تھا۔ بہت سے عیار اور مکار لوگوں نے اسے نیک نامی اور ہما کمانے کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس نے لچ کرانے کے علاوہ اسے اپنے سترج کے مشاہدات اور تاثرات پر مبنی ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا مصنف وہ خود تھا۔

"میں چھپ کر آگئی تھی۔ میں نے سوچا آپ ملاحظہ فرمائیں اور صحتی کا پیاں درکار ہوں مجھے بتا دیجیے گا۔ سو تو میں لکھی مجھ کو گا۔" اس نے جاتے ہوئے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس کے جاتے ہی راجا نے براؤن پیپر کے لفافے سے ایک کتاب نکالی۔ کتاب کے درمیان ایک اور سادہ لفافہ تھا جس پر لکھا تھا "براکر کا بیر چیک تھا۔" دیکھ نیکیے پتر! میری فروشی کی

کتنی کم قیمت مل رہی ہے مجھے۔ اس کتاب کا مصنف میں ہوں تاہم اس بد معاش کا ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تو کھوسٹ رائٹر بھی بن گیا ہے؟"
"پیسے کے لیے جو کچھ اس ملک میں معزز سمجھے جاتے والے کر رہے ہیں۔ یہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔" اس نے کہا "میں نے اس ملک کے سادہ لوح عوام کو ادھر سرکاری خزانے کو نہیں لوٹا مجھے لگتا آتا ہے۔ میں نے کتاب پر محنت کی تھی۔ میری حق حلال کی کمائی ہے۔"

میں نے کہا "تیرے اصول اور نظریات سب بدل گئے ہیں؟"
"یہ دنیا اور یہ کائنات جب سے بنی ہے۔ ہر لمحہ بدل رہی ہے۔" اس نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا "شبات ایک تعمیر کو ہے زمانے میں۔ یہ علامہ صاحب نے فرمایا تھا۔ اس حقیقت کو سمجھ نیکیے پتر! اور حیران ہونا چھوڑ دے۔ تو تیرے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟"

میں نے بڑے دکھ سے سر ہلایا "محاورے کے برعکس دو مرغیوں میں ملّا حرام ہو رہا ہے۔ حالانکہ ملا انٹری نہیں ہے۔" اس نے گاڑی کو شہناز کے ٹیکس پر روک دیا "سب محاورے الٹ گئے ہیں۔ اب چراغ تلے نہیں اوپر اندھیرا ہوتا ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایسا تو فلموں کے علاوہ زندگی میں بھی ہوتا ہی رہتا ہے۔ حالات کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے۔ بالآخر ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"نہیں یار! حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں خرابی کیا ہے؟"

یار! دولڑکیاں مرنی ہیں تجھ پر ایک دیکھی دلائی۔ ایک تجھے ضرور ملے گی دوسری کا ہو جائے گا کوئی نہ کوئی ڈیپوڑل۔ ہو سکتا ہے دونوں کو تیری منکوحہ کہلانے کا اعزاز حاصل ہو۔ کیا حرج ہے اس میں بھی؟ زندگی کی گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے۔ تین پر کٹھا چنا ہے کہ نہیں۔ بس ذرا شور زیادہ ہوتا ہے۔"

"مہاراجا! میں نے کہا "سیریس ہو جاؤ نہ میں ہاتھ مار دوں گا۔"

"اوکے۔ اوکے! غور کریں گے تیرے مسئلے پر بھی۔"

ابھی شہناز کو مت بتانا کہ مجھے پچاس ہزار کا چیک ملا ہے۔"

یہ بڑی عجیب بات تھی۔ سارے زمانے میں چکر چلانے والا ذہن اور فطین۔ بلکہ چالاک اور مکار زمانہ ساز اور معاملہ فہم راجا شہناز سے ڈرتا تھا۔ وہ ایک بے ہاک معافی

خراب جگہ ہے۔ وہاں کا ماحول انتہائی غیر شرطانہ ہے۔ وہاں زمانے بھر کے بکڑے ہوئے لوفرو اور جرائم پیشہ رہتے ہیں۔ زیادہ تر سیاہ فام ہیں۔

میں نے کہا "یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟"

"میں نے عائشہ کی ماں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک تو وہ بچی کی وجہ سے آپ سیٹ تھی۔ دوسرے وہ کچھ فطری طور پر بدنام اور بد زبان عورت ہے۔ مجھ پر برس پڑی کہ تم کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے۔ وہ خود تو چلا گیا، ہم ابھی تک مصیبت میں ہیں۔ تم کہا اس کی ایجنٹ ہو۔ کیا مقصد ہے آخر اس انکوائری کا؟ میں کیا کہتی میں نے پھر اس سے

بات نہیں کی۔ میں نے عائشہ کے باپ سے پوچھا۔ بے چارا بچی کے لیے بہت دھمکی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ڈالی ضمانت پر عائشہ کی رہائی کے لیے پولیس اسٹیشن جا رہا ہے۔"

"سوئی ایہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر پولیس کو عائشہ کے اس ہوش میں رہنے سے کیا پریشانی لاحق تھی۔ وہ خود مختار رہے جہاں چاہے رہے کیا پولیس نے لیڈی سیلیا ارسٹ کے دباؤ پر اسے وہاں سے گرفتار کر لیا۔"

"نہیں وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ دراصل کل رات کو وہ کسی نائٹ کلب میں تھی۔ وہ بھی انتہائی غیر شرطانہ اور کسی حد تک غیر محفوظ علاقے میں ہے اور وہاں بھی زیادہ تر کالے ہی جاتے ہیں۔ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ عائشہ بھی لڑکی اس ماحول میں تھی کسی سٹ ہو گی۔ خیر آدمی رات کے بعد وہ کسی کالے کے ساتھ تھی۔ ان کے پاس ایک پرانی غیر صحت دالی گاڑی تھی۔ ایک کالا اسے چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ کوئی

کالی لڑکی بیٹھی تھی جو اسے شراب پلا رہی تھی۔ جب پولیس نے انہیں گرفتار کیا تو وہ ایک چرچ کے سامنے کھڑے ایک شخص کا گانا گارہے تھے۔ تم نے سنا ہوگا۔ لو آن دی روڈ۔ جیسے والی سیٹ پر عائشہ ایک اور سر منڈے جیٹھی لو جو ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان کے لباس نامکمل تھے اور کار چلانے والے کے بارے میں پولیس کا خیال ہے کہ اس نے کچھ بھی نہیں بہن رکھا تھا۔ جب اسے اتارا گیا تو پتا چلا۔"

"اوہائی گاڈ! کیا عائشہ بھی شراب کے نشے میں دھت تھی؟ میں نے بڑے دکھ سے پوچھا۔"

"نہیں رتیسی اس نے ڈرنکزی نہیں۔ میری دق۔ لیکن تم تو جانتے ہو وہ اس کی عادی نہیں ہے۔"

"عادی نہیں ہے تو ہو جائے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خود کو احساس جرم کی اذیت سے کیسے دور رکھوں۔ یہ سب بہر حال میری وجہ سے ہوا۔ اگر اس نے خود کو تباہ کر لیا تو میں

ہم سائے سپیدہ طرم کی ہوتی ہے مگر اس سے پہلے کہ شہناز کچھ بتا دیا جا جائی صفائی پیش کرتا میرا اسل فون بنگتے۔

میں نے سی ایل آئی پر دیکھا تو یہ سوچی کا نمبر تھا۔ میری بوسے جواب میں اس نے کہا "رتیسی! انتہارے لیے ابھی نہیں ہے۔"

میں نے پریشان ہو کر کہا "عائشہ تو ٹھیک ہے۔؟"

"آئی ایم سوری!" سوچی بولی۔

مجھے اس کی آواز بہت دور جاتی محسوس ہوئی۔ کسی اہمیت کی طرح جو پہاڑوں کے درمیان بھٹکی ہوئی اپنا وجود بھی کر دیتی ہے اور ستارے میں ڈفن ہو جاتی ہے۔

میں نے خود کو جیسی طور پر بدترین جذباتی مدد سے لے چار کر لیا۔ چند سیکنڈ کے پُر آزار محسوس کے اس واقعے میں خود ہی احساس کی عدالت نے مجھ پر فوج عائد کر دی تھی۔ عائشہ کے قاتل تم ہو تم اگر چاہتے تو وہ زندہ رہ سکتی تھی مگر تم نے اسے مرنے دیا۔ تم نے اسے ٹھکرادیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس جذباتی بحران کے بعد وہ زندہ نہ رہ سکے گی اور تم نے

دیکھا کہ اس نے اپنی جان لے لی صرف تمہاری وجہ سے۔ چند سیکنڈ کے اس پُر آزار واقعے میں میرے تصور نے مجھے وہ دب دہشت ناک مناظر دکھادیے جو ہنسی مسکرائی، محسوس اور توانا، حسن و رعنائی کے احساس سے معمور زندگی کی تصویر نظر آنے والی عائشہ کی موت سے منسوب تھے۔"

پھر میں نے دل کو مضبوط کیا اور کہا "سوچی! تم خاموش کیوں ہو۔ کیا وہ مرنے کی؟ اگر اس نے خودکشی کر لی ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"خودکشی..... اوہ نو! خدا نہ کرنے ایسا مت کہو۔ دلک۔ پیچتر آپ..... حالات اتنے بھی خراب نہیں ہیں۔ سوچی نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

میں نے محسوس کیا جیسے میرے وجود کو دبانے والی بھاری چٹان ہٹ گئی ہے اور اب میں سانس لے سکتا ہوں۔ پھر کیا ہوا ہے؟"

سوچی نے کہا "کچھ نہیں..... وہ دراصل عائشہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔"

"گرفتار کر لیا ہے۔ مگر کیوں؟"

سوچی نے کہا "اس کی اپنی ماں سے لڑائی ہوئی تھی۔ بس اس کے بعد وہ مگر سے چلی گئی اور لوٹ کے نہیں آئی۔ ماں کا خیال تھا کہ وہ کسی دوست کے ساتھ ہوگی۔ اس نے ہر جگہ معلوم کیا اور بالآخر کسی نے اسے بتا دیا کہ عائشہ ایک ہوش مل چلی گئی ہے۔ وہ سخت پریشان ہوئی کیونکہ وہ ہوش بہت

نے کہا "تم کیا اس کے لیے کام کرنے لگے ہو؟"

راجا نے برہمی سے کہا "یہ کیوں کرتا ہے۔"

میں نے کہا "کبواس کیا..... چیک اس کی جبر ہے۔"

شہناز نے ہاتھ آگے بڑھایا "راجا۔ چیک دو مجھے۔"

راجا نے بڑی فرماں برداری سے چیک شہناز کو دے دیا۔

شہناز نے چیک کو غور سے دیکھا اور پھر اس نے دیکھ کر دے "تم اتنے گرہے ہو مجھے یقین نہیں آتا۔"

راجا نے سر پکڑ لیا "یہ تم نے کیا کیا شہناز! میں نے کوئی کام نہیں کیا مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔"

میں نے کہا "میں بتاتا ہوں؟ تم نے کیا کیا ہے؟ شہناز نے سزج لکھا ہے۔ ایک نشیلت کے آئینہ کے نام سے وہ کتاب شائع ہوئی ہے جس نے بھی عمر تک نہیں کیا کیا نئی ہے۔ راجا نے دوسروں کے سرتارے دیکھ کر سب کو

دیا۔"

شہناز کے سامنے راجا کی وہی حالت تھی جو تھانے

کا نام تھا۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے ہی تھے کہ شہناز آگئی۔ "یہ انتظار کر لیا آپ نے رتیسی بھائی۔ میں تو صبح سے انتظار کر رہی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر راجا نے کہا کہ مشکل سے گاڑی ملی ہے۔ پہلے کچھ آوارہ گرد کی لیں پھر آرام سے چلیں گے۔"

تھا۔ خطرات مول لے کر رپورنگ کرتا تھا اور اندر کے راز افشا کرنے کے چکر میں بار بار اپنے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی پٹائی تو کئی بار ہوئی۔ ایک بار کسی وزیر صاحب نے اپنے خلاف کرپشن کے ثبوت منظر عام پر لانے کے جرم میں راجا پر قاتلانہ حملہ بھی کر لیا۔

لیکن اسے میں شہناز کے سامنے نہیں ملی بنا دیکھتا تھا تو مجھے حیرانی ہوتی تھی۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ وہ شہناز کو بے وقوف بنانے کے لیے اداکاری کرتا ہے۔ جیسے باہر دوسری لڑکیوں پر ڈور سے ڈالنے کے لیے کرتا تھا مگر یہ حقیقت تھی۔

شہناز اس کی کزن تھی۔ وہ میڈیکل کے فائل ایڈیٹر تھی جب راجا پر ایک اس کے عشق کے دائرے کا شدید حملہ ہوا۔ اس سے پہلے وہ شہناز سے دور بھاگتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدرت نے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔

موت زندگی کی طرح عشق کا نام نہیں انسان نہیں بنا سکتا۔

شہناز ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرے نکتہ نظر سے خود بھی خوبصورت نہیں تھی۔ دہلی بلی اور سالونی۔ قد میں راجا سے دو انچ زیادہ۔ عمر میں راجا سے دو سال بڑی۔ اس کی صورت کے نقوش تھکے تھے آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور بال

حرمت انگیز حد تک لیے تھے مگر اس کی شخصیت کی سب سے بڑی دلچسپی اس کی مسکراہٹ تھی۔ دائمی پر غلوس اور مہربانی۔ اعتماد جگانے والی اور حقیقی۔ وہ نکلتے لہجے میں بات کرتی تھی اور اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ تھا۔ تین سال سے راجا کے

سحر میں گرفتار تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ رکاوٹ ڈالنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ خود شہناز نے راجا کے سامنے کچھ شرائط رکھی تھیں۔ راجا کے الفاظ میں وہ یہی تھی کہ تم سے شادی کر کے میں اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتی۔ پہلے تم سدھر جاؤ۔ اور اپنی تمام تر کوشش کے باوجود راجا سدھرنے میں

ناکام تھا۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے ہی تھے کہ شہناز آگئی۔ "یہ انتظار کر لیا آپ نے رتیسی بھائی۔ میں تو صبح سے انتظار کر رہی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر راجا نے کہا کہ مشکل سے گاڑی ملی ہے۔ پہلے کچھ آوارہ گرد کی لیں پھر آرام سے چلیں گے۔"

راجا نے مجھے گھورا "یہ مجھے بچے بڑے کیا تھا۔"

"بھوت مت بول راجا! تو اس نشیلت فروش نے کر لیا ہے میں بی بی کی میں۔ جس نے تجھے پچاس ہزار بھی دیے ہیں۔"

"پچاس ہزار دیے ہیں۔ کس بات کے؟" شہناز

ڈراما میں شائع ہونے والا پراسرار اور خوفناک ناول

کلائمٹر

ایم الیاس

قیمت 200 روپے

اس مضمون پر کی کہانی جس کے سینے میں انتقام کی چنگاری روشن ہے۔

جو کی کون تھا؟ اس کا لائنز کس نے لکھا؟

کالے سنزور بنگال کے خطرناک جاوہر کا خوفناک ٹکڑا۔

جو کی ————— جو غلاموں کے لئے تھیں بن گیا۔

اسے قریب 20 سال تک اس کے طلبہ نے اس کی یادداشت کی ہے۔

کی قیمت اور ڈراما کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات کے لئے

پراسرار اور خوفناک ناول

ایم الیاس

قیمت 200 روپے

ایم الیاس

قیمت 200 روپے

خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا سوئی مجھے بتاؤں کیا کروں؟“
اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا ”رنگ ایک انٹری“
انتہا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ایسا کچھ نہیں ہوگا جیسا تم
سوچ رہے ہو۔“

”ایسا ہوتا ہے سوئی! فرشتہ جب بغاوت کرتا ہے تو
شیطان بن جاتا ہے۔“
اس نے کہا ”میں سمجھتی ہوں کہ عائشہ کی اس حالت کی
ذمے دار تم سے زیادہ اس کی ماں ہے۔ اس بے وقوف عورت
کو سمجھنا چاہیے تھا کہ اس کی بیٹی ایک جذباتی صدمے سے
گزر رہی ہے۔ شاک کی کیفیت میں ہے۔ عائشہ کو ایک ہمدرد

یاں کی آغوش کی ضرورت تھی کسی غمگین دوست کی ضرورت
تھی کسی سخت گیر گھر کی نہیں جو اس کو لپٹ لپٹ کر لے۔ اس کا
باپ موجود ہوتا تو ایسی صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ تم جانتے ہو
وہ کتنا معقول آدمی ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ
سب ٹھیک کرے گا۔“

”عائشہ مجھے باپ پر بہت بھروسہ کرتی ہے۔“
”میری تو سمجھ میں نہیں آتا رنگ! ان دونوں نے اتنے
سال کیسے گزار لیے۔ سیلیا نے اور سام نے۔ زمین آسمان کا
فرق ہے مہاں بیوی کی فطرت میں۔ سیلیا تو لارڈ ارنسٹ سے
شادی کر کے لیڈی سیلیا ارنسٹ بن گئی مگر لارڈ ارنسٹ کو کیا
ملا؟ اس کی قوت برداشت کی بھی داد دیتی ہوں کوئی اور
سیلیا کے ساتھ گزار رہی نہیں کر سکتا تھا۔“

میں نے کہا ”وہ رومن کیسٹول ہیں۔ طلاق ممکن نہیں
تھی۔ اس لیے گزر کر رہنا پڑا ہے۔ نقصان تو ہو رہا ہے
عائشہ کو۔ وہ کتنی ذہن اور پُر اعتماد لڑکی ہے۔“

”اسی لیے مجھے امید ہے کہ حالات ٹھیک ہو جائیں
گے۔ عائشہ ایک باہمت اور مضبوط کردار کی مالک ہے۔ یہ جو
دقیقہ ردعمل ہے یہ بالکل نادر ہے۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتی
تو ایسے ہی کرتی۔ تم اس اپنا خیال رکھو میں تمہیں بھروسہ کروں
گی۔“

”ہلیز..... مجھے صورت حال سے باخبر رکھنا۔ میں تم پر
یہ بھروسہ کرتا ہوں اور دیکھو۔ موقع ملے بات کرنے کا تو
اس جذباتی لڑکی کو بھی سمجھنا۔ وہ تمہاری عزت کرتی ہے
ہائی۔“

جب میں لوٹ کے اندر گیا تو میرے دل میں احساس
جرم کی ایک غلٹ تھی جسے عقل کی یہ دلیل نہیں دے سکتی تھی کہ
سات سمندر پار ایک عامل و بائع لڑکی اپنی زندگی کے سارے
فیصلوں میں اپنے اختیار کو کیسے استعمال کرتی ہے اس سے اب

نہیں کر سکتی تھی۔ میرے
مرنے کے بعد تم کسی ایسے آدمی سے شادی کر لینا۔“
شہناز کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے راجا کو اپنی طرف
سمجھایا ”راجا! خدا کے لیے ایسا بائیس نہ کرو۔ میرا ہرگز یہ
مطلب نہیں تھا۔ یہ سب میں اس لیے کہتی ہوں تم سے کہ
میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہارے بغیر میری زندگی کا
کوئی مطلب نہیں میں کسے زندہ رہوں گی۔“

راجا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ”ج
نہیں ہو۔“
”بالکل ج“ راجا کے ڈرامے نے شہناز کو سخت جذباتی
کردیا۔

راجا نے اس کے دونوں ہاتھ تمام کے چومے اور بولا۔
”اجما..... پھر میں اپنا مرنے کا پروگرام ملتوی کرتا ہوں۔۔۔
لالا..... پارڈرا انجی کی کافی بنا کے لاؤ۔“

میں نے کہا ”اس سالے ڈراما باز کی کافی میں زہر
لا کے لانا تو لگ ایکسے سامنے رکھ کے کہنا کہ بی کر دکھائے۔ تم
بھی ملاوید ستار ہو جاتی ہوڈا اکثر شہناز۔“

شہناز نے جھینپ کر مجھے دیکھا اور کافی بنانے چلی گئی۔
اس کے جاتے ہی راجا مجھ پر برس پڑا ”ابے میں نے کیا
تیرے باپ کی جائداد اچھی لکھی یا تیری گھروالی اٹھالی تھی۔
کیوں دشمنی کرتا ہے مجھ سے ملاوید کی۔“

میں نے کہا ”پارڈرا میں تو کچھ بھی نہیں کیا۔“
”انوکے پٹھے اتنی آگ لگا کے کہتا ہے میں نے کچھ نہیں
کیا۔ ابے ایک ضرورت تھی تجھے اتنا جج بولنے کی۔ پیٹ میں
روہ ہو رہا تھا۔ یا نہیں اور۔ چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تو ہے
بے وقوف۔ ہوا تیرا مارا چپک چھاڑ دیا۔ میں کل دوسرا انوکوں
گا۔“

میں نے کہا ”مہا داجا! شہناز بے وقوف ہوتی تا تو کب
کی تیرے چکر میں آ کے برباد ہو جاتی۔ جیسے کہ خود کو بہت
چالاک اور قابل سمجھنے والی بہت سی لڑکیاں ہوئیں۔ یہ شہناز
کی کمال ہے کہ اس نے تیرے جیسے پرانے چکر باز کو چکر
میں ڈال رکھا ہے۔“

”مگر بار یہ ہر وقت کی کب ایک اور نصیحت۔ مجبور نہیں
تھانے دار بنی ہوئی ہے۔ پیار سے کبھی بات ہی نہیں کرتی۔
ہر وقت میرے اخلاق و کردار کے پیچھے بڑی رہتی ہے۔ تنگ
آ گیا ہوں میں بھی۔ کن دن واقعی خود کی کرلوں گا بھاگ
جاؤں گا تو روٹی رہے گی عمر بھر..... جیسے ابھی رو رہی تھی۔“

”نہیں راجا! تو کہاں جا سکتا ہے اس نے بڑی مضبوط
کردیا۔

راجا نے اس کے دونوں ہاتھ تمام کے چومے اور بولا۔
”اجما..... پھر میں اپنا مرنے کا پروگرام ملتوی کرتا ہوں۔۔۔
لالا..... پارڈرا انجی کی کافی بنا کے لاؤ۔“

میں نے کہا ”اس سالے ڈراما باز کی کافی میں زہر
لا کے لانا تو لگ ایکسے سامنے رکھ کے کہنا کہ بی کر دکھائے۔ تم
بھی ملاوید ستار ہو جاتی ہوڈا اکثر شہناز۔“

شہناز نے جھینپ کر مجھے دیکھا اور کافی بنانے چلی گئی۔
اس کے جاتے ہی راجا مجھ پر برس پڑا ”ابے میں نے کیا
تیرے باپ کی جائداد اچھی لکھی یا تیری گھروالی اٹھالی تھی۔
کیوں دشمنی کرتا ہے مجھ سے ملاوید کی۔“

میں نے کہا ”پارڈرا میں تو کچھ بھی نہیں کیا۔“
”انوکے پٹھے اتنی آگ لگا کے کہتا ہے میں نے کچھ نہیں
کیا۔ ابے ایک ضرورت تھی تجھے اتنا جج بولنے کی۔ پیٹ میں
روہ ہو رہا تھا۔ یا نہیں اور۔ چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تو ہے
بے وقوف۔ ہوا تیرا مارا چپک چھاڑ دیا۔ میں کل دوسرا انوکوں
گا۔“

”تو کیا..... وہ پھر آپ کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟“ وہ بولا۔

میں نے کہا "میں نے چار سال امریکا میں گزار دیے۔
اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ اس کے بعد لندن میں بہت اچھی نوکری
مل گئی۔ دو سال اچھے گزار گئے۔"

”اچھے کیسے نہ گزرتے شہناز! اس کے لیے تو دن عید اور رات شب برات۔ پوچھنے والا کوئی نہیں کہ فیکے پتر اُلسی شراب پیتے ہو یا دلالتی دھنسل“ راجا نے کہا۔

شہباز نے اسے گھورا ”بھئی تو سر میں ہو جایا کرو۔“
 راجا نے قہقہہ مارا ”شنو ڈارلنگ! وہ دونوں اس کی
 جان کے دوپے ہیں، پوچھ لو اس سے۔ ایک فریال ہی لندن
 میں کیا کم تھی کہ دوسری مقابلے پر آگئی۔ ارڈر اسٹ کی دختر
 نیک اختر! لیلیا۔ اس کی خاطر وہ عائشہ بھی ہوگئی، اب بے
 جا رہ فکا کیا کرے؟“

میں نے کہا ”راجا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مزید مشکل یہ ہوگئی کہ اباجی نے اپنا دائرہ شای فرماں جاری کر دیا کہ سب جموں کے پاکستان آ جاؤ کیونکہ تمہارے نام قسمت کی لاشیٰ لکھل آئی ہے اور تم بن گئے ہو کر دو تھی۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں رفیق بھائی۔ آپ کو کیا ضرورت ہے پردیس میں نوکری کرنے کی۔“

”یہ تو خیر ٹھیک ہے مگر معاملات بہت پے چیدہ ہیں شہناز۔ اب تم فریال کو ہی لو۔ اپنے پاؤں میں بیڑی اس نے خود ڈالی۔ مندر سلطان سے معافی کر کے۔“

”لیکن یہ فیصلہ کرنے والا تو اس کا باپ تھا۔“
 ”نہیں شہناز! اپنے لیے یہ عذاب خود فریال نے مول لیا۔ جب منصور سلطان نے اسے پہلی بار دیکھا تو اس کے حسن

پرفریٹ ہو گیا تھا۔ فریال کے کالج میں کوئی تقریب بھی جس میں وہ مہمان خصوصی تھا۔ اس نے فریال کو ڈرائے میں بفرار کرتے دیکھا اور کنریب کے بعد اس سے ملتا تو اسے اپنی قلم میں ایئر رول کے لیے آفر دے دی۔ اکثر لڑکیاں تو ایسے ہی خواب دیکھتی ہیں۔ اس کے لیے بڑے جن بھی کرتی ہیں

اور دوسرا سی بہت ہوتی ہیں۔ فرمایا لیو جیسے لائری نکل آئی۔
کے کالج میں دویم سچ مٹی کر کے ایک فلم میں ہیرن کے
لے سائن کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ معاملہ صرف زبان کا تھا۔
سلطان جیسے عیاش اور ادبش دولت مندوں کے ہاتھ
جس میں ایک حال کی طرح ہوتے جس میں لوکمان دن

رات بچھتی رہتی ہیں۔ فریال کو اپنی ہوشیاری پر بہت ناز تھا اور اپنے حسن پر بھی۔ اسے یقین تھا کہ پہلا فلم ریلیز ہونے سے دو فاسی آسمان کاسب سے روشن ستارہ بن کے چلنے لگی۔ اس کے دروازے پر فلساڑوں کی لائن لگ جائے گی جن میں صدر سلطان بھی شامل ہوگا۔ صدر سلطان یہ کھیل تو کھیل ہی رہتا تھا۔ اس نے ایکریمنٹ کیا اور ایک لاکھ ایڈوائس بھی دے دیا جو فریال کے باپ نے وصول کیا اور اٹھانے سے بھی لگادیا۔ کچھ شراب میں اور کچھ بازاری موقوفوں پر جو اسٹورڈ میں شکار ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ فریال نے صدر کی پیش قدمی کے سارے حربے ناکام بنا دیے تو اس نے آخری وار آزمایا۔ اس نے فریال کو شادی کی پیشکش کر دی۔ وہ فریال کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ فریال نے اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ شادی تو میں ابھی نہیں کر سکی۔ جب تک یہ فلم ریلیز نہ ہو جائے۔ صدر نے ایسی بہت سی فلموں کے اعلانات پہلے بھی کیے تھے جن کی کئی ہیروئن بڑی آسانی سے ترغیب کے حال میں بھینچ جاتی تھیں۔ وہ ایڈوائس لیتی تھی پھر اس کی قیمت ادا کرتی تھی اور اپنے دامن میں روائے کے داغ اور دل میں پراشار بننے کی حسرت لے کر رخصت ہو جاتی تھی۔ فریال نے ابھی تک اسے قریب بھی نہیں چھلکنے دیا تھا۔ اس کا دفاعی مصداق توڑنے کے لیے صدر سلطان نے مفتی کا باضابطہ اعلان کر دیا اور فریال اس خوش فہمی میں رہی کہ مفتی کوئی نکاح تو نہیں ہے۔ جب وہ شہرت کے آسمان پر ہو گی تو صدر جیسے نہ جانے کتنے اس کے پیچھے مہلا میں چڑے اور وہ سب کو دھکاردے گی۔ صدر سلطان کی اس وقت کیا مجال ہو گی کہ مفتی کے نام پر اپنا حق جتا سکے لیکن فریال نے اسے سارے اندازے غلط ہو گئے۔ اگر صدر کو کچھ نہیں ملتا تو فریال کے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا اور ہیروئن میں زنجیر ملاجہ نہ پڑتی۔ یہ فلم بنی اور وہ ہیروئن مگر صدر سے چانچر ناشکل ہو گیا۔ وہ ایک سیاسی ڈیڑا رزمیندار اور صنعت کار خود کو حسن کا شکاری سمجھنے والا۔ اس نے اپنی تخت سکی محسوس کی۔ چپے پیچھے اس کے حواری بھی مذاق اڑانے لگے کہ کڑی قابو نہ آئی۔ اس انارپست اور کینہ پرور شخص نے اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنالیا۔ اس نے فریال کو بھی دو رنگ دے دی کہ تعلقات میں محتاط رہے کیونکہ اب وہ صدر سلطان مرزا کی گھیر ہے جس سے بالآخر اس کی شادی ہوتی ہے۔ فریال کو جب اندازہ ہوا کہ وہ کتنی ہی طرح بچھن مچی ہے۔ ان سب نے جو فریال کے ساتھ تعلق تھے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنی

وہ اپنے ہوشیاری پر بہت مجبور تھا۔ اس نے سب کو
 جواب دیا تھا کہ وہ جب چاہے گی کہ جتنی توڑ دے گی۔
 اس سے زبردستی شادی نہیں کر سکتا اور مندر سلطان
 نے دیکھی کہ وہ دھمکتی ہوئی تھی۔ بے وقوف لڑکی یہ نہیں
 سمجھتی کہ مندر سلطان جیسے لوگوں سے تو قانون بھی نہیں
 کر سکتا کیونکہ قانون خود ان کا زرخیر رہتا ہے۔ فریال پہلے
 جانے لگی تھی کہ اس کی اہلی بھائی نے اسے کہا ہے بھراؤ
 مندر سلطان داخل دیکھا کہ مجھے کوئی جلدی نہیں
 ہے۔ تم بھولنا کہ تم میری ہو۔ اگر تم نے کسی اور کی طرف
 لپکتی ہو تو میں تمہاری طرف تو بھری میری غیرت کا مسئلہ
 ہے۔ اس کی کوڑہ نہیں چھوڑوں گا۔ فریال نے کہا کہ
 اس کے لیے لندن جا کے فیشن ڈیزائنر کا کورس کرنا
 ہے۔ اس نے کہا کہ جاؤ۔ لیکن اس کے بعد سوائے شادی
 کوئی شے نہیں ہوگی۔ چار ماہ بعد یہ کورس ختم ہو جائے گا۔
 ”اور اب فریال کیا کہتی ہے؟“ شہناز نے گھر مندی
 کیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی "اب وہ چاہی ہے کہ میں
کچھ کروں اور کچھ نہیں کر سکتا تو پھر صغیر سلطان کو ٹل کر دوں یا
نہ دوں۔"

”اس میں کیا شک ہے۔ وہ پاگل سے اور اس سے بڑا
 دل میں ہوں ورنہ صرف کہہ دیتا کہ اپنا کیا بھگتو، آپ میں کچھ

میں کر سکتا اور اس کے بعد اس کے معاملات سے قطعی لائق
 کے عائشہ سے شادی کر لیتا مگر فریال کے سامنے میں ہے
 میں ہوں وہ مجھ سے کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

”تو کیا تو نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟ تو مصدر سلطان کو ملے گا؟“ را جانے کہا۔

اے۔ اس کے بعد صفدر سلطان اس سے زبردستی شادی
لے گا۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں
ہے۔ اگر میں نے یہ کام نہ کیا تو پھر وہ خود صفدر کو قتل کر دے
گا۔“

”اور اس کے بعد.....“

”میں نے سمجھایا تھا ہے۔ مندر سلطان کو مل کر نایا کرنا
ای آسان کام ہے۔۔۔۔۔ مگر وہ سمجھتی ہے کہ آسان ہے۔ اس
دماغ ایسے ایسے سوچتا ہے۔ اس کے دماغ پر مرمز اسٹوریٹ
رجا سوئی فلموں کا اثر ہے۔ کہتی ہے کہ کام ہوشیاری ہے کہ
میں نے سمجھایا تھا ہے۔ مندر سلطان کو مل کر نایا کرنا

”مگر تمک تو براہ راست تم دلوں پر ہی جائے گا“
شہناز نے کہا۔

”ظاہر ہے اور جو کام اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سرانجام رساں
مضل سے لیتے ہیں وہ یہاں تیرہ نمبر کے مجسٹر سے ہو جاتا
ہے۔ مجر بھی اعتراف جرم کر لیتے ہیں۔ میں کہاں مقابلہ
کر سکتا ہو پولیس کے پُر تشدد دہروں کا لیکن یہ بات اس کی سمجھ
میں آئے گی جب مجھے پھانسی ہو جائے گی۔“

شہباز نے دہلی کے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”میری بات منہ سے نہ نکالیں رفیق بھائی اور حوصلہ رکھیں۔ نکل آئے گا اس کا بھی کوئی حل۔“

میں نے کہا "مسلّم صرف فریال ہی کا بیس ہے شہناز عاقل کا بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سمجھانے سے وہ سمجھ جائے گی۔" اس نے ہر جمہوری کو قبول کر لیا ہے۔ اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیا ہے کہ نہ میں اس سے شادی کر سکتا ہوں کیونکہ میں فریال کا بچہ چاہتا ہوں اور نہ وہ میرے ساتھ یہاں ساری زندگی گزار سکتی ہے۔"

”اس نے تو آپ کی خاطر اٹھنا دھب تک چھوڑ دیا۔“
میں نے کہا ”وہ ماں باپ اور گھر اور وہ ملک۔ سب کچھ
چھوڑنے کو تارے میں اس کے جذبات کی قدر ضرور کرتے

ہوں لیکن تم خود سوچو کہ جس شاہانہ ماحول میں اس نے پرورش پائی ہے لندن کی آزاد فضا اور برطانیہ جیسا ملک جمہور کے پاکستان میں رہ سکتی ہے؟ میرا خاندان تو خاصا دقوالوسی ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی قدروں کے اعتبار سے ابھی تک شاید انیسویں صدی کا ماحول ہے۔ کیا وہ میرے گھر کی چار دیواری میں وہ زندگی گزار سکتی ہے جو میری ماں نے گزاری۔ اس کے

پاکل پن کی انتہا تو یہ ہے کہ میرے ساتھ آنے کے لیے اس نے دیر لے لیا تھا اور اپنی سیٹ بھی بک کر اٹی تھی۔“

شہناز محمد دہسروہ گئی، ”اچھا؟ پھر آئی کیوں نہیں۔“

”ظاہر ہے میں نے روک دیا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد اس جذباتی صدمے کا اثر باقی نہیں رہے گا۔ وقت

ایک کو لگ نے بتایا ہے کہ عائشہ کی وجہ سے اس کے والد پر بہت پریشان ہیں۔ اس کی ماں ہمیشہ سے میری مخالف بلکہ

رودہ فیر ہر دو دن ہے۔ اب وہاں والدین اپنی مرضی چلاتے ہیں، لڑکی خود مختار ہے، باپ کی کہنی میں اچھے عہد پر ہے۔ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار ہے۔ ماں کی اس سے لڑائی ہوئی اور وہ جسے گھر سے علی گئی۔ نہ جانے کہاں اور کس

جواب ہی کرا سکتے ہیں۔“
 اسے عرصے بعد بھی انہوں نے آپ کا سراغ تلاش
 کرنا شہزادے نے فکر مندی سے کہا ”آخر یہ لوگ آپ کا پیچھا
 ہونے لگیں نہیں دیتے۔“

شہاب الدین نے صاف تو نہیں کہا مگر اشاروں میں واضح کر دیا کہ یہ کام ہو جائے تو آئندہ کوئی خدمت میرے سپرد نہیں کی جائے گی لیکن میں نے انکار کیا تو مجھے سزا ضرور ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ سزا میرے گھر کو اور میرے مستقبل کو بھی متاثر کرے۔ دراصل شہاب الدین آج کل مستحب ہے۔ اس کے سیاسی حریف پادری میں ہیں اور یہ لوگ پیچھے پھرتے ہیں۔ ان کے خلاف اب پرانے کیس درج ہو رہے ہیں۔ جو محسوس دبا دیے گئے تھے نکالے جا رہے ہیں۔ ابھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں جو انہوں نے دوسروں کے

ماٹھ کیا تھا وہی اب ان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ کچھ جان بچا کے فرار ہو گئے ہیں۔ باقی بھی نکلتا جا رہے ہیں۔ شہاب نے ان کے ساتھ ایک اور مدعا پیش کیا کہ شاہ نے برطانیہ میں

لین کے ساتھ ایک اور بدھ کا سہارے شاہ نے برطانیہ میں
سیاسی پناہ مانگی ہے۔ ان کی پارٹی کے دو باغی جنہوں نے
حکومت کر کے اپنا گروپ بنانے کی کوشش کی تھی پہلے ہی
برطانیہ میں ہیں اور ان کے کیس پر ابھی تک ہوم آفس نے

[illegible]

”کیوں.....؟ ان کا کیا خیال ہے کہ برطانوی زیرِ اعلیٰ حکم تیرا ماں ہے؟“

”ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ لارڈ ارنسٹ کی بیوی لیڈی ہیلنا کتنی متعجب عورت ہے اور عائشہ کے معاملے میں وہ

میں نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ آپ نے ایک نیا فلم بنائی ہے۔" وہ نے کہا: "جی ہاں، میں نے ایک نیا فلم بنائی ہے۔" وہ نے کہا: "جی ہاں، میں نے ایک نیا فلم بنائی ہے۔"

ہے کہ اگرچہ اس خیالِ افہام کی ضرورت ہے کہ اگرچہ اس خیالِ افہام کے

بہترین کاغذ، خوبصورت پرشنگ اور فوم والی جلد کے ساتھ

بہترین کاغذ، خوبصورت پریشک اور فوم والی جلد کے ساتھ

قیمت 400 روپے

سیریس

بلیکس کنول

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

اے ماکڑا خیر و کمال ہے ملا فراخ



علی میاں پبلیکیشنز
۲۰- عرفان ٹرائٹ
اردو بازار لاہور
07247414

اشاکٹ

عالمی ہسپتال
بست روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

کو۔ میں دوسرا حل تجویز کرتا ہوں۔ تیرے پاس جو تھوڑی بہت عقل ہے وہ بھی فی الحال کام نہیں کر رہی ہے مگر میرا داغ پوری طرح اکیٹھ ہے۔ آدی کو سب کی کن کنی چاہیے کیا جاتا جس کا شور و کام کر جائے۔

میں نے کہا، ”او کے۔ میں تجھے پانچ منٹ دیتا ہوں۔“

”یار اتونے بھی تو کچھ سوچا ہوگا؟“ راجا بولا۔

”میں خاک سوچوں۔ میرا بس چلنا تو میں لخت بھیجتا ترقی اور خوش حالی کے ان تمام منصوبوں پر جن کی بنیاد اس حویلی اور جاگیر پر رکھی گئی ہے۔ میں یہ سب کچھ مجھ کے اماں ابا کے ساتھ بھاگ جاتا لندن۔ لیکن میرے لیے ابا کو مٹانا اس لیے ناممکن ہے کہ ان کا راستہ روک کے کھڑی ہیں ان کی اماں۔ وہ کہتی ہیں مجھے دنا کے جانا۔“

”دیکھ یار! دادی اماں کی عمر اتنی برس سے اوپر ہو گئی ہے۔ جب وہ نہیں ہوں گی تو تیرے لیے والدین کو مٹانا آسان ہوگا۔ آخر تو اکلوتا ہے ان کا۔“

میں نے کہا، ”لیکن مجھے تو فریال نے الٹی مٹم دے رکھا ہے کہ تمہارے پاس چار بیٹے ہیں۔“

راجا بولا، ”تیرے مسائل کا دوسرا حل یہ ہے فیکے پتر، کدو فریال کو صاف انکار کر دے کہ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پائیدار ان اپنا۔ میں مندر سلطان کو نسل کر کے چھائی کیوں چڑھوں؟ جب اس سے منگنی کی محبت تو میں نے رکھا تھا کہ یہ بے وقوفی مت کرو۔ میری ایک بیٹی سنی اب تمہاری بیٹی سزا ہے کہ اپنا کچھ جھٹو جس سے منگنی کی محبت اسی سے شادی کر لو۔ اس کے بعد آرام سے بیاہو چالا راڈ ارٹس کی بیٹی عائشہ سے سیشن ہو جاوے گا۔ لاڈلے مرے گا تو اس کا سارا کاروبار بھی تیرا ہو جائے گا۔ پانچوں گلی میں اس سرگز اسی میں۔“

میں نے مایوسی سے کہا، ”چھوڑو راجا۔ کوئی فائدہ نہیں۔ تیرا یہ مشورہ بھی احمقانہ ہے تو کیا جانتا نہیں فریال کو۔ وہ اپنی اور میری جان ایک کر دے گی۔ مجھ سے بات کرنا بے کار ہے۔“

میں جانے کے لیے اٹھا تو شہناز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا، ”رفیق بھائی! جب دماغ پر ایک ساتھ بہت سے مسائل کا بوجھ ہو تو واقعی کچھ نہیں سوچتا۔ کنفیوژن بڑھتا جاتا ہے۔ ایسے میں سب سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے سارے مسائل کو بھول کر کسی اور کام میں مصروف ہو جائیں۔ کہیں اور دل نکالیں۔“

”ہاں۔ کسی تیسری جگہ دل نکالیں۔“ راجا نے کہا، ”شاز اپنی اس کنزن رابعہ سے جو بچپن سے تیری ساتھی رہی ہے۔“

شہناز کراہی ہوگا۔ صرف اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے بھی۔ مگر عائشہ کی ماں تیرے مطالبہ پر چراغ بانی ہوتی ہے اور تجھے کیا یوں دیتی ہے کہ ذلیل کالے آدی تجھے پتا تھا تم میری بیٹی سے محبت نہیں کرتے اس کا اجماع کر رہے ہو۔“

”ایسا تو وہ ضرور کہیے گی“ شہناز نے کہا۔

”یار! کہنے دو اسے۔ وہ پہلے کون سا اچھا سمجھتی ہے رفتی کو۔ پہلے بھی دشمن تھی۔ یہی کہیے گی تاکہ میری توقع سے بڑھ کر ذلیل ثابت ہوئے۔ مگر اس دباؤ میں وہ کام کرادے تو ایک ساتھ دو مسئلے ختم ہو جاتے ہیں بلکہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ اب پوچھو کہیے؟ وہ ایسے دوست کہ لاڈلے ارٹس کے اثر رسوخ سے شباب الدین کا مطالبہ پورا ہو جائے تو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ جو دشمنی دے رہے ہیں۔“

”بھواس بند کر اپنی راجا۔“ میں نے مجزے کہا۔

”ابھی میری بات پوری ختم نہیں ہوئی۔ یہ ہے ایک پہلو“ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ عائشہ کی ماں اپنی بیٹی کو مجھ سے بدظن کرنے اور اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لیے اسے ضرور بتائے گی کہ وہ جسے تم اپنا بچا جانتی سمجھتی تھیں اور اس کے ساتھ شادی کر کے نہیں چھوڑنے پر آمادہ تھیں اس کی اصلیت کیا ہے۔ ظاہر ہے عائشہ یقین نہیں کرے گی اور ماں کی بات کو سمجھو اور پروپیگنڈا افراد کے لیے لیکن جب بالآخر یہ ثابت ہو جائے گا کہ ماں کی بات غلط نہیں تھی اور تو نے واقعی عائشہ کے نام پر اس کے والدین کو بلیک میل کیا تھا تو عائشہ کے دل میں چھینی محبت ہے اتنی ہی نفرت پیدا ہوگی۔ فہم المطلب۔ یعنی یہی تو ہے یا ہونا چاہیے تیرا مقصد۔ کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے اور اس کے بعد اللہ اللہ خیر صلات۔ وہ جانے کی مقابلے پر صرف فریال۔ یہاں کے معاملات تیرے ہاتھ میں ہوں گے۔“

”یہ ناممکن ہے راجا!“

”اسے ممکن بنائیے پتر! عائشہ آج دھکی دے تو کل کچھ زیادہ دھکی ہو جائے گی۔ لخت بھیج دے گی تیری محبت پر۔ اس کی ماں کے لیے تو آج بھی برا ہے۔ کل زیادہ برا ہو گیا تو کیا فرق پڑے گا۔ عائشہ جو آج بھی روتی ہے کل کو رونے کے ساتھ اگر تجھے کوئے لگے گی تو اچھا ہی ہوگا۔ بالآخر سب اپنی اپنی زندگی سے مفاہت کریں گے۔“

میں نے کہا، ”چھوڑو راجا! مجھے تجھ سے ایسے مشورے کی امید نہیں تھی۔ میں نے اپنا وقت ضائع کیا میں چلتا ہوں۔“

راہ نے مرا ہاتھ پکڑ لیا، ”اچھا جانے دے اس بات

طاقت دولت کی ہو یا کلا شکوف کی۔“

”تجھے واقعی لوٹ کے نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”میں اپنی خوشی سے کب آیا ہوں یار! مجھے تو زبردستی کھینچا گیا ہے۔ باقی خاندان کی مجھے پر دیشیں تھی مگر میرے انکار پر ابا روڑے تھے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اب جوہر ہو۔ کروڑوں کی جاگیر اور حویلی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے والدین کی قیمت پر پاکستان چھوڑ کے برطانیہ آنے پر راضی نہیں تھے۔ انہیں میں کیسے چھوڑ دیتا اور یہاں آ کے میں مزید پھنس گیا ہوں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ میں عائشہ کو دھوکا دوں۔ اس سے جھوٹ بولوں کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ اس کی ماں کو چکروں کے تہاڑی اکلونی لاڈلے کی بیٹی بنی کو میں لے جا رہا ہوں اور جب اسے چکر آئے لیکن تو کہوں کہ بڑی بی بی اپنی گوری اور عالی نسب بیٹی کو ایک گلیاں کالے آدی کے چنگل سے بچانا ہے تو اسے شوہر سے ایک کام کرادو۔ اس چور پارٹی کے مفروضہ بد معاشوں کو برطانیہ کا معزز شہری بنوادو اور ان کے دشمنوں کو ملک بدر کرادو۔ لا حول ولا قوۃ۔ اتنی گلیاں حرکت کا سوچ کے بھی مجھے شرم آتی ہے۔ جب عائشہ کو یہ معلوم ہوگا کہ اپنا اوتو بدھا کرنے کے لیے میں اس کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ محبت کے نام پر میں نے اس کے والدین کو بلیک میل کیا ہے تو اس کی نظر میں میری کی عزت رہ جائے گی؟“

راجا نے سوچ کے کہا، ”فیکے پتر! ہر مسئلہ تیری خواہش کے مطابق تو حل نہیں ہوگا۔ نہ ہر خرابی کسی نقصان کے بغیر دور ہوگی۔ اب تو دیکھ لے کہ تو کیا بدداشت کر سکتا ہے۔“

میں نے کہا، ”تیرے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”دیکھ۔ میں پر تیکنیکل آدی ہوں۔ عملی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ آدی کے سامنے کی راستے ہوتے ہیں۔ ایک برا دوسرا زیادہ برا تیرا اس سے برا چوتھا سب سے برا۔ بچے کی صورت ہی نہ ہو اور کسی ایک راستے کا انتخاب ناگزیر ہو تو پھر کم تر برائی کو قبول کر لینا چاہیے۔“

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

”دیکھ یار! عائشہ کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے تو اسے چھوڑ کر آ گیا تھا۔ اسے اب تجھ سے کوئی امید نہیں ہے۔ اب فرض کر تو اس کی ماں کے سامنے اپنا مطالبہ رکھنا ہے۔ میرا مطلب ہے شباب الدین کا مطالبہ۔“

میں نے فحش سے کہا، ”راجا۔ یہ کیا۔“

راجا نے میری بات کاٹ دی، ”پہلے میری پوری بات سن لے۔ بے شک یہ بہت بری بات ہے مگر ایک برائی سے

ساتھ بھاگ گئی۔ اگر وہ کام کرادے تو اس کی عزت محفوظ رہے گی۔ بیویاں اپنے شوہروں سے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔“

”یہ تو ہے۔ شہناز بیوی بننے سے پہلے ہی مجھے بندر کی طرح اپنے اشاروں پر چلاتی رہی ہے۔ محبت کی ڈنگل کی بجائے۔“

شہناز نے میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا، ”رفتی بھائی! ایسا ہونا تو بھروسہ دانی کیا تھا۔ آج تک تو میں اپنی ایک بھی بات نہیں منوا سکی۔“

راجا بولا، ”یار! دیکھ ابھی تیرے سامنے اس نے کہا تھا کہ خود کشی مت کرو اور میں مان گیا تھا۔ اس نے چپک چپ مجھ کے پیٹک دیا۔ میں نے چون تک نہیں کی۔ یہ کہتی ہے خبردار جو کسی کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھا اور میں نہیں دیکھتا تو جانتا ہے۔“

”میں سب جانتا ہوں مہاراجا۔ مگر مجھے بتا میں کیا کروں اگر میں کچھ نہیں کرتا تو ان کی گلیاں دھکی ہے کہ اس کا غمازہ دوسروں کو بھگتنا پڑے گا۔ دوسرے میرے ماں باپ کے سوا کوئی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اب برطانیہ میں نہیں پاکستان میں ہو اس لیے قانون کی بات مت کرنا۔ قانون کی زبان یہاں کون سمجھتا ہے۔“

راجا نے کہا، ”لیکن وہ جو چاہے ہیں وہ بھی ناممکن ہے۔ ایک لاڈلے ارٹس کیا کر سکتا ہے؟“

”ایسا نہیں ہے کہ وہاں سفارش بالکل ہی نہیں چلتی۔ یہ خالص سیاسی فیصلے ہیں جس میں ہوم آفس دباؤ قبول کرتا ہے۔ لاڈلے ارٹس کی ایک مضبوط لابی ہے۔ پھر وہ ایک بزنس ٹائٹون بھی ہے لیکن عائشہ کا نام لے کر میں اس کے والدین کو بلیک میل کروں اس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”فیکے پتر! سیاسی بلیک میلنگ کا یہ سلسلہ اب ختم ہونا چاہیے اگر تو نے ان کی بات مان لی تو وہ سمجھیں گے کہ تو ڈر گیا۔“

”راجا! ڈرتا ہوں میں اپنے والدین کی وجہ سے۔ اس عمر میں وہ میری وجہ سے ذلیل ہوں۔ معیبت میں پڑیں۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا مگر یہاں میں بھی بے بس ہوں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں لندن میں رہتا اور میرے والدین بھی آ جاتے۔ برطانیہ میں ہم سب محفوظ رہ سکتے تھے کیونکہ وہاں ایسا نہیں ہے کہ قانون کے رکھوالے بھی دہی ہوں جو لا قانونیت کے ظہور دار ہیں۔ یہاں نہ حکومت کسی کو تحفظ فراہم کر سکتی ہے اور نہ عدالت۔ ایک پوری نسل نے جوان ہو کے دیکھا ہے کہ ملک میں طاقت کا قانون رائج ہے۔ خواہ وہ

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ اپنی جاگیر اور حویلی دیکھنے چلے جائیں۔ توجہ دوسری طرف کرنے سے انھیں چلی جانی ہے لاشعور کے کپیوٹر میں۔ وہاں کام ہوتا رہتا ہے اور کوئی نہ کوئی حل ضرور نکلتا ہے یہ آؤ مدد نہ ہے۔ آپ بھی آزمائیں، ابھی زیادہ مت سوچیں۔“

میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا ”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

راجا نے کہا ”نیچے پڑا شاید نہیں، شہناز ہمیشہ ٹھیک کہتی ہے یونہی تو نہیں مرنے میں اس پر۔“

شہناز خوش ہو کے شرمائی ”بھرمیری مانتے کیوں نہیں۔“

راجا نے کہا ”جل میں تجھے بشارت فاروقی کے آفس چھوڑ دیتا ہوں۔ تو اس سے اپنی ریاست کے معاملات کو سمجھ لے۔ آج تو میں کچھ مصروف ہوں۔ اگر موڈ ہے ریاست کے دورے کا تو کل پرسوں کا پروگرام بنا لیتے ہیں شہناز بھی چلے گی۔“

”میں ٹیکنیک چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔“ شہناز نے کہا

”صرف اتوار کو جا سکتی ہوں بلکہ ہفتے کی رات کو۔“

”میرا خیال ہے کہ پہلے ہم دیکھ آئیں وہ جگہ رہنے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔“ میں نے کہا۔

جب میں بشارت فاروقی کے پاس پہنچا تو شام ہونے لگی تھی۔ اس کا آفس جی پی او کے پیچھے ایک پرانی عمارت کے پہلے فلور پر تھا ہر سے عمارت قدیم اور خراب حال نظر آتی تھی۔ اندر سے آفس کو چھ دیڑھ انداز میں ڈیکوریت کیا گیا تھا۔ آفس کے دو بڑے ہال تھے۔ داخل ہوتے ہی جو ہال آتا تھا اس کو پارٹیشن سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ دائیں ہاتھ والے کیمین میں فاروقی کے اسٹنٹ بیٹھے تھے۔ ایک اسٹینو ٹائپسٹ، ایک منشی۔ بائیں طرف استقبال تھا جہاں اس کی سیکریٹری اپنی میز پر فون اور انٹرکام سجائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک صوفیٹ ملاقات کا انتظار کرنے والوں کے لیے تھا۔ دوسرے ہال جیسے کمرے میں بشارت فاروقی بیٹھا تھا۔ اس کا شمار دیوانی مقدمات کے ماہرین میں ہوتا تھا۔

سیکریٹری تین تیس کی نظر آنے والی گوری جتنی اور بھرے بھرے گداز بدن والی دگش عورت تھی۔ اس کے شانوں تک تراشے ہوئے ہال اس کے پیٹری چہرے کے گرد ہالہ ساٹاتے تھے اس کے بالوں کا گہرا کالا رنگ دیکھ کے مجھے شبہ ہوا کہ وہ میٹر کھراستہ استعمال کرتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی

آنکھوں میں بھی بگی کی جگہ کی تحریر تھی اور اس نے ساری بھی کالی باندھ رکھی تھی جس میں اس کا اجارہ نگ حریز تیار ہو گیا تھا۔ بلاؤ اس کے شانوں بازوؤں اور جسم کے خنجر و فرار پر ایسے چکا ہوا تھا کہ جیسے کسی درزی نے اسے سیاہ کمال کی طرح جسم پر منڈھ دیا ہے۔ ستر پوش کا یہ انتہا اس کے حسن و شب کی نمائش کا وہ الزام تھا جسے قبول کرتے ہوئے اس کی مسکراہٹ میں بھی غرور آ جاتا تھا۔ میں گردن کے آگے اور پیچھے گردن کی دھت سے اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے کپیوٹر سے نظر ہٹا کر مجھے ایک مہربان مسکراہٹ سے لوزا ”جی۔۔۔ فرمائیے۔“

میں نے کہا ”میں بشارت فاروقی سے ملتا ہوں۔“

”کس سلسلے میں؟“

”سلسلے تو بہت ہیں۔ آپ انہیں بتادیں کہ نواب صاحب آپ کو شرف ملاقات عطا کرنے تشریف لائے ہیں۔“

اس کا منہ جرجانی سے کھل گیا ”نواب صاحب۔۔۔!“

”جی۔۔۔ نواب رفیق احمد آف ریاست ست بدعالتی۔ کمال ہے کہ آپ ہمیں نہیں پہچانتیں۔“

اس نے کچھ بے یقینی کے ساتھ انٹرکام کا بٹن دبایا اور میری بات سن دین وہ ہرادی۔ انٹرکام پر میں نے اس کا جواب سنا ”ان سے کہیں کہ بس پانچ منٹ“ ظاہر ہے اس کے بعد سیکریٹری کے لیے ٹھیک کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ نواب رفیق احمد آف ست بدعالتی اسٹینٹ کے لیے اس کا رویہ انتہائی مودبانہ اور احترام آمیز ہو گیا۔

پانچ منٹ پورے ہونے سے پہلے ہی وہ غصہ رخصت ہو گیا جو پہلے سے بشارت فاروقی کے ساتھ تھا اور وہ بڑے جوشیہ انداز میں مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ ناقابل تصور حد تک موٹا اور دراز قد تھا چنانچہ انسان سے زیادہ دیوار نظر آتا تھا لیکن اس کا بھولا ہوا گول منہ چہرہ کسی بچے کی طرح حلوم ہوتا تھا۔ بچوں اس کی توند کے گنبد پر غصہ نہیں لگتی تھی چنانچہ اسے روکنے کے لیے وہ اسٹینٹ والے کیلکس استعمال کرتا تھا۔ کوٹ جب سلا ہوگا تو فٹ ہوگا مگر اب اس کے بٹن بند نہیں کیا جاسکتے تھے۔

”آہ۔۔۔ قبلہ نواب صاحب!“ ایک بلند باگ تھپتے کے ساتھ بشارت فاروقی دونوں بازو پھیلا کے آگے آیا ”مجھے آپ کا انتظار تھا۔ معلوم ہو گیا تھا کہ آپ ولایت سے تشریف لے آئے ہیں۔ بالکل اور بھل گئی ہیں میں۔ یعنی جیسے مجرد گئے تھے ویسے ہی بتا میم کی سند کے لوٹ

”جی بہت خوب۔۔۔ آئیے اندر آئیے۔“

آئیے ملنے کے عمل میں مجھے یوں لگا جیسے میں ریفورم کے کسی پڑا میں گھس گیا ہوں۔ وہ مجھے بڑی محبت سے دیوچ کر اپنے پیچھے لے گیا۔ اس کا آفس بہت شاندار اور شاندار تھا۔ سیاہ پالش والی قوس نما میز کی سطح شیشے کی فرج چمک رہی تھی۔ اس پر دائیں جانب تین فون رکھے تھے اور چھ انٹرکام سیٹ تھا۔ بائیں ہاتھ پر چند فائلیں پڑی تھیں۔ سفید چمکی کے گلدانوں میں شوخ رنگوں والے پھول ملی تھے۔ اس کی بلیک لیدر کے کٹن والی کرسی بھی بشارت فاروقی کے ساز کی تھی۔ اس کے پیچھے والی دیوار کے وسیع پیمانے پر رول پیسے تھا اور اس پر ایک بہت خوبصورت سینیئر تھی۔ کسی ٹیبل کا کنارہ سبزہ زار، ایک سفید گھوڑا پس منظر میں تیار ہے پر کرسی ہوئی دو گھڑی کی کرسیاں۔ ایک پر کسی کا سرخ ”دھپاڑا“ ہوا تھا۔ دوسری پر اخبار رکھا ہوا تھا۔ نیچے کالی یا چائے کے دو خالی گلاس نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سارا منظر زندہ ہے۔ وہ جوان کرسیوں پر بیٹھے تھے ابھی ابھی اٹھ کر کہیں گئے ہیں۔

بائی دیواروں پر کلز کی الماریاں تھیں جن کے شیشے کے پتے تھے اور ان کے پیچھے ضخیم قانونی کتابوں کی جلدیں نظر آ رہی تھیں۔ دنیا بھر کی عدالتوں کے صادر کردہ فیصلوں کا ریکارڈ اور اپنی ایل ڈی کے مجموعے۔ ہر بڑے وکیل کی ذاتی لائبریری میں حوالوں کے لیے یہی کتابیں ہوتی ہیں۔

جب میں اس کے سامنے پہنچا تو اس نے کہا ”نواب صاحب! اس چپڑے شوق فرمائیں گے؟“

میں نے کہا ”اگر کافی مل جائے تو کافی ہے۔“

اس نے ہانسی سے سر ہلایا ”ابھی حضرت! ہم نے تو شوق نرمانے کی بات کی تھی۔ اس خیال سے کہ جناب ولایت سے تشریف لائے ہیں۔ لگتا ہے آپ تو جگ جگ کا فرستان سے بھرا سلامت بچالائے۔“ اس نے انٹرکام کا بٹن دبا کر کہا ”بھئی شہناز! اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے ایک مسکرائی گئی! نشہ آور کافی تو روانہ کرو۔ اپنے نواب صاحب بھی لگن کا ایک جام اور۔۔۔“

میں نے کہا ”آپ نہیں پیئیں گے؟“

”دوہا! ابھی! ہم بھی پیئیں گے۔ ضرور پیئیں گے آپ کے ساتھ مگر کافی نہیں۔“ اس نے دراز میں سے ایک بوسل نکالی ”میں کوئی اور بج کر کھا کر شرب تھا۔“ تقویت قلب کے لیے ہرگز منفرج تجویز کیا ہے میرے چارہ مارنے۔“

میں نے کہا ”کیا ہوا ہے آپ کے قلب کو؟“

”ابھی حضرت۔ یہ جو مجھے کہ اس دل صد چاک کے ساتھ کیا نہیں ہوا۔ کتنی بار چوری ہوا! کس کس نے بے وفا کی کے صد مات سے دو چار کیا اور توڑا۔ بس یہی رہ گیا ہے درد دل کا مداوا! اس نے بوسل سے ایک گھونٹ لیا۔“

وہ خوش باش اور زندہ دل آدمی تھا۔ دکالت جیسے خشک بیٹے میں بھی اس کی طبیعت جس حراس ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو موائع حالات میں بھی روئے نہیں اور خود پر ہنسا جاتے ہیں۔ اس کا گفتگو اور پرحاس لہجہ اس کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ جب شہلا کافی لے کر آئی تو اس نے کہا ”بھئی! دیکھو ہم تخلیق چاہتے ہیں۔“

وہ جاتے جاتے ہلکی ”جی۔۔۔ کیا چاہتے ہیں؟“

”میرا مطلب ہے اپنے نواب صاحب قبلہ سات سمندر پار سے تشریف لائے ہیں۔ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرنے نہ ملاقاتی نہ فون۔“

”اور آج کوئی کلائنٹ آجائے تو۔۔۔؟“ شہلا نے مجھے کن آنکھوں سے دیکھا۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ فی شرٹ جیگر اور جاگرز کے ساتھ مجھ میں نواب صاحب قبلہ والی کون سی بات ہے؟

”یارا اب تک جہیں جھوٹ بولنا سکھانا پڑتا ہے۔ کہہ دینا کہ دیکھل صاحب عالم نزع میں ہیں۔ صرف فرشتہ اہل کو اندر جانے کی اجازت ہے۔“

وہ مسکرائی ”اور اگر آپ کے گھر سے فون آئے؟“

”اس سے تو صاف کہہ دینا کہ وہ جو بیٹھے تھے دو اے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ ہر حوم و منفور ہوئے۔ بامعوری ڈکٹ جو روز خواب میں آتی تھی آج آفس میں آگئی اور لے گئی انہیں۔ جو دل چاہے فرمادینا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“ اس نے قہقہہ مارا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا ”جی نواب صاحب! بٹنائے احوال دلائیں؟“

میں نے کہا ”آپ نے تو مجھے باقاعدہ نواب صاحب بتا دیا۔ میں صرف رفیق ہوں۔ آپ غائبانہ طور پر مجھ سے جھینا حصار ہوں گے۔“

”آپ کے آنے سے پہلے میں نے اس تاریخی کہانی پر بہت ریسرچ کی تھی! جس کے آپ ہی ہیرو ہیں۔“

”یہ بڑی ڈرامائی اور فلمی صورت حال ہے۔“

”اور اب آپ اس صورت حال کے بارے میں مجھ سے تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی اس خاندانی اسٹینٹ کے بارے میں جس کے آپ اچانک مالک بن گئے ہیں؟“ وہ اچانک سنبھا ہو گیا۔

”یعنی اس کے لیے مجھے سب کچھ چھوڑ کے واپس آنا پڑا۔ اپنا مستقبل اپنے کیریئر کے سارے پلان۔“

اس نے کہا ”جہاں تک قانونی معاملات ہیں تو وہ تقریباً طے ہو گئے ہیں۔ ان کی تفصیل میں مجھے تو آپ کو فائلوں کے ایک پورے دفتر کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل پرائرٹیکارڈ ہے۔ کچھ تو مجھے لینڈ ریونیو کے دفاتروں سے نکلوانا پڑا۔ باقی یہاں تاریخی دستاویزات کے قبرستان کی خاک چھاننے سے ملا۔“

میں نے کہا ”مجھے گڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی الجھن نہیں۔“

”آپ کی سہولت کے لیے میں نے متعدد تاریخی حوالوں کے ساتھ ایک سری بنائی ہے۔ اس میں تقریباً ایک سو پچاس سال کی ہنری ہے۔ جب آپ وہ سری دیکھیں گے تو آپ کو ایسا لگے گا جیسے آپ کو کئی تاریخی ناول پڑھ رہے ہیں۔ یہ حقائق آج کسی داستان سے زیادہ دلچسپ اور ترقی آموز ہیں لیکن ان کی تلاش بہت مشکل کا نام۔ میرے تین اسسٹنٹ ایک ایک صفحہ پڑھتے رہے اور ان کی نقول حاصل کرتے رہے۔ ان کی تعداد بڑھتے رہے اور خلاصے بنا کر میرے سامنے رکھ رہے۔ میں نے یہ سارا مواد عدالت کے سامنے رکھا اور آپ کے سامنے حالات و واقعات کی تصویر پیش کرنے کے لیے تمام خلاصوں کی مدد سے یہ سری بنائی۔“

میں نے کہا "آپ کی محنت کا صلہ میں کیا دوں.....
 صرف شکر یہ ادا کر سکتا ہوں۔ آپ نے ماؤنٹ ایورسٹ کو
 سر کیا اور میرے لیے آسان راستہ بتا دیا کہ اس پر اپنا جھنڈا
 لہا دوں۔"

اس نے ایک فائل اپنے سامنے رکھ لی "رفیق صاحب! دنیا واقعی جائے عبرت سرانے فانی ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے یہ حویلی بنانے والے تمہارے ہی آباد اہلداد تھے۔ میرے حساب سے تمہارے دادا کے دادا کے دادا۔ چنانچہ انہیں کیا کہا جائے گا۔ کلڑو دادا کر کلڑو مگر دادا۔ آج تم یا تمہارے والد ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ جب انہوں نے یہ حویلی بنوائی ہوگی تو انہیں اس پر کتنا غرور ہوگا۔ گردلو و اح کے علاقے میں در در دیک اس کی دھوم ہوگی۔ وہ اس میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ رہے ہوں گے۔ ہاں کھوڑے غلام اور کینڑیں۔ اس دور کے لو ایوں راجوں اور جاگیرداروں کے ساتھ ایسے ہی تصورات وابستہ ہیں۔ اب جا کے دیکھو! صرف کھوڑ ہیں اور خانہ ویرانی! بے شک ایک گھوٹے میں چند قبریں ہیں بن بن پر کچھ نام بھی پڑھے جاتے ہیں۔ سب کی

ہڈیاں تک خاک میں مل گئی ہوں گی۔“

میں نے کہا ”یہ تو زمانے کا چلن ہے۔ آج ہم خود
تاریخ کا ایک باب ہیں۔ کل کے یاد رہے گا کہ ہم کون
اور کیا تھے؟“

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”جب میں نے قیام
نے اہرام مصر دیکھے تو وہاں ایک لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو ہوتا ہے۔
اب اس کے اندر ایک کمرہ ہے جس میں بھی ہوتا ہے۔ اب سنا ہے کہ لائٹ
اور تاج محل میں بھی ہونے لگا ہے۔ یہاں ہمارے بڑے بڑے
میں گائیڈ ہیں۔ گائیڈ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ وہ بادشاہوں کی
مشائشان و شوکت اور طرز زندگی کے افسانے بڑی رنگ آمیزی
کے ساتھ سناتے ہیں۔ بڑی منظر کشی کرتے ہیں۔ اس کے بعد
گرد و پیش پر نگاہ ڈالو تو برا عجیب لگتا ہے۔ شکستہ دیواروں کی
بڑی حالت دیکھ کر کمندروں میں گونجنے والے سنائے
محموس کر کے کہ خالق نہیں رہتا، خالق باقی رہتی ہے۔
انسان فنا ہو جاتا ہے، اینٹ پھرتے ہیں۔ مٹی رہتی ہے اس
کی ملکیت پر غرور کا خون اگلی نسل کو منتقل ہو جاتا ہے۔“
میں نے کہا ”یقین کیجئے میں ذرا بھی مغرور نہیں ہوں۔
میں تو بڑی مشکل میں رہا ہوں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”مجھے معلوم ہے تم آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اب اس میں دیگر معاملات کو بھی دخل تھا۔ جلوہ فرم! دگرنگ اور حسینان صدر رنگ۔“

”اب یہ الزام تو قبول کیے جا رہا ہے نہیں لیکن اس میں کوئی عکسِ تیرہ کیوں نہیں آئے والدین کے حکم سے تفریقِ نہیں کر سکتا تھا۔ اس گل یا جاگیر سے مجھے طعنی و چبکی نہیں تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم تجھے دیکھ دو“ اس نے فائل میں سے پھیل کے ہوئے چند صفحات نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے۔

میں نے سرسری انداز میں ایک نظر ڈال کے ان صفحات
و اپنے سامنے رکھ لیا۔ "اس کا مطالعہ میں فرصت سے کروں
۔ وہاں میں کب جاسکتا ہوں۔"

”آج“ میں نے کہا۔

اس نے ایک ڈائری کے چند صفحات پلٹ کے نفی میں بلایا۔ ”آئی ایم سوری۔ آئندہ چند روز میرے لیے انتہائی عذرویت کے ہیں۔ کل ایک کیس ہے ہائی کورٹ میں۔ وہ شاید ایک اور کیس میں سریم کورٹ کا فیصلہ ہے۔“

پورا ہفتی ایسا ہے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ مجھے ناتواں کو
 آپ اس ایڈوجر کی صحبت سے معاف فرمادیں۔ میں سب
 دیکھ چکا ہوں۔ دے بھی یہ چند گھنٹوں کی سیر و تفریح نہیں
 ممکن ہے۔ آپ کو وہاں کئی روز رکنا پڑے۔“

میں نے کہا، ”کیا وہاں رہائش کا کوئی انتظام ہے؟“
 ”جی قبلہ نواب صاحب! ایڈووکیٹ اور چیک
 کے لیے لوگ پہاڑوں، ریمکٹ اور جنگلوں کا رخ کرتے
 ہیں۔ وہاں بھی تو رہے ہیں۔ ظاہر ہے سب بدعانی میں کسی
 نفاذِ انتظام ہوئی کہ اس کے لینڈ کرے یا میٹل لینڈ کے برعکس
 نہیں سمجھیں۔ جو حلی کے چند کرے سلامت ہیں اور قابل
 رہائش بنائے جاسکتے ہیں۔ گردنواں میں گاؤں دیہات کی
 آبادی ہے وہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔“
 ”اس بات کا کتنا امکان ہے کہ میں اس کمپنڈ میں قیام
 نہ کر سکیں اور زندہ سلامت لوٹ آؤں؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، زیادہ حصہ تو کھنڈر ہی ہے۔ لیکن ایک حصہ بہت بھتر ہے۔ اس کے گرنے کا کوئی امکان نہیں۔ میں نے بھی وہاں ایک دن گزارا تھا۔ رات کا کچھ پتا نہیں، اگر جن بجوت ہوں گے تو ظاہر ہے وہی ہوں گے جو تمہارے اسلاف تھے۔ ان کی ارواح شاید تمہیں شرفِ ملاقات بخشے آ جائیں کہ بالآخر آگیا ہمارا وارث!“

میں نے کہا، ”ان سے میں نٹ لوں گا۔ یہ تائیں کہ بجلی سے ہمیں؟ اور بننے کا مانی؟“

اس پر ہتاس ڈیم بنانے کا منصوبہ بھی تھا جو بعد میں معلوم
دو ٹی بنا پر ختم کر دیا گیا۔ قلعہ رہتاس سے تقریباً تین کلومیٹر
کے فاصلے پر ٹیلہ جوگیاں ہے۔ وہاں تک جانے کے لیے
گازی اچھی ہوتی ہے۔ فورڈ ویل ڈرائیو ہو تو بہت بہتر
ہے۔ ٹیلہ جوگیاں کے فوراً بعد ت بدھائی کا گاؤں ہے۔
چارپاچ کلومیٹر کا فاصلہ ہے لیکن کوئی سڑک نہیں ہے۔ ایک کچ
راستہ ہے۔ تاہم اس علاقے میں کنوئیں اور ندوب دہل ہیں
ندوب دہل بجلی سے چلتے ہیں اس لیے پینے کے پانی کا کوئی
مسئلہ نہیں اور ممکن ہے حویلی کے اس حصے میں بجلی ہو جہاں
ایک چوکیدار کا پورا خاندان آباد ہے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ
ساتھ ان کے دس بارہ گھر ہیں کچے کچے۔“

”اس چوکیدار کی ہنٹری کیا ہے یہ کب سے ہے اور کون ہے؟“

”وہ ہے ایک ستر سالہ بوڑھا۔ بیوہ نہیں ہے۔ چار بیٹے ہیں اور پھر ان کے سات آٹھ بیٹے۔ بڑھے نے کہا کہ

پاکستان بننے سے پہلے وہ یہاں آیا تھا۔ پہلے یہاں اس کی بیوی بھی کام کرتی تھی۔ دونوں تنخواہ دار تھے۔ پھر مالک چلے گئے انہوں نے خالی پڑی ہوئی زمین پر کاشت شروع کر دی۔ ان کی گزر اوقات اسی زمین پر ہے۔ اس کے وہ مالک نہیں ہیں لیکن آج تک کسی نے ان کو جھپٹا نہیں تو وہ بھی آرام سے بیٹھے ہیں۔ سبزیاں اگاتے ہیں اور چالیس پچاس کلو میٹر دور دینہ میں فروخت کرتے ہیں۔“

”اس بڑھے کا کیا نام ہے؟“

”جانو! جان محمد..... اس کے پاس کافی انفارمیشن ہوگی۔ مجھے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ تم چکر لگا کے آؤ تو پھر بیٹھ کے تفصیل سے باتیں کریں گے۔ آج رات یہ سمری ضرور دیکھ لینا۔ تمہیں بہت مرہ آئے گا۔“

شہلا نے بڑی ادائے ناز سے اندر آ کے کہا ”سر..... کیا میں جاؤں؟“

فاروانی نے کہا ”بھئی چند منٹ..... پھر چلتے ہیں۔“
 میں نے کہا ”آپ کی سیکرٹری پسند آئی۔“
 وہ ہنسنے لگا ”بے چاری یہ ہے۔ ایک بچہ بھی ہے۔ شوہر
 غائب ہو گیا۔“

”جیسے جن بھوت غائب ہو جاتے ہیں؟“ میں نے کہا۔
 ”یہی سمجھ لو۔ نو سال ہو گئے کچھ پتا نہیں۔ پولیس نے تو
 اسے شب میں پکڑا تھا کہ تو نے ہی اپنے کسی آشنا کے ساتھ
 مل کر اسے قتل کیا ہو گا اور کہیں گاڑیا ہو گا۔ میں نے اس کی

جان بچائی۔ ملازم رکھ لیا۔ اپنے پاس۔ ورنہ کیا کر لی ایسی عورت۔ اپنی حفاظت کیسے کرتی؟ بہت محنت سے کام کرتی ہے۔ صبح میں اپنے ساتھ لے آتا ہوں۔ شام کو چھوڑ دیتا ہوں۔ باتیں بنانے والے بہت باتیں بتاتے ہیں۔ سب سے زیادہ میری بیوی بولتی ہے۔ میں بہرا کو گناہ بن گیا ہوں۔ شہلا بھی برا نہیں کرتی۔“

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ”اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔“

رات کو کھانے کے بعد جب میں نے ذکر جمیل پڑھا تو خاندان کے دیگر افراد نے سب بدھائی کے بارے میں اپنے اپنے نقطہ نظر سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں ابا کے علاوہ صوفی پچازر اور خالو عنایت عرف ابو عنایت سب ہی شامل تھے۔ قالونی قبے کی کارروائی کے وقت وہ بشارت فاروقی کے ساتھ ایک دین میں بھر کر گئے تھے اور دن کے وقت انہوں نے حویلی میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک چٹک بھی منائی تھی۔ مرد جنگل میں کافی اگے تک گھوم آئے

تھے۔ خواتین پر کچھ وہاں کے پراسیب ماحول کا ڈر غالب تھا۔ انہوں نے شام کا اندھیرا چھپنے سے قبل ہی روانگی پر اصرار کیا۔ رات کو وہاں قیام کرنے کی ہمت مردوں نے بھی نہیں کی۔

مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوا کہ ماضی کے واقعات کا صحیح علم کی کوئی بات نہیں۔ گزشتہ دہائیوں میں ان کی دلچسپی صرف قصے کہانیوں کی حد تک تھی۔ ان کے ذہن میں اصل واقعات بھی غیر مستند روایات کی طرح تھے۔ تحقیق سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ ماضی غیر اہم تھا۔ اصل اہمیت اس مستقبل کی تھی جس کے ساتھ سب کو اپنے مفادات وابستہ نظر آتے تھے۔ مجھے دورے میں ملنے والی جاگیر کی مدفن خزانے جیسی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ جاننے سے کسی کو دلچسپی نہ تھی کہ خزانہ کس کا تھا اور کہاں سے آیا اور کیسے آیا۔ سنسنی خیزی کا اصل پہلو اس کی مالیت میں تھا۔

صوبی چچا کے خیال میں زمین خیر اور بے کار تھی۔ ایک حصے میں جو جنگل تھا وہ کچھ کارآمد تھا۔ حویلی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اسے گرا دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس زمین پر کاشت ہو سکتی ہے۔ مویشی بھی پالے جاسکتے ہیں لیکن یہ سب کرے گا کون؟ اس مصیبت میں پڑنے سے بہتر ہے کہ زمین چچا کرے کھرے کر لیے جائیں۔ خالو عنایت کا خیال اس کے برعکس تھا۔ ان کے پاس زراعت اور فارمنگ کا پورا پیمانہ تھا۔ جنگل کو خرید وعت دینے اور وہاں عمارتی لکڑی کا کارخانہ قائم کرنے کے امکانات بہت روشن تھے۔ وہاں فینچر بھی بنایا جاسکتا تھا۔

خواتین کو صرف اس کی مالیت سے دلچسپی تھی۔ وہ حتیٰ طور پر یہ جاننا چاہتی تھیں کہ آج میں کروڑوں کا مالک ہوں تو کتنے کروڑ کا۔ اور مستقبل کے لیے میرے منصوبے کیا ہیں؟ کیا میں ساری زمین جاگیر کے چچا واپس سات سمندر پار چلا جاؤں گا۔ جاتے وقت میں کی فراخ دل رہیں گی طرح انہوں کو بھی کچھ دے کر جاؤں گا یا نہیں؟ یہ کچھ آخر کتنے ہوں گے؟ کیا اس سے ان کی زندگی میں تھوڑی بہت فراغت آئے گی؟ ان کے بچوں کا مستقبل بنے گا یا نہیں؟ اگر میں نے کبوتری اور بے مردوبی کے ساتھ انہوں کو خیرات لکڑی کے طور پر اتنا بھی نہ دیا جتنا ہوں میں مل ادا کرے والے دیر کو ٹپ دیتے ہیں تو پھر خون کے رشتوں کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔

چھوٹوں اور باتوں سے اور ظاہری رویوں کو دیکھتا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میری خوش بختی پر دل کی گھرائی ہے۔ کسی کو خوشی ہے تو وہ میرے والدین کے علاوہ دادی میں۔ باقی

سب کے دل میں رشک سے زیادہ حسد کے جذبات موجزن نظر آتے تھے۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ ہم ایک نیکے حوسو طیتے سے تعلق رکھتے تھے اور قناعت کا فلسفہ اختیار کر کے اللہ کا شکر بھی ادا کرتے رہتے تھے لیکن خوشحالی اور دولت مندوں کا ایک ایسا خواب تھی جس کی تعبیر پانے کے لیے سب دن رات جدوجہد کرنے میں مصروف تھے۔ حق حال کی روزی اور محنت کی کمائی میں گزارا کرتے کرتے سب جیسے تھک گئے تھے۔ ایک مہینہ مشکل سے پورا ہوتا تھا کہ دوسرا پرانے مطالبات کے ساتھ آجاتا تھا۔ چچی کیس اور نیلی فون کے بل اسکول کی فیس، گھر کا خرچ، سب لگے بندھے اخراجات تھے۔ بیماری یا خوشی کے خرچ کی تمناش بھی مشکل سے بچ سکتی تھی۔ چنانچہ عیاشی کی زندگی کے صرف خواب دیکھے جاسکتے تھے۔ شاندار گھر گاڑی، شاپنگ اور سیر تفریح کے خوابوں کو زندہ رکھنے کے لیے وہ بھی پراثر باڈی لیتے تھے تو بھی لاڑی کے ٹکٹ۔

ان حالات میں ان سب کا میری خوش قسمتی پر حسد محسوس کرنا ایک فطری سی بات تھی۔ اگر انہوں نے مجھ سے تو قناعت وابستہ کر لی تھیں تو یہ بھی غلط نہ تھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ سب کے دل میں اچانک اپنائیت کا سیلاب اٹھ آیا ہے۔ اپنے اپنے خالوں سے وہ سب میرے ساتھ اپنے رشتے کی اہمیت بڑھا رہے تھے۔ مقصد سب کا ایک ہی تھا مجھے احساس دلا کہ وہ محاورہ آج بھی درست ہے۔ اول خویش بودہ درویش۔ دولت کا چشمہ خاندان میں پھوٹا ہے تو ان کی خواہشات کی زمین کو پیاس بجھانے کا حق سب سے پہلے ہے۔

یہ لوگ میری عادت، فطرت اور مزاج کے شناسا بھی تھے۔ ایک طرف ابا کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے زندگی میں نہ جانے کتنے کام کیے لیکن جم کے کچھ بھی نہیں کیا۔ منصوبے وہ بڑے جوش و خروش سے بناتے تھے لیکن ان پر عمل درآمد کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ گزشتہ چند برسوں میں ان کی پیری مریدی یہ تعویذ گنڈے اور عملیات کا دھندا اچھا خاصا چل گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ دھوکے خیز، چرب زبانی اور چالاک کا دھندا ایسے کمزور عقیدے کے گھر اکثریت میں پائے جانے والے بے عقل لوگوں پر چل رہا تھا جو بد قسمتی سے جاہل بھی تھے یا جاہل ہونے کی وجہ سے بد قسمت تھے۔

ان کی بڑی آنند بھی بڑی تیز پر اثر موقع شناس اور زمانہ ساز خاتون تھیں۔ میں تو اکثر مذاق میں کہہ دیتا تھا کہ چچا آپ روحانی علاج کا ایک زمانہ شعبہ بھی قائم کر دیں۔ چچی

سے زیادہ کامیاب لیڈی بیرو ثابت ہوں گی۔ چچی نے آپ سے سچے منصوبے کے تحت اپنی دختر نیک اختر راہیہ کو آپ سوچے ڈالنے کے لیے مامور کر دیا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے بڑی ذور سے ڈالنے کے لیے مامور کر دیا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے راہیہ میری واپسی سے قبل ہی خالو عنایت کے بیٹے سے بیاہ کر چکی تھی۔ چچا نے بڑی کیر سے معاملات سے اگر کوئی دیکھا تو انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

اس کے برعکس اماں کی بڑی بہن خالہ شاہدہ حد درجہ ناعت پسند اور صابر و شاکر قسم کی خاتون تھیں تو ان کے ماں انواعیت ہر جگہ منارنے والے وحیت قسم کے تھل تھے۔ سب کی امیدوں کا اصل انحصار دادی پر تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ خود ولایت جائیں گی اور اندر اپنے کسی بیٹے کو جانے دیں گی چنانچہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ میں ساری دولت سمیٹ کے والدین کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ولایت جاؤں اور بھول جاؤں کہ میرا کسی وطن سے یا کسی شخص سے جذبات کا کوئی رشتہ تھا۔

مسترخوان پر دادی نے اچانک چچی کو ٹوک دیا۔ "ارے بھئی! دہن یہ راہیہ نے کیا پڑے؟ پھر رگے ہیں؟ ایسے پہلے تو نہیں پہنے؟"

آنند چچی نے تنک کے کہا "کیوں اماں! کیا ہے ان کپڑوں میں؟ آج کل تو سبیں پہن رہی ہیں۔"

چچی نے غصے سے کہا "پہن رہی ہوں گی جو انہوں کو چھوڑ کر غیروں کو دیکھنا پھرتی ہیں۔"

آنند چچی نے چچی کا بھرپور دفاع کیا "آپ بھی حد کرتی ہیں اماں! یہ تو فیشن ہے آپ کی ڈی کے ڈراموں میں دیکھو تو پتا چلے۔"

"تو یہاں بھی کوئی ٹی وی کا ڈراما ہو رہا ہے کیا؟" دادی نے کہا۔

خالو عنایت نے تہجد مارا "ڈراما تو ہو رہا ہے۔ ہم بھی دیکھ رہے ہیں لا نا بھی ڈرامے کا جگر چلو۔"

آنند چچی نے فوراً راہیہ سے کہا "راہیہ! بھائی کو دے تا جا کر چلو" اور پھر براہ راست مجھے مخاطب کیا "راہیہ نے خود بتایا ہے۔"

میں نے معذرت کی "دیکھی۔ اب تو تمناش نہیں رہی۔"

خالو عنایت نے ڈنگ میرے سامنے سے اٹھالیا اور آدھا خالی کر کے پھر چم میں رکھ دیا "بھئی! ہم ناقد رہاں! یہ ولایت پلٹ لوگ کیا جائیں دیسی کھجی کے طوے کو۔ ارے بھئی! آنند! یہ تو بالکل دھوکے خیز ہیں محل والا۔ میں تو لائق پہچانتا ہوں ہر ایک کا۔"

چچی آنند نے جڑ بھوکے کہا "خاک جانتے ہو تم عنایت! کیا ذائقہ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتا۔"

اب خالہ نے غصے دیا "اپنا رشتہ جب چھوٹا تھا تو میرے ہاتھ کا چلو بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ جب آتا تھا پوچھتا تھا خالہ! جگر کا چلو بنایا اور میں کبھی کبھی کھجی کھجی میں گا جگر کا چلو کہاں؟ سردیوں میں بناؤں گی جب گا جریں آئیں گی۔"

آنند چچی نے فوراً کہا "بھین کی بات اور ہے۔ یہ تو ابھی جب ولایت گیا تو کہہ رہا تھا کہ چچی ایک بار پائے کھلا دو اپنے ہاتھ کے۔ پھر ولایت میں کہاں نصیب ہوں گے۔"

اس کے بعد خواتین میں مجھ پر اپنائیت کے حق کی برتری ثابت کرنے کا مقابلہ شروع ہوا۔ آنند چچی نے کہا کہ وہ ہر سال مجھے اپنے ہاتھ سے سوئٹریں کے دیتی تھیں۔ خالہ نے کہا کہ رشتہ کو کر آن پاک کی تعلیم میں سے دی اور دو سال میں پورے تین پارے قسم کرا دیے۔ خالہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ چوٹی جماعت تک اسے میں نے پڑھایا۔ تب کہیں اس کا اسکول میں داخلہ ہوا اور بعد میں بھی اس کا ہوم ورک میں ہی کرائی تھی۔ چچی نے دعویٰ کیا کہ میں راہیہ کے بغیر ایک بل نہیں رہ سکتا تھا تو خالہ نے کہا کہ افضل سے بڑھ کر نہ میرا کوئی دوست تھا نہ رازدار۔ میں خاموشی سے ستار ہا اور مرد مسکراتے رہے۔

یہ مقابلہ دادی کی مداخلت سے ختم ہوا۔ انہوں نے کسی بات کے سچ میں کہا "نذیر! اوپر کی منزل پر صفائی بھی ہو گئی ہے۔ اگر رنگ کرانا چاہو تو تاد بعد میں مشکل ہوگی۔"

نذیر چچی نے کہا "رنگ ٹھیک ہے اماں۔ ابھی تو کرایا تھا بیٹانے۔"

"ہاں۔ مگر کرائے دار جاتے ہیں تو ستیاناس کر جاتے ہیں۔ اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں! سامان لانے سے پہلے رنگ کرنا آسان ہوتا ہے۔"

خالو عنایت نے ایک ڈکار لے کر کہا "گویا اب یہ طے ہے کہ میر صاحب کا آستانہ یہاں کھل ہو جائے گا۔"

دادی نے انہیں ڈانٹا "عنایت! اندر میرا بیٹا ہے۔"

"وہ تو ہے۔ مگر اماں بڑا مسئلہ ہو جائے گا سب کے لیے اگر یہاں ان کے مرید جوتی درجوتی آنے لگے۔ آلو عنایت نے کہا "ان میں تو عورتیں بنے بھی ہوں گے۔ جن بھوت اتارے جائیں گے جھاڑ چھوٹ ہوگی۔"

آنند چچی نے شوہر کا دفاع کیا "تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کوئی بڑا ٹھگ ہوگی شور شرابا ہوگا۔"

”ارے آئندہ! میں نے تو خود دیکھا ہے۔ یہ جن کوئی آسانی سے اترتے ہیں.....“ آلو عنایت نے کہا ”انہوں نے ایک لڑکی کو مریچوں کی دھوئی دی! انکارا کے۔ پھر جھاڑو سے خوب جھاڑا۔ اس نے اتنا بگاڑ کیا! اتنی چیخ پکار پائی کہ توبہ۔ میں تو سمجھا مر جائے گی۔“

دادی نے کہا ”نہیں۔ یہ سب یہاں نہیں ہوگا۔“

چچا نذیر نے کہا ”مگر انا..... میں نے تو اپنے مکان کے لیے کرائے دار سے بات بھی کر لی تھی۔“

”انکار کر دے اسے۔ ابھی مگر خالی تو نہیں کیا تو نے۔“

اپنا آستانہ وہیں رکھ۔ دادی نے کہا۔

آلو عنایت ہنسے ”نذیر بھائی! اب اسے باقاعدہ درگاہ بنا لو۔ میرا مطلب ہے اس میں گنبد کا اور محرابوں کا اضافہ کرو۔ اپنا حجرہ خاص بنواؤ۔ یہ کوئی پارٹ ٹائم بزنس تو ہے نہیں۔ انجی خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔ چاہو تو مجھے بھی اپنا اسسٹنٹ رکھ لو۔ مارکیٹنگ فیلڈ میں پہلنی کر دوں گا۔ مریدوں کو گھیر کے لاؤں گا۔ کیشن ملے کر لو میرا۔“

چچا نذیر نے سخت برا مانا لیکن وہ دادی کے سامنے بول نہیں سکتے تھے۔ مگر میں چچا کا ایسے ہی مذاق اڑایا جاتا تھا۔ نہ کوئی ان کی جبری مرید کی کوشش کرتا تھا اور نہ روحانی طاقت کو ماننا تھا۔ اب تو پھر بھی خاموش رہتے تھے مگر دادی تو منہ پر صاف کہتی تھیں کہ حرام خور ہے جھاڑ پھونک اور کالے پیلے عمل کی بزمیرے سامنے ماری تا تو میں جوتا ماروں کی کھینچ کر۔“

کچھ دیر بعد جب دادی سونے چلی گئیں تو نذیر چچا کی آلو عنایت سے زبردست جھڑپ ہوئی اور انہوں نے اپنی روحانی طاقت کو ثابت کرنے کے لیے اسی لڑکی پر سے جن اتارنے کا واقعہ سنایا جس کا حوالہ آلو عنایت نے کچھ دیر پہلے دیا تھا۔

”بھئی وہ سیالکوٹ کے ایک مشہور گھرانے کی لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور ماڈرن۔ مگر جن اس پر عاشق ہو گیا۔“

میں نے کہا ”چچا! آخر یہ معاملہ کیا ہے تمام جہات کو اپنے اغیار پاکستان کی لڑکیوں سے ہی کیوں عشق ہوتا ہے؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا روبرو دار! وہ بولو۔“

میں نے کہا ”جن بے چاری غریب گھرانوں کی لڑکیوں پر ہی کیوں عاشق ہوتے ہیں پوش علاقوں کی فیشن ایبل محنت مند اور خوبصورت لڑکیاں ان سے کیسے محفوظ رہتی ہیں۔ انہیں یہ فائدہ زدہ بدصورت اور جاہل لڑکیاں ہی کیوں پسند آتی ہیں آخر؟“

چچا نے متانت سے کہا ”جہات کا وجود تو قرآن سے

ثابت ہے۔“

میں نے کہا ”اس میں کیا شک ہے۔ اصل مسئلہ کے رداس کا ہے۔ اور وہ بھی دیسی لڑکیوں سے دو طرفہ کرنے کے لیے سعودی عرب، ایران، یورپ، امریکا وغیرہ چکر نہیں لگاتے۔ کسی مس دور لنڈ یا کسی یونورس پر کیوں فرزند نہیں ہوتے؟“

راہبر بننے لگی ”اتنی دور کیوں جاتے ہیں۔ میں کہہ ہوں کسی مس یونورس سے۔ مگر مجھے کوئی جن گھاس ہی نہیں ڈالتا۔“

راہبر کی ماں نے اسے ڈانٹا ”لڑکی! پاؤں ہو گئی ہے۔ رفیق کے ساتھ مل کر تو بھی جہات کا مذاق اڑا رہی ہے۔ نذیر چچا نے بھی اسے گھورا ”اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔ ابھی جس لڑکی کا حوالہ عنایت خان نے دیا تھا وہ بھی ماشاء اللہ سے بی اے پاس تھی اور خیر سے بڑی حسین و جمیل تھی۔ پھر بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بڑے لاڈ پیار سے بڑی بھائی کوئی مسئلہ نہ پریشانی۔ رشتہ بھی اس کا بچپن ہی میں ملے کر دیا گیا تھا اپنے ہی عزیزوں میں۔“

میں نے کہا ”اور یہ بچپن والا دولہا کیا بچپن کا ہو گیا تھا؟“

انہوں نے کہا ”اس کی عمر کچھ زیادہ تھی۔ مگر اب اتنی ہی نہیں۔“

چچی نے فوراً حمایت میں دلیل دی ”فرق تو رکھا جاتا ہے اتنا۔ اب ان کے اور میرے درمیان پورے اٹھارہ سال کا فرق ہے۔“

میں نے عمر کے اس فرق کو چیلنج نہیں کیا۔ دوسرے ہی جانتے تھے کہ چچی اس فرق کو بڑھاتی جا رہی ہیں۔ پہلے وہ بارہ سال کا فرق بتاتی تھیں مگر ان کی اپنی عمر ایک جگہ رک گئی تو نذیر چچا بڑھتے بڑھتے اٹھارہ سال پہلے ہو گئے۔ دادی سے کیا جھگڑا ہوا تھا جو انہیں بیاہ کر لائی تھیں لیکن وہ بھی فنون بحث سے گریز کرتی تھیں۔

میں نے کہا ”لڑکی بی اے پاس اور خوبصورت تھی۔ صاحب زادے کے کتابدہرے ہوئے تھے اور کرتے کیا تھے؟“

”بھئی ماشاء اللہ سے گوجرانوالہ کے اسٹیشن پر چائے کا اسٹال تھا۔ انجی بھلی کمائی ہو جاتی تھی۔ ورنہ بی اے ایم اے کی آج کل کیا اوقات ہے۔ جو تیاں چٹختے پھرتے ہیں اور چار ہزار کی ٹکری بھی نہیں ملتی کو جرانوالہ ہے میں لائن پر۔ چوبیس گھنٹہ گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ دولوں ہاتھوں سے چپا سیٹھا تھا۔“

میں نے کہا ”چوبیس گھنٹہ اسٹال پر رہنے والے کو گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بھئی میاں! اب ایسے سوالوں کا جواب تو میرے پاس نہیں۔ جب اس پر جن آقا بیاہ باپ بڑے پریشان ہوئے۔ بہت علاج کرائے۔ پتا نہیں کس کس کے پاس لے گئے۔ آخر میں لڑکی کے منگیتر نے ہمارے بارے میں بتایا۔“

راہبر نے اور پر اعتقید مند تھا۔ اب تم اس کا بھی مذاق اڑاؤ مجھے عمر بھر یہ حقیقت ہے کہ اس کا کاروبار پہلے چٹا ہی نہ تھا۔ خیر ہی دوسرا اسٹال تھا۔ اس کی بہت سیل تھی۔ ہر وقت لگ لگ رہتا تھا۔ ایک روز اس نے ہم سے اتفاق کی کہ جیرا۔ کچھ بیچتے۔ ہم نے ایک خاص دقت میں عمل کیا اور اسے ایک فنش دیا۔ اس سے کہا کہ پہلی جھڑپ کو نصف شب کے بعد چائے کے لیے پانی لیا لے تو نقش کو پانی میں ڈال دے اور چائے بنا کے ملا موافق ملائے۔ جب آخری کپ راجا نے تو مجھ کی طرح دوسرے اسٹال والے کو ملا دے۔ اب یہ شکل ہے کہ کئی اسٹال کا مالک خود اپنی چائے بنا کے پی پتے۔ وہ دوسرے اسٹال کی چائے کیوں پیے گا۔ خیر جی! ان نے دوسرے اسٹال والے کو بڑی محبت سے بلایا اور کہا کہ اب ہم سے ناراض ہے۔ نہ ادھر آتے ہوں بات کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ کیا کروں! اتنا رش ہوتا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس نے چائے پیش کی اور اس نے پی لی۔ بس ہو گیا کام۔ دیکھتے دیکھتے ہمارے مرید کا کاروبار چمک اٹھا۔ جو اس کے حریف کے اسٹال پر چائے پیتے جاتے تھے ان کو چائے کا ذائقہ اتنا خراب لگتا تھا کہ وہ ایک ٹھونٹ پی کے بھڑوڑ پیتے تھے۔ پھر ساتھ دالے اسٹال پر جاتے تھے تو لطف آتا تھا۔ دو بیٹے میں نقش الٹ گیا۔ اب وہ کیاں مارتا نظر آتا تھا جس کو سر کھانے کی فرصت نہ تھی اور سارا رش میرے رب کے اسٹال پر بہتا تھا۔ تب سے وہ ایسا مرید بنا ہے کہ اب اس کی منگیتر کو جن نے بے حد پریشان کیا تو اس نے اپنے ہونے والے سر سے کہا کہ اس کا علاج کوئی کر سکتا ہے ان کی موتی نذیر۔“

میں نے کہا ”نذیر چچا! کیا حرج تھا اگر لڑکی کو اسی جن کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا۔ ایسا عاشق صادق تھا تو اسے قتل بھی رکھتا۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا۔ جو مانگتی حاضر نہ تھا۔ گھونٹے بھر کے کوئی چاہتا تو اڑا کے ہر جگہ لے جاتا۔ لیکن نہیں۔“

سب ہنسنے لگے تو صوفی چچا نے ناراضی کا اظہار کیا ”یہ بدولایتی تعلیم کا نشہ ہے رفیق میاں کہ سوچے سمجھے بغیر

بولے چلے جا رہے ہو۔ یہاں ہوتے تم تو چشم خود ملاحظہ کرتے اس لڑکی کی حالت کیا تھی۔ اس کے باپ اور بھائی کے لیے اسے قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ خود کو چھڑا کے بھاگتی تھی اور زمین پر لٹوتی تھی۔ تو پہلی نظر میں تازہ گئے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ اسے باندھ کر ڈالا اور ایک جلائی دھیلے کا آغاز کیا۔ جن چلانے لگا اور مخالفت کیلئے لگا۔ انتہائی مردانہ قسم کی عین مردانہ آواز میں ہمیں ڈرانے دھکانے لگا۔ ہم کھم گئے کہ یہ لڑکی عام جن نہیں ہے وہ اپنی اسلیٹ ظاہر نہیں کرتا تھا۔ ہم نے مراقبہ کیا تو غیب سے سارے اسرار فاش ہوئے۔ پتا چلا کہ اس نادان لڑکی نے خود جن کو کور غلایا تھا۔“

ابانے حیرت سے کہا ”جن کو کور غلایا تھا۔ وہ کیسے؟“

صوفی چچا نے کہا ”بھائی صاحب! آپ تو بچپن سے سننے آئے ہوں گے۔ یہ بات کہ لڑکیوں کو غروب آفتاب کے بعد بال کھول کر چمت کر جانے سے روکا جاتا ہے۔ وہی وقت ہوتا ہے جہات کے دواہن لوٹنے کا۔“

میں نے کہا ”کیا ان کا بھی کوئی گھونٹا ہوتا ہے؟ وہ بھی پرنسوں کی طرح صبح کھل جاتے ہیں؟“

صوفی چچا نے کسی کے ہنسنے کی پروا نہیں کی ”اس لڑکی نے بزرگوں کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ ایک روز شام تک سوتی رہی اور اچھی تو اسکی کوٹھے پر چلی گئی۔ نیچے جس تھا اور گری تھی۔ گرج چمک پر آنکھ ملتی تو ٹھنڈی ہوا کھانے کو دل چاہا۔ بس شامت اعمال بلایا تھا۔ اور چٹنی تو بارش کا طوفان۔ ایسے میں ایک حسین اور جوان لڑکی بال بکھرائے بارش میں بھیٹے اور تپنے لگے۔“

میں نے کہا ”یعنی وہ ڈانس بھی کر رہی تھی کھانسی یا قلمی؟“

چچا نے اپنی بات جاری رکھی ”لڑکیوں پر اثر ہے بھارتی فلموں کا۔ ورنہ ہمارا کوئی ایسا بھڑے۔“

میں نے کہا ”گھنٹا سی منافع چچا! کیا آپ نے پاکستانی کلچر کی نمائندہ شہکار پنجابی فلمیں دیکھی ہیں جن میں ریشمی لاپے بہن کے لڑکیاں ایسا رقص کرتی ہیں کہ فیملی کے ساتھ آنے والے پریشان اور پشیمان نظر آتے ہیں یا ان سے بھی بڑھ کر جھٹو نہیں۔“

چچا نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا ”لاحول ولا قوۃ۔ ہماری نظر تو سنیا کے باہر سے گزرتے ہوئے پوسٹر دیکھ کر بھی جھک جاتی ہے لیکن اب جو دی سی آر نے گھر گھر سنیا کھول دی ہے میں تو شریف مسلمان گھروں کی بو بٹیاں بھی بے ہودہ قلمی گانوں کی دھن پر رقص کرتی ہیں۔ ہم نے تو سارا منظر

مرا تھے کی حالت میں گویا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“
 ”مگر آپ کے مقابلے میں جن زیادہ حسن پرست اور
 عاشق مزاج ثابت ہوا۔ وہ رہتا کہاں تھا چچا؟“
 اپانے مجھے گھورا مگر سکراتے رہے۔ باقی سب جو ذریعہ
 چچا کی روحانی قوت کے کرشوں کی داستانیں سنتے رہتے تھے
 اور یہ قصہ بھی کئی بار سن چکے تھے خاموش رہے۔
 چچا نے کہا ”لو لڑکی کے گھر کے چھوڑاؤں ایک پرانا پمیل
 کار درخت تھا۔ آج کل وہاں آبادی ہے لیکن تقسیم سے پہلے
 مرگھٹ تھا۔ ہندو وہاں اپنے مردے جلاتے تھے۔ وہاں
 ہندوؤں کی ارواح خبیثہ کا غلبہ تھا۔ تقسیم کے بعد ہندو گئے تو
 ارواح نے بھی وہ مسکن چھوڑ دیا۔“
 ”یعنی پائیشن میں جن نبوت بھی تقسیم ہوئے؟“ رابعہ
 نے دے دے لے لے میں سوال کیا۔

مذہب پر جانے سے گھبراہٹ ہوئی۔ ”میں نے کہا“ اور ان کی جگہ اٹھارے سے ہجرت کر کے آنے والے جنات نے ڈیرا ڈال لیا۔ جیسے مہاجرین نے ہندو سکھوں کے مکان الاٹ کر لئے تھے؟“

بچا کی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا 'رفیق میاں' یو تو ہم نہیں جانے کہ وہ جن کب سے وہاں تھا۔ اس نے بیٹھل کے درخت سے لڑکی کو بارش میں بیٹھکا اور رقص کرتا دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ی لڑکی پر رجنی کی کیفیت کا غلبہ ہوا۔ اس نے دشت میں چلتا شروع کیا اور اپنے کپڑے پھاڑ لئیے، بال نوچے اور پھر بے ہوش ہو کے گر گئی۔ اس کے باپ اور بھائی نے اسے بڑی مشکل سے اٹھایا اور نیچے لائے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دہلی چلی گئی تھی مگر اس کا وزن اتنا

زیادہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہانپ گئے۔ ہوش میں آتے ہی لڑکی پھر اٹھی۔ جن نے اسے مجبور کیا کہ ڈانس کرے۔ اس نے باپ کو سختی دی۔ بھائی کو ایسا دکھایا کہ وہ دیوار سے جا لگا۔ مگر کی عورتیں چیخنے چلانے لگیں۔ اسی طوفانی بارش میں بھلاہد کے لیے کون آتا۔ کچھ دیر بعد وہ تھک کے گری کی تو اس کے منہ سے کف جاری تھا اور ہاتھ پاؤں اٹھ گئے تھے۔ جب بارش ختمی تو گھر والے باندھ بوندھ کر کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے انجکشن لگادیا فوراً..... ایسا ہی کرتے ہیں سارے ڈاکٹر۔ لڑکی کو اس نے انجکشن لگا کر کے چھٹی کر دیا۔ انجکشن کے اثر سے وہ سو جاتی تھی لیکن ابھی تھی تو پھر وہی حالت۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا تھا۔ جسم میں خون تو جیسے خشک ہو گیا تھا۔ رجب ہلدی جیسا پیلا رنگ کیا تھا اور جسم کی کھال

سو کہ کے چڑا ہو گئی تھی۔ مگر والے ڈاکٹر اور حکیم بدلتے گئے مگر لڑکی کی حالت میں افانے کی صورت پہرہ نہ ہوئی۔ اس کے بعد عامل بلوائے گئے۔ ان کے دھلیپے اور عمل الٹ گئے۔ ایک بڑا نامور عامل اندرون سندھ سے آیا۔ اس نے ہوا پھینچ کر آگ جلائی اور اپنا سٹنٹ عمل شروع کیا۔ لڑکی نے نہیں جن نے اس کے ایسی لالٹ ماری کہ بے چہندے کے کوسے کی طرح لڑکھ گیا۔ اس کا دھوئی تھا کہ بڑے بڑے اڑل جنت کو بھسم کر چکا ہے۔ جب وہ ہوش میں آیا تو بھیگی ہاتھیں کر رہا تھا۔ اس کے دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ ایک رات کہیں کھل گیا۔ بہت ذہوئہ اگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر ایک روز اچانک اس کی لاش ملی۔ جن نے اسے پھینک کے اسی درخت سے لٹکا دیا تھا۔ قصہ مختصر جب اس مر لیفٹ کو ہمارے پاس لایا گیا تو ہمیں بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ کتنا متہ زور جنی ہے۔ ذرا کوتاہی ہوئی تو ہماری جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ اب قسمت ایسی تھی اس کی۔

”نکس کی..... جن کی؟“ میں نے کہا۔

چجانے داخل انداز کی پروا انہیں کی ”اس لڑکی کی قسم“
 میاں رفتی! اس جن کو نکلت دینے کے لیے ایک جلاں وغیرہ
 ضروری تھا۔ اس کے لیے شوال کے مہینے کی شرط تھی کہ
 خود ہو جس شب ہوادرجعرات پڑے۔ خدا کی قدرت کہ ایسا
 ہی ہوا۔ پھر چٹا کی آگ کے کولوں کی ضرورت تھی۔ وہ انڈیا
 سے لائے گئے۔ ان کولوں کو ایک کنواری لڑکی کی کھوپڑی میں
 دیکھا تھا۔ پکوال کے ایک گورنر نے کسی قبر کی نشاندہی کی
 جہاں سال بھر پہلے کوئی لڑکی دفن کی تھی۔ اس نے خود کئی
 تھکی چٹا خچہ وارث رات کے وقت خاموشی سے گاڑ گئے
 تھے۔“

میں نے کہا ”بچا“ ممکن ہے اسے نکل گیا ہو؟“
 ”ہو سکتا ہے لیکن اس سے ہمیں فرق نہیں پڑتا تھا۔
 کھوپڑی مل گئی تو اس میں چتا کے کولے دھکائے گئے۔ ان پر
 کالی نمی کا خون چھڑکا، سور کی جڑی اور پھل کتے کی دم کے
 بال چلائے گئے۔ بھڑم کی ہوائی ساٹم جوں کی دھواں دلی
 اور دھیفہ شروع کیا تو لڑکی ذبح کی ہوئی سرخئی کی طرح چڑنے
 لگی۔ لڑکی نہیں دہن تڑپ رہا تھا۔ اس نے اذیت سے چننا
 چلانا شروع کیا مگر ہم نے دوسرا اور پھرتیسرا دھیفہ شروع
 کر دیا۔ جن کی مزاحمت نہ کر دے پڑنے لگی۔ اس کے قتل سے
 ایسی آوازیں نکلتی شروع ہوئیں جو قربانی کے بعد بکرا کا
 ہے۔ بالآخر لڑکی ساکت ہو گئی اور سکون سے سو گئی۔ اس کے
 قابض سے جن نکل گیا تھا کھو ہوا ہی ذلیل اور ذہین جن

تھا۔ وہ ایک جوں بن کے ہمارے بالوں میں گھس گیا۔“
 میں ہنس پڑا۔ ”جن ایک جوں بن گیا۔“
 ”دادی کہا کرتی ہیں ارے اس کے بالوں میں تو ہمیشہ
 جو بن پڑ جاتی گئیں“ جب یہ چھوڑا تھا۔ ”راجہ نے منہ جھکا کے
 دیکھا۔“

ایک بار پھر سب ہنسنے لگے مگر پیر چچا اس خالفاغزوہ کے
سے عادی ہو چکے تھے۔ بالفاظ دیگر ڈھٹ بن گئے تھے۔
انہوں نے مجھے مخاطب کر کے ڈانٹا ”میاں! ہنسنے کی بات
نہیں۔ جنت سے واسطہ پڑا تو ساری ہنسی بھول جاؤ گے۔
جن خاک کی نہیں ناری ہو تے ہیں۔ کسی بھی قالب میں ڈھل
جاتے ہیں۔ ہم اس وقت خود سے بے خبر تھے۔ جلال و غضب
میں خود اپنا پوش نہ تھا۔ جب حالت بہتر ہوئی تو جن سے آنے آزار
پر کمر باندھی۔ سر میں خارش شروع ہوئی اور بوڑھی چلی گئی۔ ہم
دوسر کچا کھانے کا مائل ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ جو کس مارنے
والی دوا سر میں لگاؤ ہم نے باری باری ہر دوا آزمائی۔ پھر کسی
نے مشورہ دیا کہ مکمل مارنے والی دوا سر میں ڈالو۔ کسی نے کہا
کہ کار کوج ختم کرنے والا تیل ڈالو۔ سب آزما کے دیکھ لیا۔
دوبینٹ دن میں چپکا پڑا رہتا تھا۔ رات کو ادھر سوئے گا اور ادھر
کھائے گا ادھر اس نے کروٹ لی۔ رات نیکے پسر پختے زور کھاتی
گئی۔ نیند کی کمی کا اثر دن کے کام پر پڑتا تھا۔ سارا دن اٹھتے
گرتا تھا۔ بالآخر سر منہ دایا۔ اب خدا کی قدرت دیکھو کہ
چچا جامِ یادہ یحییٰ میں ہمیں مسلمان کر چکا تھا۔“
مجھے پھر بھی آنی ”یہ نیکی تو اس کے نامہ اعمال میں لکھی
گئی۔“

چچا نے کہا ”میاں رفیق! خود تم بھی اسی کے ہاتھوں
 مسلمان ہوئے تھے اور تمہارے ابا بھی۔ اللہ اس کی مغفرت
 کرے۔ سوال سے زائد عمر میں وفات پائی۔ اس کے
 اترے پر لکھا ہوا تھا بسم اللہ الشکر۔ بس اسی کی وجہ سے جن
 کو کھانا پڑا۔ محروم بھی ایک خلیفہ تھا۔ سر کے بالوں سے
 لٹکاواڑ میں داخل ہو گیا۔“

بالے کہا "اے بھتی خیر! اتنی بھی مت ہانگو۔"
خود میرے لیے بھی ہنسی کو ضبط کرنا محال ہو رہا تھا۔ آہستہ
چل چل کر مجھ سے ہی نہیں سب سے خفا نظر آتی تھیں مگر ان کے
سامنے بول نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے حکلی سے کہا "کھی کھی
کرنے والی اس میں کیا بات ہے۔ یہ کوئی جھوٹ تو نہیں بول
رہے ہیں۔"

اماں نے کہا ”ہمیں سب پتا ہے جھوٹ بچ کا۔“
نذیر چچا نے کہا ”آپ کے سر عزیز کی قسم بھالی! اور

بد باطن جن چاہتا تھا کہ ہم سر کی طرح چہرے پر بھی اسٹرا پھرادیں۔ یہ ناممکن تھا۔ ہماری تو عمر بھر کی کمائی بھی ریش مبارک ہے۔ اس سے تو ہمارے چہرے کی زینت ہے۔ کم ہمت جن نے ہمیں اتنا زچ کیا کہ کبھی بھی تو ہم خود بخود اپنی داڑھی نوچ لیتے۔ پھر ایک رات خواب میں ہمارے پیر دم شد تشریف لائے اور بتایا کہ یہ وہی جن ہے جو اب ہمارا دشمن ہو گیا ہے اور ہماری زندگی اجہرن کرنے پر آمادہ ہے۔ اس نے ہمیں گنجی تو پہلے ہی کر دیا ہے۔ ریش مبارک سے بھی محروم کر دے گا اور اس کے بعد بھی اپنی بے آردی اور گھٹ کا بدلہ لینے کے لیے کسی نہ کسی صورت ہمیں اذیت دیتا رہے گا۔ ممکن ہے وہ پھر بن جائے یا چوٹی بن کے کاٹنا رہے۔ ہمارے جسم میں خارش کر دے جس میں کینسرے پڑ جائیں اور پیپ بنے۔ اس کا خاتمہ بے حد ضروری ہے۔ پھر آپ نے ایک ناری چلہ بتایا۔“

میں نے کہا ”یہ ناری چلنا ہوتا ہے؟“
 ”بھئی نارا کا مطلب ہے آگ۔ جنات بھی ناری ہیں اور ان کو نارا کرنے کے لیے ناری چل آ رہی ہے۔ جیسے کہتے ہیں ناکہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے تو آگ کی مخلوق کو آگ ہی ستاہ کرتی ہے لیکن ذرا کی کوئی باغظلی ہو جائے تو انجام دہی ہوتا ہے جو آگ سے کھیلنے والے کا ہو سکتا ہے۔ چل کر نے والا خود جل کے راکھ ہو جاتا ہے۔ عیر صاحب قبلہ نے ایک قبر کی نشاندہی فرمائی۔ وہ ایک ایسی ہی لڑکی کی قبر تھی جس کی جان اسی جن نے لی تھی۔ اس قبر کے بارے میں گورکن نے بتایا کہ جب اسے دفن کیا گیا تو پوری رات قبرستان کے درختوں میں بسیرا کرنے والے پرندے مضطرب رہے اور خوف زدہ آوازوں میں چلاتے رہے۔ کچھ فاصلے پر ایک سوکھا ہوا درخت تھا۔ اس کی ٹنڈ منڈ شاخ پر ایک آٹوکا بسیرا تھا۔ وہ رات بھر چنچن رہا آدمی رات کے وقت گورکن کو قبرستان میں سے کسی عورت کے چنچنے چلانے اور زور زور سے رونے کی آواز سنا لی دی تو وہ گھبرا کے باہر نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ غنڈے بد معاش یا شرابی کسی عورت کو پریشان کر رہے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گورکن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کی قبر کے پاس ایک سایہ سا گردش کر رہا ہے۔ وہ دور کے واپس آئی کوفری میں گھس گیا کیونکہ بظاہر انسان نظر آنے والا وہ سایہ درخت سے ادنیٰ تھا۔ اچانک وہ چھوٹا ہونے لگا۔ یوں جیسے قبر کے اندر دھنس رہا ہو۔ اگلے روز جب لڑکی کے لواحقین قبر پر فاتحہ خوانی کرنے آئے تو گورکن نے معلوم کر کے لڑکی کو کیا بتا دی تھی۔ کسی عزیز نے بتایا کہ لڑکی پر ایک جنز

اسے سمجھاتے "بعد میں چا چلا کر لڑکی کے لیے کہیں سے ایک رشتہ آیا اور گھر والوں نے لڑکی سے پوچھ کر شادی بھی کر دی۔ اب ماشاء اللہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ دو بچے بھی ہیں اس کے۔"

میں نے سوچ کے کہا "وہ لڑکا اسی محلے کے ہوگا یا پھر اسی کالج میں پڑھتا ہوگا جس میں لڑکی پڑھ چکی تھی؟" بے خیالی میں بچانے کہہ دیا "دونوں ہی باتیں ہیں۔" میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا۔ میں نے کہا "پھر تو سب ٹھیک ہونا ہی تھا چاہیے پہلے ہو جاتا تو آپ کو ناری جلد بھی نہ لگنا پڑتا۔"

چچا جڑ گئے "گو یا تم بھورے ہو کہ اس لڑکی نے دوسری جگہ شادی کرنے کے لیے سارا ڈراما کیا تھا؟ اسے سسر بایکے دور سے پڑتے تھے۔ میاں تمہارا کیا ہے تم کو تو ناری چلے کوئی ڈراما کہہ دو گے۔ ولایت میں گزار آئے ہو چھ سات سال۔ تمہاری آنکھوں پر تو انگریزی کی تعلیم نے پٹی باندھ دی ہے" وہ اٹھے اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

سب کو اندازہ تھا کہ اب وہ احتجاجاً واک آؤٹ کریں گے۔ ایسے سے سرد پانچے میں بچپن سے سنتا آ رہا تھا۔ آندہ چچی کا موڈ بھی خراب ہو گیا تھا۔ میری رائی بھی جو اس موضوع پر حریہ بات کرنے کے موڈ تھی لیکن میں نے معذرت کی اور سونے کے بہانے اپنے کمرے میں آ گیا۔

گھڑی میں رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ گویا لندن میں رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ لاڈلہ ارشد اپنی بیٹی کو ذاتی ضمانت پر چھڑا کے کھلے گیا ہوگا کیونکہ ایک تو جرم کی نوعیت زیادہ سنگین نہیں تھی دوسرے عاشق کا سابقہ ریکارڈ بے داغ تھا۔ میں دوبارہ کوشش کرتا رہا مگر سواصلاتی نظام کی خرابی کی یا کوئی اور وجہ کہ میری کال ہی نہیں گئی۔

صوفی چچا کے جناتی قصے نے میرا بہت دقت خالق کیا تھا اور میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اگرچہ واقعات میرے لیے ناقابل یقین تھے مگر میں پورے دھوٹے سے نہ پرہیز کی بات کو سو فیصد جھوٹ سمجھنے سے قاصر تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ کچھ بھی کہیں گھر میں ایسے واقعات گھڑنے کے انہیں کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یقین کوئی نہیں کرے گا اور دادی تو بالکل معاف نہیں کریں گی۔

پراسرار واقعات ہر جگہ پیش آتے تھے۔ خود لندن جیسے شہر میں عاتلوں کی کمی نہ تھی جو روحوں کو بلاتے تھے اور ان سے بات کرانے کے دعوے دہرائی تھے۔ وہ کرسٹل بال میں دیکھ کر

فریضہ ہو گیا تھا ایک عامل نے جن کو قابو کرنے کی کوشش کی تو جن نے اس کی گردن مروڑ دی۔ دوسرے کو خون کی الٹیاں آنے لگیں۔ پھر لڑکی کو جھک کے کسی عامل کے پاس لے گئے تھے۔ وہاں سے آنے کے بعد اس کی حالت اور بگڑ گئی۔ حالانکہ عامل نے کہا تھا کہ وہ تین راتوں کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ تیسری رات وہ مر گئی۔ یہ کافی پرانی بات تھی۔ جب ہمیں وہاں ناری چلے کانٹے کے لیے کہا گیا تو ہم نے رات کے وقت چاکر دیکھا۔ قبر ایک طرف سے دھس گئی تھی۔ ہم نے اندازہ کر کے اس کے ہیروں کی طرف سے ہڈیوں کو بنایا اور اپنے کھڑے ہونے کے لیے جگہ بنائی۔ یہ تین رات کا چلہ تھا۔ پہلی رات خبیث جن مختلف صورتیں بدل کے ہمیں ڈرانے آتا رہا۔ کبھی سانپ بن کر ناگوں سے لپٹ جاتا، کبھی بگھو بن کے گردن پر پتھر لگتا۔ ہمارے استغراق میں فرق نہ آیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ بانکار ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔ دوسری رات وہ زیادہ بے چین ہوا اور تڑپ تڑپ کے عجیب منحوس آوازیں آنے لگیں۔ بالآخر وہ رونے پینے اور منت ساجت کرنے لگا۔ تمام عمر ہماری تابعداری کے دعوے کرنے لگا۔ لالچ دینے لگا اور پھر دھمکیاں لیکن ہم نے تو اسے جس نہیں کرنے کی قسم کھائی تھی۔ ہم نے دخیفہ نہیں چھوڑا۔ آخر شب میں اچانک ہماری داڑھی سے دھواں خارج ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ داڑھی میں آگ لگ جائے گی مگر پھر بالوں سے راکھ بھرنے لگی اور قبر کے اندر گرنے لگی۔ قبر کے اندر راکھ کا ڈمیرج ہو گیا۔ اذان فجر کی آواز آئی تو ہم نے طبیعت میں بہت سکون محسوس کیا۔ قبر سے نکل کے مسجد کا رخ کیا اور وضو کر کے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد جب روشنی پھیل گئی تو جس نے دوبارہ قبرستان جانے پر مجبور کیا۔ اس قبر کو دیکھا تو راکھ کہیں نہ تھی مگر ارد گرد کے درخت پودے اور گھاس پھوس جل کر سیاہ ہو چکے تھے اور وہاں ایسی بدبو تھی کہ سانس بھی لینا محال تھا۔ الحمد للہ وہ لڑکی بھی ٹھیک ہو گئی اور کچھ عرصے بعد اس نے شادی بھی کر لی۔

میں نے کہا "اسی بچپن اینڈ بچپن کے معیترے؟" چچا نے قدرے تامل کیا "نہیں وہاں تو شادی نہیں ہوئی۔"

"پھر کہاں ہوئی؟" راجہ چپ نہ رہ سکی۔ "وہ دراصل..... ہمارے اس سرید کے دل میں کچھ خوف بیٹھ گیا تھا کہ کہیں وہ جن اس کا دشمن نہ ہو جائے۔" میں نے کہا "تو آپ نے مجھ کر دیا تھا۔" "ہاں..... لیکن وہ ڈر گیا تھا۔ ہمیں موقع ہی نہ ملا کہ

انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنالیا تھا لیکن افغانستان میں ایسا نہ تھا۔ وہاں ایک قوم بستی تھی اور وہ سب ایک زبان بولتے تھے۔ ان کا مذہب ایک تھا اور تہذیبی روایات ایک تھیں۔ وہ آپس میں ضرور لڑتے تھے مگر کسی بیرونی حکمران کے سامنے متحد تھے اور کافر فرنگی جو شراب پیتا تھا اور سور کھاتا تھا تاقیات ان پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔

انگریزوں کی طاقت ان کی نو بیستی قوت کے ساتھ ان کے ڈپلن اور سیاسی چال بازی میں مضمر تھی۔ انہوں نے سندھ اور بلوچستان کے راستے افغانستان پر یلغار کی تو ان کی منظم فوج کے پاس بے پناہ اسلحہ اور توپ خانہ تھا۔ سردار دوست محمد اس کا مقابلہ کیسے کرتا اور کب تک کرتا۔ انگریزوں نے اسے گرفتار کر لیا اور قیدی بنائے ہندوستان بھیج دیا۔ اس کی جگہ انگریزوں نے اپنے ایک پموشاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا اور اپنی انواع کو جلال آباد اور کابل میں چھاؤنی بنائے رکھا۔

صرف ایک سال بعد ہی افغانوں نے انگریز کے بنائے ہوئے حکمران شاہ شجاع کو قتل کر دیا اور سردار دوست محمد کے بیٹے اکبر خان کی بادشاہت قائم کر دی۔ اکبر خان نے عیان حکومت سنبھالنے ہی کابل کے انگریز کمانڈر جنرل سیل کو نوٹس دے دیا کہ وہ ایک مہینے میں اس کے والد سردار دوست محمد خاں کو ہندوستان سے واپس لائے اور افغانستان میں اس کی حکمرانی بحال کرے ورنہ افغانستان میں موجود ہر ایک انگریز کو جین کر قتل کر دیا جائے گا۔

جنرل سیل نے غور و خوض اور دائرے ہند سے مشورے کے لیے ایک ماہ کی مہلت طلب کی۔ اکبر خان کو اس کے جاسوسوں کے ذریعے اطلاع ملی کہ انگریز اس کے والد سردار دوست محمد خان کے ساتھ ایک شرط معاہدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوست محمد کو گوالیار کے قلعے میں رکھا گیا تھا۔ دائرے کے ایک نمائندے نے اس سے ملاقات میں کہا کہ تمہارا باغی بیٹا یہ چاہتا ہے کہ تم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ وہ افغانستان کا مستقل بادشاہ تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے بعد وہ انگریزوں کی اطاعت بھی قبول کر لے گا مگر ہندوستان کا انگریز دائرے ایسا کرنے سے پہلے دوست محمد خان کو ایک موقع اور دینا چاہتا ہے۔ اگر وہ انگریزوں کی اطاعت قبول کر لے تو اسے واپس بھیج کر افغانستان کا حکمران بنادیا جائے گا اور اس کے بیٹے اکبر خان کو تخت سے اتار کے بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

کہتے ہیں سردار دوست محمد خان نے قیدی اور مجبور

مستقبل کے واقعات کی نشاندہی بھی کرتے تھے اور ان کے پاس سب گورے آتے تھے جو بڑی بڑی فنیس ادا کرتے تھے۔ ان عاتلوں پر یقین کرنے والوں میں لو جو ان بڑے عورت مرد سب شامل ہوتے تھے۔ لندن کے اندازوں میں آسب زدہ مکانات کے بارے میں واقعات بھی شائع ہوتے تھے۔ بڑے بڑے صاحبان مکمل بھوتوں کے بارے میں ایسے ایسے واقعات سناتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ امریکا اور یورپ میں عجیب و غریب فرتے تھے جو راہبیت کے بارے میں ناقابل فہم عقائد رکھتے تھے۔ ان پر ایسے فرتے بھی تھے جو شیطان کے پیروکار اور بچاری سمجھے جاتے تھے۔ جادو ٹاپورے یورپ امریکا میں عام تھا۔ میرا ذاتی مشاہدہ کچھ نہ تھا۔ مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو خود کسی پیر ارادے کا کردار بنا ہو۔ آپ جی نے کسی نے نہیں سنا ہی کہ ایسا میرے ساتھ ہوا۔ سب وہ ہتے تھے جو دوسروں پر مگر زری تھی۔ سنی سانی باتیں دہراتے تھے اور اکثر جھوٹ بولتے تھے چنانچہ ایسی باتوں پر سوچنا بھی میرے نزدیک تصحیح اوقات کے سوا کچھ نہ تھا۔

اچانک مجھے بشارت فاروقی کی دی ہوئی سری کا خیال یاد میں لیٹ کر پڑھنے لگا۔

☆☆☆

روایات کے مطابق حویلی اور جاگیر سے منسوب تاریخی واقعات کا سلسلہ 1857ء کی جنگ آزادی سے بھی بہت پہلے شروع ہوتا تھا۔ سترہ سال قبل یعنی 1840ء تک انگریزوں کی مکمل داری پورے ہندوستان پر قائم ہو چکی تھی اور انہوں نے کلکتہ سے بمبئی، دہلی اور لاہور تک عوام اور حکمرانوں کی باہمی طاقت سے دہشت بٹھادی تھی۔ آخری تاجدار سلطنت علی گڑھ ہمارا شاہ ظفر کی حکومت قلعے تک محدود ہو گئی تھی اور انگریزوں کی نظر اب ہندوستان کے دیگر علاقوں سے بڑھ کر دیگر لوگوں تک پھیل رہی تھی۔

افغانستان میں سردار دوست محمد کی حکومت تھی لیکن وہاں کی کابل اور جلال آباد میں انگریز اپنی چھاؤنی قائم کر چکے تھے اور فوجی قوت کے بل پر پورے افغانستان کو اسی طرح تسلط گزارنا چاہتے تھے۔ جیسے وہ ہندوستان کو بنا چکے تھے لیکن ملال یہ مشکل ہی نہیں نامکن تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان ان محنت چھوٹی بڑی ریاستوں راجاؤں ذاتی ہڈیوں کے علاوہ صوبوں میں بنا ہوا تھا۔ جو اختلاف رعایا کے درمیان معاشرتی، لسانی اور تہذیبی فیصلوں پر تھا دیہاتیوں کے درمیان تھا اور اسی انتشار سے فائدہ اٹھا کے

ہونے کے باوجود اس رائے کے نمائندے کے منہ پر تھوک دیا اور کہا ”جھوٹے پر خدا کی جولنت ہوتی ہے وہ تیری صورت پر نظر آ رہی ہے۔ نہ میرا بھائی ایسا ہے اور نہ میں کہ افغانستان کے تخت کے لیے کافر انگریز ہم سے اطاعت خرید سکے۔“

خود اکبر خان بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے کابل کے انگریز کمانڈر جنرل سیل کو دوسرا الوش بھیجا کہ سردار دوست محمد خان کو باعزت طور پر واپس لانے اور افغانستان کا حکمران بنانے کے بعد انگریزوں کو ایک ماہ کے اندر اپنی ساری فوج افغانستان سے نکالنی ہوگی ورنہ حریت پسند اور غیرت مند افغان ایک بھی سپاہی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تاہم انگریزوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے تو انہیں مزید ایک ماہ کی مہلت دی جائے گی۔ لیکن بد عہدی کے خلاف عنایت کے طور پر جنرل سیل کی بیوی اور انگریز فوج کے سوا فسادوں کو شاہی مہمان رکھا جائے گا۔ دوسرے فریب اور عیاری کا مظاہرہ کرنے کی صورت میں سب سے پہلے انہی کو متعلق کیا جائے گا۔

یہ خطرہ نہ کرنے سے پہلے ہی اکبر خان کی فوج کے کچھ دستوں نے جن میں خاص حراج کے کفن پوش جانناز شامل تھے چھاؤنی پر رات کے وقت حملہ کیا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سواکریز افسروں کو اور جنرل سیل کی بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے کسی کے ساتھ بھی بدسلوکی نہیں کی۔ کوئی لوٹ مار نہیں مچائی اور کسی کو ہلا دیہ قتل نہیں کیا۔ ہاں مقابلے پر آنے والے اور حراحت کرنے والوں کا مٹایا کر دیا گیا۔ تمام قیدیوں کو شاہی مہمان کی حیثیت دی گئی اور کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ انہیں بتادیا گیا کہ معاہدے کی خلاف ورزی نہ ہوئی تو سب کو باعزت طور پر واپس پہنچا دیا جائے گا۔

جنرل سیل جھٹس گیا۔ اس نے معاہدے کی نقل وائسرائے ہند کی معرفت افغانستان میں ملکہ وکٹوریہ کو ارسال کی۔ جب وہاں غور و خوض میں تاخیر ہوئی تو جنرل سیل خود لندن پہنچا۔ وہاں اسے صاف بتادیا گیا کہ حکومت برطانیہ کی طرح بھی باغیوں سے بلیک سیل نہیں ہوگی۔ جنرل سیل اپنی مدد کے لیے جلال آباد چھاؤنی سے فوج طلب کرے اور قیدیوں کو چھڑانے کے بعد باغیوں کے ساتھ سختی سے نئے۔ افغان سرداروں کو سرعام پھانسی پر لٹکایا جائے اور ان کی لاشوں کو درس عبرت کے لیے عین دین تک نہ اتارا جائے۔ عام باغیوں کو قوت و دم کر دیا جائے۔

جنرل سیل نے ایسا ہی کیا۔ اس نے جلال آباد کے علاوہ ہندوستان سے بھی انگریز فوج طلب کی مگر افغانوں نے ایک جنگی حکمت عملی کے مطابق انہیں ایک پہاڑی درے میں گھیر لیا جس کا نام جلد کہ تھا اور لشکر کے ایک ایک سپاہی کو چھن چن کر قتل کر دیا۔ صرف ایک انگریز کو زندہ چھوڑا گیا جو ڈاکٹر تھا۔ اس کا نام برائی ڈن تھا۔ کہتے ہیں اسے کپڑے اتار کے ایک بچہ سے میں ڈال گیا اور اسی حالت میں سردار اکبر خان کے سامنے پیش کیا گیا تو دہشت ہے اس کی حالت غیر مچی۔ اکبر خان نے کہا کہ اب ہم جنہیں جنگی قیدی نہیں بلکہ سفیر کا درجہ دیا کرتے ہیں۔ پھر اس کو بچہ سے بے نکال کے شاہی خلعت پہنائی گئی اور ایک خط دیا گیا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ سوائے جنرل سیل کے یہ خط کسی کو نہ دیا جائے۔ پھر اسے سواری کے لیے ایک گھوڑا دے کر روانہ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر برائیڈن اتنا دہشت زدہ تھا کہ روانگی کے بعد مسلسل گھوڑا دوڑاتا رہا اور خوف سے مڑے دیکھتا گیا کہ کہیں افغان اس کے قاتل قب میں تو نہیں ہیں۔ وہ خود تو اس طویل سفر کی تجبیل کے بھی زندہ رہا مگر اس کا گھوڑا مر گیا۔ جنرل سیل کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ وہ وائسرائے سے مشورے کے لیے ہندوستان گیا ہوا ہے۔ جلال آباد سے ہندوستان تک کے طویل سفر میں اس پر کیا سختی ہے بڑی لگی کہانی ہے۔ جب وہ سندھ سے گزر کے پنجاب میں داخل ہوا تو مرنے کے قریب تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے حد دلچسپ اور افسانوی تھا۔ کہتے ہیں حقیقت ہر انسان نے یہ زیادہ پراثر ہوتی ہے۔ الف لیلی کی داستانوں میں الہ دین کو وہ چراغ مل گیا تھا جس کے تابع جن البدین کی ہر فرمائش ایک جھپٹے میں پوری کر دیے تھے۔ خوش نصیبی نے علی باکو چاقیوں چوروں کے خزانے تک پہنچا دیا تھا۔ ایسی ہی ایک جگہ دور کی کہانی بشیر ساربان کی ہے جو اوٹ پر سوار کراچی کے کسی راستے پر کھڑا انتظار تھا کہ امریکی صدر جانسن کی شاہی سواری گزر جائے تو وہ بھی اپنی راہ لے۔ جب صدر کا جلوس گزرا تو جانسن کی نظر بشیر ساربان پر مچی۔ انہوں نے گاڑی روکوائی۔ نیچے اتر کر بشیر ساربان سے ہاتھ ملایا اور اسے امریکا آنے کی دعوت دے ڈالی۔ جسے چاہیں وہی سہاگن۔ بشیر اوٹ والا امریکی صدر کا مہمان بن کے امریکا پہنچا تو اس کی بے حد خاطر مدد ملت ہوئی اور وہ امریکا سے دھیر دھیر تحفے لے کر واپس آیا۔ شاہی اس میں ایک ٹرک بھی تھا۔ اگر وہ دور اندیش ہوتا تو اپنی زندگی ٹھٹھا باٹ سے گزرتا مگر معلوم ہیں اس کے ساتھ کیا

ہوا کہ اس کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ زندگی کے آخری دور میں امریکی کی ایک مضافاتی ہسپتال لاٹھی میں بڑی مسرت کے دن گزار رہا تھا۔

ڈاکٹر برائیڈن کو بہادر پور کے گرد و نواح میں کسی کسان نے دیکھ لیا جو اپنی جگہ کے ساتھ تیل گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔ برائیڈن بے ہوش پڑا تھا اور اگر کسان کی نظر نہ پڑتی تو شاید بھوک پیاس سے مر جاتا۔ کسان نے اسے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا۔ جب پانی پی کے اسے ہوش آیا اور کچھ کھانے کو ملا تو اس نے کسان سے گزارش کی کہ وہ اسے کسی طرح جہلم کے قریب رہتاس کے قلعے میں پہنچا دے۔ جنرل سیل وہاں انگریز فوج کے کسی دوسرے جنرل سے ملاقات میں مصروف تھا اور ان کے درمیان یہ مشورہ جاری تھا کہ افغانستان کی شرمناک عبرت ناک اور دردناک شکست کا بدلہ لینے کے لیے کتنا بڑا لشکر جوار تشکیل دیا جائے جو ایک خول انگریز کے بدلے میں دس افغانوں کو قتل کرے۔ ایک سواکریز غلام بنائے جانے والے انگریز افسروں کے بدلے میں ایک ہزار ایک افغان معززین کو قیدی بنا کے لائے اور جنرل سیل کی خالص دلائی بیوی کے بدلے میں افغان سردار کی بیوی اور خاندان کی ہر عورت کو اغلا لائے۔

ابھی یہ ملاح مشورہ جاری ہی تھا کہ ایک فوجی گارڈ نے اس انتہائی اہم اور خفیہ اجلاس میں مداخلت کی اور سیلوٹ مار کے کہا کہ ڈاکٹر برائیڈن افغانستان کے سردار اکبر خان کا انتہائی اہم پیغام لے کر آیا ہے۔

”کہاں ہے وہ پیغام؟“ جنرل سیل نے کہا۔
”ڈاکٹر برائیڈن کہتا ہے کہ یہ پیغام وہ خود صرف جنرل سیل کے ہاتھ میں دینے کا پابند ہے“ گارڈ نے کہا۔
”اوکے۔۔۔ ڈاکٹر برائیڈن کہاں سے آئے ہیں؟“
”وہ قلعے کے باہر تیل گاڑی میں لیٹا ہوا ہے سر جے ایک اٹھ دہائی ڈرائیو کر رہا ہے اور برائیڈن کا اصرار ہے کہ تیل گاڑی کو قلعے میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے“ گارڈ نے کہا۔ ”یہ اس کی درخواست ہے۔“
”واٹ نان سنس! خیر اسے آنے دو جیسے بھی وہ آتا ہے۔“

چنانچہ وہ تیل گاڑی رہتاس کے قلعے میں یوں داخل ہوئی جیسے جنرل سیل کو لانے والی فوجی گاڑی۔ گاڑی عین ٹرک ہائیڈ کوارٹر کے سامنے آ کر رکی تو ڈاکٹر برائیڈن نے خط کے ساتھ اس دیہاتی کو کبھی پیش کیا جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کی تباداری کی کچی اور اسے رہتاس تک پہنچایا

تھا۔

جنرل سیل اس دیہاتی کی خدمت گزاری سے اتنا متاثر ہوا کہ خود اس کی تیل گاڑی میں بیٹھ کے اسے قلعے کی فصیل کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ باہر آنے کے بعد اس نے ہاتھ لہرا کے کہا ”ویل جگ نیو! ہم تم سے بہت خوش ہوا۔ تم ڈاکٹر برائیڈن کا جان بچایا۔ وہ افغانستان میں برٹش سفیر ہے۔ تم نے ملکہ برطانیہ کے لیے بہت بڑا خدمت سرانجام دیا ابھی ہم تم کو ملکہ کی طرف سے اس کا رگزارہی کا انعام دے گا۔ یو لو کیا مانگتا ہے؟“

دیہاتی کے لیے فوری طور پر فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ کیا مانگے اور کیا نہ مانگے۔ اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر جنرل نے کہا ”اوکے“ ابھی تم تیل گاڑی میں جاؤ ادھر سارا زمین کوئین کا ہے۔ شام تک تم جتنا زمین کا راؤ ڈر لگائے گا سب تمہارا انعام ہوگا۔ ناؤ کو۔۔۔ جب سورج غروب ہوگا تو ہم تم کو ادھر لے جائے۔“

اب والدہ اعظم غلام نے کہا کہ بعد تیل تک گئے تھے اور اس انعامی اسکیم والی دیر بھین کے لیے پوری طرح فٹ نہیں تھے۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ دیہاتی نے بیوی بچوں کو وہیں چھوڑا اور تیل گاڑی کو شام تک دوڑاتا رہا۔ سورج غروب ہوا تو وہ پھر اپنے نقطہ آغاز پر تھا جہاں جنرل سیل اس کا منتظر تھا۔ وعدے کے مطابق اس نے وہ ساری زمین اس دیہاتی کے نام کر دی جس کا وہ چکر لگا کے آیا تھا۔

یہ دیہاتی ہمارے جد امجد عزت علی تھے جن کی ہم آٹھویں یا نویں پیدائش میں شمار ہوتے تھے۔ عزت علی کے بیوی بیٹے انہی کے ساتھ تھے۔ غالباً وہ لوٹ کر اس راستے پر ہی نہیں گئے جس پر نہ جانے کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ وہ اسی جگہ آباد ہو گئے جو اب موضع ست بدھانی تھا۔

اس شخص میں ایک دلچسپ بات جس کا میری کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگلے سال یعنی 1842ء میں جنرل سیل نے ایک بہت بڑی اور طاقتور فوج کے ساتھ افغانستان پر چڑھائی کی۔ افغانوں کو تمام معلومات مل رہی تھیں اور وہ پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ انگریز فوج کے استقبال کے منتظر تھے۔

جنرل سیل کی بیوی بدستور سردار اکبر خان کی مہمان خاص کی حیثیت سے اس کے گھر میں موجود تھی۔ سردار اکبر اس عورت کی اہم دفرست اور سیاسی سمیرت سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے سردار سے کہا کہ اس کثرت و خون کو رد کا جاسکتا ہے۔ اگر تم میری ملاقات میرے شوہر جنرل سیل سے کرادو۔

جاتے تھے۔ لیکن قدیر احمد کا بیٹا ابرہیل میں ایک ایسی جگہ ڈوب گیا تھا جہاں اس حادثے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ وہاں سے بچے بوڑھے سب ہی دریا پار کر جاتے تھے اور کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ آتے کوئی قدم گھنچ لینے والی گہرائی بھی ہے۔ بد قسمتی سے مرے والے کو تیرا بھی نہیں آتا تھا۔

ایک سال اور گزر گیا۔ ایک رات ان کا تیسرا بیٹا سوتے میں کوئی آہٹ سن کے جاگا۔ اسے شک ہوا کہ باہر باڑے میں کوئی چوراہی کارروائی میں مصروف ہے۔ آدھی رات کے وقت مرغیاں گڑگڑا رہی تھیں۔ پھر کرباں بولنے لگیں اور اسے یوں لگا جیسے کچھ لوگ سرکشی میں بول رہے ہیں۔ اس کے کان کھڑے ہوئے تو اس کے کانوں نے گفتگو بھی سمجھ لی۔ پہلے کسی نے کہا ”اُدے پاگل دے پڑا“ پھر دوسرا بولا ”جلدی کرو.....“ اس نے دانت نہیں کراہی بھی کی۔ قدیر احمد کا بیٹا جست لگا کے بستر سے اٹھا اور اپنی شکاری بندوق کے ساتھ باہر نکلا۔ جب اس نے دروازہ کھول کے چوروں کو لکھارا تو گھر میں سب ہی بیدار ہو گئے۔ چور جو گھوڑے چرانے آئے تھے فرار ہو گئے۔ قدیر احمد کا بیٹا ان کے پیچھے دوڑا۔ اس نے ایک فائر سے ایک ظرم کو گرالیا۔ قدیر احمد اسے روکتے رہے کیونکہ نقصان کوئی نہیں ہوا تھا تو خطرہ یا پریشانی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ دیر بعد دوسرے فائر کی آواز سنائی دی تو وہ سمجھے کہ بیٹے نے دوسرے چور کو بھی نشانہ بنالیا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بھاگنے والے دوسرے چوروں نے تعاقب کرنے والے کو روک دیا تھا۔ جاتے وقت وہ اپنے زخمی ساتھی کو بھی اٹھا کر لے گئے بعد میں وہ زخمی مر گیا اور نام چور بھی بکڑ لے گئے۔ ان پر چوری ڈھکی اور قتل کے مقدمات بھی چلے اور دو گناہی بھی ہوئی مگر قدیر احمد نے تیسرے سال اپنا تیسرا بیٹا نکودیا تو وہ تقریباً پاگل ہو گئے۔ فقیر کی بددعا نے فریضہ اجل کا روپ دھار لیا تھا اور وہ ان کے بیٹوں کے تعاقب میں تھی۔ اسی ترتیب سے انہیں دوسری دنیا میں بھیج رہی تھی جس ترتیب سے وہ اس دنیا میں آئے تھے۔ وہ فقیر کے مزار پر سر جھٹے رہے روتے رہے اور معافیاں مانگتے مگر ایک شخص انجام سے بچنے کی سبیل نہ کر پائے۔

چوتھا بیٹا یوں گیا کہ ایک رات اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ وہ اسے گاڑی میں ڈال کے جہلم لے جا رہے تھے کہ آدھے راستے میں گاڑی بند ہو گئی۔ اچانک ان کی نظر فول میٹر پر پڑی تو پتا چلا کہ پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔ یہ ناقابل

اعٹھا کے باہر پھینک دیں۔ اسے ہاتھ لگا تو وہ سرد ہو چکا تھا۔ یوں جیسے مرے ہوئے کبھی کی گھنٹے ہو چکے ہوں۔

قدیر احمد لرز گئے۔ شدید صدمے نے ان کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا اور ان کے دماغ کو احساس جرم و گناہ کے آزار میں مبتلا کر دیا۔ درویش نے کہا تھا کہ اسے تو سٹی نے بلایا تھا۔ اسے وہیں دفن کر دیا گیا اور قدیر احمد نے پختہ قبر بنوائے اس کے گرد ایک احاطہ اور پھر ایک کمرابھی تعمیر کرایا۔ وہ روز فاتحہ خوانی کرتے وہیں بیٹے کے حالات میں مصروف رہے۔ جمعرات کو چراغ جلائے اور نیاز بنائے۔ اللہ سے توبہ کرتے۔

لیکن درویش نے جو کہا تھا کہ سب سات سال کا مکمل ہے وہ گویا لوطہ تقدیر تھا جو اس نے پڑھ کے سنایا تھا۔ اس واقعے کو ایک سال گزر گیا۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا اچھا کپروہاں تھا۔ تیسواری کا شوقین تھا اور اکشر شکار پر جاتا تھا۔ ایک رات قریب کے کسی گاؤں میں ہونے والے تیز و بازی کے مقابلے میں شرکت کر کے لوٹ رہا تھا کہ نہ جانے کیسے اس کا مدھاپاں والو اور پند گھوڑا بدک کے بے قابو ہو گیا۔ اس کے ماتھے آنے والے ایک ملازم نے بتایا کہ وہ اصل راستے سے ہٹ گئے تھے مگر مالک نے کہا کہ گھر کی کون سی بات ہے۔ دوسرا دستہ غورالسا ہوا جانے گا۔ آدھا کھٹادیر سے گھر پہنچ جائے گا۔ ہماری کون سی گاڑی لٹکی جا رہی ہے۔ یہ سب راستے ان کے دیکھے بھالے تھے جن پر وہ برسوں سے آباد رہے تھے۔ ملازم خاموش ہو گیا۔ اس کے کہنے کے مطابق ایک جگہ گھوڑا اچانک بے قابو ہو کے اچھلنے لگا۔ ملازم کا خیال تھا کہ جانور ہے کوئی بدروح یا شیطانی مخلوق دیکھ لی تھی۔ لازم بنے کر گیا۔ مالک نے گھوڑے کو بہت چکارا اور آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ پھر یکنخت گھوڑا سر پٹ بھاگا اور جنگل میں غائب ہو گیا۔ ملازم پیچھے دوڑا مگر وہ ان کا سراغ نہ پاسکا۔ صبح گھوڑا خود ہی گھر آ گیا تو قدیر احمد ملازمین اور مزارعوں کے ساتھ جنگل کی طرف گئے اور اہل ایک جگہ بیٹے کی لکڑی ہوئی لاش مل گئی۔ پھر پر لگنے سے اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا اور گردن میں ٹوٹ گئی تھی۔

دوسرے سال اس سے چھوٹا بیٹا دریائے کھار میں ڈوب گیا۔ یہ عام دنوں میں کسی نالے کی طرح بہتا تھا اور پانی اتنا کھتا تھا کہ لوگ جو تے اتار کے اسے پھینک سے بھی عبور کر لیتے تھے۔ صرف برسات کے موسم میں اس پر کبھی کبھی طوفانی آبی تھی تو پانی کناروں کو چھوئے لگتا تھا اور بعض اوقات گردلوں کے علاقوں میں فصلیں اور مویشی بھی ڈوب

اشغال ہوا تو قدیر احمد پچاس سے اوپر کے ہو گئے تھے اور ان کے بیٹے جوان ہو چکے تھے یا ہو رہے تھے۔ ایک بیٹی کی خواہش میں انہوں نے یکے بعد دیگرے تین نکاح کیے مگر شاید عمر کے اس دور میں وہ ”بے ختم“ ہو چکے تھے اور صاحب اولاد نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ قدیر احمد خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کا کوئی سوتلا بھائی بھی ہے۔

قدیر احمد اپنی حویلی اور جاگیر پر بڑے ٹھاٹس باٹ سے رہتے تھے اور بے حد دولت مند شمار ہوتے تھے۔ ان کے بیٹوں کو اس غیر آباد جگہ پر رہنا پسند نہیں تھا مگر جاگیر اور اس کی ساری آمدنی قدیر احمد کے قبضے میں تھی اور اس کے بغیر بیٹے لاوار میں کوٹھی بنانے کے رہنے اور شہری زندگی اختیار کرنے کے خواب پورے نہیں کر سکتے تھے۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں تھے۔ ان کی تعلیم ایک چھوٹے قصبے دینا کے نڈل اسکول تک محدود رہی تھی چنانچہ وہ زمینداری کرتے رہے اور محدود سی عیاشی کرتے رہے۔ اس امید میں کہ جب ابا دنیا سے کوچ کریں گے تو جاگیر کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ اپنے اپنے حصے کی دولت سمیٹ کر جہاں چاہیں گے آباد ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی برس کرنا چاہتا تھا تو کوئی لندن یا امریکا میں آباد ہونے کا خواہش مند تھا۔

ایک روز قدیر احمد صبح اٹھے تو دیکھا کہ ان کی حویلی کے عین مقابل باغ میں کسی جگہ یا درویش نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ وہ تخت پر افروختہ ہوئے اور ایک ملازم کو بھیجا کہ درویش کو نکال باہر کرے۔ ملازم کچھ دیر بعد پریشان اور سہا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ جب تا وہ کہتا ہے اس زمین کا مالک ہی مجھے یہاں سے اٹھا سکتا ہے۔

قدیر احمد خود گئے اور بڑے غصے میں کہا ”بڑھے! خیریت چاہتا ہے تو اپنا بویرا بستر سمیٹ اور یہاں سے نکل جا۔“

درویش نے سر اٹھایا ”تو مالک ہے اس زمین کا۔“
”ہاں یہ میری زمین ہے۔“
درویش نے ایک مٹھی بھر کے مٹی اٹھائی ”یہ تو مٹی ہے اور مٹی اللہ کی امانت ہے ہمیں مٹی بھی نے بلایا ہے۔“
قدیر احمد آپے سے باہر ہو گئے ”کبواس کی تو یہیں زندہ گاڑدوں گا۔“

ان کے چلانے کی آواز سن کے ساتوں بیٹے باہر آ گئے تھے۔ درویش نے انہیں مسکرا کے دیکھا ”تو سات بیٹوں کا باپ ہے۔ سات بار تجھے مبارک۔ سات سال ہی کا مکمل ہے“ پھر وہ سیدھا لیت گیا۔ قدیر احمد نے بیٹوں کو حکم دیا کہ

سردار اکبر خان مان گیا اور اس کے خصوصی ایلچی ایک برطانوی انگریز افسر جیمز اسٹارٹن کے ساتھ جرنل سل سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ انہوں نے جرنل سل کو اس کی بیوی کا پیغام دیا اور معلوم نہیں کیا ضمانت دی کہ جرنل سل نے اکبر خان کے قاصدوں کے ساتھ جانا منظور کر لیا۔ جرنل پہلے اپنی بیوی سے ملا اور اس نے اپنے شوہر کو سمجھا یا کہ وہ جنگ سے باز رہے اور مصالحت کے ایک فارمولے کو منظور کر لے۔ یہ فارمولا خود جرنل سل کی بیوی نے پیش کیا تھا۔ سردار اکبر خان اور جرنل سل کی دونوں ملاقات میں اس فارمولے پر اتفاق رائے ہو گیا۔ ایسا نہ ہوتا تو دوسری شکست کے بعد انگریز فوج میں ڈاکٹر برائین جیسا نام بھی بچ کے نہ جاتا۔ غیرت علی کے بعد ان کا بیٹا محفوظ علی اس جاگیر کا وارث ہوا۔ ان کے تین بیٹے اور بھی تھے مگر دستور کے مطابق جاگیر کی ملکیت کا حق محفوظ علی کو منتقل ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عزت علی کی حقنی بیٹیاں تھیں اور وہ رخصت ہو کے کہاں گئیں۔ محفوظ علی نے جاگیر کو منظم کیا۔ اس کے گرد باڑھ لگوائی اور قریب سے گزرنے والے دریائے کھار سے ایک چھوٹی سی نہر نکال کے زمین کے لیے پانی حاصل کیا۔ عزت علی کے بیٹوں یعنی محفوظ علی کے بھائیوں کے شادیاں بھی گرد و لوح کے عزت دار گھرانوں میں ہوئیں اور ان سب کی اولادیں بھی جاگیر میں رہیں۔ ان کی رہائش ایک بہت بڑے احاطے میں تھی جس میں سب کی ضرورت کے مطابق کمروں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بیس بائیس افراد پر مشتمل یہ گھرانہ بے حد خوش حال زندگی بسر کر رہا تھا کہ بیسویں صدی کا آغاز ہوتا ہی خاندان کو کسی پراسرار بیماری نے اپنی لیپٹ میں لے لیا۔ غالباً یہ بیماری طاعون تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جاگیر میں ایک قبرستان آباد ہو گیا۔ ایک شیرخوار کے سوا کوئی نہ بچا۔ اس کے بارے میں اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جسے اللہ کے اسے کون چھپے۔

اس بچے کو جب جارج ششم کی تخت نشینی پر 1912ء کے دہائی دربار میں پیش کیا گیا تو وہ تین سال کا تھا۔ اس کی پرورش ایک ملازم اور اس کی بیوی نے کی تھی جو خود بے اولاد تھے۔ انگریز نے اس بچے کو جاگیر دار تسلیم کیا اور اس کی حفاظت کی۔ یہ میرے پردادا کے بھائی قدیر احمد تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریز حاکموں کی مہربانی اور قدر دانی سے انہیں سلاوی کے ٹھیکے لے تو وہ ملا مال ہو گئے اور جنگ عظیم ختم ہوئی تو انہوں نے بیس بائیس افراد کی ویران رہائش گاہوں کو گرا کر ایک شاندار حویلی تعمیر کیا۔

قدیر احمد کی پہلی بیوی سے سات بیٹے تھے۔ جب اس کا

یقین بات تھی۔ تمام گاڑیوں کے ٹینک عام طور پر خراب رہتے تھے اور اسانی پٹرول کا ایک ڈسٹری بیوٹن خالی نہیں ہوتا تھا کیونکہ پٹرول پمپ اس جگہ سے تیس میل دور تھا۔ جب قدر احمد نے پیچھے اتر کر دیکھا تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ پچھلے حصے کی ڈکی سے شروع ہو کر آگے انجن تک جانے والی نول کی پائپ لائن ٹوٹ گئی ہے۔ غائبانہ پیچھے سے کوئی پتھر اچھل کر فلور سے ٹکرا رہا تھا۔ رات کے وقت اس سڑک پر کسی دوسری گاڑی کی آمد کا امکان بھی نہ تھا۔ قدر احمد کے بیٹے کی اینڈرکس پھٹ گئی اور سڑک تک وہ اس کی لاش لیے دیر ان راستے پر بیٹھے رہے۔

پانچواں جیٹا بیٹی ٹی روڈ پر اپنی گاڑی میں سڑک رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوست بھی تھا جسے لاہور جانا تھا۔ اس نے دوست سے کہا کہ وہ گاڑی لے جائے ورنہ اس جگہ راولپنڈی سے آنے والی کسی بس میں اسے جگہ نہیں ملے گی۔ وہ خود کی کرانے کی گاڑی میں دیتا ہے مگر چلا جائے گا۔ دوست نے بہت کہا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسے گھر چھوڑ کے بھی اپنا سڑک جاری رکھ سکتا ہے مگر اس نے دوست کی نہ مانی اور کہا کہ میری فکرت کرو۔ میں پیدل بھی جا سکتا ہوں۔ دوست کے جانے کے بعد وہ سڑک عبور کر کے اس جگہ آ گیا جہاں سے مین روڈ سے آنے والی گاڑیاں رہتاس جانے والی چھوٹی سڑک پر مڑ جاتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی سوزوکی دیکھن یا کارا سے لفٹ دے کر حویلی تک پہنچا دے گی۔ وہ کوئی اجنبی نہیں تھا۔ اس علاقے کے بیشتر لوگ اسے پہچانتے تھے۔ ابھی اسے وہاں کھڑے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ لاہور کی طرف سے آنے والی ایک دیکھن نے مڑنے کا اشارہ دیا۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر بے بریک بھی لگائے مگر اچانک گاڑی کا تابی راڈ مکمل کیا اور گاڑی بے قابو ہو کر قدر احمد کے بیٹے پر چڑھ گئی۔

چھٹا بیٹا ہمارا ہوا تو قدر احمد اسے لے کر لاہور دوڑے۔ اسے کوئی خاص بیماری نہیں تھی۔ ایک بہت اچھی شہرت رکھنے والے اور دی آئی بی ہسپتال کے ڈاکٹر نے انہیں لکھی دی کہ اتنا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ معمولی سوجی بخار ہے جو کل تک اتر جائے گا لیکن اس رات نرس نے اسے کسی دوسرے لیجن کا انجنکشن لگا دیا۔ نرس پرانی اور تجربہ کار تھی اور تحقیقات میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آخر انجنکشن کیسے بدل گئے تھے۔ وہ انجنکشن بھی خطرناک قسم کا نہیں تھا۔ وہ عام پنسلین اینٹی بائیوٹک کا انجنکشن تھا مگر یہ بات اس کے مرنے کے بعد معلوم ہوئی کہ قدر احمد کے بیٹے کو پنسلین سے شدید الرجی تھی۔

قدر احمد کی اب عجیب حالت ہو گئی تھی۔ وہ نفسیاتی مریض تو بہت پہلے سے تھے۔ اب ان پر ڈیپریشن اور پاگل پن کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ جب وہ ہوش میں ہوتے تھے تو درویش کی قبر پر بیٹھے روتے رہتے تھے اور اس کے پیروں کی طرف ایک نظار میں غبی ہوتی۔ پھر قبروں کے گھورتے رہتے تھے۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ غور نے ان کے ذہن کو کھڑکی کے جالے کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ انہیں تصور میں یا خواب میں ساتویں بیٹے کی موت کے مناظر دکھائی دیتے تھے تو وہ بچہ مار کے بھاگتے تھے۔ اسی کیفیت میں وہ ایک بار بیڑھیوں سے گر گئے اور دوسری بار دیوار سے ٹکرائے۔ پھر نہ جانے کس نے انہیں ایک راہ بھائی کر ساتویں بیٹے کو وہ اس حویلی کے آسب سے نکال کے کہیں اور بھیج دیں۔ اتنی دور کردہ فقیر کی بد دعا سے محفوظ ہو جائے۔ مشورہ دینے والے کا پھل بھی تھا۔ اپنی موت سے بچنے کے لیے کہاں جا سکتا ہے۔ قدر احمد نے آخری بیٹے کو لندن بھیج دیا۔ فیلڈ کیا۔ فلائٹ رات کے وقت روانہ ہو گئی۔ وہ اڑپورٹ سے لوٹے تو کچھ بے چہن تھے۔ انہیں وہ لوگوں حاصل نہیں ہوا تھا جس کی توقع تھی۔ دھوٹے کے لیے پیلو کر دینیں بدلتے رہے تیسرے دن اس بے چہنی کا سبب اخباری خبر کی صورت ان کے سامنے آ گیا۔ فرشتہ اچل نہ انہیں مطلع کیا۔ جس جہاز پر ان کا بیٹا موت سے دور بھاگا تھا وہ ہسپتال میں گر گیا ہے۔

بس اس کے بعد قدر احمد کا دماغ الٹ گیا۔ انہوں نے ہندوؤں نکالی باری باری تینوں بیویوں کو کوئی مار کے ایک کنوئیں میں ڈالا اور پھر کنوئیں کی منڈ پر پرندہ پھیر کے باجے۔ ہندوؤں کو پھیر سے بکڑ کے انہوں نے نال اپنے منہ سے لگا دی اور انگوٹھے سے گھوڑا بادیا۔ دھماکا ہوتے ہی وہ پلٹ کر کنوئیں میں غائب ہو گئے۔

اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اس کے آسب زار حویلی اور اس سے ملحق جاگیر کا والی وارنٹ کوئی نہ تھا۔ چنانچہ فقیر کی سات مبارک بادوں کے بعد سات بدھائی چلے گئے۔ مشہور ہو گئی تھی۔ اس فقیر کی قبر رفتہ رفتہ زیارت گاہ بن گئی۔ گردنواح کے کچھ لوگ حقائق سے باخبر تھے۔ جانی عقیدت میں چرچاں چلاتے رہے۔ پھر کسی نے وہاں جمن کو مکمل سامع کی ابتدا کی اور قوال آئے تو ہر جمعرات کو سونے کلام پر جموئے والے بھی آئے اور چادر چڑھانے والے بھی۔

پھر اچانک ایک غصہ کفیل احمد نمودار ہوا۔ اس

ات میں حق ملکیت کا دعویٰ دائر کیا اور بتایا کہ قدر احمد کے ہاتھ محفوظ ملے۔ ایک نہیں دو شادیوں کی تھیں مگر ان کی دوسری بیوی خدیجہ طور پر اپنی ہی ایک ملازمہ مبارک بیگم سے ہوئی تھی۔ اپنے والد کے ڈر سے اور کچھ خاندانی بیوی کے خوف سے انہوں نے دوسری بیوی کو حویلی میں نہیں رکھا۔ وہ لاہور میں رہی اور اس نے شوہر سے کیے ہوئے حلیفہ وعدے کو مرنے تک بھیا کیا کہ اس راز کو وہ ہمیشہ اپنے سینے میں دفن کرے گی۔ اس نے ثابت کیا کہ وہ بھی محفوظ علی کا بیٹا ہے اور قدر احمد کا سوتا بھائی ہے۔ محفوظ علی کا سارا خاندان طاغون کے مرض میں ختم ہو گیا تھا۔ مگر مبارک بیگم لاہور میں ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ کفیل احمد اس کا کلوتا بیٹا تھا۔ اپنی زندگی میں وہاں نے اسے کبھی باپ کا نام نہیں بتایا تھا مگر اس کی موت کے بعد جب کفیل احمد نے ایک صندوق کو کھولا جو ہمیشہ اس کی ماں مبارک بیگم کی تحویل میں اور محفوظ رہتا تھا تو اس میں سے بہت سے دستاویزی ثبوت برآمد ہوئے جن سے ان کو معلوم ہوا کہ وہ قدر احمد کا بیٹا ہے۔ کفیل احمد نے یہ بارے ثبوت عدالت کے سامنے رکھے تو ٹھیک دھبے کی کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہی اور دست بدھائی کی حویلی اور جاگیر پر اس حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا۔

تاہم کفیل احمد نے عدالت میں حلف اٹھانے کے باوجود ثبوت بولا تھا۔ وہ مبارک بیگم کے کفن سے محفوظ علی کا کلوتا بیٹا تھا۔ پہلا بیٹا عزیز احمد تھا۔ یہ میرے دادا تھے۔ ان کی پادشاہ بارہ اپریل 1912ء کی تھی۔ پہلی بیوی کے کفن سے باہر نکلنے والے قدر احمد صرف سات دن چھوٹے تھے اور ان کی پہلی کو پیدا ہوئے تھے۔ گویا قدر احمد میرے سوتیلے والد تھے۔

کفیل احمد کی پیدائش سات سال بعد کی تھی۔ وہ مبارک بیگم کا کلوتا بیٹا نہیں دوسرا بیٹا تھا لیکن عدالت میں اس کے حقائق کی صداقت کو تسلیم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ قانونی ضرورت کے تحت بدھائی کی جاگیر کی ملکیت کے مقدمے میں کوئی دلیل پیش نہ کی گئی۔ جب دوسرا کوئی دعوے دار سامنے نہ آیا تو کفیل احمد ہی کو واحد وارث قرار دیتے ہوئے ساری جائیداد حویلی کی ملکیت دے دی گئی۔

اصل کفیل احمد کے بڑے بھائی یعنی میرے دادا تلاش خان میں دہلی چلے گئے تھے۔ بعد میں حالات ایسے بنے کہ تلاش خان سے ملازمت ملی اور وہ ایک شہر سے دوسرے شہر لٹھکتے رہے۔ اسی دوران ایک حادثہ پیش آ گیا۔ یہ

میرے دادا عزیز احمد کا دادی جان سے عشق تھا جس کا احوال دادی جان نے مختلف مواقع پر آپس بھر بھر کے ایک ایک حوالوں سے سنا تھا۔ کسی بھی موقع پر وہ دادا کو یاد کر کے کوئی واقعہ سنا دیتی تھیں۔ بھر بھر کر دیتے تھے۔ وہ کچھ خفا ہوتی تھیں کچھ خوش اور بالآخر خراشا شرماتے بہت کچھ بتا دیتی تھیں۔ ان سب کو جوڑ کے ہم نے ستر سال پہلے دست قدرت کے ہاتھوں لکھی جانے والی دادا دادی کی داستان عشق مرتب کر لی تھی۔

واقعات کے مطابق دادا عزیز احمد سلسلہ ملازمت دہلی سے لکھنؤ یا شاید لکھنؤ سے دہلی جا رہے تھے۔ کسی اسٹیشن پر انہوں نے پلیٹ فارم کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ٹرین کے زباندہ کے ایک کھڑکی میں دادی کے حسن بے مثال کا جلوہ بے حجاب دیکھ لیا۔ وہ ہر نفع کا نقاب اٹھا کے ڈول ہاتھ میں تھا۔ کسی کئی کو یاریلو کے ملازم کو متوجہ کرنا چاہتی تھیں کہ انہیں بیٹے کے لیے پانی لا دے مگر پڑیوگ میں ان کی کوئی نہیں سن رہا تھا کیونکہ کھانا شاپ بہت مختصر تھا۔ اس مختصر سے وقت میں دادا نے ایک تاریخ ساز فیصلہ کیا۔ انہوں نے دادی سے ڈول لیا بلکہ چھینا۔ انہیں پانی لا کے دیا اور پھر اپنی ٹرین چھوڑ کے اس ٹرین میں سوار ہو گئے جو مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سامان پر بھی احنت بھیج دی۔ وہ ادھر چلے گئے جہر دل لے گئے۔

اس عشق کی تفصیل میں زندگی کے ان مکت واقعات آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ دادا نے بالآخر دادی کو پایا مگر اس جرم عاشقی کی بادشاہ میں ماں نے انہیں لکھ دیا کہ اب دھرتے دم تک ان کی صورت نہ دیکھیں گی کیونکہ رواجی انداز میں انہوں نے دادا کی نسبت کہیں طے کر رکھی تھی۔ بیٹے کی اس حرکت نے ان کو بدعہدی کا مجرم بنادیا تھا۔ رشتہ نامک کے اور زبان دے کے کسی وجہ کے بغیر پھر جانا اس عہد میں ایک ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا تھا اور ایسا کرنے والا معاشرے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا تھا۔

یوں دادا اپنے خاندان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ وہ بھی لوٹ کے گھر نہیں گئے اور ان کی اپنے بھائی کفیل احمد اور اپنی ماں مبارک بیگم سے ملاقات نہ ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب تقسیم ہو گئی اور پاکستان بن گیا تو عزیز احمد لوٹ کے لاہور آئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اسی شہر میں کہیں ان کا چھوٹا بھائی ہوگا اور ممکن ہے ان کی ماں بھی مل جائے گا اس کا امکان بہت کم تھا۔

یہ بات مجھے خود دادی جان نے بتائی تھی کہ ان کے شوہر

عزیز احمد نے اپنے گم شدہ بھائی اور لاپتہ ماں کا سراغ لگانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ چالیس سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ عشق ایک داستان ماضی بن گیا تھا جس نے انہیں سب سے چھڑا دیا تھا۔ اب رشتوں کی غلط ایک آزار بن رہی تھی۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کفیل احمد کی نظر سے بھی کوئی اشتہار مگر زرا ہو کر وہ بڑے بھائی سے ملتا جو جانہ اد کی خاطر بولا جانے والا مجبوت اس کا جرم بن جاتا۔ شاید اسے دھوکا دہی اور غلط بیانی کے جرم میں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ وہ قن تہاست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ اس نے دانستہ دھما تمام اشتہارات کو نظر انداز کیا ہوگا۔ عزیز احمد بھی کچھ عرصے بعد مایوس ہو گئے اور انہوں نے تلاش ختم کر دی۔

کفیل احمد لا دلدار رہا۔ اولاد کے لیے اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کر ڈالیں مگر کسی نے اس کو ایک وارث نہ دیا۔ اس نے باری باری سب کو ہاتھ ہونے کے جرم میں طلاق کا پردہ تھمایا اور رخصت کر دیا۔ آخری بیوی سے مایوس ہونے کے بعد اسے یقین آ گیا کہ وہ وحیثیت ازدی سے نہیں لڑ سکتا۔ اس کی عمر بھی ساٹھ سال سے زائد ہو چکی تھی۔ ممکن ہے اس وقت تک کسی نے اس کو یہ بھی سمجھا دیا ہو کہ ہاتھ اس کی کوئی بیوی نہیں تھی۔ ہاتھ وہ خود ہے۔ یہ ایک ایسی سچ حقیقت ہے جسے آج کے ترقی یافتہ دور میں میری عمر وحیثیت نہیں کرتے۔ اس نے پانچویں شادی نہیں کی اور اتنی بڑی جاگیر کی ملکیت حاصل کر کے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس میں اپنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ اس کی دیکھ بھال کر سکتا اور جاگیر کے انتظام کو چلاتا۔ سکندر کی طرح وہ بھی جب دنیا سے گیا تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر ایک بار بھر لاوارث ہو گئی۔

لیکن یہ وراثت کی اس کہانی کا ڈراپ سین نہیں تھا۔ واقعات نے ایک نیا موزلہ۔ ایک جاگیر کا ایک ایسا وارث سامنے آ گیا جس کے بارے میں فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ خرچہ ہے۔ یہ قدیر احمد کا سب سے چھوٹا یعنی ساتواں بیٹا تھا جس کو فقیر کی بددعا سے بچانے کے لیے جہاز پر سوار کر کے سات سمندر پار بھیج دیا گیا تھا۔ جہاز کے کریش ہونے کی اطلاع درست تھی۔ فلائٹ پر ایک سو تیر مسافر اور پانی مٹلے کے ارکان تھے۔ زیادہ تر مسافروں کی شناخت ہو گئی تھی تاہم ایک خاصی بڑی تعداد ان کی تھی جن کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ تحقیقات کرنے والوں نے بڑی محنت سے مرنے والوں کی فہرست مرتب کی تھی۔ ان کے یقین کے مطابق کوئی زندہ نہیں

بچا تھا لیکن یہ یقین غلط تھا۔

نہ جانے اسے کیا کہا جائے گا؟ شاید قدیر احمد کی پوری ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ اس کی زندگی پوری ہو گئی تھی۔ کریش کی اطلاع ملتے ہی اس نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فقیر کی بددعا نے اس کا پچھما چھوڑ دیا تھا۔ وہ خودکشی نہ کرتا تو اس کا آخری بیٹا بھی ہلاک ہو جاتا۔ اس کی موت کے وقت وہ زندہ تھا اور قدرت کے معاملات بھلا کس نے سمجھا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ وہ زندہ رہا۔ اور بے ہوشی کی حالت میں وہ ایک تختے پر تیر رہا اور غریب اس کا نام عثمان لیا تھا اور بہت مدت گزر جانے کے بعد اس نے حق ملکیت کا ایک اور مقدمہ دائر کیا تھا۔ وہ مقدمہ جیت گیا تھا اور اس نے یہ حویلی اور جاگیر میرے نام کر دی تھی۔

☆☆☆

ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کے بارے میں اس تاریخی دستاویز کو پڑھ کے میرا دماغ ٹکرا گیا۔ جب میں اس کی فائل کو ختم کیا تو صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ابھی دور تھی اور میرے آس پاس آدھی رات کے کھانے کا سکوت تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے تاریخ نہیں پڑھی کوئی تاریخی ناول پڑھا ہے۔ میٹرک کے زمانے میں اداوار کے بعد نو جوانی میں ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب میں نے بہت سے دلولہ انگیز تاریخی ناول بڑے جذبہ ایمانی کے ساتھ پڑھے تھے اور میرا کامل اعتقاد تھا کہ ادب کا نوبل انعام ختمیم مجازی کو نہیں دیا گیا تو اس کی وجہ محض انگریزوں اور عیسائیوں کا تعصب ہے ورنہ اس سے عظیم ادب نہ تخلیق ہوتا۔ دقت کے ساتھ وہ جذبہ مفقود ہو گیا تھا اور اب مجھے تاریخی ناولوں میں تاریخ کے ساتھ ہونے والی "تواریخ" پر افسوس ہوتا تھا لیکن جو میں نے فائل کی سرکری میں پڑھا ایک طرح سے میرے ماضی کی سرگزشت تھی۔ وہ مختصر واقعات تھے جو میرے خاندان کے ساتھ پیش آئے۔ ان میں میری انتہائی دلچسپی ایک قدرتی بات تھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے خاندانی میوزیم میں وہ سب کچھ دیکھ جائے کہ اپنے آباؤ اجداد سے منسوب ہوں ان کی تصاویر ان کی ذاتی استعمال کی اشیاء۔ ان کے کتب خانوں کے قلمی نسخے۔ اور وہ سب جو عجب خالوں میں رکھا جاتا ہے۔ میری نیند اڑ گئی تھی۔ تاریخ کے ان ڈرامائی واقعات بے آگاہی کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی باور دیکھی ہو اور مجھ پر ایک نامعلوم خوف سوار ہو گیا۔ خاندان

بانے اور بنانے والی اس نحوست زدہ حویلی اور جاگیر کا ایک اب میں تھا۔ مجھ سے پہلے جو کچھ قدیر احمد کے ساتھ ہوا، رزا فر تھا۔ اس درویش کی قبر کے نیچے اس کی بددعا کے سادے سنگ کا آج بھی چوتھوں میں موجود ہوں گے۔ ان کے اچھے چوہو کی کے مالک تھے ایک فقیر کے ڈھانچے کے قدموں میں پڑے تھے۔ مجھے میرا قطعہ یاد آیا۔ کل پاؤں ایک کاسے سر پر جو آگیا بھر وہ استخوان کشتوں سے چور تھا سینے لگا کہ دھکے کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سر پر خور تھا کیا وہ کنواں آج بھی ہوگا جس کے زرخیزی دینے والے اور بھول کھانے والے شفاف پانی میں حویلی کے بالوں کی خونی لاشیں گری تھیں۔ میں نے بچن میں کانی کے لیے ایکٹرک کھیل کا بلک لگا تے ہوئے سوچا۔ کتنی خوری اٹھا کر اور کتنے حلیہ مجبوت بول کے کفیل احمد نے اس حویلی اور جاگیر کا حق ملکیت حاصل کیا تھا مگر یہ حق کتنے دن رہا؟ اسے تو ایک وارث تک نصیب نہ ہوا اور آج اگر دقت کے ہاتھوں نے وراثت اور ملکیت کا ناسا میرے حق میں پلٹ دیا ہے تو کیا خوش ہونا چاہیے؟ مجھے تو ڈرنا چاہیے۔

نفرت مزاج اور ذہنی تربیت کے اعتبار سے میں ذرا بھی توہم پرست اور فکری مزاج یا نکرد عقیدے کا آدمی نہیں ہوں۔ میرا فوق الفطرت واقعات یا حالات پر کوئی یقین نہیں اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ جن مجبوت اور بدادراہ انسانوں کی دنیا میں کسی قسم کی خرابی یا تباہی کا سبب بن سکتے ہیں۔ میں نے زندگی میں ان گنت برسرار واقعات سنے اور پڑھے تھے جو ہر زمانے میں ہر جگہ پیش آچکے تھے اور آج بھی ٹپٹا آتے رہتے تھے مگر میرا ان سے براہ راست واسطہ نہیں ہوا چنانچہ وہ سب میرے لیے کھے فائے انہوں سے زیادہ کچھ دے۔

میرے نزدیک جو تھا منجانب اللہ تھا۔ اس قادر مطلق نے کائنات کو ایک نظم و ضبط کے ساتھ تخلیق کیا تھا۔ مگر کسی ہونوں کی طرح آسمانوں اور زمینوں کے درمیان جو کچھ تھا اس کو شرمہ تخلیق کا آئینہ دار تھا۔ بدلتے موسمی ستاروں اور سیاروں کی گردش سیلاب اور زلزلے زندگی کا چکر ہوتا اور تمام اسباب و علل کی بنیاد پر اپنا وجود رکھتے تھے۔ بلا جواز ہو نہ تھا۔ یہی نفرت تھی کہی کائنات کا ڈسپن تھا چنانچہ افوق الفطرت کچھ نہ تھا۔

تاہم ناقابل فہم بہت کچھ تھا اور انسان کی عقل کی جنور

قدرت کے تمام اسرار اور موزیک رسائی نہ تھی۔

واپس اپنے کمرے میں آ کے کالی پیٹے ہوئے مجھے اپنے خاندان کی تاریخ میں اپنی یاد کا ایک صفحہ جوڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو آج سے پہلے ایسے ہی تھا جیسے کسی کتاب سے نکلا ہوا درق۔ یہ میری زندگی کا ایک اٹکھار اور کسی حد تک برسرار تجربہ تھا جس کو میں کسی حوالے سے بھی سمجھ نہیں پایا تھا مگر اب سارے حوالے مکمل تھے۔

مجھے یاد رہا تھا کہ ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کے آخری وارث سے لندن میں میری ملاقات ہو چکی تھی۔ اتفاقات کے کچھ سلسلے بالکل فنی اور ناقابل یقین ضرور ہوتے ہیں مگر ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ خصوصاً اس لیے کہ قدرت اپنے قبضہ اختیار میں سب کچھ رکھتی ہے۔ یہ دو سال پہلے ہونے والی ملاقات بھی ایسی ہی تھی۔ میں کفیل احمد سے مل چکا تھا لیکن آج تک مجھے اس کی غرض و غایت کا علم نہ تھا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ رشتے میں وہ میرا دادا ہی تھا لیکن کچھ نہیں کیونکہ وہ میرے دادا کا سوتلا بھائی تھا جسے جہاز کے کریش میں مرحوم مان لیا گیا تھا۔

مجھے لندن میں اپنی ملازمت کا آغاز کیے تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن میرے ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ میرے بیلو کے جواب میں کسی نے کہا "ریش صاحب! امیں عبدالقیوم بول رہا ہوں۔ میری لیگل فرم لندن میں غیر قانونی تارکین وطن کے معاملات سے ڈیل کرتی ہے۔"

میں نے کہا "فرمائیے۔ میں تو یہاں سونفید قانونی طریقے سے آیا ہوں چار سال سے امریکا میں تھا۔"

اس نے کہا "مجھے معلوم ہے کیا میں آپ سے مل سکتا ہوں؟"

"بالکل مل سکتے ہیں لیکن یہ تو بتا دیجئے کہ کس سلسلے میں؟ مجھے تو نہ سیاسی ناہ کا مسئلہ ہے نہ حصول شہریت کا۔"

وہ ہنسنے لگا "یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ جب میں ملوں گا تو عرض کروں گا۔ کیا آپ اس وقت فارغ ہیں؟"

"فارغ ہو جاؤں گا آدمے پون گھنٹے میں" میں نے۔

مگر ذہنی۔

"میں حاضر ہوتا ہوں" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ ٹھیک آدمے گھنٹے بعد آ گیا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا "ہم صرف پاکستانیوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے تمام قانونی اور غیر قانونی مقدمات کی پیروی کرتے مجھے دس سال ہو گئے۔ میری فرم میں میرے ساتھ کام کرنے والے بھی سب پاکستانی ہیں۔"

میں نے اخلا کا کہا "آپ سے مل کے خوش ہوئی۔ اب فرمائیے۔"

وہ بولا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کسی جگہ بیٹھ کے ایک کپ کافی پیے ہوئے بات کریں۔"

میں اسے ایک ریستورنٹ میں لے گیا "آپ نے میرے تجسس کو بہت بڑھادیا ہے۔ میں حریہ سسٹنس برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ بولا "مسٹر رفیق! کیا آپ کسی عقلی احمد کو جانتے ہیں؟"

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا "یہ کون صاحب ہیں؟"

اس نے کہا "وہ ایک خاصا عمر رسیدہ اور منطوق شخص ہے۔ تقریباً پچاس سال پہلے لندن آنے والے ایک جہاز کے کرئیں میں وہ دفنی طور پر بھی تاکارہ ہو گیا تھا اور چالیس سال زیر علاج رہا۔"

"چالیس سال.....؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"جی..... چالیس سال!" عبدالقیوم نے کہا "عادے کے بعد مارگ کی چوٹ سے اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی۔"

وہ اپنا نام تک نہیں بتا سکتا تھا۔ جہاز سمندر میں گرا تھا اور یہ شخص بے ہوش کی کیفیت میں تین دن تک ایک تختے پر پڑا رہا تھا۔ اب یہ قدرت کے کیمیل ہیں۔ لیٹے لیٹے وہ تختہ بہت دور چلا گیا اور اسے کسی بحری جہاز کے حملے نے نکال لیا۔ ڈاکٹر اس کی جسمانی یا دہنی صحت پالی کے بارے میں ایک فیصد بھی پُر امید نہ تھے لیکن انہوں نے علاج جاری رکھا۔ یہاں لندن میں ایک رفاہی ادارہ ہے۔ اسے چند دولت مند خاندانوں کا مالی تعاون حاصل ہے۔ ایک مہلی نے اس کی ذمے داری قبول کر لی اور علاج چلا رہا ورنہ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ تقریباً پچیس سال بعد اس کی یادداشت اجاگر بحال ہو گئی۔ کسی وجہ کے بغیر ڈاکٹر تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کسی دوا یا علاج کا کمال نہیں تھا۔"

میں نے کہا "دیری گڈ۔ لیکن یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا "وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے.....؟" میں نے حیرانی سے کہا "کیوں قیوم صاحب؟"

قیوم نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ مجھے میرے سوکل نے منع کیا ہے کہ میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ اور دیے بھی اس پیشے کی

اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ میں اس کی مرضی جانے بغیر کوئی افشاء نہ کروں۔"

میں نے کہا "اور وہ جانے بغیر میں اس سے ملے افکار کروں..... پھر؟"

"پھر کیا..... اس میں زبردستی کون کر سکتا ہے۔ اسے بتا دوں گا لیکن....." وہ کہہ کھینچ کھینچ رک گیا۔

"لیکن کیا قیوم صاحب.....؟"

"وہ ایک بہت بڑا حیا پار اور تنہا آدمی ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی ایک زندہ لاش کی طرح گزاری ہے۔ اب بھی وہ مکمل چیز پر پڑا ہی رہتا ہے۔ اگر آپ اپنے وقت سے دو گھنٹے نکال کے اس کی خواہش پوری کرنے چاہتے ہیں تو میرے نزدیک یہ ایک نیکی ہوگی۔ یہاں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں باقاعدگی سے اولد ہوس میں جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی تنہائی دور کرتے ہیں جن کا دنیا میں کوئی نہیں یا ہے تو انہیں چھوڑ چکا ہے۔"

"وقت ملا تو میں بھی ایسا کروں گا مسٹر قیوم! ابھی تو سوال یہ ہے اس معذور بوزے کا..... کیا نام بتایا آپ نے؟"

"عقلی احمد۔ جب آپ اس سے ملیں تو ممکن ہے وہ خود آپ کو بتا دے کہ وہ کیوں ملنا چاہتا تھا۔ مجھے تو اس نے جھڑک دیا تھا کہ اپنے کام سے کام نہ رکھو۔ اس لڑکے سے رابطہ کرو اور کہہ دو کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کچھ دیر سوچ کے کہا "اوہ کے قیوم صاحب۔ مجھے کب چلنا ہوگا؟ آپ کے سوکل کے پاس۔"

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "یہ تو آپ کی خدمت پر منحصر ہے۔ اگر وقت ہے اور آپ کی کوئی مصروفیت نہیں ہے تو ہم ابھی جا سکتے ہیں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جلدی تو ہے رفیق صاحب! ایسی وہ اپنا وقت گزار رہا ہے۔ اب موت کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ کیا پتا کہ کراں کر جائے۔ پھر تاخیر سے کیا حاصل؟ دیے تو ظاہر ہے آپ کی مرضی۔"

میں نے کہا "اوہ کے! میں چلا ہوں۔"

معاہدہ پر اسرار تھا چنانچہ میں نے بہتر بھی سمجھا کہ اس سے نمٹ لیا جائے تو بہتر ہے۔ عبدالقیوم نے "جی" کا اصرار تھا کہ میں اسے بٹ صاحب کہوں مجھے اپنی گاڑی میں بٹھالیا "لندن کی ٹریفک میں دو گاڑیوں کا ایک ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی گاڑی چھوڑ دیں۔ میں آپ کو

ایک چھوڑ دوں گا۔"

"لو پر اہم!" میں نے کہا "واپسی پر میں کیسی لے لوں گا؟"

"مجوزی لندن کی مصروف شاہراہوں سے گزرتی جنوبی علاقے کی طرف چلتی گئی۔ تقریباً سو گھنٹے بعد ہم مصافحات کے ایک پرسکون علاقے میں پہنچ گئے۔ گاڑی سرسبز درختوں سے گھری ہوئی درمزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہوئی جو لندن کے مخصوص انداز میں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور ان کے دروازے کھڑکیاں چمکتے ہوئے سفید تھے۔ گاڑی کو آڑی حصے میں پارک کر کے ہم لوٹے تو مجھے دونوں طرف بڑے بڑے گھاس کے تختے نظر آئے جن کے گرد رنگین پولوں کی چھالیں سی بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں نوارے سے مل رہے تھے۔ لہائی کے رخ پر بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ سفید چمکی چمکیں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سفید روغن والی گھڑی کی آرام کرسیاں پڑی تھیں پانچ مرد اور سات

پڑھی عورتیں مختلف جگہ چپ چاپ اور مانت بیٹھے غلامیں گھور رہے تھے۔ وہ آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔

بٹ صاحب نے مجھے کا ریڈر سے ایک دروازہ دکھایا اور بولا "میں گاڑی میں بیٹھا ہوں" اور وہاں ہو گیا۔

میں نے دروازہ کھولا تو اپنے عین مقابل ایک شخص کو دیکھ کر حیرت ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اسی سال سے زائد ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے سر اور ہونٹوں کے بال بالکل سفید تھے۔ وہ دہلا چلا تھا اور مکمل چیز پر بالکل مانت بیٹھا تھا مگر اس کی آنکھیں بہت بے چین تھیں۔ وہ اس عمر میں بھی چشمہ نہیں لگاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور اس کے چہرے کے تخت فوٹس میں مسکراہٹ کی بڑی پیدا ہو گئی۔

میں نے کہا "السلام علیکم! میں رفیق احمد ہوں۔"

اس نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا "میں نے جنہیں پکارنا لیا تھا پوچھو کیسے؟"

میں نے مجبوراً پوچھا "کیسے؟"

"تمہاری ناک سے۔ بالوں کے اور آنکھوں کے رنگ سے۔ آؤ آگے آگے میرے پاس بیٹھو! اس نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا "آپ کے مکمل عبدالقیوم بٹ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟"

اس نے سر کو خفیہ سی جنبش دی "تم رشید احمد کے بیٹے ہو۔ اور عزیز احمد کے پوتے..... راست؟"

میں نے کہا "جی..... لیکن آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

اس نے کہا "کیا میرے بارے میں تم نے ان سے کچھ نہیں سنا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی کسی نے آپ کا ذکر کیا ہو۔ عقلی احمد کا نام میں نے کسی سے نہیں سنا۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "مبارک بیگم کا نام تو بھینچا نہیں سنا ہوگا؟"

میں نے کہا "کون تھیں وہ..... ایک مبارک بیگم نے تو فلم دائرہ کے گانے گائے تھے۔"

"شٹ آپ! وہ تمہارے دادا عزیز احمد کی والدہ تھیں۔" اس نے لہجہ بدلے بغیر کہا "تمہاری پردادی!"

مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا "میری پردادی کے بارے میں آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"قدریر احمد تمہارے پرداد تھے۔ انہوں نے دوشادیاں کی تھیں۔ تم پہلی بیوی کی اولاد دے ہو۔ تمہارے پرداد کے والد تھے محفوظ علی اور دادا عزت علی۔ میرا ایک سوتیلہ بھائی تھا۔ لکھیل احمد!" وہ جیسے اپنے آپ سے بول رہا تھا۔

میں نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ یہ سب نام میرے لیے اجنبی ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں دکھ اتر آیا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں بھی دنیا اتنی بدل گئی ہے۔ یہاں کی بات الگ ہے۔ یہاں سب بھان متی کے کہتے ہیں۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ پھر اینٹ کہیں کئی روڑا کہیں گیا۔ کسی کو کسی کا پتا نہیں۔ نہ بچوں کو غرض کہ ماں کون تھی اور باپ کون تھا۔ پھر آگے کی کون بتائے کہ دادا کون تھا۔ دادی کون تھی؟ پہلے تو بڑے ہی سب بتاتے تھے۔ کیا اب بڑوں کے پاس بھی وقت نہیں رہا خود بخود تو بچے کچھ نہیں جان سکتے۔ لوگ اپنے ماضی سے کٹ گئے ہیں۔"

میں نے کہا "سرا! آپ نے مجھے سخت تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔ آخر آپ کا میری پہلی سے کیا رشتہ ہے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے سراٹھایا اور مجھے ہلک جھپکائے بغیر دیکھنا رہا "ممکن ہے تمہاری قوت مشاہدہ بھی تمہاری مدد نہ کرے۔ سر کے بال بالکل سفید ہو گئے ہیں اور آنکھیں بھی مہلی ہو گئی ہیں لیکن ایک دن تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ ابھی تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم یہاں ایک مجلسِ فرم میں کنسلٹنٹ ہو رات؟"

اب میرے پاس جا رہا تھا کہ میں رخصت ہوں۔ فجر احمد نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ اسے مجھ سے کیا دلچسپی تھی اور وہ میری پہلی کے بارے میں اتنی معلومات کیسے رکھتا تھا۔ جب میں باہر آیا تو مجھے قیوم بٹ کی گاڑی خبر نہ آئی۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایک ملازم میرے قریب آیا۔

”اگر آپ مسٹر بٹ کو تلاش کر رہے ہیں تو آپ سے لیے اطلاع ہے کہ وہ چلے گئے۔“ اس نے کہا۔

”اس نے کہا تھا کہ وہ انتظار کر رہا ہے۔ یہ سخت بد قسمتی کی بات ہے“ میں نے کہا۔

”اس کو گھر سے کال آئی تھی۔ اس کی بیوی کو امیر جنس تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آپ سے معذرت کر لوں“ ملازم ہنس پورا کر کے چلا گیا۔

اس کے بعد اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ میں نے دو بار قیوم بٹ کو فون کیا مگر وہ نہیں ملا۔ پھر ایک دن اتفاق سے وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے نظر آیا تو میں نے اسے روک لیا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس نے وہی کہا کہ وہ ضابطہ اخلاق کا پابند ہے اور میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔

میں نے کہا ”اس نے کوئی تھد دینے کی بات کی تھی۔“

”تو ابھی بات ہے۔“

”مگر وہ کیا تھد دینا چاہتا ہے مجھے۔۔۔ اور کیوں؟“

بٹ نے گھڑی دیکھی ”دیکھو یہ جو لادارٹ بوڑے ہوتے ہیں یہاں ان میں سے کچھ دولت مند بھی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی نوجوان کے لیے وصیت کر جاتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد۔۔۔“

میں نے کہا ”بٹ صاحب! مجھے کسی کا ترک نہیں لینا اور میں نے تو اس کے ساتھ کوئی نیکی بھی نہیں کی۔“

قیوم بٹ نے کہا ”یار! ابھی میں جلدی میں ہوں۔ پھر بات کریں گے۔“

لیکن پھر بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اگلی رات ہی میں کاروباری معاملات میں الجھ گیا۔ پہلے دس دن کے دورے پر جرمی گیا پھر فرانس میری زندگی کے روز و شب انتہائی مصروف رہے اور عقل احمد کا خیال خود بخود ذہن کے انہماک خانوں میں اتر گیا۔ اور کچھ عرصے بعد اتنا غیر اہم ہو گیا کہ میں پھر بعد جب میں نے ابھی سے بات کی تو مجھے ”سارے نام بھول چکے تھے جن کا حوالہ عقل احمد نے دیا تھا۔ میں نے ابھی سے پوچھا کہ کیا وہ لندن کے کسی عقلی احمد کا بھائی ہیں تو انہوں نے کہا کہ لندن میں کیا پاکستان میں اس

ہم کسی آدمی سے میری واقفیت نہیں۔
 ہم نے کہا ”وہ خاصا عمر رسیدہ ہے۔ اس کی بچاسی کا تو
 ہوا، سلون ہے۔ کسی ایئر کریٹش میں زخمی ہوا تھا۔ پینتیس
 چالیس سال اسپتال میں پڑا رہا۔ وہ ہماری ساری جہلی کو جانتا
 ہے۔“
 اہلانی نے کہا ”ایسا کون ہے؟ مجھے تو معلوم نہیں تمہاری
 دلی سے پوچھوں گا۔“
 شاید انہوں نے بھی دادی سے نہیں پوچھا ہو گا ورنہ شاید
 کسی حوالے سے دادی کو یہ نام یاد آ جاتا۔ دراصل عقیل احمد
 کے بارے میں نصف صدی قبل ہی فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ
 مر چکا ہے۔ مرنے والوں کے نام اتنا عمر صرگن یاد رکھتا ہے۔
 نصوص ان کے جن سے آپ کا براہ راست کوئی رشتہ نہ ہو۔
 اہلانی خاندانی تاریخ کے اوراق پڑھنے کے بعد میرے
 ذہن کے سارے خلا پر ہو گئے اور واقعات کا سلسلہ آپس میں
 ڈگمگا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ عقیل احمد کی یادداشت بحال
 ہوتے ہی اسے یاد کیا ہو گا کہ اس کے چھ بڑے بھائی کس
 طرح باری باری دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور اسے فقیر کی
 بددعا سے بچانے کے لیے لندن بھیجا گیا تھا۔ وہ موت سے بچ
 گیا تھا مگر اس کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ اس نے سینتیس
 سال تک مردوں جیسی زندگی گزار لی تھی اور جب حقیقی زندگی
 کے احساس کی طرف لوٹا تو تہمتا تھا اور سلون پڑا تھا۔ اس نے
 مہر القیوم کی معرفت حویلی اور جاگیر کے بارے میں معلومات
 حاصل کی ہوں گی تو اسے ساری صورت حال پتہ چل گئی ہوگی
 کہ دادا کے بھائی عقیل احمد نے بدتمیزی سے اور جھوٹ بول کے
 خود کو جاگیر کا تہادار ثابت کر دیا تھا اور اس کا مالک بن گیا
 تھا۔ عزیز احمد کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ دونوں بھائیوں کا تمام غم
 انہی میں تقسیم نہیں رہا تھا اور ایک کو دوسرے کی کوئی خبر ہی نہ
 کی کہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔
 عقیل احمد نے قیوم بٹ کے ذریعے تمام معاملات لے
 لیے اور اپنا حق وراثت حاصل کرنے کے بعد بشارت فاروقی
 کو قاتل ٹھہرا دیا۔ عقیل احمد کے لیے عمر کے اس حصے میں اور
 ان حالات میں حویلی یا جاگیر کا قبضہ حاصل کرنا نا حاصل تھا۔
 روٹنگا اس کے لیے ایک جائے عبرت اور اذیت کی علامت
 بن گئی۔ وہاں اس کے چھ بھائی ایک قطار میں اپنی قبروں میں
 لپٹے ہوئے تھے اور اس کے والدین کی لاشوں کو ٹنگے والا
 کواں موجود تھا۔ وہ خود اس منحوس ذلت کی نشانی بن کر زندہ
 تھا۔ وہ اس حویلی میں کیسا سر جوڑے جاتا؟
 میرے دادا عزیز احمد کا حق مارنے والا ان کا بھائی عقیل

احمد بھی مر چکا تھا۔ جاگیر بھر لادارث تھی اس لیے قتل احمد کو آسانی سے مل گئی شاید اس نے ماضی کی تلافی کا فیصلہ کیا۔ اگر کفیل احمد یہ جھوٹ نہ بولتا کہ وہ دادا دادرث ہے تو اس کے وارث میرے دادا عزیز احمد ہی ہوتے اور ان کے بعد یہ جاگیر اور حلی خود بدوخت وراثت میں ان کے بیٹوں کو ملتی یعنی رشید احمد اور میرے چچا زبیر احمد اس کے مالک ہوتے۔ معلوم نہیں کیوں عقل احمد نے یہ جاگیر اور حلی میرے والد دادو چچا کے حوالے نہیں کی۔ اس نے میرا انتخاب کیا۔ یہ کام اس نے اپنی زندگی میں ہی کر لیا۔ اگر وہ ایسے ہی مر جاتا تو ایک بار پھر اس جاگیر اور حلی کا کوئی مالک نہ رہتا۔ شرعی قانونی وراثت کے مطابق جو پاکستان میں رائج ہے میرے والد اور چچا میں یہ جائیداد برابر تقسیم ہوتی اور پھر ان کی اولادوں میں لیکن ایک تو عقل احمد پاکستان میں نہیں تھے دوسرے کسی جائیداد کا مالک اپنی زندگی میں اپنا سب کچھ کی کو بھی دے سکتا ہے۔

جیسا کہ مجھے قیوم بٹ نے بتایا تھا، عقل احمد نے میرے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے ملا تھا اور اس ملاقات میں نہ اس نے اپنے اور میرے رشتے کی وضاحت کی تھی اور نہ مقصد ملاقات واضح کیا تھا۔ اشاروں میں اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ مجھے کوئی تحفہ دے گا مگر ایک مفلوج بیمار بوڑھے سے کوئی ایسی چیز تو لینے کے لیے رکھ سکتا تھا کہ تحفے میں وہ کمزوروں کی جائیداد دے سکتا ہے۔ یہ خیال مجھے کیسے آسکتا تھا کہ تینتیس سال ایک فلاحی ادارے میں زبیر علاج رہنے والا اتنی بڑی جاگیر کا مالک ہے۔ تحفے کی مجھے ضرورت ہی نہ تھی چنانچہ میں نے اس کی نوعیت کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی تو ادا نہ کی۔

اگر عقل احمد چاہتا تو بشارت فاروقی سے کہہ کے ساری جائیداد کو فروخت کر دیتا اور رقم برطانیہ منگوالیتا یا یہ سب پاکستان کے کسی ویلفیئر ٹرسٹ کے حوالے کر جاتا۔ اب اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کہ آخر اس نے یہ تحفہ ای انعام مجھے ہی کیوں دیا۔ اس حاشیت خسروانہ کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟ کیونکہ اس داستان کا آخری ڈرامائی سوڈ کچھ عرصہ پہلے آچکا تھا۔ جب ابانے بشارت فاروقی سے تمام واقعات معلوم ہونے کے بعد لندن میں قیوم بٹ کی معرفت عقل احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو انہیں بتایا گیا کہ وہ یقیناً قتل عقل احمد کا سوتے میں انتقال ہو گیا تھا۔

اب اپنی بھرا بھرا کوٹاہی اور بے حس پر مجھے دکھ اور شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ عقل احمد سے نہیں ملا

تھا جو میرے دادا کا بھائی ہونے کے ناتے میرا دادا ہی تھا۔ میں وہاں موجود تھا جسے اس نے اپنی ساری جائیداد کا وارث بنا دیا تھا مگر وہ خود لاوارث مر گیا۔ آخر اس نے ایسی رازداری کیوں برتی؟ کیوں مجھے نہیں بتایا کہ وہ کون ہے؟ اس نے میرے والد اور چچا نذیر کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ آخر کیوں؟ ہر اجنبی کی نہ کسی "کیوں؟" پر تمام ہوتی تھی مگر سارے سوال بے جواب تھے۔ خود ابا جی اور چچا نے لندن میں مجھے کچھ نہیں بتایا نہ اور کچھ نہ کسی میں کم سے کم اپنے اس خاندانی بزرگ اور محسن کی قبر پر فاتحہ پڑھا تا تو یہی بات کچھ باعث سکون ہوتی۔

نیند اڑ جانے کے بعد میں کسی بے خواب آنکھ کی طرح اپنے خیالوں میں بھگ رہا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک پڑا۔ آخر اس وقت مجھے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ سوال کے ساتھ ہی ذہن کے اسکرین پر جواب بھی نمودار ہو گیا۔ لندن میں اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میری داستان ماضی کی بھول بھلیوں میں سرگرداں دماغ ایک جست میں آج کے سنگین حقائق کی دنیا میں پہنچ گیا۔ چنلے پہلے میرے تصور میں چوٹی اور جاگیر سے منسوب روایات کی تاریخی قلم چل رہی تھی۔ دوسرے لمبے جیسے جھیل بدل گیا اور اسکرین پر لندن ابھرا یا جہاں عائشہ بھی اور اس کے نفسیاتی مسائل تھے جن کا ذمہ دار میں خود کو سمجھنے پر مجبور تھا۔

میں نے ریسپورڈ اٹھا کے کہا "ہیلو!"
دوسری طرف سے لارڈ ارلست کی آواز آئی "ازدوس رفتی؟"

میں نے کہا "میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔"
"اوہ! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں نیند سے جگانا پڑے گا۔ تمہارے ملک میں تو اس وقت چار بجے ہوں گے۔"
میں نے کہا "ہاں..... لیکن میں عائشہ کی طرف سے پریشان تھا۔ وہ اب کیسی ہے؟"

"ابھی تک کوئی ایسا بات تو نہیں ہوئی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے لیے ایک مسئلہ بن جائے گی۔"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔"
اس نے کہا "جب تک تم یہاں تھے میں پریشان ہی کا فکار نہیں ہوا تھا۔ جانتے ہو تمہارے جا چکے کے بعد اس نے کیا کیا؟"

میں نے کہا "ہاں..... سوئی نے مجھے بتایا تھا۔ کہ وہ مکر سے چلی گئی اور پھر..... پکڑی گئی۔"

"ہاں۔ میں نے اسے اپنے چھڑا لیا۔ وہ پہلی بار کسی غیر اخلاقی فعل میں ملوث ہوئی تھی اس لیے سزا سے بچ گئی۔ تاہم مجھے پولیس کے سامنے سخت اغمازی پڑی۔ پولیس نے بھی رازداری سے کام لیا اور کسی کو بتائیں چلا لیکن مجھے ڈر ہے کہ ایسا دوسری بار بھی ہوگا۔ بار بار ہوگا۔ اس کے بعد یہ بات کی سے بھی چھپی نہیں رہے گی اور ہماری پوزیشن ضرور خراب ہوگی۔"

"آپ اسے سمجھا سکتے ہیں۔"
وہ خطرناک انداز میں ہنسا "کیا وہ کوئی ایسی جی ہے کہ میرے سمجھانے سے سمجھ جائے۔ قانونی طور پر وہ عاقل دماغ ہے اور مجھے یہ حق حاصل ہی نہیں کہ میں اسے رد سکوں۔"
"لیکن اخلاقی طور پر آپ اس کا حق رکھتے ہیں۔ آخر آپ اس کے والدین ہیں۔"

وہ بولا "شاید تمہارے ملک میں والدین کا اخلاقی حق اہمیت رکھتا ہو۔"

میں نے کہا "آپ اسے کسی نفسیاتی کلینک میں رکھ سکتے ہیں۔ یا کسی سائیکیاٹرٹ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔"

"میں نے عائشہ سے بات کی تھی مگر اس نے وہی کہا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے کہا کہ ڈیڈ! اب یہ میری زندگی ہے۔ اس کو بنانے بگاڑنے کی ذمہ داری آپ کی نہیں رہی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ایسے غیر بن کے اور اتنی بے مروتی کے ساتھ اس نے سبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ وہ جانتی ہے میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "وہ فرسٹریشن کا شکار ہے۔"

"اوہ۔ نو۔ اب تو یہ اس سے بہت آگے کی بات ہے۔ وہ ڈپریشن میں چلی گئی ہے۔ تم جانتے ہو وہ کتنی ذہین ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے لیکن اب تو اس نے لائف میں اپنا انٹرست ہی ختم کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ میرے لیے بڑی اذیت کی بات ہے کہ میں خود کو عائشہ کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھتا ہوں لیکن اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتا۔"

"رہتی! کیا واقعی تم اس کی مدد کرنا چاہتے ہو۔"
میں نے کہا "اپنے احساس جرم کی عقل سے نجات کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ عائشہ کی مجھے اتنی ہی پروا ہے جتنی آپ کو۔"

"تھیک یو۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ میری ایک ہی اولاد ہے۔ اسی سے میری ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ اگر میرا کم سے کم ایک بیٹا ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔"

اپنی طور پر اتنا کمزور نہ ہوتا۔ تم سے یہ حقیقت بھی نہیں کہ میری اپنی بیوی سے نہیں جتنی۔ اس کے اور حوا میں زمین آسمان کا فرق ہے جو یقیناً پہلے بھی اب میں نے اس سے شادی کی تھی لیکن میری نظر نہ کچھ اٹھانے میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ عشق میں آدمی صرف لڑکے سے کام لیتا ہے۔ عقل سے نہیں۔ خیر..... یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اکثر جوڑے ایڈجسٹ نہیں کر سکتے تو اپنے خاندان کی طرف لپکتے ہیں۔ ایسا میں بھی کر سکتا تھا۔ میری مالی حالت بدترین ایسی تھی کہ سیلیا کو چھوڑ دیتا تو مجھے کوئی فرق نہ پڑتی اسے پڑتا۔ وہ بہت عاصیانہ مگر انے کی لڑکی تھی۔ باہرانی تعصب نہیں رکھتا مگر یہ حقیقت ہے کہ طبقاتی فرق ہی مسائل پیدا کرتا ہے۔ صرف عائشہ کے لیے میں نے برداشت کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ عائشہ کا بچپن ماں یا کسی بے لگ کرے اور وہ بعد میں نفسیاتی مسائل کا شکار ہو۔

اباں نے میری مجبوری کو اپنی شذوری بتالیا۔ اس نے ایک کل کیا۔ میں سخت دباؤ میں رہا۔
میں نے اہور دانہ لے لی تھی کہا "میں سمجھ سکتا ہوں۔"
"میں نے عائشہ کو اعلیٰ تعلیم دلانی اور ذمہ دار بنایا۔

بقیہ حقا کہ وہ میرے کاروبار کو ترقی دینے کی پوری جہت دیتی ہے۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ میرا جو کچھ اب اسی کا ہے۔ اصل پریشانی میری یہ ہے کہ عائشہ ہی بے لگے سب کچھ ہے۔"

میں نے کہا "آپ ضرورت سے زیادہ مایوسی کا شکار ہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عائشہ کو بھی آپ کا بہت خیال ہے۔"

"میں اب اسے صرف تمہارا خیال ہے۔ اس نے اسے لیے اپنا مذہب بدل لیا۔ مذہب ہر شخص کا ذاتی الہ ہے۔ وہ تم سے شادی کرتی تو یہ بھی اس کا ذاتی معاملہ ہوتا۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا اور حقیقت تو چھوڑ تو میں لگا بھی پہنڈ کرتا تھا۔ میرے معیار سے تم عائشہ کے لیے بدعنوان تھے۔"

میں نے کہا "عائشہ کی ماں ہرگز ایسا نہیں سمجھتی۔"
"اس کی تائید بھی ہے جس کی سزا میں بھی محبت رہا ہوں۔ عائشہ بھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس طرح ایک عائشہ کو چھوڑ کے واپس جانے کا فیصلہ کر لو گے۔"

میں نے کہا "وہ میری مجبوری تھی۔"
"میں سمجھتا ہوں۔ مگر عائشہ نہیں سمجھتی۔ وہ حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی۔ کیا تم نے اسے سمجھایا نہیں تھا کہ تم اس کو پسند

کرنے کے باوجود اس سے شادی کیوں نہیں کر سکتے؟"
میں نے کہا "میں نے بہت سمجھایا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔"

لارڈ ارلست نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کاش ایسا ہوتا رہتی۔ جانتے ہو جب میں پولیس اسٹیشن گیا تو وہ کس کے ساتھ تھی۔ اس کے ساتھ ایک سیاہ فام لڑکا تھا۔ مجھے سے شناخت نامے پر دستخط کرانے والے پولیس افسر نے مجھے بتایا کہ جو سیاہ فام نوجوان عائشہ کے ساتھ تھا۔ اس کا بہت لبا چوڑا کرکٹل ریکارڈ ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ عائشہ جیسی لڑکی کا ایسا بوائے فرینڈ کیوں ہے؟ مجھے سخت غصہ آیا مگر میں خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا ہے تو کو کس کرتا ہے۔ میری بیٹی نہ جانے کیسے وہاں پہنچ گئی۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کے ٹھکانے پر۔ جسے عائشہ پسند کرتی ہے وہ تو بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ، مذہب اور پنڈت آدمی ہے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کا نام کیا ہے تو میں نے کہا کہ وہ عائشہ کو چھوڑ گیا ہے اور اسی لیے عائشہ نفسیاتی طور پر ڈسٹرب ہے۔ اس نے بڑی اہم روی کی اور عائشہ کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ اس لڑکے کو بند رکھا۔ مگر آگے میں نے اس کی ماں کو عائشہ سے دور رکھا اور اس سے بالکل دوستوں کی طرح بات کی۔ میں نے سوچی کو بھی بلایا تھا۔"

"مجھے یقین ہے اس نے آپ کی بات سنی ہوگی۔"
"رہتی..... بات سمجھ میں آتی ہے عقل سے اور جب عقل پر چڑ بات کا غلبہ ہو تو دلیل بے اثر ہو جاتی ہے۔ اسے کس نے نہیں سمجھایا۔ تمہارے علاوہ بھی بہت لوگ تھے۔ میں اس کے کچھ تھیں دوستوں کو جانتا ہوں۔ انہوں نے بھی عائشہ سے بات کی تھی۔ کل سوئی نے میری مدد کی۔ اس نے عائشہ سے کہا کہ اول تو رہتی تم سے شادی کرنے پر راضی نہیں اور اگر ہو جائے تب بھی تمہارا اس کے ساتھ پاکستان میں رہنا ناممکن ہوگا۔ سوئی نے خود اپنی مثال دی کہ میں صرف ملازمت کے لیے برطانیہ میں مقیم ہوں۔ مستقل طور پر میں جاپان کے علاوہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں رہ سکتی خواہ مجھے وہاں دنیا بھر کی آسائشات فراہم کر دی جائے۔ رہتی ایک مہر تھا۔ تعلیم یافتہ بھی تھا اور خوش حال بھی۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر وہ یہاں نہیں رہ سکا تو میری ساری زندگی پاکستان میں کیسے گزار دی؟ قیمت ہے کہ اس وقت عائشہ کا موڈ حارہ نہ نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھو تم عائشہ نہیں ہو اور میں سوئی نہیں ہوں۔ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میرے لیے کیا ممکن ہوگا اور کیا ناممکن؟ ظاہر ہے اس کے بعد سوئی تو لا جواب

”گلدوس از مالکی بلان۔ تم خود کو ایک برا آدمی ثابت کرو گے“ قابل نفرت۔ تم اپنے ماحول کو عائشہ کے لیے ناقابل برداشت بنا دو گے۔ اگر تم اپنی جیلی کو اعتماد میں لے سکتے ہو تو دھماکہ کے ساتھ حمل کے اس بلان کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ وہ اپنے رویے سے عائشہ کا بیجا غراب کر سکتے ہیں۔“

میں نے ہنس کے کہا "سوچ لو! اچھی طرح لاؤ آرٹسٹ! تم اپنی بیٹی کو خود غائب میں دھکیل رہے ہو؟"

"اوہ! وہ خود غائب میں پڑنا چاہتی ہے مگر اسے عذاب سمجھنے پر تیار نہیں۔ یہ سب بالآخر عائشہ کے مستقبل کی بھڑی کے لیے ہے۔ تم دیکھ لینا، وہ حقیقت کا ایسا بھیاک روپ دیکھ کر کتنی جلدی بچھتا کی۔ اپنی مثل ٹھکانے آئے گی تو اسے اندازہ ہوگا کہ ہم اس کے خیر خواہ تھے۔ وہ تم سے بدظن ہو کے اور تمہاری محبت پر لنت بھیج کے داہیں بھاگے گی۔ اس کے خواب بکھر جائیں گے تو وہ روٹی ہوئی داہیں آ کے میرے گلے لگ جائے گی کہ ڈیڈی! آپ ٹھیک کہتے تھے۔"

میں نے کہا "میں تمہارے پلان کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں لاؤ!"

وہ خوش ہو کے بولا "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ویسا کرو گے جیسا کہ میں نے تمہیں سمجھایا؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ عائشہ کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"دیٹ ڈی جسٹ فائن۔ اس بے وقوف لڑکی کا یہی علاج سب سے بہتر ہے۔ کنوئیں میں گرنے سے چوٹ لگتی ہے، کنوئیں میں کودنے سے کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "کیا اس کی ماں بھی ایسا ہونے دے گی؟"

"اسے میں راضی کر لوں گا۔"

میں نے کہا "اسے میری نیک نیتی کا یقین دلانا۔ وہ مجھ سے سخت بدگمان ہے۔ عائشہ یہاں اتنی ہی محفوظ ہوگی جتنی گھر میں ہے۔ یہی میری عائشہ کے لیے حقیقتی محبت ہے کہ میں اسے مستقبل میں ہمیشہ بہت خوش دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔"

"تم یقیناً اسے خوابوں کی تعبیر دے سکتے تھے جو مجھے نہیں ملی۔"

میں نے کہا "کاش یہ ممکن ہوتا۔ اگر مجبوری حاکم نہ ہوتی تو ہماری ازدواجی زندگی مثالی ہوتی۔ لیکن آدمی کو چاہئے سے سب نہیں ملتا۔"

اس نے کہا "ہو سکتا ہے ایک دوروز میں عائشہ خود تمہیں بتائے کہ وہ پاکستان آ رہی ہے۔"

"جب تک میں اپنے خاندان والوں سے بات کروں گا اور پھر عائشہ کو خود انوائٹ کروں گا کہ وہ ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ رہے۔"

"تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ سمجھ گئی میں نے ایک مصرعہ سر کر لیا لیکن رقیں! میرے دل کے کسی گوشے میں

ایک ڈر کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ شکست کا ڈر اس بات کا ذکر نہیں میرا اندازہ غلط نہ ہو جائے۔ اگر سب ویسا نہ ہوا جیسا میں نے سوچا ہے پھر؟"

"آپ کے لیے کوئی رسک نہیں۔"

"رسک کیوں نہیں۔ فرض کرنا ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا اس لیے میں یہ سوچتا ہوں کہ کبھی وہ میری توقعات سے بڑھ کر بہادر اور مستقل مزاج ثابت ہوئی وہ سب برداشت کرے گی۔ اور تم نے اس سے بھی شادی کر لی۔ پھر؟"

میں نے ہنس کے کہا "لاؤ آرٹسٹ! آپ کو بالکل فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی بیٹی لوٹ کر آپ کے پاس آئے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے اور میری گمانی ہے۔"

آپ جس عائشہ کو یہاں آنے دیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ میں اس کے دل میں اپنی محبت کو نفرت میں بدل کے دکھاؤں گا۔ یہ پیچھے میں نے قبول کر لیا ہے۔"

"تھینکس ہوائے۔ تم نے میرا سارا غم کا بوجھ اتار دیا۔"

بیٹی کے معاملے میں میں انتہائی کمزور آدمی ہوں۔ حالانکہ میں ایسا ظاہر نہیں کرتا مگر تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ اس جذباتی سہارے کے بغیر میں زندہ رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میں تم کو بہت پسند کرتا ہوں۔ خدا حافظ۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تھینکس لاؤ آرٹسٹ!" میں نے کہا اور دفن رکھ دیا۔

اس سے بات کر کے میں اس نئی صورت حال کا تصور کرتا رہا اور مسکراتا رہا۔ اچانک ہیرو سے میرا دل ایک دن کا ہو گیا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ برطانیہ کی اور شاہانہ پیش و عشرت کے ماحول کی پروردہ ایک لڑکی اس گھر میں کیسے گزارہ کرے گی۔ ست بدحالی کی جاگیر پر ایک آسیب زدہ حویلی میں کبھی رہے گی؟

پورا خاندان نہ سکا میرے والدین بہت فرماں دل اور روشن خیال لوگ تھے۔ وہ میری خوشی کے لیے میری ہر بات مان سکتے تھے اور سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ اگر بالفرض محال میں عائشہ سے شادی کا فیصلہ بھی کر لیتا تو وہ بڑی طرح اور خوش خوش میرا ساتھ دیتے۔ کسی دقیقہ نوسی اور جاہل خاندان میں عام عورت کے لیے گھر کوئی سینئر کا محل نہیں ہوتا۔ عملاً وہ ایک خاندان ہوتا ہے مگر ہمارے گھروں کے ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی ایسا نہیں سمجھتی۔ کیونکہ اس کی ذہنی تربیت اسے سکھاتی ہے کہ وہ میرا گھر میری جنت کے فلسفے پر قانع ہو۔ گھر میں اپنی حیثیت کو فطری طور پر اور لوشہ

نہہ جانے اور خوش رہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ذہنی راتی ہے۔ بالکل اسی طرح مجھے چڑھا کر کے بچہ کے منہ پر ہاتھ پڑھانے والے شیر کے بچے کو خود کو قید میں محسوس نہیں کرتے۔

لیکن آزاد نفساؤں میں پرواز کرنے والا پنجمی اچانک بڑے میں بند کر دیا جائے تو بہت بھڑ پڑاتا ہے۔ بچہ بڑے کے گلے جانا چاہتا تھا۔ عائشہ کے ذہن میں میری تعلیم تہذیب اور روشن خیالی کا تصور ہے اور پاکستان کی ماڈرن پٹرن سوسائٹی کا جو نقشہ ہے اگر وہ باطل ہو جائے یا باطل کر دیا جائے تو یہ اس کے لیے بہت بڑا منسل شک ہوگا۔ اگر اسے یقین دلادیا جائے کہ یہ عشق نہیں آسان بلکہ اک آگ کا دریا ہے تو وہ بھی محبت کے زنداں سے آزادی حاصل کر کے فرار میں ہی عافیت جانے کی لیکن اس کے لیے پہلے

ہے حالات پیدا کرنا ضروری ہوگا۔ سب کو سمجھانا پڑے گا کہ لاؤ آرٹسٹ کا منصوبہ کیا ہے اور اس پر عمل درآمد سے کیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ انان اور ابا طیفانیک اور سیدھے مادے شریف لوگ ہیں۔ ان کے لیے گھر آئے مہمان کے ساتھ بد اخلاقی کا رویہ رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ اس سے زیادہ

بڑی پرالم وادی کی ہوگی۔ وہ ایسے کسی ڈرامے کا کردار بننے پر کمال رضا مند ہوں گی۔ وہ تو کہیں کی کہہ کر اپنے نمونے ڈراما آئے تو دے اس لڑکی کو میرے سامنے۔ میں دیکھتی ہوں کہ میری بات اس کی سمجھ میں کیسے نہیں آتی۔ دادی کے علاوہ گھر میں چچا اور چچی جیسی شخصیات ہیں۔ چچا تو کہیں گے کہ سمجھنے میں اپنے موبکوں کو اس قسم کے پیچھے لگا دیتا ہوں۔ دیکھنا کیسے

الٹے پاؤں جاتی ہے ولایت۔ چچی کی اپنی مثل ہے۔ وہ میری ماری کوٹھوس کو اپنی سادہ لوحی یا کم عقلی سے ناکام بھی کر سکتی ہیں۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک آہٹ سی محسوس ہوئی اور میں چونک کے پلٹا تو پردے کے پیچھے سے سس راہبہ بیٹی پگالی نمودار ہوئیں۔

میں نے حیرانی سے کہا "تم..... اس وقت یہاں؟"

وہ ہنسی اور کس پر ہنسنے لگی "ہاں۔ میں نے کمرے میں انڈیو دیکھی اور آگئی۔ پہلے بھی شاید تم نماز فجر کے لیے اٹھے ہو مگر یہاں تو معاملہ یہی تھا۔"

"تم شرافت سے بھی آ سکتی تھیں۔ یوں پردے کے پیچھے کیوں چھپی کھڑی تھیں؟" میں نے کہا۔

"وہ دراصل آپ کچھ راز دنیا میں مصروف تھے۔ میں

نے دخل در معقولات سے گریز کیا۔"

"بڑی لوازش ہے آپ کی۔ اب یہ فریاد کہ تم کو آخر کس کی یاد نے بے قرار کیا ہے کہ تمہاری آنکھوں کی تندیا اڑ گئی ہے؟"

اس نے کہا "کزن..... جاگ تو تم بھی رہے ہو۔"

"میرے جاگنے کی وجہ دوسری ہے۔ لندن کے حساب سے میرے سونے کا وقت اب ہوا ہے تم کو کیا ہوا ہے؟"

"عشق....." اس نے ایک لمبی آہ بھری "تم کو تو احساس ہوتا نہیں..... اور کیسے ہو لایا ہے آئے ہو وہاں ناشتے کے وقت ایک سے عشق ہوتا ہے لچ میں دوسری مرتبہ ہے ڈز تیسری کرائی ہے۔ دلائی گوری چوڑی کے مقابلے میں اپنی کالی گولی کزن کی کیا اوقات ہے مگر باوا! دل تو سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔"

میں نے سر ہلکے کہا "اف..... کتابوں نے لگی ہو تم۔"

اس نے اٹھ کے دروازہ بند کیا "میں نے سوچا نہار منہ سب سے پہلے میں تم سے اظہار عشق کر کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر لوں۔ بعد میں تو چاہیں کتنی ڈورے ڈالیں گی تم پر۔"

میں نے کہا "بکواس بند کر دو اور یہ دروازہ کھول دو۔"

راہبہ ہنسی "ارے یار! اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر میں کزن ہوں تمہاری..... کوئی جلا تو نہیں۔ اور بدنامی ہوگی تو میری....."

"مجھے تم سے بہادری کی سند نہیں چاہیے۔ کیا ضرورت ہے کسی کو باتیں ماننے کا موقع دینے کی؟" میں نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

"رفیق صاحب! ہماری خاندانی اور تہذیبی روایات کے مطابق کزن سے عشق لازمی ہوتا ہے، تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔"

"اگر تم شرافت سے باعزت طور پر رخصت ہو جاؤ تو..... ہمارے تعلقات آئندہ بھی اچھے رہیں گے مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اس نے ہاتھ باندھ کے کمرے میں مہلنا شروع کیا "دیکھو کزن! میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ بس ایک گھنٹے میں حال دل کہوں گی اور چلی جاؤں گی۔ رہی نیند کی بات تو نیند مجھے بھی آ رہی ہے۔ کیا خیال ہے یہیں سو جاؤں..... تمہارے ساتھ۔ اسی بیڈ پر..... شرافت سے۔"

میں نے کہا "کچھ شرم کر دو۔"

"یار! ہم کی بارسو چکے ہیں تمہیں یاد نہیں۔ وادی جب

اس جن کی کہانی سنائی تھی جو انساؤں کا خون ایسے لی جاتا تھا جیسے لوگ بوجھ منہ سے لگا کے کوک پیٹے ہیں تو رات کو مجھے ڈر لگتا تھا اور میں کھس جاتی تھی تمہارے ساتھ..... آہ..... اس کے باوجود مجھیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔

”راجہ.....!“ میں نے ہار مانتے ہوئے کہا ”اگر افضل نے تمہیں دیکھا تو کیا وہ بیلے گا نہیں؟“

”اسے میں جلاتی رہتی ہوں۔ بجا بھی دیتی ہوں۔ اس کی گھڑمت کرو۔ اسے میں نے ایک چڑیل کی طرح اپنے کنبے میں جکڑ رکھا ہے اور اب تم سے کیا پردہ..... دل سے تو ہم نے ایجاب قبول کر لیا ہے۔ کسی مولوی کے سامنے ہونا باقی ہے۔ انہی ہمارے ناجائز تعلقات ہیں۔“

میں نے کہا ”جاؤ پہلے کافی بنا کے لاؤ میرے لیے۔ پھر کریں گے باقی باتیں۔“

وہ انہی ”میں چائے پیتی ہوں“ تمہیں بھی دے لی گئی۔ کافی پینے کی نہیں سننے کی چیز ہوتی ہے..... بابا بلیے شاہ کی کافی۔“

راجہ میرے معیار سے ایک عام سی لڑکی تھی۔ وہ اپنی ماں جیسی تیز طرار اور چالاک نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اور میرا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ سب سے زیادہ میں اس کو مارتا تھا اور اس کے باوجود وہ سب سے زیادہ مجھے پریشان کرتی تھی۔ کبھی اپنی شرارتوں سے ”کبھی فریادیں سنو“ ”کبھی باتوں سے۔ میری ایک ذمہ داری ہے بھی تھی کہ اسے

بڑھاؤں کیونکہ بڑھائی کے معاملے میں اس کا داغ چلتا ہی نہیں تھا۔ اور چلتا بھی کیسے کتابوں سے زیادہ اس کی دلچسپی پہلے کانوں میں تھی پھر فلوں میں ہوگئی۔ جب وہ میٹرک میں پڑھتی تھی تو ہمارے گھر آ کے دی سی آر پر کوئی فلم لگانے کی فرمائش کرتی تھی۔ پھر دروازہ بند کر کے کانوں کی دھن پر ڈانس کرتی تھی اور مجھ سے پوچھتی تھی کہ میں کیسا ناچتی ہوں؟ گانے کے لیے تو اس کی آواز بہت خراب تھی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ پرنیکس کے بعد وہ اچھا ڈانس کرنے لگی تھی۔ میں ”خ“ کے ڈانس کو دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ اس کے ایک اندر ایک رقاصہ کی بے بہن روح بقیہ تھی مگر کھر کا ماحول ایسا تھا کہ اس کی فطری صلاحیت کا اظہار ”بے شرعی“ کہلاتا۔ اس کے شوق کو غیر اخلاقی اور غیر شرعی قرار دے کر ختم کر دیا گیا۔

اس نے دو دعوے اور نقل کر کے میٹرک پاس کیا اور چار سال میں انٹر کا مرحلہ بھی طے کر لیا مگر اس کے بعد یونیورسٹی میں جا کے اس نے پہلے انچ ڈرامے میں حصہ لیا۔ ان سرگرمیوں کی رپورٹ گھر تک نہ گئی تو راجہ کو فوراً گھر میں نظر بند کر دیا گیا

کہ لی بی بی اب لی اے ایم اے جو کرتا ہے پرائیوٹ امتحان دے کر کرو۔ احتجاجاً اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔

اس کی صورت ابھی تھی لیکن رنگ سالوا تھا۔ اس نے اپنے رخ روشن پر رنگ گورا کرنے والی ہر کریم آزمائی تھی۔ جب بھی اس کے سامنے کئی کئی کریم کا اشتہار آتا تھا وہ مجھ سے کہتی تھی ”بعض اوقات اس کے پیسے بھی مجھے دینے پڑتے تھے۔ میں اسے سمجھاتا تھا کہ ساری دنیا کے بیوٹی سوسٹیکوش اور کریمیں مل کر بھی کسی ہمیشہ کو گائے جیسا نہیں بنا سکتے مگر اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ میرے لندن جانے سے پہلے اس پر ڈیپریشن طاری تھا۔ اس نے بے تحاشا کھانا شروع کر دیا تھا اور آتی ہمیشہ میں کئی کئی لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنا وزن کم کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اپنے میجر اسٹائل لباس اور میک اپ کے سلیقے سے وہ پھر کش نظر آنے لگی تھی۔

راجہ کوئی دی وڈی ادا میں اور فلوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ اس شوق پر ماں کو قطعی اعتراض نہ تھا مگر صوفی بچا جیسا شخص خود اپنے گھر میں یہ بود و لعب کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ بھی بنی کے معاملے میں۔ نتیجہ یہ کہ راجہ جلد سے جلد اس گھر سے رخصتی کی خواہش مند تھی۔ اسے یقین تھا کہ شادی کے بعد وہ من مانی کر سکے گی اور شوہر کی طرف سے اسے پوری آزادی مل جائے گی تو وہ شوہر کے اتنی کا سب سے دشمن ستارہ بن کے بچنے لگی۔ دولت اور شہرت اس کے گھر کی ہانڈی ہوگی۔

اس کے دل کی مراد برآنے میں تاخیر کے دو بنیادی اسباب تھے۔ راجہ بچپن سے ہماری خالہ کے بیٹے افضل سے منسوب تھی۔ راجہ اور افضل کی لپٹی جمنوں والی محبت کے فے اور مناظر سب نے ہی دیکھے اور سنے تھے۔ صوفی بچا کے لیے یہ بڑے اطمینان کی بات تھی اور یہ صورت حال اس لیے بھی مثالی تھی کہ افضل ان کا مرید ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی عقیدت مندی سے بچا کے ہاتھ چومتا تھا۔ ان کی ہر خدمت بجالاتا تھا اور ہماری سریدی کے دھندے میں ان کا معاون خصوصی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دن وہ ان کی جگہ لے گا اور ان سے زیادہ کامیاب رہے گا۔ بچگی کو اس سے چڑھتی۔ ان کے نزدیک افضل وہ مثالی داماد نہیں تھا جو وہ اپنی بیٹی کے لیے چاہتی تھیں۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ صورت سے بھی پرلے درجے کا حق لگتا تھا اور اپنی حرکتوں سے بھی ایسا ہی ثابت کرتا رہتا تھا۔ وہ کوئی کام دھند انہیں کرتا تھا اور اپنا زیادہ وقت پیر و مرشد کی بارگاہ میں گزارتا تھا۔ چچی نے شادی و فتنوں کے پھر لگائے ”دروغ بر گردن راوی“ ضرورت رشتہ

کا علم میں اشتہار دینے کے بعد خود اپنے شوہر سے جسے وہ ”مکی“ کہتی تھی دال براہ صحتی آئی تھیں! اچھے رشتے کے لیے خود ”درد و دھن“ تفتش اور عملیات تک سب کرائے تھے مگر اصل سے بہتر کوئی رشتہ اگر آیا تھا تو خود راجہ نے انکار کر دیا تھا۔ تاہم ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو صورت میں پری زاد برکت میں فرشتہ اور قسمت میں شاہزادہ ہوتا۔

پھر اچانک پردیس سے میری واپسی کا غلغلہ ہوا۔ میں نے خود باپوں والی ہمہ مفت داماد کی جیتی جاگتی تصویر بھی۔ مجھ لندن میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ چچی نے تمام امکانات کو مدد کر کے خود اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ راجہ کی شادی ہوگی تو مجھ سے۔ بدخواہوں کے منہ میں خاک بننے اور مذاق اڑانے والے حاسدوں کا منہ کالا۔ سب دیکھتے رہ جاتیں۔ ح۔ افضل تو کسی گنتی میں ہی نہیں۔ باقی سب کی بھی کیا شہرت ہے۔ کہاں کی فریال اور کون عاقل۔ وہ ایسا چکر چلائی گی کہ ساری پائلیں دور ہو جائیں گی۔ اس غیر اعلانیہ جنگ میں وہ خود کو پوئلین اعظم سے زیادہ شاطر اور بڑا جرنیل سمجھتی تھیں۔ راجہ سے بھی انہیں پوری امید تھی کہ میرے معاملے میں وہ افضل کو بھی دودھ میں پڑی کھسی کی طرح نکال دے گا۔ مگر اس کی ادھر مجھے حاصل کرنے کی جدوجہد میں ماں کا یوں ہاتھ دے گی کہ سارے حریف شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ایسی باتیں سن کے مجھے بھی ہنسی آتی تھی اور پٹائی بھی ہوتی تھی۔

راجہ دروازے کو لات سے کھول کے اندر آئی تو اس کے ہاتھ میں کافی کے دھگ تھے۔ ایک مجھے تھا کہ وہ میرے مانتے بیٹھی۔

میں نے کہا ”کافی تو سننے کی چیز ہوتی ہے۔“

اس نے ایک چسکی لے کر کہا ”تمہاری خاطر میں بھی یہ زہریلی رہی ہوں کزن! ترے عشق چنایا کرتھا تھا۔ جب سے تم نے بڑے تمہیں فرمت ہی نہیں ہے بات کرنے کی۔“

میں نے کہا ”فرمت تو آج بھی نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے لہذا بات کے دور سے پر۔“

وہ ہنسی ”سلطنت کیوں نہیں کہتے۔“

میں نے کہا ”راہی! کیا تمہیں اندازہ ہے کہ میں کتنی عظمت میں گھرا ہوا ہوں۔ کیسے سنگین مسائل سے دوچار ہوں؟“

”بالکل ہے۔ لیکن تمہاری تشریف آوری نے میرے لیے کیسے سنگین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ حالات ایسے ہیں ریتی صاحب کہ ہم ایک

دوسرے کے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔“

میں نے ہاتھ جوڑے ”مجھے تو معاف ہی رکھو لی بی! خدا مجھ پر ایسا برا وقت نہ لائے کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔“

وہ بولی ”تمہاری شادی ایک قوی بلکہ بین الاقوامی مسئلہ بن چکی ہے۔ تم ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے ہو مسٹر لیکے!“

میں نے رقت انگیز لہجے میں کہا ”بلاشبہ کزن! خود تم سب سے بڑا خطرہ بن کے مجھے گھر رہی ہو۔“

اس نے اپنی ہمت جاری رکھی ”مجھے وہ بھی معلوم ہے جو تم سمجھتے ہو کسی کو معلوم نہیں! پوچھو کیسے؟“

”مجبوراً میں نے کہا“ ”اوکے۔ پوچھ لیتا ہوں وہ کیسے؟“ ”وہ ایسے کہ میرا ایک شہینہ سراغ رسانی ہے۔ وہ بہت ایکٹیو ہے کیونکہ الحمد للہ اس کی سربراہ میرے ہمیشہ ذہین خاتون ہے۔ آج کل تمہارے کس پر میری ساری توجہ ہے کیونکہ تمہاری ملکیت کے جھڑے پر پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان تیسری جنگ عظیم کے خطرات پیدا ہو رہے ہیں! پوچھو وہ کیسے؟“

”ہرگز نہیں پوچھو گے۔“

”اوکے“ میں بتا دیتی ہوں۔ کرکٹ کی تو کوئی بات نہیں کزن! اس میں باہر جارت پلتی ہے مگر یہ معاملہ ہے زندگی اور موت کا۔ ایک بڑی خطرناک قسم کی پاکستانی لڑکی ہے۔ دوسری سرمایہ دار ملک کی حسینہ ہے۔ ان دونوں نے تم کو مسئلہ کشمیر بنالیا ہے! رائٹ!“

”رائٹ“ مگر یہ بات تو سب جانتے ہیں۔“

”جو بات راجہ جانتی ہے کوئی نہیں جانتا کہ بہت جلد وہ دلائی جی حسینہ یہاں آ رہی ہے پاکستان میں اور اس گھر میں جو عجائب گھر ہے۔“

میں اچھل پڑا ”یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟“

وہ ہنسی ”مجھے معاف کرنا..... مجھے انگریزی زبان تو نہیں آتی مگر جتنی آتی ہے اس کے مطابق.....“ اس نے لوفرانہ انداز میں بائیں آنکھ دہائی اور بولی ”جب تم فون پر بات کر رہے تھے تو میں پردے کے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی لیکن گھر کی کوئی بات نہیں کزن۔ اگر یہ راز ہے تو راز ہی رہے گا۔ تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو۔ میں تمہاری معاون خصوصی دوست ”مشیر“ جاسوس“ سیکریٹری یہاں تک کہ محبوبہ کا دل بھی کر سکتی ہوں۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا ”میرے حال زار پر یہ

شکست شب

خواتین کا مقبول ترین ناول

ہاں شکر بجالاتے ہوئے بڑے سکون سے گزرا رہی تھی۔ میں نے اپنی حریفانہ پرہیزی رنگ کیا جو ہوس زر کی بدنامی سے لگتی۔

راہبہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگر آدمی جائیداد میں انصاف کے ساتھ دوسرے حق دار کو دے دو گے تو غریب نہیں ہواؤ گے۔ بے ملک مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔

میرے خیالات کی رد ٹیلی فون کی گھنٹی سے ٹوٹ گئی۔

مات نے ریسورٹ اٹھا کے کہا ”ہیلو“

دوسری طرف سے کسی اجنبی آواز نے کہا ”مجھے رفتی سے بات کرنی ہے۔“

میں نے کہا ”فرمائیے میں رفتی احمدی ہوں۔“

ایک لمبو وقف کے بعد دوسری طرف سے کہا گیا ”میں دن سے صفدر سلطان پول رہا ہوں۔“

پہلے مجھے شب ہوا کہ میرے کالوں نے غلط نہیں سنا تو پھر یہ بات غلط ہوئی مگر بزرادری سیل کی دوزی سے ہوا کے دوش پر آنے والی اس آواز کو پہچاننا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے تسخیل کے کہا ”جی فرمائے؟“

اس نے خاصے پُر عونت اور غلیظ آواز لہجے میں پوچھا

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ فریال کہاں ہے؟“

میں نے پھر خود کو سنبھالا اور سیٹ لہجے میں پوچھا ”یہ میں پاکستان میں بیٹھ کے کیسے بتا سکتا ہوں“ جب تمہیں لندن لہا بیٹھ کے معلوم نہیں؟“

اس نے قدرے بد تمیزی سے کہا ”دیکھو۔ پتا تو مجھے چل جاتا ہے۔ وہ اپنے قلیت پر نہیں ہے۔ کیا وہ پاکستان میں ہے؟“

”میں سارے پاکستان کی خبر نہیں رکھتا اور فریال کے بارے میں مجھ سے سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ نہاری ڈے داری ہے یا میری؟“

اس نے کہا ”مجھ سے چالاکی کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دو کہ وہ تمہارے گھر میں تو نہیں ہے؟“

میں نے دہاز کے کہا ”میرے گھر میں..... صفدر سلطان کیا تم نے میں ہو؟“

”کسی خوش فہمی میں ہرگز نہ رہنا۔ اگر مجھے پتا چلا بعد میں ٹھیک نہیں ہوگا۔“ اس نے مجھے دھمکی دی۔

”کیا ٹھیک نہیں ہوگا؟ تم تو پہلے ہی اپنے کیے کو بھگت رہے ہو۔ گھر سے اور ملک سے بھاگے ہوئے ہو۔ پہلے اپنے معاملات کو ٹھیک کرلو۔ اس کے بعد مجھے ٹھیک کرنے کی بات کرنا“ میں نے غرا کے کہا اور فون بند کر دیا۔

ہو جاؤ گے..... اور نہیں دو گے تو.....“

”تو کیا ہوگا؟“ میں نے بوہمل دل کے ساتھ کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی ”پتا نہیں ایسی بات مجھے کہنی چاہیے یا نہیں مگر کزن.....! تمہارے ساتھ میں ہمیشہ خلص رہی ہوں کیونکہ تم میرے ساتھ خلص تھے۔ دولت کی مجھے ہوس بہر حال نہیں ہے لیکن میری والدہ..... ان کی نفرت مجھ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ تمہارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے کہا ”وہ مجھ پر تنوید مگڑے کر آئیں گی، مستقل عمل اور کالا جادو کرنا میں کسی“

وہ کچھ دیر فرش کو دیکھتی رہی اور بھر پھڑکی ہوئی۔ ”سوچ کزن! اگر دوڑوں کی جاگیر حاصل کرنے کے لیے کوئی کس انہماک جاسکتا ہے؟“

میں دم بخود رہ گیا۔ جاتے جاتے رابعہ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ حق و راست کو منتقل کرنے کے لیے میری جان بھی لی جاسکتی ہے۔ جتنا مجھے ملتا تھا اس سے بہت کم کے لیے قتل کئے جاتے ہیں۔ اگر اتنی بڑی جاگیر حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قتل کر دے یا کرادے اور وہ قتل کسی طرح بھی قتل ثابت نہ ہو بلکہ حادثہ ظفر آئے یا طبی موت تو جاگیر باآخرا کے ملے گی۔

میرے بعد وارث کون ہوگا.....؟

اب صبح ہوئی تھی اور گھر کے اندر سے سناٹی دینے والی آوازیں بے ظاہر کر رہی تھیں کہ اب نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر اب بچن میں مصروف ہو گئی ہیں۔ شاید ابا اور چچا بھی چائے پی رہے ہوں گے۔ رابعہ کی قدر میرے دل میں بڑھ گئی تھی۔ اس کی صاف گوئی اور اس کے خلوص نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس نے میری آنکھیں کھول دی تھیں اور مجھے ان انڈیشوں سے ہوشیار کر دیا تھا جن سے میں اپنی سادگی میں بالکل بے خبر تھا۔

جاگیر کی نحوست کے سائے اب میرے خاندان اور مستقبل کی طرف بڑھ رہے تھے اور میرا دل دشت آگنہ خیالوں کی یلغار میں تھا۔ کیا اب زندگی بھر رشتوں کی آبرو کا بھرم رکھنے والے بھائیوں کے دل بدتن ہو جائیں گے؟ بہت جلد جگہ کدورت اور نفرت پروان چڑھے گی؟ جاگیر وہ عداوت بن جائے گی؟ دیر نہ داناں اور سارنیشیں ہوں گی۔ اپنے بستر پر لیٹ کر جھٹ کو گھورتے ہوئے میں نے جنم تصور سے وہ سب دیکھ لیا جو مست بدعا کی جاگیر اور حرم سے مجھے خنجر کرنے کے لیے کافی تھا۔ پھر میں نے اس زندگی کا تصور کراچمہ والے زرخیز بوٹھا میں اقامت کے ساتھ

سب کو حاصل رہتا ہے کہ اپنی کوئی بھی چیز کسی کو بھی بخش دی مگر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔

”اگر انہوں نے نا انصافی کی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں خود نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیوں انہوں نے میرا انتخاب کیا۔ کیا نذیر چچا مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ اب میں نصف ان کے نام کروں؟“

”ابا تو نہیں مگر ماں کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ضرور تم سے بات کریں گی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تم لندن میں تھے تم نے عقل احمد سے مل کے کوئی چکر چلایا، اسے کوئی پٹی پڑھائی۔“

میں نے برہمی سے کہا ”لاحول ولا قوۃ۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ لندن میں ہے۔ اس نے میرا پتا چلایا۔“

”یہ کہا جا رہا ہے کہ جیسے پہلے لکیل احمد نے غلط بیانی کی تھی کہ وہ اکیلا وارث ہے، اُسے تم نے فائدہ اٹھایا۔“

”راہبہ! خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔“

”میں کب کہہ رہی ہوں کہ ہے۔ مگر لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ ابا نے مکمل صورت حال کو قبول کر لیا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا تو اس میں تمہارا کیا کسی اور کا کیا قصور۔ عقل احمد نے زیادتی دینا کی۔ وہ دراصل کا معاملہ شرع اور قانون کے مطابق طے کرتے.....“

”کیا یہ تمہارے جذبات ہیں؟“

”کزن! مجھے یہ پتا کہ تمہاری اداری میری پوزیشن میں کیا فرق ہے؟ آخر میرے ابا کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ بے شک انہوں نے تمہارے دادا کو کچھ نہیں دیا مگر جنہیں دے دیا بات تو ایک ہی ہے۔ حق تو اتنا ہی میرا بھی تھا۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”راہبہ! میں تمہاری بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ قانونی طور پر عقل احمد مرحوم کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اخلاقی اعتبار سے تھا لیکن اب میں کیا کروں؟“

”یہ تم خود سوچو کہ جنہیں کیا کرنا چاہیے۔ اماں آئیں گی تمہارے پاس فریاد لے کر۔ جمہولی پھیلا کے حق اور انصاف کی دہائی دیں گی۔ ہمیں گی کہ مر نے والا تو ہمارا دینی طور پر بھی مغلوب تھا مگر تم کو سوچنا چاہیے۔ اس حق تلفی کا ازالہ تم کر سکتے ہو۔“

میں نے کہا ”مطلب یہ کہ آدمی جائیداد انہیں دے دوں؟“

راہبہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ”دے دو گے رشتی صاحب تو غریب تو نہیں

اگر میں لندن میں ہوتا اور فریال ایسے اپنا کمال کا کام کرتے میں میرے سامنے آ جاتی تو جتنے جتنے میرا بر حال ہو جاتا اور میں اس سے پہلا سوال یہ کرتا کہ یہ کیا ڈراما ہے؟ مگر یہاں اس کا چہرہ دکھ کے میں اتنا حیران اور پریشان ہوا کہ بولنا ہی بھول گیا۔ آواز میرے حلق میں جھنسن گئی۔ میں پتھر کے بت کی طرح دم بخود چلیں جھپکے بغیر اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس نے میری آنکھوں کے سامنے چمکی بھائی۔ ”اے رومیو! ایسے کب تک دیکھتے رہو گے مجھے؟“

میں چونکا ”مگر فریال۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں کیسے۔۔۔ اور کیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے میرے پیچھے پیچھے۔۔۔ اچانک۔۔۔“ میرے الفاظ میں کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ لطف لینے کے لیے قہقہہ لگا کر ہنسی ”کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر تمہارے پیچھے نہیں آتی تو کیا تو کوئی بلینئر۔۔۔ کے پیچھے جاتی؟“ میں نے پوچھا کہ سر کھایا ”وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔“

اس نے مجھے ڈانٹا ”یہ کیا بد نظری ہے کہ دروازے پر روک کے اگر گھر کر رہے ہو۔ گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا ہے تمہارے یہاں پہلے لٹیش ہوتی ہے کہ کیوں آئے ہو کیسے آئے ہو۔ مجھ سے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے۔“

اندروں سے راجہ نے جانتے بوجھتے چلا کے پوچھا ”کون آیا ہے رفیق بھائی! اس سے باتیں کر رہے ہیں۔“ میں نے کہنے کی کوشش کی کہ فریال آئی ہے لیکن میرے حلق سے بے معنی آوازوں کی غرغراہٹ برآمد ہوئی۔ فریال نے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اسے انکار کرنے کا کیا کچھ سمجھانے کا فائدہ کچھ نہ ہوتا۔ وہ مجھے دھکا دے کر الگ کرنی اور زبردستی گھر میں قید کر دیا۔

اور اس نے یہی کیا ”چلو ہٹو۔ راستہ دو مجھے اور میرا سوٹ کیس اٹھا لاؤ۔“ وہ قہقہہ بنا غوطہ مار کے میری دائیں ٹانگیں سے لٹکی۔ اور برق سمیت اندر چلی گئی۔

میں نے سوٹ کیس کو ایسے اٹھایا جیسے اس میں کوئی بم نصب ہے جو پھٹنے سے پھٹ جائے گا۔ دھماکا اب مگر زیر تھا۔ اگر میں پہلے سے تیار کرتا اسباب بٹاتا اور کم سے کم دادی کو یا راجہ کو شریک راز کر سکتا تو شاید فریال کا ایسے نازل ہونا کم فرمایا پیدا کرتا اور میری مشکل کچھ آسان ہو جاتی لیکن اس کے بنے نازل ہونے سے میرے گھر میں جو نچل آنا یقینی تھا۔ میری کچھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنی پوزیشن کیسے واضح کروں گا اور کیسے سب کو سمجھاؤں گا کہ فریال کی

تقریف آوری کسی طے شدہ پروگرام یا سازش کا نتیجہ نہیں ہے۔

جب میں اندر پہنچا تو لاؤنچ میں سب لوگ ایک دم دائرے میں فریال کے مقابل کھڑے اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر کی شیرینی جسے آج تک وہ سلاخوں کے نیچے دھبچتے آئے تھے اپنا ایک ان کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اور اب پوچھ رہی تھی کہ ناشتے میں کسے تناول فرماؤں؟ جلدی فیصلہ کر کے بتائیں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

میں نے پھلکا کے کہا ”یہ۔۔۔ فریال۔۔۔ فریال ہے۔“

فریال چمک کے چلی ”تمہیں پتا نہیں؟ تمہاری منگوان ہوں تو اور کہاں جاؤں گی۔ یہی ہے اب میرا گھر۔ کیا تم نے بتایا نہیں تھا انہیں کہ تم مجھ سے شادی کر چکے ہو۔ یہ سب ایسے دیر سے پھاڑ پھاڑ کے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟“ ”شادی؟“ ”سب سے پہلے راجہ نے۔ پھر ایک بکنڈ کے ذقے سے دیگر خواتین نے چیخ ماری۔“ رفیق! یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چلا کے کہا ”یہ بکواس کرتی ہے۔ جھوٹ بولتی ہے۔“

فریال نے بڑے پیش میں برق اتار کے گولا سناپا اور بم کی طرح میری طرف پھینکا۔ ”میں جھوٹ بولتی ہوں۔ نکاح نامہ ہے میرے پاس رومیو! اس پر دستخط ہیں تمہارے۔ اور دو گواہوں کے۔“

صوتی چچانے بہ آواز بلند کہا ”استغفر اللہ۔“ اور پلٹ کے کمرے میں غائب ہو گئے۔ اندر سے انہوں نے تین بار لالچل پڑی اور پھر کوئی جلائی وغیرہ شروع کر دیا۔ ایسا کرنے میں وہ سو فی صد حق بجانب تھے کیونکہ برق کے نیچے فریال نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا، وہ لندن کے معیار سے بھی اتنا کم تھا کہ مرکز پر گوردوں کے بھی سرگھوم جاتے۔ پاکستانی غیرت قوی سے زمین میں گڑ جاتے یا فریال کے پیچھے پڑ جاتے۔

آمنہ جی کا آتش فشاں پھٹ پڑا ”اری چھال! اب حیا! تن پر کپڑا نہیں! آگنی برق اودھ کے حق جتانے کہ میرا نکاح ہوا ہے۔“

فریال نے اپنے بیگ میں سے سگریٹ نکال کے جلائی ”آف کورس۔ یہ میرا قانونی شوہر ہے۔ میرے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔“

دادی نے جوتی اتار کے میری طرف پھینکی ”تو کیا انوکھی

لرح دیر سے گھما رہا ہے نمونے! پکڑ جوتی اس جھوٹی حرافہ کی اور نکال باہر کر۔“

میں خامے جارحانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھا تھا کہ فریال نے اپنے بیگ میں سے ریوالتور نکال لیا ”خبردار! جو کوئی میرے قریب آیا۔“ میں نے محسوس کیا کہ میری آواز ہی نہیں ناخنیں بھی کانپ رہی ہیں۔

فریال نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کے ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھی اور سگریٹ کے کش لے کر دھواں چھت فی طرف پھینکا ”کیوں ہیرا درک کیوں گئے تمہاری تو بڈن بھی گیلی ہو جی سے غالباً!“

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا ”فریال۔ سیدی ہو کے بیٹو! لندن میں تو بھی تم نے ایسا بے ہودہ لباس نہیں پہنا تھا۔“

فریال نے پوز بدل لیا یہ دوسرا پوز زیادہ قابل اعتراض تھا۔ ”اے بے ہودہ صرف انسان ہوتا ہے میرا لباس کچھ بھی ہو رہوں گی تو فریال!“

اماں نے زار و قطار دوتے ہوئے کہا ”رفیق! اس بے خرم کو میری نظروں سے دور لے جا۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔“

ابا کے چہرے پر سخت اذیت کے آثار تھے۔ ان کا ایک ہاتھ اپنے سینے پر تھا۔ ”رفیق بنا!“ انہوں نے گراہ کے کہا ”تھوڑا گھبراہٹیں یہ ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ آہ۔۔۔“

اماں نے انہیں سہارا دیا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ دادی نے سینے پر دو ہتھ مارے اور دوپٹا پھیلا کے آسمان کی طرف دیکھا ”یا میرے اللہ تو مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتا۔“

میں نے چیخ کے کہا ”فریال! یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر کسی کو کچھ ہوا تو۔۔۔“

”تو کیا۔۔۔ بولو!“ اس نے مجھے آنکھ ماری ”یار! کیا میں بھی نہیں یہ سب لوگ ڈراما کر رہے ہیں۔ لباس کے معاملے میں خواہ مخواہ اتنے جذباتی ہو رہے ہیں۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم دیکھ کر لیتا۔ اچھا اب مجھے بتاؤ کہ ہمارا کمرہ کدھر ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

میں نے دھماکے کہا ”انوکھی! کچھ نکل جاؤ یہاں سے اٹھ جاؤ۔“

فریال پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے سگریٹ کے باقی ٹکڑے کو ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دور اچھال دیا۔

”رومیو! لڑکی کون ہے؟“

دہاں اب راجہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے آگے گولا ہو کے کہا ”میں بتاتی ہوں تجھے کہ میں کون ہوں۔ میں رفیق کی عزیز زاد ہوں یعنی کرن۔ ہماری معنی بچپن میں ہی طے کر دی گئی تھی۔ اور اب میں اس کی پہلی اور خاندانی بیوی ہوں۔“

میں نے چلا کے کہا ”راجہ۔۔۔ اوائٹ ٹان سنس۔“ راجہ اسی طرح بولتی رہی ”مجھ سے تحریری اجازت لیے بغیر یہ دوسری شادی کیسے کر سکتا ہے۔ مسلم عائلی قوانین مجریہ 1961 کے تحت ہم دونوں اندر ہو جاؤ گے۔“

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ”یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے۔ کیا تم بھی پاگل ہو گئی ہو؟“

اسی وقت کال بیل بجی اور فریال نے بجی سے جس کے کہا ”لو۔۔۔ وہ بھی آگئی۔ نیم صاحب۔ گورے لارڈ کی اولاد۔“

میں نے کہا ”کون۔ عائشہ؟“

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ عائشہ سیدی اندر آگئی۔ میں پھر پتھر کا بت بن گیا۔ عائشہ نے مجھے دیکھتے ہی چیخ ماری ”رفیق! آئی ایم ہینئر۔۔۔ اور پھر مجھ سے لینے کے لیے بائیں پھیلا کے دوڑی لیکن اس نے زری گونے کے کام والا بہت بھاری شرارہ بہن رکھا تھا جو اتنا وسیع و عریض تھا کہ پھیلا یا جاتا تو شامیانہ بن جاتا۔ اس کے ساتھ باری دوپٹا بھی تھا اور سر سے پاؤں تک اس نے سیروں وزن کے بھاری تہنے لٹکا رکھے تھے چنانچہ کوئی قابل اعتراض بوس دکاندار کو منظر پیش کرنے سے پہلے ہی وہ الجھ کے فریال کے قدموں میں جا گری۔

فریال نے اسے بڑی حقارت سے دیکھا ”تو یہاں بھی پہنچ گئی رفیق! کے پیچھے دم بٹائی ولا جی کتیا!“

عائشہ نے ستائش سے اپنا لباس درست کیا ”میں ایک عائلی نسب خاندانی لڑکی نہ ہوتی تو ایسی ہی بازاری زبان میں تم کو دندان شکن جواب دیتی۔“

فریال نے جی سے کہا ”میں نے تو تجھے جہاز میں ہی دیکھ لیا تھا۔ اچھا ہوتا اگر دروازہ کھول کے تجھے سمندر میں پھینک دیتی۔ لاال جوڑا تو یوں بہن کے آئی ہے جیسے آج ہی رہیں سے تیرا بیاہ ہوگا۔“

عائشہ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”وہ تو ہوگا کیوں رفیق! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ مجھے کچھ دیر اس لیے ہو گئی کہ میں یہ برائڈل ڈریس لینے چلی گئی تھی اور داہن بٹنے کے

بعد میں نے سوچا کہ بیٹی بارہ سے میک اپ بھی کرائی لوں کیسی لگ رہی ہوں میں؟“

میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”خدا کے لیے تم سب خاموش ہو جاؤ۔ اگر تم نے اپنی گواہی بند نہ کی تو خود کوئی کرلوں گا۔ تم سب یہ ہو جاؤ گی شادی سے پہلے۔“

فریال نے بے پروائی سے کہا ”یار! ایک تہائی بیوی بننے سے تو واقعی بڑھ ہو جانا ہی اچھا۔ تم چاہو تو خود کسی لیے یہ ریو اور لے لو۔“

میں نے طنز سے کہا ”میں سمجھ گیا..... نفی ہے۔“

”شٹ آپ..... ایک گولی سے میں مندر سلطان مرزا کو جہنم رسید کر چکی ہوں۔ کہو تو دو گولیاں چلا کے دکھاؤں..... ان دونوں کو بھی وہیں دھج دوں؟“ فریال نے ریو اور کا رخ باری باری عائنہ اور راجہ کی طرف کیا۔

عائنہ نے زری سے کہا ”پلیز فریال! ایسی بات مت کرو۔ ٹیک اٹ ایزی..... ہم اس مسئلے کا حل نکال سکتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اقوام متحدہ بھی مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔“

عائنہ نے نفی میں سر ہلایا ”رہتی۔ تم کیوں پریشان ہو۔ اگر تم نے فریال سے پہلے شادی کر لی ہے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں دوسری بیوی بننے کے لیے تیار ہوں۔“

فریال نے قہقہہ لگایا ”اب تم دوسری بھی نہیں تیسری ہو دختر لارڈ۔ ہمارے اس چکر باز عاشق نے ایک تو پہلے ہی کر لی تھی۔“

عائنہ نے دلچسپی سے کہا ”اچھا! پہلی کون ہے؟“

راجہ دونوں ہاتھ کر پر رکھ کے آگے آئی ”دیکھ لے مجھے کوری۔ میں ہوں پہلی..... اور منسل خاندانی بیوی جس کی ایڈوائس سبک تھی برسوں سے۔“

عائنہ نے سر ہلایا ”ٹھیک ہے۔ رفتی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جارہا کہ سکتا ہے۔ فی الحال ہم تینوں کو پراسن بھائے باہی کے عہد کی سمجھوتے کی ضرورت ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔ حملہ عروسی میں صرف ایک دلہن کی منجائش رکھی جاتی ہے۔ تین دلہنوں کی پارکنگ نہیں ہو سکتی۔“

راجہ نے اتفاق کیا ”ایک نام میں تین تلواریں کیسے ساسکتی ہیں؟“

عائنہ نے کچھ دیر سوچ کے کہا ”میں سمجھ گئی۔ یہ مگر واقعی چھوٹا ہے لیکن اب تو ہمارے شوہر کے پاس کیشم نہیں جیسے خاندانی حویلی ہے۔ وہ شاہی حرم آباد کر سکتا ہے۔ مسئلہ ہے

رفتی کا جو صرف ایک ہی ہے۔ مگر اوزہ تو کرتا ہی پڑے گا ہمیں۔“

راجہ نے کہا ”مگر اوزہ کرتی ہے میری جوتی۔“

فریال نے ریو اور کو عائنہ کی پسیلوں پر رکھ کے دباؤ ”ولایتی چڑیل رفتی کوئی دولت مشترکہ نہیں ہے وہ صرف میرا ہے۔“

راجہ چلائی ”سب سے پہلا حق میرا ہے میں پہلی بیوی ہوں۔“

فریال نے ریو اور کا رخ راجہ کی طرف کر دیا ”رفتی کی بیوی صرف میں ہوں۔ پہلی بھی اور آخری بھی“ تم دونوں جاؤ بھاڑ میں۔“

اچانک اندر سے آدھ چچی دہائی دیتی آدھ ہوئیں ”ارے تجھ پر اللہ کی مار۔ تیری صورت پر پھلکار۔ بے جا بدکردار میرا دلادنا دھمکانا چاہتی ہے نا ہنجار۔ میری راجہ ہے اس کی حق دار۔“

فریال نے غرا کے کہا ”یہ کیا شاعرانہ کواس لگا رہی ہے بڑھیا۔ کیوں اپنی جان سے جانا چاہتی ہے۔“

چچی نے پلٹ کر ہانک لگائی ”اچی کیا کر رہے ہو دیر کر بات کی ہی۔ آخر کب ختم ہو گا تمہارا جلالی وظیفہ؟“

اندر سے موٹی چچا کی آتش فشاں کی طرح گڑگڑانے ”آ رہے ہیں شاہ جنتا بربیک فاسٹ کر رہے ہیں۔“

چچی نے ہاتھ لہرا کے کہا ”ان سے کہو ہمیں کڑا لیں اس چڑیل کو۔“

موٹی چچا اندر سے ایک لمبی ڈنڈی والا کڑ چھا اٹھائے نکلے جس میں انکار سے دھک رہے تھے۔ انہوں نے آگے کچھ بڑھ کے چمڑ کا تو ایک دم دھوئیں کا مرغولہ سا اٹھا۔

راجہ نے قہقہہ لگایا ”اب دیکھنا کیا ہوتا ہے فریال! ابا کے کالے جادو کی کاٹ نہیں۔“

فریال نے قہقہہ لگایا ”اس کی کاٹ یہ ہے“ اور ریو اور اٹھا کے موٹی چچا پر فائر کیا۔

میں بجلی کی طرح چمڑکا ”نہیں فریال! میں ایک دم موٹی چچا کے سامنے آ گیا۔ کوئی میرے سینے پر گئی میں نے ایک بچا ماری۔“

اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے بارش شروع ہوئی ہے۔ پھر میرے کانوں میں راجہ کے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔

”کیا خواب دیکھ رہے تھے ہیرو؟“ راجہ نے ہنسنے پتے کہا۔

میں نے اسے ہونٹوں کی طرح دیکھا ”راجہ! کیا میں ذمہ دار ہوں؟“

”نہیں فوت ہو چکے ہو“ اس نے باقی پانی مجھ پر پھینک دیا۔ ”گلتا ہے رات کو میرے جانے کے بعد چڑھا لی گئی۔ ولایت سے لائے ہو گئے نا۔ خراب ہوش میں آ جاؤ۔ سب ہاتھ پر تھما کر انتظار کر رہے ہیں۔“

جب وہ چلی گئی تو میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس میں لونج رہے تھے۔ راجہ فجر کی نماز کے بعد گئی تھی تو میں کچھ دیر کے لیے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ اس دقت چھ بجے تھے۔ میں نے ساری رات اپنی خاندانی جاکیر کی خونی داستان دہاتے گزاری تھی۔ میرے ذہن پر ان تمام باتوں کا اثر بھی تھا جو مجھے راجہ نے بتائی تھیں۔ میں نے فون پر عائنہ کے باپ سے بھی بات کی تھی اور مندر سلطان مرزا سے بھی۔ ان سب ٹھکرات نے دل کر ایک سے سرد پنا خواب کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدلنے ہوئے اس خواب کے مناظر یاد آئے تو مجھے بے ساختہ ہنسی آئی لیکن میں نے اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہیں کیا۔ حقیقت کی دنیا میں مجھے بیک وقت بہت سے سنگین مسائل کا سامنا تھا اور ان کے مقابلے میں خواب غیر اہم ہو گئے تھے۔ میں کینیڈن کا شکار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس مسئلے کو لہذا اہمیت ترجیح دوں اور ان کے حل کے لیے کون سی سہت میں قدم اٹھاؤں۔

فوری تشریش کا سبب فریال کی خیر دعائیت تھی۔ مندر سلطان کا مجھے فون کرنا وہ تھا۔ مقاصد کی عکاسی کرتا تھا۔ یا تو کچھ فریال لا پتا میں اور وہ اس کے لیے اتنا شکر تھا کہ لندن میں تلاش کے سارے امکانات ختم ہو گئے تو انتہائی مجبوری میں آخری کوشش کے طور پر اس نے مجھ سے رابطہ کی ذلت کو بھی قبول کر لیا یا پھر خطرہ وہی تھا جس کی طرف سب سے پہلے میرا خیال گیا تھا۔ فریال کی کسی حرکت پر اشتعال کی انتہائی کیفیت میں اس نے فریال کو کول کر دیا اور اس کی لاش کو غائب کرنے کے بعد اب اپنی بے گناہی کی تشہیر کے لیے مارے زمانے سے پوچھتا پھر رہا ہے کہ فریال کہاں ہے؟

وہ پاکستان کے کسی شہر یا قصبے کا معاملہ نہیں تھا جہاں دھن دھاندلی یا دھونس سے وہ اپنے جرم کی پردہ پوشی میں کامیاب ہو جاتا۔ یہاں قانون اور انصاف کے رکھوالے خود اس کی مدد کرتے اور انہما دقتیشی کارروائی کے بعد کیس یوم حشر تک کے لیے لاکھوں انصاف طلب مقامات کے قبرستان میں دفن ہو جاتا۔ بھول شاعر.....

نہ باس پر کوئی دھبہ نہ خاک پر کوئی داغ نہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لبو کا سراغ نہ مدی نہ شہادت“ حساب پاک ہوا یہ خون خاک نغیناں تھا رزق خاک ہوا لندن میں ایسا نہیں تھا۔ وہاں جرم کی نوبت قانونی ہوا محض اخلاقی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والے سارے ادارے میڈیا پبلک اور انصاف و قانون کی عمل داری قائم کرنے کے ذمے دار سب ایک ساتھ حرکت میں آ جاتے ہیں اور جتنا مشکل جرم کا ارتکاب ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل اسے چھپانا ثابت ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ کوئی کیس بھی ختم نہیں ہوتا۔ حل نہ ہونے والے کیس کی فائل بند کر کے لڈا اسٹوریج میں چھپنے کا کوئی تصور نہیں۔ برسوں بعد بھی مجرم کو یہ اعتماد اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا کہ اب ڈر کی کوئی بات نہیں رہی۔ غیر حل شدہ جرائم کا ریکارڈ تازہ ترین صورت حال کے ساتھ ہر وقت دستیاب رہتا ہے اور جیسے ہی کوئی شہادت سامنے آئے تحقیقات کا دفتر پوری مستعدی کے ساتھ بھر پور جاتا ہے۔

مجھے دیکھ کر مندر سلطان کو فریال کے لپٹا ہونے کی نگر تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ سب سے پہلے شبک اسی میں دھول جھونکنا ناممکن ہوگا۔ اگر اس نے فریال کو کول کیا ہوگا تو اب وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے حالات و واقعات کی شہادت پیدا کرے گا۔ سراغ نہائے گا اور اپنے قانونی دفاع کے حصار کو مضبوط کرے گا۔

میں بے جانے کے لیے مضطرب تھا کہ حقیقی صورت حال کیا ہے۔ اگر فریال زندہ ہے تو میرے لندن سے آنے کے اثرات لیس گھنٹے کے اندر ایسی کیا بات ہوئی کہ وہ روپوشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ محوم پھر کے میرے شکوک مندر سلطان پر فوس ہو جاتے تھے۔ صرف وہی تھا جس سے فریال کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ لیکن نہ میرے پاس مندر سلطان کا فون نمبر اور پتا تھا کہ میں اس سے کچھ پوچھ سکتا یا بالواسطہ طور پر لندن میں اس کی نقل و حرکت کے بارے میں کسی سے معلومات لے سکتا۔ نہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ فریال کہاں ہوگی؟ عائنہ کے لیے تو میں نے سوچی کہ معلومات کا ذریعہ بنایا تھا۔ عائنہ کی ماں نے کچھ نہیں بتایا تھا مگر باپ نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ لندن میں میرے دوست ہمدرد اور شانا بہت تھے جن میں فریال کا معاملہ مختلف تھا۔ میں اس کے ساتھ اپنے تعلق کو کسی طرح بھی اسکیٹل کی بنیاد نہیں بنا سکتا تھا۔

ایک نیک مجھے اس مہربان لیدی ڈاکٹر کا خیال آیا جو فریال کی رازدار اور مددگار تھی۔ فریال علات کے بہانے چپکے لیے اس کے پاس جاتی تھی۔ اپنی گاڑی باہر کے پارکنگ ایریا میں چھوڑتی تھی اور اندر سے ڈاکٹر کی کار میں بیٹھ کے مجھ سے ملنے آ جاتی تھی۔ اس کا چھپا کرنے والے چائوس اور پھر سے دار بے دونوں کی طرح فریال کی کار پر نظر رکھنے مطمئن بیٹھے رہتے تھے کہ مالک اندر ہی ہے۔ وہاں وہ صبح سے شام تک رہتے تو اس کی مرضی۔ مقرر سلطان بھی جانتا تھا کہ لندن میں فریال کی ایک ہی دوست ہے اور فریال بھی ضرورت کے تحت جاتی ہے اور دو چار گھنٹے ٹرپ شپ میں گزار لیتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ رات کو وہ ہمیشہ اپنے فلیٹ میں ہوتی تھی اور باہر جہاں جاتی تھی وہ بازار ہو، کلب یا ہوٹل اس کا شو فر لے جاتا تھا جو مقرر سلطان کا نمک خوار غلام تھا اور فریال کے روز و شب کی تمام مصروفیات کی مکمل رپورٹ اپنے آقا کو ارسال کرتا رہتا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ لندن میں ابھی صبح کے باج بجے تھے۔ فریال کی دوست لیدی ڈاکٹر شائستہ بڑی خوش اخلاق تھی۔ میں اس سے کئی بار مل چکا تھا۔ وہ خاموش طبع اور بہت لیے دیے رہنے والی عورت تھی۔ میں نے اسے کبھی تہہ نہ لگا کے بیٹھے ہوئے یا دوپٹے آواز میں بے تکلفی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کام کی بات کے سوا کوئی بات کرنا اسے اچھا نہیں لگتا۔ بعض اوقات تو مجھے کوفت ہونے لگتی تھی۔ میں نے فریال سے کہا تھا کہ آخر تمہاری یہ سبکی اتنی آدم ہزار کیوں ہے؟

فریال نے کہا تھا ”تمہیں دیکھ کے اسے کچھ ہو جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چڑ کے کہا ”میری صورت ایسی ہے؟“

فریال نے متانت سے سر ہلا دیا ”غالباً..... بلکہ یقیناً۔“

”لا حول و لا قوۃ..... اپنی صورت دیکھی ہے اس نے۔“

ذاتی مقصد کے لیے اہمیت دینے پر مجبور سے مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ایک بار میں نے چپ کر ان کی باتیں سنیں تو شرم سے میرے کان لال ہو گئے۔ وہ میں انگریز کی طرح بڑی بے شرعی کی باتیں کر رہی تھیں۔ خوب شور مچا رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ اس روز میں نے اپنے میں اپنی صورت کا بخیر جائزہ لیا کہ آخر مجھے دیکھ کے اسے کیا ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ خرابی اس کے دماغ میں ہے۔

اس کا شو ہر بھی ڈاکٹر تھا اور کوئی بیس سال پہلے لندن آ کے آباد ہوا تھا۔ دس سال قبل وہ پاکستان کے پٹنوا دان خان گیا اور وہاں سے اپنی بچپن کی اس محبت کو عقد کی زنجیر میں باندھ کے لے آیا جو اپنے محبوب کی فرمائش پر ڈاکٹر بن گئی۔ فور دونوں کی نظر میں اور عقل میں تھا جو کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ عشق ایسا ہوتا پھر یہی ہوتا ہے۔ مجھے سخت تعجب ہوتا تھا کہ شوہر کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود وہ ڈاکٹر بدستور عاشق صادق کا رد بھی بڑی دل جنتی سے کر رہا تھا۔ یہ ایک تنگ بھی نہیں تھی۔ لندن جیسے شہر میں اور ایک اسپتال میں اسے دل لگی کے مواقع ہر وقت دستیاب تھے۔ خصوصاً یوں کہ وہ چند سہم کی تھی۔ مگر اس نے تو مجھے غلطی سے بھی کسی پر غلط نگاہ ڈالنے کے گناہ کبیرہ سے بچنے کی قسم کھا رہی تھی۔ میں نے فریال کے سامنے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ سالہ ڈرامے باز ہے۔ بیوی کو اٹھاتا ہے۔ مگر فریال نے جواب میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بڑے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا کہ کوئی اٹو کا پٹا یہ ثابت بھی تو کرے۔ اس کے بعد مجھ پر لازم ہو گیا کہ میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی طرح کام کروں جو بیویوں کو طلاق حاصل کرنے کے لیے شوہر کی بے وفائی کے سارے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ میں نے یہ کام بلا معاوضہ کیا۔ جھک ماری اور اپنی عقل پر ماتم کرتا رہا۔ وہ واقعی کاٹھ کا ٹوٹا تھا۔

☆☆☆

اگر ابھی میں فون کرتا تو وہ ہلکی جھون ہرگز برائے نہ مانتے مگر خود میں نے لذت خواہ محرم میں دخل اندازی سے گریز کیا۔ راجا میرا بے تکلف دوست ہی نہیں ایک مضبوط سہارا بھی تھا۔ اپنے لا محدود دوسال اور کسی حد تک شیطانی ذہانت کے باعث اس کی مدد سے میرے مشکل کام بھی آسان ہو جاتے تھے۔ اپنے موجودہ حالات میں مجھے ہر لمحہ اس کی مشاورت درکار تھی۔

فون کرنے کے بجائے میں نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ نہ وہ اس وقت آفس میں ہو سکتا تھا اور نہ پریس

میں۔ عام طور پر وہ رات کے دو بجے اخبار کی آخری کالمسے پریس میں جانے کے بعد فارغ ہو جاتا تھا تو گھر جاتا تھا اور پھر دوپہر تک سوتا رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے اٹنے کا وقت ہو گیا ہے لیکن وہ غائب تھا۔ ڈور لا کر کو دیکھ کے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ دروازہ اندر بند ہے یا منتقل ہے اور بار بار دھکیلی جانے کے باوجود بالوقت اس کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ پہلے وہ سوتے وقت کالوں میں روٹی ٹھونس لیتا تھا۔ ہم وہ ایر پلگ لے آیا جس سے کان بالکل بند ہوتے ہیں۔ اس کے درمیان باتیں رہنے والے دو ہونے کے درمیان ایک ختم نہ ہونے والی نظریاتی جنگ رہی تھی جو مدت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر رہی تھی۔ برف کی سردی کے ہتھم مولانا کا انتہا پسند مذہبی گھرانہ دھماکا جھر کے بعد اپنے ڈیک پر پہلے تلاوت کے اور پھر لائے کیسٹ..... اذان کی طرح سارے محلے کو سنانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دوسری طرف ایک ایسا گھرانہ تھا جہاں بے مغرب کی بیوی گویا ان کے ماڈرن اور مہذب نے کیوں کی تھی۔ در جواب آں غزل۔ انہوں نے مولانا ب کا مقابلہ باپ بیوزک سے شروع کیا۔ دونوں کے باپوں مل تھے اور کوئی دایوم کم کرنا تو یہ اپنی شکست تسلیم نے اور مقابلہ کو کھلی چھوٹ دینے کے مترادف ہوتا۔

دور کے گھر ذرا کم متاثر ہوتے تھے اور دوا بھی انداز میں لیاں سے مسابکی کے نام پر ان کی اپیلی کر چکے تھے لیکن لائونڈ ہوا تو سب نے کہا کہ اب کون ان کے منہ گئے گئے اور سننے پر کوئی راضی نہیں۔ مارا گیا راجا..... وہ بھی ہر کہ گھر و اسلام کو رد کرنے میں ناکام رہا۔ ایک طریقہ یہ لڑو پو پوس سے رجوع کرنا مگر اسے معلوم تھا کہ یہاں کا نا اس معاملے میں کتنا بے بس ہے۔ یہاں ”پبلک ٹی“ کا کوئی تصور بھی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ اس نے بھی پبلک لڑنا صابر و شاکر رہنا بہتر سمجھا اور کان بند کر کے سونے ایسا سے مظلوم ہی نہیں تھا کہ نعت خوانی اور باپ بیوزک پر لڑاں چل رہے ہیں یا بند ہو گئے ہیں؟ یہ پبلک کوئی وہ کا تھا کہ ایک دن دونوں گھروں کے سربراہ جیل جاتیں۔ ان کے درمیان مار پیٹ تو ہو چکی تھی۔ اب ایک کے ہاتھ ہونے یا دوسرے کے جنت الفردوس میں جک پانے کا طریقہ تھا۔ ایک قتل ہوگا اور دوسرا پھانسی چڑھے گا تو لاکھوں سے ایر پلگ نکال دوں گا“ اس نے مجھے یقین دلایا۔

اچھی بات یہ تھی کہ راجا نے دروازے پر ”ان یا آؤٹ“ ہونے کی اطلاع کا نظام اپنا رکھا تھا۔ جب وہ باہر جاتا تھا تو ایک سلائیڈنگ بند دے ”آؤٹ“ کو نمایاں کر دیتا تھا اور اندر قدم رکھتے ہی ”ان“ کو سامنے لانا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے نام کی تختی کے نیچے ”آؤٹ“ دیکھ کر مجھے کچھ باپوسی اور جھرمجھرائی ہوتی۔ یاد وہ رات کو لوٹ کے آیا ہی نہیں تھا یا پھر مجھ کو سویرے نہیں نکلیں گے تھا۔ میں نے شہناز کے گھر فون کیا۔

اس نے خاصی افسردگی سے کہا ”ہاں رفتی بھائی! وہ یہاں ہے سو رہا ہے۔“

میں نے کہا ”خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت کہاں رفتی بھائی! کل رات اس پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ ایک خربشاخ ہوئی تھی کسی کیشری میں بڑبڑل اور تالہ بندی کے اصل اسباب کے بارے میں۔ اب پتا نہیں مالکوں نے غصہ سے جیسے تھے یا خود یونین والے تھے۔ دونوں ایک ہی ہیں خبر دی گئی کہ راجا نے۔“

میں نے کہا ”اچھا“ میں آتا ہوں۔“

شہناز کے گھر پہنچنے کے میں نے راجا کو دیکھا تو مجھے کچھ قسلی ہوئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں ٹالین پر سو رہا تھا۔ یہ خلاف معمول تھا کیونکہ شہناز کے گھر میں تین بندرہم تھے۔ ان میں سے ایک ابتدا سے راجا کے لیے وقت تھا۔ ان کے تعلقات کی یہ نوعیت بڑی عجیب تھی اور میرے سوا ساری دنیا اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔ بے طے تھا کہ ان کی شادی ہوگی۔ شہناز تو خیر بڑی نیک سخی اور خوش و خضر سے راجا کو چاہتا تھا مگر باہر کوئی نہ کوئی جکر چلائے رکھے والا راجا بھی بچ بچ کسی کے عشق میں جھلا تھا تو وہ شہناز تھی۔ وہ راجا کا اسی طرح خیال رکھتی تھی جیسے کوئی بھی خدمت گزار اور وفا شعار بیوی رکھ سکتی ہے اور خود راجا ایک روائتی شوہر کی طرح شہناز سے ڈرتا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا شہناز کے گھر میں آکے سو جاتا تھا مگر اس نے اپنا الگ گھر بھی لے رکھا تھا اور یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ ان کے درمیان جہاں بیوی جیسے جہانی مراسم بھی نہیں رہے۔ اس کی وجہ شہناز کی سخت گیری تھی تو راجا کی وہ ”شرافت“ بھی جس کا وہ صرف شہناز کے معاملے میں قائل تھا۔

شہناز نے راجا کی ایک جھلک دکھا کے مجھے مطمئن کر دیا تو میں نے کہا ”یہ کب آیا یہاں؟“

”صبح چار بجے۔“

میں لاؤنج کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اور ڈرائنگ روم

میں کیوں سو رہا ہے؟“
 ”کبہر ہاتھ ڈاکٹر نے فوم پر سونے سے منع کیا ہے۔ کمر
 میں بھی چوٹ آئی ہے۔ ریزہ کی ہڈی پر“ وہ رونے کے
 قریب ہوئی۔
 میں نے کہا ”شہناز! تم کیسی ڈاکٹر ہو تم نے دیکھا کوئی
 انکسے..... یا ام آئی رپورٹ؟“
 ”اس نے خود بتایا ہے۔“
 میں نے کہا ”شہناز! اچھی طرح جانتی ہو تم کہ کرائم
 رپورٹنگ کرتے کرتے وہ انسوری رائٹر بن گیا ہے۔ دنیا بھر
 کی جموٹی جی کیا نہیں لگوتی رہتا ہے۔ مجھے تو وہ ٹھیک لگ رہا
 تھا۔ میں جگتا ہوں اسے۔“
 شہناز نے تذبذب کا مظاہرہ کیا ”آرام کرنے دیں
 اسے۔“
 میں اٹھ کھڑا ہوا ”سات۔ آٹھ گھنٹے ہو گئے آرام
 کرتے۔ تکلیف میں ہوتا تو ایسی گہری نیند آتی..... خراٹے
 یہاں تک سنائی دے رہے ہیں۔ بس وہ تمہیں پریشان کرتا
 ہے اور تم کو بھی پریشانی اچھی لگتی ہے۔“
 میں نے سوتے ہوئے راجا کے لات رسید کی ”اٹھ
 مردے“ سکر کیکر گئے۔“
 وہ ہڑبڑاکے اٹھا اور شہناز کو دیکھ کے کچھ گھبراہٹ۔ اس
 نے کراہ کے کہا ”آہ..... یار..... مرے ہوئے کو کیوں مارتا
 ہے؟“
 میں نے کہا ”تیری تو کمر کے سارے مہرے چور چور
 ہو گئے تھے؟“
 اس نے فحش سے کہا ”میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔
 چوٹیں بہت آتی ہیں۔“
 میں نے سر ہلایا ”اس میں کیا شک ہے؟ شہناز نے بتایا
 کہ تجھے غنڈوں نے گھیر لیا تھا؟“
 ”اے ہاں یار! میں اکیلا اور وہ چار“ اس نے دردناک
 آواز میں کہا اور پھر شہناز سے مخاطب ہوا ”تم کیسا سن رہی
 ہو۔ سب کچھ بتا دو یا تھا۔ جاؤ کچھ چائے کا کرو۔“
 میں نے کہا ”تجھے لے جاتے ہیں کسی اسپتال کے آئی
 سی یو میں۔ تیری حالت سخت تشویشناک ہے۔“
 راجا نے شہناز کو جاتا دیکھا اور دانت پیس کے کہا ”کیا
 چاہتا ہے آخر تو؟“
 میں نے اس کو ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا اور
 تھوڑا سا سمٹا کے آہستہ سے نیچے پھینک دیا ”بچ گیا ہے
 مہاراجا؟“

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا ”اب جانے بھی دے کر
 چڑا“
 میں نے کہا ”تو شہناز کو پریشان کیوں کرتا ہے؟“
 ”اسے اچھا لگتا ہے یہ سب“ میرا جھوٹ بولنا چاہتا
 کرتا۔ جیسے مجھے اچھا لگتا ہے اس کا بگڑنا“ ڈانٹ ڈپٹ کر
 شہناز بے وقوف نہیں ہے اور نہ میں پاگل ہوں۔“
 ہماری محبت ایسی ہی ہے۔“
 میں نے کہا ”آخر ہوا کیا تھا؟“
 وہ بولا ”بچو نہیں یار! ہمارے ایک سابق گورنر صاحب
 عمرہ کرنے گئے تھے۔ اصل میں تو ایک دو روزی کے امریکی
 عہدے دار کی ریفرنس تھی۔ وہاں ان کا کوئی بزنس کنٹریکٹ
 بھی فائل ہو گیا۔ اسی خوشی میں انہوں نے واپسی پر پارٹی
 دی۔ میرے جیسے دو چار خیراتی ٹیوشی بلا لیے۔ اچھا فائل
 وہاں کچھ لوگوں نے دھوکے سے چلا دی۔“
 میں نے کہا ”میرے سامنے کون اس کرنے کی ضرورت
 نہیں۔ بڑا معصوم ہے تا تو..... شراب کے ڈالنے کا کیا پتہ
 انہوں نے کہا ہوگا یہ لبتانی گر پ اور اسٹریمری جوں کی
 کاک ٹیل ہے۔ کیا حرکت کی تھی تو نے نفے میں؟“
 اس نے سوچ کے جواب دیا ”یار! حرکت تو ایسی کوئی
 نہیں کی تھی پہلے تو خرابی یہ ہوئی کہ واپسی پر میری گاڑی
 اشارت نہیں ہوئی۔ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ میزبان
 نے کہا کہ وہ خود صبح اپنے ڈرائیور کے ساتھ بیچ دیں گے۔
 ایک خاتون کے ساتھ مجھے بٹھا دیا کہ یہ آپ کو ڈراپ کر دیں
 گی۔ وہ ایک فیشن ڈیزائنر ہیں پہلے ماڈل تھی۔ اس نے گی
 پہلے سکر تھی۔ اس سے بھی پہلے کچھ نہیں تھی۔ بھاگ بھری نام
 تھا۔ اب لی لی کہلاتی ہے۔ وہ مجھے اخبار کے دفتر کی طرف
 لے جانے لگی تو میں نے کہا کہ لی لی آج ڈے آف ہے۔
 مجھے گھر جانا ہے۔ کہنے لگی کہ ٹھیک ہے گھر چلو۔ وہیں تو رات
 ہوئی میں تمہارے اخبار کے آفس کے پیچھے۔“
 میں نے اسے حیرت انگیز نظروں سے دیکھا ”اور تو نے
 کہا ہوگا کہ آپ نے تو میرے دل کی بات کی۔ اللہ
 جزائے خیر دے۔“
 ”اے نہیں یار! اب اتنا بد وقت بھی نہیں ہوں میں اتنا
 نے کہا کہ مجھے اپنے گھر جانا ہے جہاں میری سب یونیورسٹی
 بیوی میرے لیے چشم براہ ہے۔ وہ بہت ہنس کر تم کو لٹے ہیں
 بھی یاد نہیں کہ تمہاری تو شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کہا
 کہ نفے میں میری اتنی عقل خراب نہیں ہوئی ہے کہ مجھے ڈپٹی
 بھی پری نظر آئے۔ بس اس کے بعد گاڑی روک کے ان

نے مجھے اتار دیا۔ میں پیدل چل پڑا۔ اس وقت آدمی رات
 نہ جانے کہاں سے دو موٹر سائیکلوں والے نمودار ہو گئے۔
 کوئی پچیس پر موٹر سائیکل اٹھا کے چلانے کا مقابلہ کر رہے
 تھے۔ میں ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا
 بھاشا ہے؟ فٹ ہاتھ پر موٹر سائیکل چلاتے ہو۔ وہ سالے
 بے سلسلے شہزادے، گجڑے ہوئے رئیس زادے انہوں نے
 مجھ پر چڑھائی کر دی کہ یہ تیرے باپ کی فٹ ہاتھ ہے۔ خود تو
 ترک کے چھ میں چل رہا تھا..... خیر غیبت ہے ہڈی پھلی
 ب سلامت ہیں۔ تو بتا تیری شکل پر محسوس کیوں برس رہی
 ہے؟“
 میں نے کہا ”چائے پینے سے پہلے بندھو لے۔ پھر
 کپڑے بدل کے چل میرے ساتھ۔ میں بہت پریشانی میں
 جلا ہوں۔“
 وہ اٹھ کھڑا ہوا ”اللہ نے مقدر میں جو چیز رکھی ہے فیکے
 چڑھ لے گی۔ بقول شاعر..... ہر چند کہ دنیا میں تو دوڑا ہی
 بھرے گا قسمت میں جو۔“
 شہناز کے چائے سمیت وارد ہونے سے بھی شعر نامکمل
 رہ گیا۔ جو پیسے بھی سنس ہو جاتا۔ اب دوپہر کے بارہ بجتے
 والے تھے۔ لندن میں ڈاکٹر شائستہ کو فون کرنے کے لیے یہ
 وقت انتہائی مناسب تھا لیکن میں نے پہلے براہ راست فریال
 کے ایمرٹن کا نمبر ملانا بہتر سمجھا۔ دوسری طرف ٹھنسی جی تو
 میں نے ریسپورڈ شہناز کو تھما دیا۔
 ”ڈرائیو چھو کہ فریال کہاں ہے؟“
 وہ کچھ حیران ہوئی ”آپ خود کیوں نہیں پوچھتے؟“
 ”بتاؤں گا بعد میں“ میں نے کہا۔
 ریسپورڈ دوسری طرف سے اٹھایا کیا تو شہناز نے کہا
 ”ہیلو..... جی کون بول رہا ہے..... میں ڈاکٹر شہناز
 ہوں..... مجھے فریال سے بات کرنی تھی۔“
 میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اور زیر لب کہا
 ”پوچھنا وہ کہاں ہے؟“
 شہناز نے سر ہلایا ”میں اس کی فریڈ ہوں..... وہ نہیں
 ہے؟ اچھا جی کہاں گئی ہے..... تاکہ کہیں مگنی کب آئے
 گی؟“ نہیں پتا چلیں جی! آپ بتا دیں کہ لاہور سے ڈاکٹر
 شہناز نے فون کیا تھا۔ صبح ملا تو میں پھر بات کر دی کہ
 راجا ناشتا کرتے ہوئے مجھے گھور رہا تھا ”یہ کیا پکڑ
 ہے؟“
 میں نے کہا ”فریال غائب ہے۔“
 ”اس کا میں کیا مطلب نکالوں؟ کیا وہ اغوا ہو گئی

ہے یا برخاستہ اور غبت..... تجھ سے جان چھڑا کے فرار ہو گئی ہے
 یا ایسے غائب ہو گئی ہے جیسے جادو کی چمڑی سے کوئی چیز
 غائب ہوئی ہے۔“
 میں نے کہا ”آج صبح صبح صبح صبح سلطان نے فون کیا تھا
 مجھے۔“
 پہلے اس نے سر ہلا کے ”اچھا“ کہہ دیا اور پھر اچھا
 ”کون..... تیرا ہونے والا قاتل..... رقیب رویا ہے؟“
 میں نے کہا ”کیا اس نام کے دوسرے آدمی سے
 واقف ہے تو؟ اس نے بڑی فرعونیت کے ساتھ مجھ سے پوچھا
 تھا کہ فریال کہاں ہے؟“
 ”پھر..... تو نے کیا گالی دی اسے؟ شہناز! تم کان بند
 کر لو اپنے“ راجا نے حکم دیا ”اور نہ ہی مجھے بھولو۔“
 ”میں نے اسے ایک دندان شکن جواب دیا لیکن اس
 کے بعد سے میں سخت تنہائی میں جلا ہوں۔ وہ خود تو پاکستان
 سے بھاگا ہے اپنی بیوی کو قتل کر کے۔ معلوم نہیں وہاں کیا ہوا
 کہ فریال روپوش ہونے پر مجبور ہوئی۔ مجھے تو ڈر یہ بھی ہے
 کہ کہیں اس نے فریال کو.....“
 راجا نے میری بات کاٹ دی ”اے ایسا میں مارا
 نہیں ہے۔ اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ یہاں رہے کہ اپنی دولت
 اور طاقت سے قانون کا مقابلہ کرتا۔ گرفتار ہوتا تو ضمانت
 کرالیتا“ وہاں فریال کو قتل کر دے..... نامکمل۔“
 ”نامکمل کچھ نہیں ہوتا راجا۔ اشتعال کی حالت میں
 دماغ کام نہیں کرتا“ میں نے کہا ”آخ فریال کہاں ہے؟“
 ”پتا چل جائے گا کیجیے پتر! گھبراہٹ۔“
 میں نے فون اٹھایا ”اس کی رازدار ہے ڈاکٹر شائستہ۔
 فریال کی کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں۔“
 ”اور بھی بہت لوگ ہیں یار! اخبار والوں کا پورا نیٹ
 ورک ہے۔ لندن میں جیوتی بھی کم ہو جائے تو پتا چلا جاسکتا
 ہے۔“ راجا نے کہا۔
 دوسری طرف سے خود شائستہ نے فون اٹھایا
 ”ہیلو.....!“
 میں نے کہا ”ڈاکٹر شائستہ! میں پاکستان سے رفق
 بات کر رہا ہوں۔“
 ”جی..... اس نے مختصر کہا۔“
 ”کیا آپ کو فریال کے بارے میں کچھ معلوم ہے کہ وہ
 کہاں ہے؟“
 ”جی نہیں۔“
 میں نے اسے بھی پوری بات بتائی اور اپنے خدشات کا

اعتماد کیا۔ آپ کے خیال میں وہ کہاں ہو سکتی ہے؟“
”اس نے فون کیا تھا کہیں۔ میری بات نہیں ہوئی۔ میرے بیٹے سے اس نے کہا تھا کہ می کو بتادیتا میں خیریت سے ہوں اور پھر فون کر دوں گی۔ یہ کل صبح کی بات ہے۔ پھر فون نہیں آیا۔“

میرے ذہن سے نظرات کا پارگراں اتر گیا۔ ”اگر وہ پھر فون کرے تو اسے کہیں کہ مجھ سے ضرورت بات کرے۔“
”جی بہت اچھا“ شائستہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں راجا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے تو بہتر ہوتا۔ میں نے غلطی کی کہ اس کے ساتھ پریس کلب چلا گیا۔ بلاشبہ اس وقت وہاں کم لوگ تھے لیکن میں نے تفصیل سے راجا کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس میں خاصا وقت لگا اور دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ راجا بظاہر بڑی دلچسپی اور توجہ سے میری بات سن رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہ سیریس نہیں ہے۔ ہم الگ جگہ بیٹھے تھے اور ہماری ٹیبل پر آ کے کسی نے ہمیں ڈسٹرپ نہیں کیا مگر ہال میں آنے جانے والے سب راجا کے ہم پیشہ اور بے تکلف لوگ تھے۔ وہ دور سے ہاتھ ملا کے دس کرتے تھے۔ ان کے درمیان ہیلو بائے کا اور خیر و عافیت کے رسمی جملوں کا تبادلہ ہوتا تھا تو راجا کی توجہ دینی طور پر بٹ جاتی تھی۔ ایک بار وہ ”سوری یار! میں آیا ایک منٹ میں“ کہہ کر گیا تو پانچ منٹ میں واپس آ گیا۔ دوسری بار پھر اس نے یہی حرکت کی ”یار! بڑا ضروری کام ہے اس بندے سے۔ میں آیا ایک منٹ میں“ اس نے درمیان میں کہا اور اٹھ کے غائب ہو گیا۔

دس منٹ بعد اس نے سامنے بیٹھ کے معذرت کی ”معاف کرنا یار! کیا کہہ رہا تھا تو؟“

میں نے برہمی سے کہا ”کچھ نہیں کہہ رہا تھا میں“ بکو اس کر رہا تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ تو سن ہی نہیں رہا تھا۔“

وہ ہنسنے لگا ”ایسی بات نہیں ہے فیکے پتر۔ تیری دردناک عبرت ناک اور شرم ناک آپ جی جی کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا میں نے۔“

میں نے جمل کے کہا ”اس لیے ہنسی آ رہی ہے تجھے۔“

”یار! مجھے بتا روئے کی اس میں کون سی بات ہے۔ تو کچھ ضرورت سے زیادہ مینشن لے رہا ہے۔“

میں نے احتجاج کیا ”ایسا ہرگز نہیں ہے۔“

”ایسا ہی ہے رفیق صاحب! میں بتاتا ہوں تجھے۔ چل تیرے مسائل کو لیتے ہیں ون بائی ون۔ پراہلم نمبر ون فریال

کی تھی رات۔ کیا کیا فرض کر رہا تھا تو۔۔۔۔۔ خیر، قصور تھا نہیں۔ تیرے عشق خانہ خراب کا ہے۔ تیری یہ فکر تو دور ہوئی تاکہ صند سلطان نے اسے ٹوٹے ٹوٹے کر کے دریاے ٹبر میں بہا دیا ہوگا۔ اب وہ کہاں ہے؟ یہ بھی بہت جلد پتا چل جائے گا۔ اور میں اپنی ددر میں نگاہوں سے اس کو بھی یہاں دیکھ رہا ہوں۔ تو چاہے تو شرط لگا لے پچاس پچاس ہزار کی اس نے جب سے ٹوٹوں کی ایک گڈی نکال کے میز پر پھینکی۔ میں نے کہا ”مہاراجا! یہ رقم کہاں سے آئی تیرے پاس؟“

اس نے فوراً نوٹ واپس اٹھا لیے ”یار! پتا نہیں کیوں میں اتنا تاجہ بانی ہو جاتا ہوں۔“

میں نے کہا ”میں سمجھ گیا۔ یہ اسی اسمگر نے دیے ہوں گے جس کے جج کا جعلی سفرنامہ تو نے لکھا تھا“ چیک شہناز نے بھاڑ دیا تھا۔“

”بڑا اتیر مارا تھا اس نے چیک بھاڑ کے۔ باگل کی بجی! کل میں نے گیش لے لیا۔ میں نے کوئی رشوت تو نہیں لی ہے۔ تو خود انصاف سے کام لے۔ جج کرنے والے کے لیے تو سفرنامہ لکھا بہت آسان ہے۔ جو دیکھا تھا لکھ دیا۔ میری دگنی محنت ہوئی تھی میں نے ریسرچ کر کے لکھا۔“

میں نے کہا ”میرے سامنے فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو آج کل جس قسم کی محنت کر رہا ہے وہ مجھے معلوم ہے۔“

”اوکے۔ پراہلم نمبر دو تو کسے سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ اس دمکی کو جو شہاب الدین اینڈ گامے شاہ کے سلسلے میں چیف صاحب کی طرف سے دی گئی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے کوئی نوٹس نہیں دیا ہے کہ یہ کام ایک ہفتے میں ہو جانا چاہیے۔ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ فی الحال لعنت بھیج ان پر۔ اگر کوئی فون کرے یہ پیغام ملے کہ جلدی کر دو تو صاف کہہ دینا کہ میں کوشش کر رہا ہوں۔ گارنٹی کوئی نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔ اور تم جلدی کر اسکتے ہو تو کرالو کسی اور سے۔“

”تو جانتا ہے ان کے طریقے۔۔۔۔۔؟“

”اے بے وہ کچھ نہیں کریں گے۔ کر سکتے تو کرنے لیتے۔ وہ

محتاج ہیں تیرے۔ انہیں تیرا وسیلہ بہت باورفل لگتا ہے۔ وہ اس چانس کو ضائع نہیں کریں گے۔ وہ تجھے پورا موقع دیں

گے اور اس مہلت میں کچھ نہ ضرور ہو جائے گا۔ کوئی رات نہ

ضرور نکل آئے گا۔ عائنہ خود یہاں آ رہی ہے۔“

”میں اس سے کوئی بات نہیں کر دوں گا۔“

”نہ کرتا“ میں کرلوں گا۔“

میں نے بگڑ کے کہا ”نہ تو اور نہ کوئی اور۔ میں تجھے بتا رہا ہوں تیری میری دوستی ختم ہو جائے گی۔“

”غصہ حرام ہے دیکھتے پتہ! غصہ بندے کی عقل کو اپنے
کھا جاتا ہے۔ جیسے گھراں اس ملک کو کھا گئے۔ سوائے
سرسر تھیر کے گھر میں خاک نہیں۔ عائشہ کا باپ جتنا دولت
مند اور بااثر ہے اتنا ہی سیانا بھی ہے۔ خزیہ کوئی کہنے کی بات
نہیں۔ بے وفو ہوتا تو دولت مند کیسے ہوتا۔ سیانے تو
میرے جیسے بھی ہیں جو جوتاں بچھاتے اور کھاتے پھرتے
جس صدا افسوس۔ اچھی بات یہ ہے کہ لاڈلارنٹ تجھے پسند
کرتا ہے۔ اپنی بیٹی کے معاملے میں وہ تجھے بھروسے کے
قابل بھی سمجھتا ہے چنانچہ تیری کو یہاں بھیج رہا ہے۔ اس امید
میں کہ تو اس کا دامغ سیٹ کر کے اسے واپس ارسال کر دے
گا۔ کیا وہ تیری جینوزن پر اہم نہیں ہے گا؟ اگر اس کے اختیار
میں کچھ ہوگا تو وہ تیری دھم دھور کرے گا۔ ورنہ صاف بتا دے
گا کہ سواری کا کام نہیں ہو سکتا۔ تو یہی بات چیف صاحب کو
بتا دینا تیرا کام تمام۔“

کہا۔

راجانے میرے شانے پر ہاتھ مارا "اؤں نے نیکے چتر۔
 مجاہد بن مجاہد..... نہ بن حیرا کام تمام کرنے والوں کی ایسی
 تھی۔ اے یہ شہاب الدین اور گامے شاہ چیز کیا ہیں۔
 سالوں کو ایسے غائب کر رکھے ہیں ہم کہ صور اسرافیل پر انھیں
 گے تو میدان شہر کا راستہ پوچھتے پھریں گے۔"
 میرے دل کو راجا کی بات سے تھوڑی سی تقویٰ ملی۔
 "بھائی جگجگ میں یوں ہتھیار ڈالنے والا تو میں بھی نہیں ہوں"
 لڑے بغیر۔

”ابھی تو اس مسئلے کو بھی رکھ رہے۔ ایک مسئلہ ہے عائد کا۔ اسے رد کرتا تو میرے بس کی بات ہے نہیں آئے دے اسے۔ غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے۔ منت لیں گے اس بلا سے بھی۔ رابوہی جی مخلص مددگار ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ دریں اثنا تو اپنے ابا کو سب بتا دے۔ ان کے اور تیرے درمیان جڑیشن کیپ کم ہے کیونکہ وہ پروفیسر تھے۔ تیری عمر کے سیکڑوں کو جو ان کے شاگرد رہے ہیں۔ اس سے گھر میں ماحول سازگار رہے گا۔ عائشہ کے عشق کا بھوت اترنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک مہینے میں وہ بھاگ جائے گی۔“

”اور نہ بھائی پھر.....؟“

”پھر کی پھر دیکھیں۔“

جاگیر اور جائیداد کا۔ رابع نے جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان میں شدید اختلافات کا دورہ رہی کا۔“

”یہ معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں راجا۔ خون رشتے کے دعوے دار جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اگر میں نے فیصلہ کیا ہے۔“

”غلط فیصلہ کیا ہے تو نے جلد بازی میں۔ ابھی
آزما۔ انسانوں کو پرکھنے کا یہ موقع ضائع مت کر۔ دیکھو

کے چہرے کیسے بدلتے ہیں۔ دوست دشمن کی پہچان
 طرح ہو کی نیکی بچہ۔ صاف انکار کر دے کہ کوئی مجھ سے
 سخاوت کی توقع نہ رکھے۔ جو کچھ مجھ ملا ہے جائز اور ناجائز
 طریقے سے ملا ہے۔ نہ میں نے کسی کا حق مارا ہے اور نہ
 کے ساتھ کوئی دھوکا کیا ہے۔ خیال میں سب کا کھوں گا
 حقدار سمجھ کے کسی کو کھڑ نہیں دوں گا۔ کوئی امید بھی نہ رکھے
 اس کے بعد دیکھو کیا ہوتا ہے؟“

میں نے ایک تمہری سانس لی ”تیری بات دل کو گونگنا رہا!“

اس نے اپنی غیر موجود موچھوں پر تادوبا۔ "اس
علاوہ تو اکیلا نہیں ہے میرے جگر کے نکلے۔" قسم اللہ کی قسم
کے پٹے لگا دیں گے اگر کسی نے تیری طرف سے جھوٹی نظر
دیکھا۔ اپنا اسٹائل کچھ اے دو مکن جیسا ہے۔"

میں نے کہا ”راجا تو ست بدھائی جائے گا یہاں ساتھ۔ اگر آج شام نہیں تو کل..... یہ کام ضروری ہے۔“

”میری ملازمت بھی ضروری ہے۔“

میں نے کہا ”اے لغت بھیج ملازمت پر۔ مجھے ضرورت ہے اکیلا میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

اس نے سر ہلایا ”گھبراہٹ نیکے پتھر۔ تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔ یہ بتا اسکو ہے تیرے پاس۔“
میں نے نفی میں سر ہلادیا ”کبھی ضرورت محسوس ہوئی۔“

”خیر واسطہ جن دشمنوں سے ہے وہ صرف ظالم زبان جانتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنا پڑا تو کہیے کرے رہنا اب پہلے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ جو لوگ آج کے قوازم کی بات کرتے ہیں وہ بے خوف نہیں ہیں۔ دھماکا کر کے صاف ہٹا دیں گے۔ ہمارے کو کہیں خوش مت رہنا۔ اہم ہم ہمارے پاس بھی ہے۔ خیر تو کثرت اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ اپنی دشمنی کا ایک بڑا

”لیبرے قابو میں ہے“ تھانے دار ہے۔“
”کیسا کرے گا؟“

”دو تھے ہر چیز فراہم کر رکھا ہے۔ کلاخوف اور دسکیم
راک ایک ہر چیز دو حسب ضرورت کسی کے فیضے سے
تذکرانے کے لیے حاضر اسٹاک میں رکھتے ہیں۔“ راجا
نواز داری نے کہا ”افغانستان کے مجاہدین کا مال آج کل
آتا ہوا ہے۔ مجھے بہت شاندار چیز دی تھی اس نے۔
بائس والا خود کار ریو اور ہے۔ کسی کو گولی مار دو تو اسے بھی
بائس جلا کر آ کر ہوا کیا۔“

”تو نے ایسی خطرناک چیز کیوں کی؟“

”یار! اس رسی تھی اس لیے لی اور مفت بہر حال
نہیں لی۔ تیرے لیے بھی کوشش کر ہوں۔ ایک اور چیز اس
خانے میں دی تھی۔ جیسے کہ آج کل مارکیٹنگ کا طریقہ
ہے۔ اونٹن لوتو ملی مفت۔ بیوی لوتو پچر مفت۔ اس نے مجھے
الکھڑے میں دیکھنے والی عین دی۔ سخت نمونہ ہے ویسے تو
کونو نہ تو یہاں جمہوریت بھی ہے۔“ بات کرتے کرتے وہ
اُٹھ گیا ”نورا کو پڑی مٹ گھمانا تیرے پیچھے زار داماں
بابا ایک بندہ بھڑا ہے، وہ مجھے کھٹکھٹو لگ رہا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”پریس کلب کا ممبر تو وہ ہے نہیں۔ ایک ممبر کے ساتھ آیا تھا لیکن بہت دیر سے اکیلا بیٹھا ہے۔ ممبر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔“

”اسی نمبر سے پوچھ لے“ فون کر کے۔“

”یار! وہ بھی جھٹلی سمائی ہے۔ کسی ذریعے سے ایک اخبار کے رپورٹر کا پریس کارڈ جتوایا ہے۔ لوگوں کو بیک میل نہ کھجھرتا ہے۔ یہ بندہ انجان نظر آنے کی کوشش تو کر رہا ہے۔ مراس کی دلچسپی تاہم ہی ذات میں ہے۔ مجھ میں۔“

”اس سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟“

راجا نے اسے ایک گائی دی ”دراصل مجھے اس کا چہرہ
 نہ دیکھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اب یاد آیا کہ اسے تو میں
 بچہ در پہلے بھی اپنے گھر کے باہر دیکھا تھا۔ وہاں
 موٹر سائیکل میں کوئی خرابی تلاش کرنے کی ایکٹنگ کر رہا
 تھا۔“

میں نے کہا "تیرا مطلب ہے..... وہ ہمارا بچہ کرتا
 جان آیا ہے؟"
 "نور کوٹھک۔۔۔ تیرے گھر سے تیرا تعاقب کر رہا ہوگا
 اب تو ایک کمرہ۔۔۔ ہال کے آخر میں ہے داش روٹم جا
 ہوئے اس پر ایک نگاہ ڈال اور بیت الخلا میں قیام

دوران میں غور و خوض فرما۔ شاید تجھے کچھ یاد آ جائے“ راجا نے کہا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے نتیجے کے ساتھ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور
اٹھ کھڑا ہوا۔ جب میں اس شخص کے قریب سے گزرا تو وہ
بیکل میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ دم کے ایک اخبار میں
شائع ہونے والی کسی حینہ کی جلورے تصویر پر نظر ہی جمائے
بیٹھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق سب بائیس سال عمر کے
اس نوجوان نے جینو پر ڈھیلی ڈھالی ڈھنٹ پہن رکھی تھی
جس پر سامنے انگریزی کے حروف میں "ڈ" لکھا ہوا تھا۔ وہ
دلچسپ اور حد سے زیادہ سنجیدہ صورت تھا۔ "اے کاڈورنی
اضطراب اس کی غیر ارادی حرکات، سکنتات سے مبرا تھا۔
میں سیدھا اس دروم میں گیا اور کچھ دیر میں تم لو ٹھیک ہوا یا
اور راجا کے سامنے بیٹھ گیا۔ "ممکن ہے حیرت نے مجھے
بھی وہم میں مبتلا کر دیا ہو مگر اس کی صورت واقعی شناسا کرتی
ہے یاد کچھ نہیں آ رہا۔"

”جل ہم اسے موقع دیتے ہیں۔ وہ خود ہی بتادے گا۔“
 راجا نے کہا اور ہم اطمینان سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔
 جب میں گاڑی نکال رہا تھا تو راجا کے شبہات کی تصدیق
 ہونے لگی۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی بہت کم
 موٹر سائیکلوں میں سے اپنی موٹر سائیکل باہر نکال چکا تھا۔

میں نے کہا ”راجا۔ اے کہاں لے جا میں؟“
راجا نے کہا ”ہم اے ڈاج دینے کی کوشش کریں گے۔“

میں نے راجا کا مطلب سمجھ لیا۔ پریس کلب سے پاس آ کے میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا لی۔ راجا نے بیک ویو میر کارخ اپنی طرف کر لیا تھا۔ اس نے رنگ کٹسری شردھ کی "تو آگے دیکھ کر گاڑی چلا۔ پیچھے میں نظر رکھتا ہوں۔ اسے شک کی کوئی بات نہیں کیجے جڑا وہ کا ہوا ہے پیچھے۔ کالی مر ہے یا کالا بکرا۔ اس کا بھی جڑا مل جائے گا۔ اس کے تھوڑے ٹھک نہیں گئے۔ بندہ خطرناک ہے۔"

میں نے کہا ”راجا! ایسا نہ ہو کہ تیرے چکر میں میرا
جان جائے“ اور گاڑی کو ایک دم موڑ لیا۔
”میرا کوئی دشمن نہیں“ راجا نے کہا۔

”یاد کر ان سب کو جن کو تو نے رواں مالی سال میں ا
عشق کے چال میں پھانسا۔ آخر وہ شریف زوایاں کسی
عزت ہوں گی۔“

راجا تلخی سے ہنسا ”شریف زادیاں! اے ان
اصلیت سامنے آجائے تو شریف صاحب خودکشی کر لیں

اپنی گاڑی میں چھوڑنے نہیں آیا تھا۔ شعبہ حادثات کے سامنے کافی لوگ جمع تھے۔ ایبویٹس سائرن بجاتی آگے بڑھی تو لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ جب راجا کی سہارے کے بغیر ایبویٹس سے اترا تو مجھے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔ ”نیکے پترا تو ٹھیک ہے نا؟“ راجا نے مجھے نظروں سے اور کچھ ہاتھوں سے ٹٹول کے دیکھا۔

”ہاں اور تو.....“ میں نے کہا ”تیرا تو کافی خون بہہ گیا ہے۔“

”اے نہیں۔ معمولی زخم ہیں۔ کچھ خراشیں ہیں چل آ جا میرے ساتھ لیکن ایک بات دھیان سے سن لے۔ یہاں صرف حادثے کا سبب بتانا ہے۔ یہ نہیں کہنا ہے کہ کسی نے گولی چلائی تھی۔“

میں نے سر ہلایا ”میں کہہ دوں گا بریک فٹل ہو گئے تھے۔“

لوگوں کے درمیان سے گزر کے ہم اولی ڈی انچارج کے پاس گئے۔ راجا کا بریس کارڈ نہ ہوتا تو وہ پہلے نہیں پولیس سرجن سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتا۔ ضابطے کی کارروائی کے بغیر ڈاکٹر نے ہمارا معائنہ کیا اور کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ مجزائی طور پر ہماری سب بڈیاں سلامت ہیں۔ ایک ہیوی ویٹ لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں صدمے میں دوکالے کمروں کی قربانی کا مشورہ بھی دیا۔

جب ہمارے زخم صاف کر کے مرہم پی کر دی گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ زخم کتنی گہری تھی۔ میرے ہاتھوں پر اور چہرے پر اتنی خراشیں ہیں کہ میرا اس حالت میں گھر جانا نقصان مند نہیں۔ میرے ماتھے اور چہرے پر میڈیکل ٹیپ کے چار سفید کراس تھے۔ میری دائیں کلائی پچھلے سے ٹوٹی تھی۔ اس پر ڈاکٹر نے اسٹریچ بیڈ پر بٹھا دیا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ گاڑی کو بڑک کر آتا ہے۔ چند منٹ میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹھیکہ کی جڑ بات سے مغلوب ہو کے میری مدد کرنے والے اور مجھے یہاں تک لانے والے قانونی پکڑوں کے ڈر سے فرار ہو گئے ہیں۔

میری حالت ایسی نہیں تھی کہ مجھے اسٹریچر کی ضرورت ہوگی۔ میں خود چل کے بھی طبی امداد کے لیے بنے ہوئے گاؤننگ جاسکتا تھا لیکن میں ہنسا رہا۔ مجھے راجا کی آمد کا انتظار تھا۔ مجھے جویش ضرور آئی تھی مگر میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ راجا کی حالت ٹھیک ہوگی تو شہر کا ہسپتال کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔

سڑا کے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ اب وہاں نہیں تھا۔ میں نے کہا ”اس نے..... کوئی چلائی تھی۔“

ڈرائیور نے سر جھکا کے مجھے دیکھا ”کس نے گولی چلائی تھی؟“

میں نے کہا ”وہ..... نکل گیا۔ اس نے گولی چلائی تو پڑ پڑ کر گیا۔ اسی سے گاڑی اٹنی تھی۔“

میرے خیر خواہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ”کون تھا وہ؟“

میں نے کہا ”اس کا نام تو میں نہیں جانتا۔“

کار چلانے والے نے کہا ”چلو جی اللہ نے بچالیا۔ اب آپ مہربانی کرنا۔ یہ بات ہسپتال میں کسی سے مت کہنا ورنہ معاملہ لمبا ہو جائے گا۔ ہم کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔“

پچھلی سیٹ پر مجھے سنبھالنے والے نے کہا ”ہم آپ کو سرکاری ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ برائوین ہسپتال والے ٹویس لیں گے نہیں۔ آپ بس اتنا کہنا کہ ٹائر پھٹ گیا تھا۔ حادثہ اتنا تھانہ جملہ جملہ آگے تو آپ کے لیے بھی بڑی سمیت ہو جائے گی۔“

ڈرائیور نے کہا ”ٹویس والے بہت پیسا کھائیں گے۔ آپ تو اس بندے کا نام بھی نہیں جانتے۔“

”بس اللہ کا شکر کرو کہ جان بچ گئی آج۔ آخر کیوں چلائی تھی اس نے آپ پر گولی؟“

میں نے کہا ”مجھے یہ بھی علم نہیں۔“

انہوں نے گاڑی کو ہسپتال کے اندر شعبہ حادثات کے سامنے روکا اور مجھے پیچھے اترنے میں مدد دی۔ ایک نے کہا کہ وہ کوئی کالے لٹا ہے جو مجھے اسٹریچر پر لے جائے۔ اس نے مجھے ایک سٹریچر پر بٹھا دیا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ گاڑی کو بڑک کر آتا ہے۔ چند منٹ میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹھیکہ کی جڑ بات سے مغلوب ہو کے میری مدد کرنے والے اور مجھے یہاں تک لانے والے قانونی پکڑوں کے ڈر سے فرار ہو گئے ہیں۔

میری حالت ایسی نہیں تھی کہ مجھے اسٹریچر کی ضرورت ہوگی۔ میں خود چل کے بھی طبی امداد کے لیے بنے ہوئے گاؤننگ جاسکتا تھا لیکن میں ہنسا رہا۔ مجھے راجا کی آمد کا انتظار تھا۔ مجھے جویش ضرور آئی تھی مگر میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ راجا کی حالت ٹھیک ہوگی تو شہر کا ہسپتال کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔

راجا کچھ دیر بعد ایک ایبویٹس میں پہنچا۔ اسے کوئی

جواب میں اس نے حرکت کی ”ہاں..... ہاں..... ٹھیک ہے؟“

اب میں نے اپنے ہاتھوں پر دوں کو ہلا کے دیکھا۔ اسکرین کا شیشہ باریک ذرات کی صورت میں اٹھ رہا تھا۔ یہ ذرات میرے سر کے بالوں میں جھپٹے ہوئے تھے۔ میرے جسم کے کھلے حصوں پر خراشیں ڈال کے چپکے تھے۔ خون میرے چہرے پر اور ہاتھوں پر لکیریں چارہاڑ میں نے سینٹ بیٹ سے آواز دو کے راجا کو سہارا دیا اور اسے سیٹ پر سیدھا بیٹھنے میں مدد دی۔

اس وقت تک نہ جانے کہاں کہاں سے دوڑ دوڑ بہت سے لوگ آچکے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والی بہنیں گاڑیاں رگ گئی تھیں۔ وہ سب ہمارے مددگار تھے۔ نہیں نے بڑی سخت سے ہمیں باہر نکالا۔ چھت چپکے جانے گاڑی کے دروازے پر چھٹ گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ لوگوں نے ہمیں انہی کھڑکیوں سے باہر کھینچا۔ اس وقت تک مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آخری دو گاڑی کے کھمبے سے ٹکرانے کا تھا۔ ٹیلی فون کا کھمبا پچھلے طرف جھک گیا تھا۔

جب مجھے اور راجا کو ہسپتال لے جانے کے لیے ایک الگ گاڑیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا تو میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ حادثے کی جگہ پر ٹریفک جام ہونے لگا تھا اور کم کم میں جالیں افراد وہاں جا رہے تھے۔

اچانک میری نظر نے بہت سے دکھی اور مہربان انسانوں کے درمیان اپنے دشمن کا چہرہ پہچانا۔ اس چہرے پر نفرت کے زہر میں بھی ہوئی سکرابٹ تھی اور وہ آدھے جسم میں جن میں عداوت اور بغض کی آگ بجتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کو میں نے کچھ دیر پہلے ہی پریس کلب میں دیکھا تھا۔ اب چہرے کو ہیملٹ میں چھپا رہا تھا۔

میں نے چلا کے لوگوں کو بتانے کی کوشش کی ”وہ..... شخص..... اسے روکو۔“

دو افراد مجھے ایک کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ”کون؟“ اور لیٹ کے دیکھا۔

میں نے کہا ”وہ..... جس کی ٹی شرٹ پر ڈیپل کھ ہے۔“

دوسرے نے اس وقت تک دروازہ بند کر دیا تھا ”جی چلو۔ ادھر جو ہسپتال بھی قریب ہو۔“

آگے گاڑی کے ڈرائیور نے کچھ پیڈل چھوڑ دیا۔ گاڑی ایک جھینکے سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ میں نے

گاڑی کو سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لے۔ یہ سڑک خالی ہی رہتی ہے۔ آگے کہیں اسے روک کے پوچھیں گے کہ بچے آخر اس نصاب کا مقصد کیا ہے؟ مگر یار وہ تو غائب ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے ہانسی سے کہا۔

”مطلب یہ کہ وہ شاید سیدھا گزر گیا۔ وہ سمجھ گیا ہو گا کہ ہمیں شک ہو گیا ہے۔“

راجا کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ میرے کانوں میں فائز کی آواز آئی۔ جسم کے مدافعتی رد عمل کے طور پر میرا سر خود بخود جھک گیا حالانکہ نشانہ میرا سر ہوتا تو یہ حرکت مجھے گولی سے بچانیں سکتی تھی۔ خطرے کا احساس میرے لاشعور میں موجود تھا چنانچہ میرے سیرے بڑے بڑے پڈل کو دبا دیا۔ اس سے بس اتنا فائدہ ہوا کہ گاڑی کی رفتار کچھ کم ہو گئی۔

میں نے گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی دوسرا دھماکا سنا۔ دونوں آوازوں کے درمیان سیکنڈ کے سوئس جیسے بھی کم کر کا فرق تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی میرے قابو سے بہر ہوئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ گولی نے آگے دائیں ہاتھ والا ٹائر چاڑھا دیا ہے۔

ٹائر برسٹ ہوتے ہی گاڑی الٹ گئی۔ امریکا اور لندن میں رہنے کی وجہ سے مجھے سیٹ بیلت باندھنے کی عادت ہو گئی تھی ورنہ یہاں نہ کوئی قانونی ضرورت نہ سمجھتا تھا اور نہ اپنی حفاظت کے لیے ایسا کرتا تھا۔ اسی عادت نے مجھے محفوظ رکھا مگر یہ بھی کہنا شاید غلط ہوگا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے راجا نے سیٹ بیلت نہیں باندھی تھی لیکن وہ بھی محفوظ رہا۔ بس ہماری زندگی بچی کہ ہم بچ گئے۔

گاڑی ایک بار اٹھنے کے بعد پھر سیدھی ہوئی لیکن اپنی رفتار میں آگے بھی گئی۔ جھکوں کے دوران میں نے شیشہ ٹوٹنے کی اور گاڑی کی فولادی پاؤں کی سڑک کی سطح سے تصادم کی ٹی جلی آوازوں کا شور بھی سنا چرایک اور دھماکا ہوا اور یکلخت ساری آوازوں پر سکوت غالب آ گیا۔ وہ زلزلہ ٹھہر گیا جس نے مجھے گاڑی کے اندر یوں ہلا دیا تھا جیسے میں گھومتے ہوئے ٹنگریٹ کمرے کے اندر پڑا ہوا پتھر ہوں۔

اس وقت مجھے کوئی احساس تھا تو اپنے زندہ ہونے کا مجھے یہ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں کس حد تک زخمی ہوں۔ دونوں یا پھر دونوں جویش معمولی جہا یا سنگین۔ ہوش کے اولین سے پہلا رد عمل یہ تھا کہ میں..... چلا کے راجا کو آواز دی۔ وہ میرے ساتھ ہی سیٹ پر الٹا پڑا تھا اور اس کے ماتھے پر خون تھا۔

میں نے چلا کے کہا ”راجا..... تو ٹھیک ہے راجا.....؟“

دھاراجہ رانا اپنے گے گا تو کردار بھی الٹ جائیں گے۔ تاریخ ایسے ہی بنتی ہے۔
کیا میرا نام بھی سزائے موت پانے والوں میں درج تھا؟ اگر تھا تو کس کس کی فہرست میں؟
راجا نے میرے سامنے چٹکی بجائی ”زمین پر آ جائیے پترا“

”یار! میں سوچ رہا تھا۔۔۔“

”اب سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے“ اس نے میری بات کاٹ دی۔
میں نے کہا ”آخروہ کون تھا؟ ہم پریس کلب میں ہی پوچھ لیتے اس سے۔ مگر خبر۔۔۔ تیسری بار سامنے آیا تو چھوڑوں گا نہیں۔“

راجا ہنس ”جپ جاپ بکڑے کھا۔ شہناز کو بس یہی معلوم ہے کہ ایک معمولی سا ایکسپنٹ ہو گیا تھا۔“
میں نے کہا ”جس میں گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ اب یہ بات بھلا چھپی رہ سکتی ہے۔ ہم تو فرار ہو گئے جائے حادثہ سے اور اسپتال سے گھر آ گئے۔ گاڑی کی لاش ابھی تک وہیں بڑی ہو گئی۔“

راجا کے حکون اور اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا ”اے پولیس اٹھا کے گئی تھی۔ میں نے بات کر لی ہے۔ تیرا جب دل چاہے ان کے مردہ خانے سے گاڑی کا جنازہ اٹھالینا اور دفن کرنا بھی قبرستان میں۔“

”لیکن خبر چھپائی تو نہیں جا سکتی۔“
”خبر۔۔۔ اب یہی خبر؟ تو سمجھ لے کہ معاملہ ختم۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ انت بھلا سو بھلا۔“

میں نے کہا ”یہ اچھا انجام ہے۔؟“
”اس سے اچھا انجام کیا ہو سکتا تھا دوست۔ ایسے حادثے میں آٹھ گھنٹے بعد یا تو مرحومین کفن پہننے تدفین کے مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں یا یونیورسٹی ہسپتال پر پلاسٹر چڑھائے پڑے ہوتے ہیں۔ ہم یہاں بیٹھے کے کھارہے ہیں گھر باگرم بکڑے۔ کیا اس کے لیے ہمیں خدا کا خصوصی طور پر شکر گزار نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے ہم جیسے گنہگاروں پر اتنا رحم کیا۔“

میں نے کہا ”اس میں کیا شک ہے۔“
راجا نے شہناز کی طرف دیکھا جواب چاہنے کی کڑے جاری تھی۔ ”میری زندگی میں ایسے مواقع پہلے بھی آ چکے ہیں۔ جب میری دفاتر ممکن تھی۔ میرا خیال ہے کہ شہناز کی دعاؤں نے مجھے بچالیا ورنہ یار میرے اپنے اعمال تو ایسے

نہ مگر آٹھ سال میں صورت حالات بدل گئی تھی۔ تنظیم کے قیام سے اختیار و اقتدار کے سارے وسیلے نکل گئے تھے۔ ان نے بیکار کارکن مارے جا چکے تھے اور ہزاروں جلاوطنی یا ردپوشی کی زندگی گزر رہے تھے۔ نئی نئی سیاست دوراں نے ان کے دشمنوں کو عروج بخش دیا تھا اور تنظیم اپنا وجود برقرار رکھنے کی جنگ بھی ہار رہی تھی۔

تنظیم کے دشمن منطقی طور پر میرے بھی دشمن تھے۔ وہ تنظیم کے ہر کارکن کے دشمن تھے جنہوں نے اپنے دور اقتدار میں ہر طرح سے ان پر عرصہء حیات تنگ کر دیا تھا۔ تنظیم کے چیف کے حکم پر اپنے حریفوں کا قتل عام کیا تھا۔ ان کے گھر اجاڑے تھے۔ انہیں بھی اور سرکاری جیلوں میں ٹھوسا تھا۔ ان پر جموں نے مقامات کے انبار لگا دیے تھے اور دشمنانہ نعرہ کے سارے حربے آزمائے تھے۔ اب وہ برسرِ اقتدار تھے تو تنظیم کے لیے کام کرنے والے جتنی مجرم کار کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ہر شکست خوردہ قوم کے ساتھ تاریخ نے تاریخ کے ہر دور میں انتقامی کارروائی کی ہے تو مورخ نے بھی اسے مکافات عمل کا نام دیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ جیسے تنظیم مجھے بھول چکی ہے ایسے ہی تنظیم کے ظلم و ستم کا شکار ہونے والے بھی مجھے بھول چکے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ اگر شہاب الدین نے پاکستان بننے ہی مجھے احساس دلایا تھا کہ میں خود کو ان کے قتلے سے آزاد نہ سمجھوں ایسے ہی تنظیم کے دشمنوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہوگا۔ میرا یہ عذر کون قبول کرے گا کہ میں نے جو غلط کام کیے تھے، بڑے قوت کیے تھے اور تنظیم کے ہاتھوں بلیک میل ہو گئے کیے تھے۔

ایک سوال یہ بھی تھا کہ آخر میں نے کیا غلط کام کیے تھے؟ میرا ماضی تاریخ کا حصہ تھا۔ جو کچھ میں کر چکا تھا، نہ بھلا یا جا سکتا تھا اور نہ سنایا جا سکتا تھا۔ مجھے اب یاد بھی نہیں تھا کہ ظلم اور نا انصافی کا شکار ہونے والے کون تھے اور کتنے تھے۔

لیکن وہ بہت تھے۔ ان میں ایسے بھی تو ہوں گے جنہوں نے مجھ کو کھلایا ہوگا، پہچان لیا ہوگا۔ میرا نام اس فہرست میں لکھ لیا ہوگا جس کے جرائم ناقابل معافی تھے۔ جن کے لیے سزا مقصوم تھی۔ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ وہ جہاں ملیں گے اور جب ملیں گے، انہیں سزا ضرور دی جائے گی۔ انتقام کی سیاست میں معافی کسی کے لیے نہیں تھی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا چلن تھا چنانچہ معمولی جرم کی سزا کا عبرت آموز ہونا بھی ضروری تھا تو ایسے عمل جاری تھا۔ جو کل ظالم تھا وہ آج مظلوم تھا اور مظلوم نے ظالم کا روپ دھار لیا تھا۔ کبھی وقت کا

نروس تھا۔ اس حادثے نے میرے اعصاب کو منتشر کر دیا تھا۔ ہر حادثے کی دہشت ایسی ہی ہوتی ہے جو بخوبی دہرہ اڑ کر رہی ہے لیکن اس سے نجات پانے میں بہت عرصہ لگتا ہے۔ میرے لیے دہرا عذاب اس خیال کا ہی تھا کہ گاڑی کا الٹ جانا محض ایک حادثہ نہیں تھا جو کسی کے ہاتھ کہیں بھی پیش آ سکتا ہے اور جس کی وجہ کا تعین قدرت کر لی ہے۔ یہ ایک ناقابل حتمی کا نتیجہ تھا۔

میرا عقیدہ پہلے بھی رائج تھا کہ وقت آ جائے تو اپنی تدبیر سے کوئی نال نہیں سکتا اور جس کا وقت نہ آیا ہو اسے کوئی مار نہیں سکتا۔ میں نے بالکل معمولی نظر آنے والے واقعات میں ناقابل یقین طور پر لوگوں کو سر دے دیکھا تھا۔ اتنے بڑے حادثے میں میرا یا راجا کا معمولی خراشوں کے ساتھ زخمی سلامتی خچ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

صحت اور سلامتی پر اعتبار بحال ہوتے ہی میرے خیالات پر ایک سوالیہ نشان یوں مسلط ہو گیا تھا کہ جواب ملے بغیر اس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا لیکن لاحد و امکانات کے ڈھیر سے پورے یقین کے ساتھ ایک جواب نکالنا ناممکن تھا۔ سوال ایک ہی تھا۔ آخر وہ کون تھا؟ اس کے گھٹن سے دھرا

ضمنی سوال جنم لینا تھا کہ وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟ میں ایسے لوگوں کی فہرست بنانا جو میرے وجود کو ان جہاں سے حرف غلط کی طرح مٹا دیتا چاہتے تھے تو اس میں سب سے اوپر مندر سلطان مرزا کا نام آتا لیکن وہ لندن میں تھا اور میری معلومات کی حد تک ابھی اس نے رقبہ نما مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے میری جان لینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا بھی شروع نہیں کیا تھا یا شاید میرا معلومات ناقص تھیں۔

اس کے بعد لیڈی سیلیا ارنسٹ تھی جسے میں جانی دشمنوں میں شمار کرتا تھا اور لندن میں مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملے سازش کے بارے میں ثبوت اس کے خلاف ملے تھے لیکن میرے تہا پہ پاکستان لوٹ آنے کے بعد وہ کچھ مطمئن ہو گئی کہ اس کی سفید فام عالی نسب بیٹی فی الحال محفوظ ہے۔ چ دن میں وہ بھی یہ بندوبست نہیں کر سکتی تھی کہ پاکستان میں مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے کرانے کے قابل تلاش کر لے۔ خطرہ مجھے چیف کی طرف سے بھی تھا اور گائے شاہ شہاب الدین جیسے لوگوں سے بھی لیکن فی الحال ان کے مفادات کے تقاضے پر کچھ اور تھے۔ وہ مجھ سے مدد کے طالب تھے اور مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ چیف کے نزدیک پہلے میں ایک مفرد تھا اور میرا فرار بھی بغاوت کے مترادف

بات نہیں۔ سب سے بڑھ کر دادی۔ وہ تو عمر کے اس حصے میں ہیں جب معمولی سا مدد بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔
راجا نے کہا ”ابھی کیا ضرورت ہے گھر جا کے یہ چاند جیسا داغ دار چہرہ دکھانے کی۔ شہناز کے پاس پلٹے ہیں۔“
میں نے کہا ”ٹھیک ہے“ مگر شہناز سے کیا جھوٹ بولنا ہے؟“

”جج دی ہوگا جو تو بتائے گا۔ میری کسی بات کا تو وہ یقین ہی نہیں کرتی یار! راجا نے تا ساف سے سر ہلایا۔

”اپنا اعتبار تو نے خود گنوایا ہے مہاراجا!“
ڈاکٹر ہونے کے باوجود شہناز نے خاصی بدحواسی دکھائی اور کچھ رد و مواضع بھی کیا مگر بالآخر اس نے ایک بینڈروم کو جزل وارڈ میں تبدیل کر کے ہمیں ساتھ ساتھ لٹا دیا۔ اس سے ابھی نرس ہمیں کہاں میسر آتی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی ڈاکٹری بھی دکھائی اور ہمیں ایک انجکشن لگا دیا۔ اس کے بارے میں شہناز نے بتایا کہ سکون آ رہا تھا۔ ”اب تم سو جاؤ گے اور جب اٹھو گے تو شاک کا اثر ختم ہو جائے گا۔ بہت بہتر محسوس کرو گے۔“ شہناز نے کہا۔

راجا نے احتجاج کیا ”ہم باتیں کرنا چاہتے تھے۔“
شہناز نے لائٹ آف کی اور دروازہ بند کر دیا ”اب تو سونا ہی پڑے گا۔ چلو آٹھ گھنٹے بند کرو۔ منہ بند نہ کیا تو شپ چپکا دوں گی۔“

”الوکی کبھی!“ راجا نے کچھ مدت اور کچھ نکلی سے کہا۔
میں نے کہا ”راجا۔ تیرے جیسے گھبراہٹ کرنا کینے شخص کے ساتھ آخر شہناز کی کیسے گزرے گی؟“

”بہت ابھی گزرے گی۔ جیسے اب گزر رہی ہے۔“
راجا نے جڑ کے کہا ”تو اپنی فکر کر۔ تیرے پیچھے کی بلا نہیں گئی ہوگی۔“

جب میری آنکھ کھلی تو میری حالت یوں ہی بہت بہتر تھی۔ راجا پھر پہلے اٹھ گیا تھا اور باہر لاؤنج میں بیٹھا گرم گرم بکڑے کھا رہا تھا جو شہناز براہ راست کچن سے ارسال کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں چھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھا ہوں اور باہر بات ہو گئی ہے۔

شہناز نے کہا ”رٹیں بھائی کیا حال ہے؟ چائے تیار ہے۔ بیٹھ جائیں آپ بھی انہی کے ساتھ۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

”بہت بہتر۔“ میں نے کہا۔
حقیقت بھی یہی تھی۔ سکون آ رہا تھا اور دو کے زیر اثر نیند نے مجھے واقعی پسکون کر دیا تھا ورنہ سونے سے پہلے میں بہت

نہیں تھے۔“

میں نے کہا ”میں خود حیران ہوتا ہوں کہ جس راہ پر میں چل لگا تھا اس پر چلتے چلتے میرا بھائی قدر سیدھا قبرستان پہنچا۔ وہ موت کا کھیل ایسا ہی تھا۔ میں کیسے بچ گیا؟“

راجا نے ایک آہ بھری ”یار! تیرے ساتھ ماں باپ کی دعائیں تھیں۔“

”مجھے انہی کی فکر ہے راجا! ان کے سامنے میں کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ میں گھر سے لگا تھا تو میرا منہ ایسا نہیں تھا۔“

راجا نے ایک ڈکار لی ”اے کیا ضرورت ہے فوری طور پر انہیں منہ دکھانے کی۔ وہ چار دن میں یہ داغ دے اور خراشیں ایسی نہیں رہیں گی۔ تھوڑی سی سوچیں ہے دائیں طرف اور ناک پر یہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔“

”وہ چار دن کیا میں چہرے پر نقاب ڈال کے بھروں؟“

کچھ تو بتانا پڑے گا انہیں۔ وہ گاڑی کے بارے میں بھی پوچھیں گے کتنا جھوٹ بولوں گا میں؟“

”اتنا مت گھبرائیے پترا! یاد رکھ! انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے اس کا داغ۔ وہ داغ سے بڑا کمپیوٹر نہ ایجاد ہوا۔ نہ نہ ہوگا۔ اگر یہ تیرے کنٹرول میں ہے تو ہر مسئلے کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ اس گاڑی کو جو درحقیقت تیرے ابا کی گاڑی تھی ایسے ہی بھلا دے جیسے ان سب لڑکیوں کو تو نے بھلا دیا جو ولایت میں تیرے زیر استعمال رہیں۔“

میں نے کہا ”بکواس نہ کرو۔“

”دیکھ میرے سامنے بھی اپنی پارسی کا راکم مت الٹا۔ میں ذرا لگی لپی رکھے بغیر بات کرتا ہوں۔ اپنے ابا سے کہہ دینا کہ پرانی گاڑی تو میں نے سچ دی۔ وہ میرے جیسے رئیس کے شایان شان بھی نہیں تھی اور ولایت میں جو لڑکیاں..... میرا مطلب ہے جو گاڑیاں میرے زیر استعمال رہیں ان کے مقابلے میں ایسی ہی تھی جیسے عائشہ کے مقابلے میں رابعہ..... یاد وہ جو باسی آئی ہے گھر میں ہمارا دربرن کرنے..... وہ دروازے پر کھڑی دیکھیں گئی جم جم کرتی لمبی مرسیز پر تو خوشی سے نہال ہو جائیں گے۔“

میں نے کہا ”وہ مرسیز پر تو خرید کے دے گا مجھے؟“

”یار! میں تو تھ پر اس لگائے بیٹھا ہوں..... جیسے تیرا سارا خاندان بیٹھا ہے۔ اتنی بڑی گاڑی کا مالک تو ہے یا میں؟“

”اے جاگیر جاگیر جاگیر..... سالے! ابھی تو میں نے صرف نام ہی سنا ہے۔ دیکھا تک نہیں ہے اس جگہ کو۔ اس کی مالیت کروڑوں میں ہوگی مگر میرے پاس تو نہیں ہیں

کروڑوں۔ ابا کے پاس بینک میں کتنے ہیں اس سے بھی بڑے غرض نہیں۔ خود میرے پاس ابھی دس لاکھ سے زیادہ ہیں۔ اتنی ہی پس انداز کیا تھا میں نے۔ دس ہزار پاؤنڈ تھے۔ یہاں وہ دس لاکھ روپے بن گئے۔“

راجا نے کہا ”کل کی فکر نہ کر۔ جس کے اٹھنے کروڑوں کے ہوں اسے ہر بینک ہاتھ جوڑ کے کروڑوں روپے ہے کہ سرکار آپ کی مرضی کمرشل پلازا بنائے کوئی صنعت لگائے بین الاقوامی تجارت میں قدم رنجبر مائے کچھ بھی کیجیے بس فرض لے کر ہم پر احسان فرمائیے۔ ہم جیسے لگا لوں گے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ کریڈٹ کارڈ کیجیے پرسن لون لیجیے..... کار لیجیے۔“

”کل کے بارے میں ابھی کچھ طے نہیں کیا میں نے کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ ابا کا ایک آئینہ تھا کہ وہاں شیشم کے جنگلات ہیں۔ ان کو بڑھایا جاسکتا ہے اور عمارتی لکڑی یا فرنیچر کا کارخانہ لگایا جاسکتا ہے۔ زراعت یا فارمنگ ہو سکتی ہے۔ پولٹری فارمنگ ڈیری فارمنگ فیش فارمنگ۔ یہ سب دیکھنا ہے مجھے۔ آج یہ حادثہ نہ ہوتا تو ہم کل جاسکتے تھے۔“

راجا نے کہا ”ہم جائیں گے ریتیں صاحب! بلکہ آپ یوں سمجھئے کہ ہم چلے گئے اس وقت وہیں موجود ہیں۔ آئی میری بات سمجھ شریف میں؟ نہیں آئی ناں..... شہناز میری جان! ایک کام کرو..... فرافون کرو اپنے رفیق بھائی کے گھر۔“

شہناز خاموشی سے چائے پی رہی تھی اور ہماری باتیں سن رہی تھی۔ وہ چونکی ”میں فون کروں؟“

”ہاں! ایک سے ضرور سا جھوٹ بولنا ہے جنہیں اس کے باپ سے کہو کہ راجا اور رفیق بھائی آج وہ پیر کے کھانے کے بعد چلے گئے سستے بدھائی۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ گھروالوں کو بتا دینا مگر مرفون خراب تھا اس لیے زرا در پر سے اطلاع دے رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے دو چار دن لگ جائیں انہیں آپ پریشان نہ ہوں۔“

”گھر راجا.....؟“ شہناز نے احتجاج کیا۔

”اگر مگر بعد میں کرنا“ راجا بڑبڑکیا ”یہ معاملات تمہاری سمجھ کے دائرے سے باہر کے ہیں۔ اس لیے جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔“

”جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ تم مجھ سے جھوٹ کیوں بولنا چاہتے ہو..... اور وہ بھی رفیق بھائی کے والدین سے..... میں فون نہیں کروں گی۔“

راجا خوشامد پر اتر آیا ”کیا تم سے کوئی غلط کام

رہسکتا ہوں؟“

”ہاں! خود تو کرتے ہی ہو مجھ سے بھی غلط کام کرائے بہتے..... کہہ دو کتنا ڈس؟“

”راہی! اس کی کیا ضرورت ہے“ راجا نے کھسپائے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا ”دیکھو جھوٹ اگر مفاد ہائے کے لیے بولا جائے اور اس سے کسی کو فائدہ پہنچے تو کوئی بات کیات نہیں۔ اپنے بھائی کی ظاہری حالت تو کم دیکھ ہی رہی ہو۔ ایسی حالت میں یہ اماں ابا کے سامنے جاتے ہوئے زرتا ہے۔ کہیں ان کو ہارٹ ایک نہ ہو جائے۔ دادی کی عمر تم جانتی ہو وہ معمولی سا صدمہ بھی کہاں برداشت کر سکتی ہیں۔ اس کی گاڑی کو بھی خاصا نقصان پہنچا ہے۔ وہ ابا کی گاڑی تھی۔ انہیں دیکھ کے صدمہ ہوگا۔ اس کی اماں کی طرح دن اندر بھی۔ رفیق کا خیال یہ ہے کہ اب اس کو ٹھکانے لگادیا جائے۔ جیسے ہمیں جو دودھ نہ دے پوچھ خانے والوں کے دالے کردی جاتی ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اسے بھی کبڑیوں کو دے کر ایک ٹی کا خریدے اور ابا کو پیش کر دے۔ کیا اس میں کوئی غلط بات ہے؟“

”اس میں تو کوئی حرج نہیں مگر.....“

”صرف تمہارا خیال ہے جو غلط نہیں ہو سکتا کہ دو چار دن میں زخم اور سوجن وغیرہ کے نشانات ختم ہو جائیں گے یا کم ہو جائیں گے۔ تو دو چار دن کی روپوشی کے لیے ہم نے سوچا ہے کہ اس کی جاگیر پر دیکھ آئیں۔ یہ کام بھی ضروری ہے۔“

”لیکن ابھی تم اس قابل ہی کہاں ہو کہ سفر کرو۔ جنہیں چار پانچ دن اختی باویک گولیاں لگنی ہوں گی اور درد کی دوائیں.....“

راجا نے کہا ”وہ ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ دکاندار سے کھانے کا بھی وعدہ۔ چلو اب شاباش فون کرو“ راجا نے کہا۔

شہناز نے میری طرف دیکھا تو میں نے بھی سر ہلا دیا ”انہیں تم ہی مطمئن کر سکتی ہو۔“

مجبوراً شہناز نے فون پر وہ سب کہہ دیا جو ہم چاہتے تھے۔ تاہم اس کی تشویش برقرار رہی۔ اس کی دل خواہش تھی کہ کم چند دن گھر سے ہی نہ لگیں اور باقاعدہ مریض بن کے گھر آئیں اور وہ علاج کے ساتھ مکمل تندرستی کے لیے گھر نہ آسکیں ضرورت تھی اور نہ یہ ہمارے لیے ممکن تھا۔

رات گئے تک ہم باہر کھڑے رہے۔ راجا کا خیال تھا کہ میرے اس اچھی دھن کا سراغ لگانا مشکل ضرور ہوگا

تاہم نہیں۔ میرے ذہن میں خلش کا سبب کچھ اور تھا۔ کوشش کے باوجود میں اس خیال کو دل سے نکالنے میں ناکام تھا کہ وہ ابھی نہیں اس کی صورت کا کوئی عکس میرے لاشعور میں محفوظ تھا مگر دقت کی گرد سے یاد کا کوئی عنوان ابھر کے پہچان کی روشنی میں نہ آتا تھا۔

ایسی ہر اچھن کا آسان علاج بھی ہوتا ہے کہ اسے بھلا دیا جائے پھر کی الہامی انداز میں اچانک یاد سے ہو جانے والی کوئی بات ایسے دقت میں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ذہن کے پردے پر درشن ہو جاتی ہے جب آپ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہے ہوتے۔

اس رات مجھ پر یہ کیفیت خواب بن کے نازل ہوئی۔ ہر خواب کی طرح یہ خواب بھی غیر منطقی تفصیلات پر مشتمل تھا۔ اس کے واقعات ایک مسلسل فلم کی طرح نہیں تھے بلکہ مختلف فلموں کے کٹروں جیسے تھے جو ایک کہانی سے بھی مربوط نہ ہوں۔ میں لندن کی کسی سڑک پر بارش میں ایک لڑکی کے ساتھ چارہا تھا اور وہ چھتری کے نیچے ہونے کے بہانے مجھ سے چٹ رہی تھی۔ اچانک سامنے سے سیاہ رنگ کی ایک میت گاڑی نمودار ہوئی۔ اس دو گھوڑوں والی کوچ کو دو کوچیان چلا رہے تھے جو سامنے خاصی بلندی پر سیاہ لباس اور سیاہ ادنیٰ بیٹ پہنے بیٹھے تھے۔ یہ شہاب الدین اور گامے شاہ تھے۔ انہوں نے مجھ کو دیکھ کے گاڑی روکی۔

”ہم چیف کو دفنے جا رہے ہیں“ شہاب الدین بولا۔ گامے شاہ نے کہا ”آج صبح اسے پھانسی دے دی گئی۔“

میں نے بڑی سرت کا اکتھار کیا ”دیری گڈ۔ لیکن اس کا جرم کیا تھا؟“

”اس نے ناچنگ کو شوٹ کر دیا تھا۔ اور اس کی لاش کے ٹکڑے اپنے کتوں کو کھلاتا رہا تھا“ دو میسنگ۔“

گامے شاہ نے کہا ”وہ کتے اب آخر ہو گئے ہیں۔“

میں نے کہا ”اسے گاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر لندن میں اور بھی تو بھوکے کتے ہوں گے۔“

شہاب الدین نے گامے شاہ کو دیکھا ”آئینہ برا نہیں۔“

گامے شاہ نے سر ہلایا ”ہم چیف کا ڈاگ فوڈ بنا سکتے ہیں۔ ڈبوں میں بیک کر کے بیچتے ہے اچھے پیسے ملیں گے۔“

شہاب الدین نے بیٹ اٹھا کے میرا منہ پر ادا کیا اور میت گاڑی کو موڑ کر واپس لے گیا۔ میں نے اسے دھند میں غائب ہوتے دیکھا پھر میں نے اپنی ہم سفر کی طرف دیکھا

لیکن وہ جھڑی کے نیچے نہیں تھی، کچھ فاصلے پر ایک پرانے سے مکان کے دروازے پر کھڑی بیگم ری تھی۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ایک دم ہلٹی اور میں نے دیکھا کہ وہ کوئی اور ہے۔ اس نے دوپٹے کو سر کے اوپر سے گزرا کے ایک کونوں منہ میں دبا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ ایک طرف سے چھپ گیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔

میں نے کہا ”فرخندہ! باہر کھڑی بارش میں کیوں بیگم ری ہو؟“

اس نے روتے ہوئے کہا ”اندر کیسے جاؤں..... یہ مگر نہیں قبرستان ہے۔“

وہ ناظم آباد کے علاقے کا خاصا پرانا اور چھوٹا سا مکان تھا جس کی کھڑکیوں کے کھلے پٹ کے سامنے لوہے کی سلاخیں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سلاخوں کے درمیان سے اندر جھانکا۔ اندر اندر میرا تھا مگر مجھے ایک شخص سجدے جیسی حالت میں ٹخمد نظر آیا۔ غور کرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کا تو سر ہی نہیں ہے۔ چھتے کے کھلے سے بھی ایک شخص لٹکا ہوا تھا لیکن وہ کھلے کے ساتھ گھوم رہا تھا چنانچہ اس کا چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے جسم سے نکلنے والے خون کے پھینے چاروں طرف کی دیوار پر مسلسل پڑ رہے تھے اور ہر قطرے سے بھی سرخ لکیریں پیچھے پڑ رہی تھیں۔

جب میں اس دہشت ناک خواب سے جاگا تو میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میری سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور میں پیسے میں تھا۔ خواب کا منظر ہونو میری آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ میں اس گھر کو دیکھ سکتا تھا۔ اس لڑکی کا چہرہ دیکھ سکتا تھا جس کا نام فرخندہ تھا۔ وہ میرے ماضی کی بھیا تک یادوں کے قبرستان سے باہر آ جانے والی لڑکی کی بدروح کی طرح تھی جو برسوں بعد ایک لمحے کی گئی تھی۔ اور مجھے سیاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

دس سال پہلے میں تنظیم کا بے حد فائدہ اور جوشیلا کارکن تھا۔ دو سال کے مختصر عرصے میں جو مقام میں نے حاصل کر لیا تھا وہ کچھ پرانے کارکن دس سال میں بھی حاصل نہ کر پائے تھے لیکن میری یہ ترقی بے سبب نہ تھی۔ سرفروشانہ جذبے کے ساتھ میں نے ایسے کارنامے سرانجام دیے تھے کہ میں بہت جلد اعلیٰ قیادت کی نظروں میں آ گیا تھا۔ میری ایک اور خصوصیت جو مجھے دوسروں پر ممتاز کرتی تھی میری غیر معمولی ذہانت اور فطانت تھی۔ میرے پاس صرف جذبات ہی نہیں

تھے راہنمائی کرنے والی عقل بھی تھی۔ میں فوٹو پلاننگ کر سکتا تھا اور ایک ٹیم سے اپنی مرضی کے مطابق لے سکتا تھا خواہ اس میں کتنے ہی نااہل لوگ کیوں نہ ہوں جب میری قائدانہ صلاحیت سامنے آئی تو تنظیم کے کمان نے مجھے اور پہنچایا اور مجھے وہ ذمہ داری سونپ دی جو شاید سب سے اہم تھی۔

مجھے شعبہ نشر و اشاعت اور تعلقات عامہ دیے گئے اس شعبے کے نام سے زیادہ اس کے کام کی اہمیت تھی۔ کئی اچھے برے والے پر تنظیم کے نقطہ نظر سے پریس ریلیز کرنا اور اس کی اشاعت یا پریس کانفرنس کے لیے جگہ تقریر لکھنا تو کبھی بھار کا کام تھا۔ میرا زیادہ وقت لوگوں کا رکھنا کی ذہنی تربیت میں گزرتا تھا۔ میں تنظیم کے دفاتر میں جا کے ذمہ دار عہدوں پر فائز لوگوں کی کارکردگی جانزہ لیتا تھا اور چیف کو رپورٹ دیتا تھا کہ کس کی اصلاح ضروری ہے اور کس کی حوصلہ افزائی۔ کس کو فائن ٹیوننگ کی ضرورت ہے اور کسے کو شل کی۔ لوگ مجھ سے ایسے ہی غور کھاتے تھے جیسے جرنل عوام گستاخو سے ڈرتے تھے۔

تنظیم کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں تھی۔ اس کی بنیاد ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ”سوشلسٹ انقلاب“ کے نام سے رکھی گئی تھی اور اس کے مقاصد بھی پہنچا پادلی کے نعروں سے ہم آہنگ تھے کہ اسلام ہمارا دین ہے ہمارا ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ اس جیتر میں مرزا مقصود احمد ایک انسٹوڈنٹ لیڈر تھا۔ وہاں امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے مزدور یونین لیڈر کی حیثیت سے شہرت اختیار کی اور انتخابات میں پہنچا پادلی کے لیے کام کرتا رہا۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے اس نے ”سوشلسٹ انقلاب تنظیم“ بنائی اور خاصے فائدے کے حامل کیے۔ اس کا پہلی انسٹوڈنٹ فیڈریشن نے ترقی ملیاں تھا اور وہ بعد میں ایف ایس ایف جیسی تنظیم کے لیے کئی خدمات سرانجام دیتا رہا۔

پھر حالات نے پلٹا لکھا۔ بی این اے کی تحریک چلاؤ مرزا مقصود احمد کے ایک حریف سید مہربان شاہ نے دورانہ کشی کا ثبوت دیتے ہوئے تنظیم کے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک طرح کا فارورڈ بلاک بنالیا۔ اس نے ہائی ہو شیاری سے ایک افواہ پھیلائی کہ مرزا مقصود احمد درحقیقت قادیانی ہے اور یہ وہی لوگ اسے بھی ایم ایم احمدی سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ تھا مگر بڑے منظم طریقے پر بولا گیا تھا اور ان کی شہر میں بھٹو مخالف سیاسی جماعتوں سے پوری مدد ملی تھی۔

میں قادیانیوں کے خلاف جذبات عروج پر تھے اور ان کو قتل کر دینے کا مطالبہ زور پکارتا جا رہا تھا۔ مرزا مقصود احمد نے ممکن طریقے سے اس الزام کو مسترد کیا مگر آگ میں جلی گئی۔ جب ایک عدالتی فیصلے کے ذریعے قادیانیوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا گیا تو صورت حال اور خراب ہو گئی۔ سید مہربان شاہ نے مرنے سے فائدہ اٹھایا اور ایک رات کچھ سلام برست نو جوانوں نے عالم اشتعال میں مرزا مقصود احمد کو قتل کر دیا۔ سید مہربان شاہ نے خود کو تنظیم کا امیر کہلوایا۔

ضامن کے دور میں سید مہربان شاہ نے پارٹی کا نام ”سوشلسٹ انقلاب تنظیم“ سے بدل کر ”اسلامی انقلاب تنظیم“ کر دیا اور تجویزی بہت سرکاری سرپرستی بھی حاصل کر لی۔ یہ تنظیم ہوا تو تنظیم پھر نوٹ چھوٹ کا شکار ہوئی۔ سید مہربان شاہ نے خطرہ محسوس کیا تو جان بچا کے ملک سے نکل گیا۔ اس نے اتنی دولت اکٹھی کر لی تھی کہ اسے سیاست میں رہ کے جان کا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کسی غیر ملکی عورت سے شادی کی اور اسرائیلیا میں سیٹل ہو گیا۔

جب میں نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی تو یہ نہ ہو سکتا تھا کہ اس نے اسلامی بلکہ عالمی انقلاب تنظیم بھی اور اس کا صدر مجیب الرحمن تھا جو دنیا بھر میں عدم سادات اور انصافی کے نظام کے خلاف نو جوانوں کی انقلابی طاقت کو استعمال کرنے کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ قلم، بیرونی، استحصا اور فری دور کرنے کے لیے ایک وقت اسلام کی تعلیمات کے خلاف بھی دیتا تھا۔ چین کے انقلاب کی بات بھی کرتا تھا اور انہوں نے نیشنل منڈیلا تک سب کا مداح تھا۔ اس کی آتش فشاں سے نو جوان ذہنوں کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔

پھر مجیب الرحمن نے جولا بدلا اور عالمی کے بجائے اسے امریکی انقلاب تحریک بنادیا اور خود کو چیف کہلوایا۔ اگلے پانچ سال تک اس نے میرے جیسے ناپختہ شعور رکھنے والے بے شمار نو جوانوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ اب قانونی جدوجہد سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ انصاف کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ غریبوں کو اپنی تقدیر بدلنے کے لیے اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ ہر خرابی کا علاج خود کرنا ہوگا۔ وہ راست اقدام کے فلسفے کا پیروں تھا۔ انصاف خود کو انتقام خود کو خرابی کو خود مراد تو ہیں لیکن اس کا تشدد کا فلسفہ اس دور کے مابین فرسٹریشن کے شکار ہے یعنی اور مگر ای میں جتلا ابھری یک مین کو انجیل کرتا تھا۔

خود میں نے تنظیم کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ آج میرے

لیے باعث شرم تھا اور میرے ضمیر پر ایک مشکل بوجھ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ مسر یہ تھا کہ تو ایک شیطانی جادو جس نے میری عقل پر پٹی باندھ دی تھی اور میرے دماغ کو مسموم کر دیا تھا۔ میرے جیسے بیکروں میں ہزاروں نو جوان لانا تو نیت کے راستے پر چلے ہوئے مارے گئے۔ جیلوں میں پہنچے یا رد پوش ہو گئے۔ دشمنوں کے ہاتھوں اغوا ہوئے یا تباہ ہو گئے۔ چیف مجیب الرحمن پر کوئی آج نہ آئی۔ جب اس کے دشمن غالب آنے لگے تو وہ دینی چلا گیا۔ وہاں سے جرنی پہنچا۔ اس کے دست راست سمجھے جانے والے خود اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ باقی تتر بتر ہو گئے مگر انہوں نے بلیک میلنگ سے اپنے مذموم مقاصد پر عمل درآمد کا سلسلہ جاری رکھا۔

یہ دس سال پہلے کی بات ہے جب تنظیم کی طاقت اپنے عروج پر تھی۔ چند دن پہلے خفیہ ذرائع نے ایک انداز کی نشاندہی کی تھی جو درپردہ تنظیم کے مفادات کے خلاف کام کر رہا تھا۔ میں یونیورسٹی کے امتحان میں آخری پرچے سے فارغ ہو کے نکلا تو شہر جانے والی بس جسے پوائنٹ کہتے تھے نکل گئی تھی۔ اگلے پوائنٹ کی روانگی میں دیر تھی میں بس اسٹاپ پر کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیٹ تک بیدل جا کے بلیک ٹرانسپورٹ بکڑوں یا کینے میرا چلا جاؤں کہ ایک سیاہ رنگ کی کار میرے سامنے آئی۔ اس کے شیشے بھی سیاہ تھے مگر میں اس کا روک بچھا نہ تھا۔

دو اسکرین کے پیچھے میں نے خوفناک مونچھوں والے شوگر کو بھی دیکھا جس کے چہرے سے جلادوں جیسی خابثت اور بے رحمی نکلتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص کلاشکوف سنبھالے بٹھا تھا۔ پیچھے والا دروازہ کھلا تو میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی ایک لڑکی ماریا کو دیکھا۔ یہ کار بھی اسی کی تھی اس کا پیر اب اس اور چیف کا دست راست تھا۔ اس لڑکی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ماریا نے اسکرین کے کہا ”پوائنٹ نکل گیا تمہارا؟“ میں نے کہا ”ہاں“ مصروفیت میں دقت کا خیال ہی نہیں رہا۔

وہ مہنی خیز انداز میں ہنسی ”مصروفیت ہو فرخندہ جیسی تو ایسا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دینا بہتر سمجھا۔ وہ بہت عرصے سے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور اپنے باب کو بھی بتا چکی تھی کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ پسند بالکل یک طرفہ تھی اور بہت عرصے تک مجھے بھی اس کا علم نہ تھا۔ پھر جب اس نے

بڑھانے والا بھی میرے دوست کا بھائی تھا۔ ہم نے دو پہر کا ٹھکانا ہوٹل میں اکٹھے کیا۔ اسے میرے دوستوں نے برات کی دعوت قرار دیا۔ اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ فرخندہ با میرے رویے کی کون سی مجرم خاموشی تھی جسے ماریا نے محسوس کر لیا۔ عورت کے اندر کہیں ایک بھٹی جس کی ”چپ“ لگی ہوتی ہے جس سے وہ خطرے کو سونگھ لیتی ہے۔ ہم سے جو غلطی ہوئی تھی اس کا اندازہ مجھے ایک ہفتے بعد ہوا۔ ماریا نے ایک روز مجھے کینے میرا میاں پکڑ لیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے اسے مدعو کیا ”کیا بیوی

چاہئے یا؟“

اس نے کہا ”کچھ نہیں“ میرے ساتھ چلو۔“

میں بڑی مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا ”مائی بیلیور.....“

اس نے مجھے غور سے دیکھا ”کیا بات ہے آج کل تم

بڑے اچھے بچے بنے ہوئے ہو۔ بہت دلجوئی کرتے ہو

میری۔ کیا فرخندہ سے لڑائی ہوگئی ہے؟“

میں نے کہا ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں“ لیکن میں

نے دل ہی دل میں مانا کہ میرا دیہ زیادہ محتاط ہونے سے

قابل غور ہو گیا تھا۔ شوہر جب باہر کی عورت کے ساتھ چکر

چلاتا ہے تو گھر میں بیوی کے لیے زیادہ محبت جتانے لگتا ہے۔

ہر بیوی فوراً تازہ جاتی ہے کہ بدلے بدلے میرے سر کا نظر

آتے ہیں آخر بات کیا ہے؟

”آج کل تم فرخندہ سے ملتے ہی نہیں“ اس نے مجھ پر

نظر جما کے کہا۔

”تم کیا میری جاسوسی کرتی ہو؟“ میں نے برہمی سے

کہا۔

”کیوں نہ کروں..... حق بنتا ہے میرا؟“

”کس بات کا حق..... کیسا حق؟“ میرا پارا چڑھ گیا۔

اس نے میرے گلے میں اپنی ہاتھیں ڈال دیں۔ اس

وقت ہم یونیورسٹی کینے میرا کے باہر کھڑے کم سے کم پچاس

لاکھ لاکھوں کی نظروں میں تھے۔ وہ سب بھی لوہر ڈھکی

طرح کی کسی نہ کسی بیچ پر دو انگ پوز میں بیٹھے تھے اور اس

پارے میں کسی قسم کے احساس جرم میں مبتلا نہیں تھے مگر اس

قلبی اسٹائل میں عشق کی شہم میں حد سے نہیں بڑھ رہے تھے۔

میں نے اس کے ہاتھ جھک کے اسے دور کر دیا ”کیا تم

بالکل ہی پاگل ہو گئی ہو؟“

”ارے یار! جب چار کیا تو ڈرنا کیا“ اس نے کھسیانی

ہنسی کے ساتھ کہا کہ کیونکہ اس کے ساتھ میرے رویے کو سب

ماریا تہمیرا بہت تعریف کرتی ہے۔ پھر اس نے ماریا کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ایک عقیدہ بڑھا کہ دنیا کی کون سی خوتنی ہے جو اس کی بیٹی میں نہیں۔ پھر وہ دونوں اٹھ گئے اور مجھے ماریا کے سپرد کر گئے۔ میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔ میں نے ماریا کے ساتھ چاہئے لی۔

پھر اس کا گھر اور کمرہ دیکھا۔ اس کے بعد چٹکی کے ساتھ کھانا کھایا جس میں ماریا کی دو شادی شدہ بہنیں اور دو غیر شادی شدہ بہنوں کے بورڈ نے مجھے اچھے بندوں سے پاس کر کے بلور بہنوں کی تقریر کی منظوری دی۔ بورڈ کے جیتز میں میری دامادی کے کپس پر پہلے ہی سائیکل چکے تھے۔

اگلے دن میں نے یہ سب فرخندہ کو بتا دیا اور اسے

درپیش خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے پردہ پوز بھی کر دیا۔

”فرخندہ! ہمیں ملانا خیر شادی کر لینی چاہیے۔“

وہ گھبرا گئی ”ایسے کیسے..... ابھی تو.....“

میں نے کہا ”مگر ہم نکاح کر لیں اور کسی کو نہ بتائیں تو

ہماری تعلیم متاثر نہیں ہوگی۔ ویسے یونیورسٹی میں شادی شدہ

جوڑوں کے بڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔“

”میرے والدین نہیں مائیں گے رفتی!“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میرے والدین بھی نہیں مائیں

گئے۔ وہ کہیں گے اتنی جلدی کیا ہے؟ کوئی عمر ہے شادی کی“

پہلے بڑھاپی تمہارے اماں ابا کہیں گے۔“

”نہیں.....“ اس نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا

”دراصل..... میری مصیبت ہو چکی ہے“ باقاعدہ..... وہ بیک

وقت میرا چچا زاد اور خالہ زاد ہے۔ میرے اور اس کے ماں

باپ بھائی نہیں ہیں۔ قیامت آجائے کی دونوں گھرانوں

میں۔“

”یہ تم نے مجھے آج تک نہیں بتایا تھا! خیر..... اس سے

فرق نہیں پڑتا۔ شادی تو ہمیں کرنا ہے فوراً..... ایسا کرتے

تو نہ تم کی کو بتاؤ نہ میں بتاؤں گا۔ کل نکاح پڑھو اسکے

رجسٹریشن کرا لیتے ہیں۔“

مجھے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گی

”نہیں..... نہیں روئی..... میں نہیں کر سکتی۔“

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں پکڑ لیا۔ ”تمہیں میرا

ناکھٹا ہوا فرخندہ! ہم عاقل و بالغ ہیں۔ دنیا سے لڑ سکتے

ہیں۔“

وہ ناکھتی رہی اور نہیں نہیں کرتی رہی لیکن بالآخر مجبور

ہوئی۔ تین دن بعد ہم نے شادی کر لی۔ میرے چند دوستوں

کی موجودگی میں ہمارا نکاح ایک ہوٹل میں ہوا۔ نکاح

میں نے کہا ”ماریا! میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔“

”میں نے ابا کو بتا دیا ہے کہ میں صرف تمہارے ہر خوش رہ سکتی ہوں“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا ”بھیر..... انہوں نے کیا کہا؟“

”انہوں نے وہی کہا جس کی مجھے پوری امید تھی

انہوں نے کہا کہ ماریا! میری خوشی تمہاری خوشی سے الگ

نہیں۔“

میں نے ہمت کر کے کہا ”دیکھو ماریا! تم اچھی طرح

جانتی ہو اور یونیورسٹی میں سب ہی جانتے ہیں کہ میں فرخندہ

سے محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔“

”تو مت کرو۔ میں تو شادی کی بات کر رہی تھی۔“

کے بعد میں تمہیں محبت کرنا بھی سکھا دوں گی۔ ابھی تم فرخندہ

سے محبت کرتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں“ اس نے

جانتے جانتے کہا۔

یہ ایک واضح دھمکی یا چیلنج تھا۔ محبت کی یہ جگہ فرخندہ

بھی ہار جائے گی۔ جگہ جیتنے کے لیے وہ کیا کرے گی اگر

مصلحت مند ہو تو خود ہی سمجھ لو۔ اس کے باپ کے پاس اتنی

طاقت ہے کہ بیٹی کی خوشی ہر قیمت پر اسے فراہم کر سکتا ہے۔

دودن بعد مجھے اس کے گھر حاضری دینا پڑی۔ مجھے اہم

سے حکم ہوا تھا۔ میں ماریا کے کٹھن والے دو چار رگڑے لٹے

میں جاتا نہیں جاتا تھا لیکن ایک کار مجھے لے جانے کے لیے

آگئی۔ اس کار کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ کسی کے دروازے پر

اس کار کا نظر آتا تو ہی دہشت پیدا کرتا تھا جتنی غریب لگتی

میں آدمی رات کے وقت سی آئی والوں کی موبائل کنگ

ہے۔ لوگ کہتی تھیں وہ دیکھتے رہتے کہ وہ کس بد نصیب

کے دروازے پر رکتی ہے۔ جو اس میں جاتے تھے کم یا

خیریت سے واپس آتے تھے مگر ملک الموت کی طرح آتے

والوں کے ساتھ جانے سے انکار کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

ماریا کے گھر میں میرا استقبال قطعی غیر سرکاری انداز میں

یعنی بڑی اپنائیت کے ساتھ ہوا۔ اس کے باپ نے مجھے ڈیڑھ

شفقت کے ساتھ رہیو کیا اور کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کر

رہا۔ اس نے میری تعریف کی۔ میرے کام کی تعریف کی۔

یونیورسٹی میں میرے شاندار تعلیمی ریکارڈ کی تعریف کی۔

میرے گھر اور والدین کی تعریف کی۔ وہ اپنی بیٹی کی زبان

بول رہا تھا۔ پھر اس کی ماں صدمے داری ہونے کے لیے

آگئی۔ خالص زنانہ انداز میں اپنائیت کا اظہار کرنے کے

لیے اس نے کہا کہ جیٹا آج کیا کر دینا بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔“

کھل کے اشارے دینے شروع کیے اور مجھ سے ملنے کے بہانے تلاش کرنے لگی تو میں محتاط ہو گیا۔ میں نے واضح بے رخی کا انداز اختیار کر لیا اور اس سے ملنے سے گریز کرتا رہا لیکن

نداس نے شکایت کی اور نہ جوصلہ ہارا۔

وہ اچھی لڑکی تھی۔ خوبصورت اور خوب سیرت۔ کچھ

لوگ دیکھنا اس کا قرب حاصل کرنے کے مواقع کو اپنی خوش

نصیبی شمار کرتے مگر میں فرخندہ کو چاہتا تھا اور یہ بات سب ہی

جانتے تھے۔ اس کے مقابلے میں فرخندہ کی حیثیت کم تر ہی

سمجھی جاتی تھی۔ وہ ماریا کو مقابلہ حسن میں شکست نہیں دے

سکتی تھی۔ فرخندہ کا باپ ایک این جی اے کے کام کرتا تھا اور

آمدنی کے اعتبار سے میری طرح متوسط طبقے کا آدمی تھا مگر

اب نچلے متوسط طبقے میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کے مقابلے

میں ماریا کے باپ کے پاس تمام ناجائز ذرائع سے حاصل

ہونے والی بے حساب دولت تھی۔ وہ بہت بڑا بد معاش بھی تھا

اور چیف کا دست راست ہونے کی وجہ سے بے حد اثر رسوخ

کا مالک بن گیا تھا۔ ماریا ایک شوخ مزاج بلڈ گانڈ پینڈ کرنے

والی لڑکی تھی جبکہ فرخندہ طبعا خاموش اور الگ تھلگ رہنے

والی۔

سارا معاملہ تھا دل کا۔ پھر میں کسی ترازو سے تول کے

کیسے ماریا کے حق میں فیصلہ کرتا کہ مجھے اس سے محبت کرنی

چاہیے۔ بیشتر ہی لڑکے ایسی ہی ترازو ساتھ رکھتے تھے اور خود

لوگیاں بھی اتنی عقل مند ہو گئی تھیں کہ شادی کے لیے مشتق کرتے

وقت فلی ہیرد والی صفات کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔ ماریا

میرے معاملے میں ختم تھی چنانچہ میں نے اس کی دل شکنی

سے گریز کیا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں اس کے باپ

سے ڈرتا تھا۔

مختلف مواقع پر ماریا نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے لیے

فلاس طرم خان کے بیٹے کا رشتہ آٹھایا فلاں امیر زادے کے

گھر والے چکر لگا رہے ہیں مگر میں نے صاف انکار کر دیا

ہے۔ تنگ آ کے ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ تم ایسا کیوں

کر رہی ہو اور کر رہی ہو تو مجھے بتانے کا مقصد کیا ہے؟ اس

نے صاف کہا ”میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم سے شادی

کرنا چاہتی ہوں۔“

میں اس اعلان کی توقع نہیں رکھتا تھا میں نے کہا ”مجھ

میں کیا ہے ماریا! میں تمہارے قابل ہرگز نہیں ہوں۔“

”خود کو میری نظر سے دیکھو۔ مگر یہ تمہارے لیے ممکن

نہیں ہے۔ تمہاری محبت میں مجھے دل کے ساتھ دماغ کی

حمایت بھی حاصل ہے۔“

نے لوٹ کیا تھا "میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ آج رات کا کھانا تم کو ہمارے ساتھ کھانا ہے" اُنہا نے بلایا ہے۔
"میں نہیں آ سکتا" میں نے دھاڑ کر کہا۔

اس کی صورت پر شرمندگی کا رد عمل برہمی کے جذبات کا عکس بن کر نمودار ہوا "اب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنے والدین کو بل لارہے ہو ہمارے گھر؟"

"وہ کس لیے..... ان کا کیا تعلق تمہارے باپ سے؟"
"پیغام دے کر آئیں گے..... بایہ کام بھی مجھے کرنا پڑے گا۔ میں آؤں اپنے والدین کے ساتھ؟"

چنانچہ کیوں میرا دم مار غموں گیا اور غصے میں میرے منہ سے وہ بات نکل گئی جو کسی کو معلوم نہیں تھی "دیکھو ماریا! تم بھی سن لو اور اپنے اماں ابا کو بھی بتا دینا" میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔

"مگر کیوں.....؟" وہ غصے میں چلائی۔
میں نے کہہ دیا "اس لیے کہ میں فرخندہ سے شادی کر چکا ہوں۔"

چند لمبے خاموشی رہی۔ اس دوران مجھے احساس ہوا کہ غلطی سے ہی سبھی گھر میں نے اپنے پاؤں پر کلبھڑائی ماری ہے۔ ماریا کو یہ بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ وہ میری صورت دیکھتی رہی اور بہت جلد سچ کو سمجھنے میں کامیاب رہی "کیا کہا تم نے شادی کر چکے ہو؟" اس نے سچا لہجے میں سوال کیا "کب.....؟"

اب تردید لا حاصل تھی۔ میں نے کہا "ایک ہفتہ ہو گیا۔"

اس کی صورت کے تاثرات اس حد تک بدل گئے تھے کہ ماریا مجھے ایک انہنی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے غمزدگی کے آنے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اس کی انوکھلت سے دو چار کر دیا تھا۔ وہ غم خوردہ ناگن کی طرح اندر ہی اندر بے بسی سے تل کھا رہی تھی مگر اپنے ظاہری رویے سے یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھی کہ اس نے فرخندہ کی جیت کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا ہے۔

اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کے اپنا ہاتھ بڑھایا "میری طرف سے اسے بھی مبارکباد دیتا۔ مجھے امید ہے تم دونوں خوش رہو گے۔"

میں نے کہا "ماریا! آئی ایم سوری!"
وہ مسکرائی "رات ازاو کے۔ جب دو آدمی جو اکیلے ہیں تو ایک ضرور ہارتا ہے۔"
میں نے کہا "تم سے ایک درخواست ہے ابھی ہم نے

کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔"
وہ جاتے جاتے رک گئی "کیا مطلب..... کورٹ میرن کی ہے تم نے؟"

میں نے کہا "نہیں..... کورٹ میرن تو نہیں نکاح کر لیا ہے، دو گواہوں کی موجودگی میں..... اور کبھی....."
اس کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی "فکرت کرو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ فرخندہ کو بھی مت بتانا کہ تم نے مجھے شریک راز کر لیا ہے۔ اسے اچھا نہیں لگے گا۔"

اس کی بات مجھے مقبول لگی۔ میں نے فرخندہ سے کہہ نہیں کہا۔ ابھی اس بات کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے چیف نے طلب کیا۔ یہ چیف سے میری پہلی براہ راست ملاقات تھی ورنہ اس کے احکامات مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار اس نے فون پر مجھے شاباش بھی دی تھی۔ میں مشکل دیکھ میں پڑ گیا۔ میرے دوستوں کو یقین تھا کہ مجھے تنظیم میں کوئی ذمے داری سونپنے کے لیے طلب کیا گیا ہے کیونکہ میری کارکردگی کا گراف مسلسل اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا اعتراف ہائی کمان کی طرف سے کسی نہ کسی صورت میں ہونا رہتا تھا۔

چیف سے ملاقات کا عمل بہت پرسرار اور دشوار تھا۔ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا۔ ایک گاڑی سے میں دوسری میں سوار ہوا۔ پھر نہ جانے کتنے دروازوں سے گزرا۔ دو سو تینے نیچے اترا، معلوم نہیں اتنی گہرائی میں واقع وہ خانہ کہاں تھا؟

بالآخر ایک کمرے میں پٹی کھول دی گئی۔ اس سے پہلے میری عمل تلاشی کپڑے اتار کے لی جا چکی تھی۔ یہ کمرہ مشکل سے آٹھ فٹ لمبا چوڑا اور اونچا تھا۔ اس کی دیواریں بالکل سیاہ تھیں۔ دروازہ صرف ایک تھا اور فرش پر دو کرسیوں کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک کرسی پر چیف پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ نہیں کیا۔ اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کسی فائنٹ تنظیم کے لیڈر کی طرح وہ اپنی خفیت کا ایک دہشت زدہ کرنے والا انج تھم رکھتا تھا۔

چیف چھ فٹ قد کا گورا چٹا آدمی تھا۔ بہت پہلے جب معمولی اسٹوڈنٹ لیڈر تھا "اس کی داڑھی نہیں تھی۔ اب وہ ہر تصویر میں فریج کٹ داڑھی کے ساتھ نظر آتا تھا۔ اس نے میچنگ ٹائی کے ساتھ بہترین سلا ہوا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کوئی بہت بیش قیمت فرانسسی خوشبو لگا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سرخ شراب کے دو جام تھے۔
ایک اس نے مجھے تمہارا "رفیق احمد! تمہاری صحت کے

میں نے بڑی مشکل سے کہا "اس بات کا کیا ثبوت ہے چیف!"

اس نے کہا "میں بات کا؟"
میں نے کہا "میں کہہ رہا ہوں کہ سب انہوں نے لکھا ہے؟"
"اوہ..... میں سمجھا، تم اپنے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ اس شخص کے خلاف بہت ثبوت ہیں۔ گواہ بھی ہیں۔ طرز تحریر اس کا ہے۔ ہم نے ایک مسودہ بھی پڑا ہے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔"

میں نے تھوک گل کے کہا "فرض کیجیے ایسا ہے چیف....."

اس نے میری بات کاٹ دی "فرض کرنے والی کوئی بات نہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے" کیا اسے اندر کی انفارمیشن تم دیتے ہو؟"

میرا طعنے شگ ہوئے لگے "یہ غلط ہے چیف!"
"تم اس کی بیٹی سے ملے ہو نا..... اس سے محبت کرتے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں..... وہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔"
"ایڈمیٹ! تمہاری عقل میں یہ معمولی سی بات کیوں نہیں آتی، اس نے اپنی لڑکی کو تمہارے پیچھے لگا دیا ہے۔ وہ تم سے سب اگلا جی ہوگی۔ عشق میں آدمی خود عقل کا دشمن ہو جاتا ہے۔"

میں نے بڑے اصرار سے کہا "نہیں چیف! میں نے آج تک فرخندہ سے سیاسی معاملات پر کوئی بات نہیں کی مجھے آخر کیا.....؟"

"تم کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا رفیق!" اس نے میری بات کاٹ دی "شک برا اور راست تم پر جا رہا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ چیف کا ذہن میرے خلاف کر دیا گیا ہے۔ وہ مجھ سے بدظن ہے اور میرا اپنی صفائی میں کچھ کہنا اسے قائل نہیں کر سکتا۔ میری تردید سے اس کا سوڈ خراب ہو رہا تھا۔ وہ غیر مشروط اطاعت مانگتا تھا اور اختلاف بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کا حراج اس حد تک آمرانہ تھا کہ (نہوڈ باندھ) وہ اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو حکم خداوندی سمجھتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ دوسرے بھی سمجھیں۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا چیف!"
"مسئلہ صیب فتنہ کا ہے، ختم کر دو۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ تنظیم کے مسائل کو حل کرنے کا یہی

لیے۔
میں اتنا بے بس اور مفلوج ہو گیا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا مالاٹک میں نے پہلے بھی شراب نہیں لی تھی مگر میں نے نہ صرف یہ کہ جام لے لیا بلکہ اس کے ساتھ جام اٹھا کے ٹکرایا اور لپکا۔
"رفیق احمد! شعبہ نشر و اشاعت میں تم بہت اچھا کام کر رہے ہو۔ تنظیم کو عوامی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔" اس نے اٹھ کے بیٹھے ہوئے کہا "لیکن تمہاری توجہ ایک پہلو پر نہیں ہے۔"

میں نے کہا "وہ کیا چیف!"
"تم دشمنوں کے مخالف پروپیگنڈے کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہو۔ کچھ لوگ ہمارے خلاف زہر اگل رہے ہیں۔"

میں نے کہا "کون لوگ چیف؟"
اس نے کہا "مگر شہزادہ کچھ کتا بچے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں بہت خطرناک مواد موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گھر کا کوئی بھائی لڑکا ڈھانچا جاتا ہے۔ یہ انفارمیشن سچ ہے رفیق! کیا تم دیکھو گے؟"

"لیس چیف!"
وہ دروازے سے باہر گیا اور چند منٹ میں لوٹ آیا۔ اس نے مجھے تین کتا بچے تھما دیے۔ "ان کے علاوہ ایک پوز بھی پڑا گیا ہے۔ ہمارے اندر کے راز ان کی صورت باہر نکل رہے ہیں۔"

"ایسا کون ہو سکتا ہے چیف!" میں نے کتا بچے دیکھ کر کہا۔

اس نے ساٹ لہجے میں کہا "یہ غالباً تم ہو۔"

مجھ پر جیسے بجلی سی گری "میں..... میں چیف!"
"لیس! تم صیب فتنہ کو جانتے ہو؟"

کمرامیری نظروں کے سامنے گھومتے لگے۔ صیب فتنہ فرخندہ کے والد کا نام تھا۔

چیف نے اپنی بات جاری رکھی "وہ ایک این جی او کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ کچھ خواتین کے حقوق کی جدوجہد کا ڈراما ہے۔ وہ ان کے سارے اسکرپٹ لکھتا ہے۔ ابھی ایک ٹھیکر ہمارے پاس بھی کی تھی۔ اچھا لکھنے والا ہے مگر اسے پیسے بہت کم ملتے ہیں۔ ہم نے اسے پیغام دیا تھا کہ ہمارے لیے لکھے لیکن وہ بد بخت ہمارے دشمنوں کے ساتھ مل گیا۔ ظاہر ہے صرف پیسے کے لیے۔ جیسا تو ہم دس گنا دیتے مگر اسے کچھ نظر نہ آتی اختلاف کا مرض لاحق تھا۔"

انداز تھا لیکن یہ انتہائی قدم تھا۔ پہلے وہ اپنے خالقین کو خبردار کرتے تھے، پھر انہیں انکار کے کسی زیر زمین مہموت خانے میں پہنچا دیتے تھے۔ یہ تارچر سیل کہاں تھے اور وہاں کیا ہوتا تھا؟ انہیں کون چلاتا تھا؟ اس بارے میں میری معلومات ہی سنائی باتوں تک محدود تھیں۔ تنظیم میں ایک شعبے کو دوسرے شعبے کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ ہر شخص اگر اپنے کام سے کام نہیں رکھتا تھا تو سزا پاتا تھا۔ تارچر سیلوں کے بارے میں پبلک میں بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ یہ باتیں دہشت کی فضا قائم رکھنے کے لیے پھیلائی جاتی تھیں۔

جو لوگ ایک دفعہ کے سمجھانے سے نہیں سمجھتے تھے ان کو تارچر سیل پہنچا دیا جاتا تھا۔ تنظیم کی اصطلاح میں ان کا نام ریفرام سینٹر تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ریفرام سینٹر میں کتنے لوگ پہنچائے گئے اور وہاں ان پر کیا مژری کیونکہ جو اتنے خوش قسمت ہوتے تھے کہ زندہ سلامت اور بھائی ہوش دھواں لوٹ آئیں وہ زندگی بھر کی خاموشی بھی ختم نہیں کرتے تھے۔ جو اصلاح کے عمل کی تاب نہ لاتے ہوئے تنظیم کی اصطلاح میں خرچ ہو جائیں ان کا حساب کسی سے طلب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو لوگ غائب ہو جاتے تھے ان کے بارے میں کوئی کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا تھا۔ لواحقین عدالت عالیہ تک چلے جائیں تو ”قانون نافذ کرنے والے اداروں“ کے سب نمائندے سے حلف نامے داخل کر دیتے تھے کہ مذکورہ شخص ان کی تحویل میں نہیں ہے۔

”تمہاری اس خاموشی کا کیا مطلب نکالا جائے رہیں؟“ چیف کی آواز گونجی۔

میں چونکا ”جی..... کچھ نہیں..... میرا مطلب ہے اگر آپ کسی طرح حبیب غففر کو خبردار کر دیتے..... یا اس کی اصلاح.....“

اس نے دھاڑ کے کہا ”شت اپ۔ آج تک کسی نے مجھے یہ بتانے کی جرات نہیں کی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ تمہاری پہلی غلطی ہے اس لیے معاف کر رہا ہوں۔“

میرے جسم پر خوف سے ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا ”چیف.....! اس کی بیٹی.....“

”وہ تمہاری بیوی ہے“ چیف نے اچانک اپنا لہجہ بدل لیا ”مجھے معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تنظیم میں شامل ہو اور تمہاری طرح اپنی کارکردگی ثابت کرے۔ تم نے اس سے شادی کی ہے تو یہ بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ اب تم پاسکتے ہو۔“

مجھ پر اس کی اتنی دہشت سوار تھی کہ میں چیف سے یہ بھی

نہ کہہ سکا کہ میں فرخندہ کے باپ کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔ اس جرم کو کچھ بھی ہو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اس بات کا اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا تھا کہ یہ شراکتی کسی نے کی ہوگی۔ مگر اپنے باپ کے سامنے جا کے روئی ہوگی اور اس کے باپ نے کہا ہوگا کہ بیٹی اپنے آئسو پونچھ لے روئے والے وہ ہوں گے جنہوں نے تجھے دکھ دیا۔ اب وہ کبھی نہیں رو سکتے۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ فرخندہ کے باپ نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ اس نے کوئی کتابچہ نہیں لکھا تھا۔ تنظیم کے خلاف کوئی تحریر چھاپی تھی۔ چیف نے مجھے جو کتابچے دکھائے ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ صرف مجھے دکھانے اور قائل کرنے کے لیے چھاپے گئے تھے اور شاید ان کی ایک ایک کاپی ہوگی جو بعد میں تلف کر دی گئی ہوگی۔

میں تین دن تک سخت ٹینشن میں رہا کہ بلاچوں و چرا چیف کے احکامات پر کیسے عمل درآمد کروں یا کراؤں؟ اصولی طور پر یہ کام میرا نہیں تھا مگر میں چیف کے سامنے ایسا کہتا تو یہ اسے اپنی غلطی کا احساس دلانے کے مترادف اور ایک ٹھنک جرم ہوتا۔ مجھے رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔ میں یونیورسٹی بھی نہیں گیا تھا کہ فرخندہ کا سامنا نہ ہو ورنہ میری حالت دیکھتے ہی وہ تازہ جائے گی کہ میں کسی پریشانی کا شکار ہوں۔ میں نے سوچا کہ فرخندہ سے بات کروں اسے تنظیم سے میری وابستگی کا تو اندازہ تھا اور وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی مگر اسے یہ علم نہیں تھا کہ اپنی ”کارکردگی“ کی بنا پر میں تنظیم کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ پھر میں نے اس کے باپ سے براہ راست معلومات حاصل کرنے اور اسے سمجھانے یا خبردار کرنے کا سوچا۔ اسی شش و پنج میں تین دن گزر گئے۔

خود چیف شاید اتنا بے رحمانہ فیصلہ نہ کرتا۔ وہ میری سابقہ خدمات کے پیش نظر میری بیوی کو اس معاملے سے الگ رکھتا مگر اسے بھڑکانے اور انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرنے والا اس کا دست راست ماریا کا باپ تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ یہ لوہڑا بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس لڑکی کی بات کو آپ کی بات سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تین دن میں اس نے کچھ نہیں کیا۔ اب آپ کو کچھ ضرور کرنا چاہیے ورنہ کل کو تنظیم کے دوسرے ماتحت اس نا فرمانی سے شہ پائیں گے۔ یہ کہا جائے گا کہ اب آپ کی تنظیم پر گرفت مضبوط نہیں رہی۔

چیف کی بھی کمزوری تھی۔ اس نے تنظیم کے تادیبی شعبے کو حکم دیا کہ فرخندہ کے باپ کو ایسی سزا دی جائے جس سے مجھے عبرت حاصل ہو۔ تنظیم کے ڈی۔جی۔ اسکواڈ میں انتہائی سفاک بے رحم اور درندہ صفت افراد شامل تھے۔ وہ ہر بہت

کے مظاہرے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ خوزیری ان کی سرشت میں چھپے ہوئے حیوان کی بھوک مناتی تھی۔ عرف عام میں وہ شیطان کے چیلے بھلاتے تھے۔

چوتھے پانچویں دن میں یونیورسٹی گیا تو مجھے احساس ہوا کہ دوست اور کلاس فیلو مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ مجھ سے کتار پر تھے اور اپنی آنکھوں میں چھپے کسی سوال کو پوچھنے سے گریز پانظر آتے تھے۔ بالآخر میں نے ایک لڑکے کو پوچھا۔

”یار! کیا میرے سر پر راتوں رات سینگ لگ آئے ہیں؟ ایسی کیا بات ہوئی ہے؟“

اس نے بہت سوچ کے اور میری صورت پر غور کر کے کسی حد تک دھکی خوف زدہ اور ہورد لہجے میں کہا ”تجھے نہیں معلوم؟“

”کیا نہیں معلوم؟“

”یار..... وہ سب جو اخبارات میں شائع ہوا ہے؟“ وہ بھی دامن چھڑا کے بھاگنے لگا۔

”کیا شائع ہوا ہے؟“

”تو خود اخبار دیکھ لے یار!“ وہ راستہ کاٹ کے نکل گیا۔

جب میں نے کینے میرا میں جا کے اخبار دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہاں میرے آنے سے پہلے بھی میں ہی موضوع بحث تھا اور اچانک وہاں ایک پراسرار مٹی خیز اور پوہل خاموشی مسلط ہوئی ہے۔ وہ سب دیکھ رہے تھے کہ میں اخبار دیکھ رہا ہوں۔ چند منٹ میں کینے میرا یا خالی ہو گیا۔

لیکن مجھے اس کا پتا نہیں چلا۔ میری نظریں فرخندہ کی لاش پر جم کر رہ گئیں۔ لاش کے حوالے سے ایک خبر صفحہ اول پر پراس میں لگی تھی۔ گزشتہ رات نامعلوم افراد نے فلاں اینجی کے اسکرپٹ رائٹر کے گھر میں داخل ہو کر اعلیٰ خانہ کو زخمی کیا۔ لوٹ مار کی اور غالباً مزاحمت کرنے پر اسکرپٹ رائٹر کو زخمی کر دیا۔ ان کی بیوی جس کے جگر کے سرطان کی تشخیص تین ماہ قبل ہوئی تھی فلاں اسپتال کے آئی سی یو میں داخل ہے۔ ان کی بیٹی کی لاش کمرے میں چھت کے نیچے سے لٹکی پائی گئی اور پولیس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حملہ آوروں نے اس کی اجتماعی اور درزی کرنے کے بعد اسے بھی قتل کر دیا لیکن اسے خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ حملہ آور اپنے ساتھ کیا لے گئے۔ یہ بتانے والا کوئی نہیں۔ مرنوم کا ایک بیٹا باہر ہے۔ یہاں وہ ایک ہی لڑکی کے ساتھ رہتے تھے جو یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ باقی سب وہی کو اس

تھی کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے اور فلاں نے کہا ہے کہ مجرم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ فلاں نے سخت دکھ اور فلاں نے تشویش کا اظہار کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس خبر کی تفصیل میں ایک بات نہیں تھی۔ فرخندہ کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی رہتا تھا جس کی عمر دس سال تھی۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں تھا کہ وہ واردات کے وقت کہاں تھا۔ نو دس سال کا بچہ کسی اسپتال میں ماں کے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً آئی سی یو۔

میرا خیال تھا کہ میں خودکشی کر لوں گا، پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ میں پولیس کے پاس جا کے اس قتل کے اسباب اور قاتلوں کو بے نقاب کر دوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ چیف کو قتل کر دوں۔ ماریا کے باپ کا مرڈالوں اور ماریا کی لاش کو اسی طرح نیچے سے لٹکا دوں۔

لیکن یہ سب ایک خیالی پاگل پن تھا۔ نہ میں کچھ کرنے کی ہمت رکھتا تھا اور نہ کر سکتا تھا۔ چیف تک تو میری رسائی بھی نہ تھی جو بھی اس کے سامنے جاتا تھا اس کے کپڑے اتار کے تھلائی لی جاتی تھی۔ وہ باہر نکلتا تھا تو سسجھا محفلوں کے زمرے میں اور سیاہ شیشوں والی گاڑی استعمال کرتا تھا۔ یہ گاڑی بدلتی رہتی تھی۔ ماریا اور اس کے باپ کو قتل کیا جاسکتا تھا۔ میں پولیس یا عدالت میں جا کے اپنا بیان بھی ریکارڈ کر سکتا تھا مگر یہ خودکشی سے بھی بدتر ہوتا۔ نہ پولیس مجھ پر یقین کرتی نہ عدالت۔ نہ میرے پاس کوئی ثبوت تھا اور نہ گواہ۔ میری کسی بھی جذباتی حماقت کا خیارہ میرے ساتھ میرا پورا خاندان بچھتے پر مجبور ہوتا۔

چنانچہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ سوائے رونے کے۔ میرا دماغ تقریباً خراب ہو گیا تھا۔ ایک آواز میرے اندر سے مجھے اعتراض جرم پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ مان لو کہ فرخندہ کی بے آبرودموت کے ذمے دار تم ہو۔ نہ تم اس سے محبت اور شادی کرتے نہ اس کی جان اور عزت جانی۔ تم اندازہ کر سکتے تھے کہ ماریا کا رد عمل کیا ہوگا اور اس کا باپ کیا کر سکتا ہے مگر تم نے اس کے باوجود فرخندہ کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کیا تھا اگر تم ماریا کو نالتے رہتے۔ مملکت سے کام لیتے فرخندہ کی جان کو یوں داؤ پر نہ لگاتے۔ اسے چھوڑ دیتے، تمہیں لے کر بھاگ جاتے، محبت کرتے تھے تو کچھ کر کے دکھاتے۔

رات کو فرخندہ مجھے تسلی دیتے آ جاتی تھی۔ خود کو قصور وار مت سمجھو اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ پھر میرے سامنے اس کی نیچے سے جھبکی ہوئی لاش آ جاتی تھی اور میں دہشت زدہ ہو کے اٹھ بیٹھتا تھا۔ اپنے طور پر میں

میں نے کہا ”یہ بھی لازمی نہیں، ہم باہر سیٹل ہو سکتے ہیں۔“

”کیا تم اپنے ماں باپ سے ڈرتے ہو؟ وہ نہیں مانیں گے؟“

میں نے کہا ”ہاں۔۔۔۔۔ اور میں ان کی مرضی کچھ بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اگلو بیٹا ہوں۔“

”مگر وہ نہ مانے۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔؟“

میں نے جس کے کہا ”یہ ناممکن ہے کہ وہ میری خواہش پوری نہ کریں اور پھر تم جیسی لڑکی انہیں دل و جان سے قبول ہوگی۔ وہ چراغ لے کر ساری دنیا میں تلاش کرتے رہیں جب بھی ایسی جگہاں ملے گی انہیں؟“

وہ خوش ہوئی ”لیکن یہ بچہ۔۔۔۔۔ کیا انہیں صدمہ نہیں ہوگا؟“

میں نے سوچ کے کہا ”چلو یہ مسئلہ ہی ختم کر ڈالبارش کرالو۔“

”ابارشن۔۔۔۔۔؟“ وہ فکر مند ہوئی ”مگر کیسے۔۔۔۔۔ اور کہاں سے؟“

”یہ انتظام میں کرلوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ فکری کوئی بات نہیں بچے بہت ہوں گے شادی کے بعد۔“

وہ ماں کی اندر میں نے ایک پرائیویٹ میٹرنی ہوم سے اس کا ڈی این سی کرادیا۔ اس میں میرے دس ہزار خرچ ہوئے لیکن میں نے اسپتال سے وہ ساری روپوش لے لیں جن میں ماریا کا اصل ماں مع والد کے نام کے موجود تھا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ میری بیوی ہے مگر اس کا نام ماریا ریٹش نہیں ماریہ لطیف لکھوایا تھا۔ یہی نام اس کی پریکٹس رپورٹ پر بھی تھا۔

ماریا ایک سبیلی کی شادی کا بہانہ کر کے گھر سے گئی تھی اور صرف ایک رات اسپتال میں گزار کے لوٹ آئی۔ پروگرام کے مطابق میں نے پلان کے آخری مرحلے میں ماریا کے ساتھ آخری رات اسی سرکاری ہسپتال میں گزار دی لیکن اس رات کے لیے میں نے خصوصی انتظامات کیے تھے۔ نصف شب کے بعد تک ہم سمندر میں نہاتے رہے اور پھر ہٹ میں جو کچھ کرتے رہے اس کی مخصوص زاویے سے فلم بندی و ذخیرہ کمرے کرتے رہے۔ یہ کمرے اندھیرے میں بھی اتنی ہی صاف منظر کشی کر سکتے تھے جتنی دن کے اجالے میں اور ایک چھوٹے سے ریوٹ سے کنٹرول ہوتے تھے۔ میرا چہرہ کسی منظر میں کسی نوادے سے سامنے نہ آیا۔

رات کے آخری پہر میں چار افراد نہاتے ہوئے اندر

دکھی کو راز دار بنا کے کچھ کہے گی نہ میں کسی کو بناؤں گا کہ میں ماریا کو چاہنے لگا ہوں۔ لڑکوں کی تو کوئی بات نہیں ان کا فلسفہ ہے کہ لڑکی اور برس کے مچھ ہو جانے کی کیا فکر کرنی۔ ایک مٹس ہوگئی تو دوسری آگئی ہوگی مگر لڑکیاں مجھے بہت لعنت ملات کریں گی وغیرہ وغیرہ۔ ہم ٹیلیس مگر مگر باہر۔ کسی کے سامنے نہیں۔ ماریا میری باتوں میں آگئی۔ وہ مجھے اتنی جلدی دوبارہ حاصل کر لینے پر اتنی خوش تھی کہ اس نے میری ہر بات مان لی۔

ہم شام کو یارات کو اکٹھے گھومتے تھے۔ ہوٹلوں میں جاتے تھے لائیک ڈرائیو کرتے تھے اور ساحل سمندر کے کسی کالج میں یا کسی مضامینات کے فارم ہاؤس میں پبلک مناتے تھے۔ میرے عشق کے والہانہ پن نے اسے اتنا بے خود کر دیا تھا کہ کسی تذبذب یا محنت کے بغیر میں نے جب چاہا اس نے خود کو میرے سپرد کر دیا۔ مجھ پر مکمل اختیار کے نئے میں وہ اتنی مدد ہوئی کہ اسے نتائج کی کھلی فکر نہ تھی۔ اس نے مجھ سے اجازت کر لیا تھا کہ فرخندہ سے محبت اور شادی میری بے دلتی تھی اور اس لڑکی کے لیے ماریا کو ٹھکرانے کے میں نے تمنا کیا تھا۔ اسے کوئی شک نہ تھا کہ سفر ختم ہوتے ہی میں اپنے والدین کے ساتھ ان کے گھر آؤں گا اور ہم نتیجہ آنے سے پہلے ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ جو ازدواجی تعلقات ہمارے درمیان موجود تھے اس پر ماریا کسی احساس جرم و دماغ میں مبتلا نہ تھی۔

دوسرے مینیجمنٹ میں اس کے پریکٹس ٹیسٹ کی رپورٹ پوزیٹو آگئی تو میں نے اسے تسلی دی کہ ”پریکٹس کی کیا بات ہے؟ ہم تو جانتے ہیں ناں کہ بچہ ہمارا ہی ہے۔“

اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا ”لیکن ریٹش! دنیا کیا کہے گی۔ اگر شادی کے چار ماہ بعد ہی بچہ ہو گیا؟“

ہم اس وقت ساحل سمندر کے ایک سرکاری گیٹ ہاؤس میں تھے جہاں ہمیں پوری غلط میسر تھی۔ میں نے کہا ”دنیا کی ایسی تھی۔“

اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا ”ریٹش! ڈیڑی کی عزت کا معاملہ بھی تو ہے۔“

میں نے کہا ”آخر تم کیسی جاہلی ہو؟“

”ہم فوراً شادی کر لیں۔“

”میرا خیال ہے یہ مسئلہ دوسرے طریقے سے بھی حل کیا جاسکتا ہے۔ شادی کے بعد ہم باہر چلے جائیں۔“

”اس سے بچنے کی پیدائش سوخو تو نہیں ہوگی۔ ہمیں واپس تو آنا ہوگا کبھی نہ کبھی۔“

اور قابل اعتماد دوست ثابت ہوئے۔ انہوں نے میری اور فرخندہ کی محبت یا شادی کے بارے میں بھی کسی کے سامنے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ نو جوانی کے اندھا کر دینے والے جذبات میں ہم کتنا آگے بڑھ گئے تھے۔ میری عمر اس وقت صرف بیس سال اور فرخندہ کی اٹھارہ سے کچھ اوپر تھی چنانچہ ہمیں یہ خوش گمانی بھی تھی کہ اب ہم عاقل و بالغ ہیں اور اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا قانونی حق رکھتے ہیں۔ اگر ہم جذبات پر قابو رکھتے، مصلحت کو سمجھتے اور معاملات اپنے والدین کے سپرد کر دیتے تو کوئی خرابی نہ ہوتی لیکن یہ خیالات وقت کے ساتھ حاصل ہونے والی شعور کی چنگی کا نتیجہ ہیں اور آٹھ سال گزر جانے کے بعد فرخندہ ماضی کی ایک بھولی بھری یاد بن چکی ہے۔

فرخندہ کی موت نے مجھے بہت بڑا الجھن دیا تھا۔ میں اس صدمے سے سنبھل گیا تھا اور میری سوچ میں زندگی بدل دینے والی تبدیلی آگئی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ جس راستے پر میں چل رہا ہوں اس میں میرے لیے کوئی کامیاب مستقبل نہیں۔ مجھے اپنا راستہ بدلنا ہوگا اپنے ماضی کے ہر آسیب سے چمکارا حاصل کیے بغیر میں کامیابی حاصل نہیں کر پاؤں گا۔

میں نے سنجیدگی سے تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اپنے والدین سے پوری طرح تعاون کیا اور انہیں یقین دلایا کہ آہستہ آہستہ میں خود کو تنظیم سے الگ کر لوں گا۔ میں پھر یونیورسٹی جانے لگا اور وہاں میں نے مشہور کیا کہ والدین مجھے ماسٹری ڈگری کے لیے ہارورڈ بھیج رہے ہیں۔ پچھ مینیجمنٹ میں پاکستان سے چلا جاؤں گا۔ تاہم میں نے ختم کو یقین دلایا کہ امریکا میں رہ کے بھی میں تنظیم سے تعاون جاری رکھوں گا اور جب واپس آؤں گا تو میری خدمات تنظیم کے لیے وقف ہوں گی۔

ماریا دو مینیجمنٹ میں دور رہی۔ پھر میرا موڈ دیکھتے ہوئے اس نے دوبارہ مجھے محصور کرنے کا پلان بنایا۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب آئے گی اور میں نے بھی یہ ظاہر کیا جیسے میں اس کے ہمدردانہ رویے سے متاثر ہو رہا ہوں۔ ایک پلان میرے ذہن میں بھی تھا۔ میں نے ماریا کی حوصلہ افزائی کی لیکن اس سے کہا کہ فرخندہ کی موت کے بعد میں بہت ڈرتا ہوں۔ ہم اپنے عشق کی تصویریں کریں گے۔ یونیورسٹی میں ملنا تو درکنار ہم ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کریں گے۔ ہمارے درمیان مکمل انجینیت کی خلیج سب کو نظر آئی چاہے۔

سکون آور گولیاں نکلنے لگی۔ میں اپنے والدین کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ میری حالت سے اتنے پریشان تھے کہ ایک دن مجھے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر ابا کے بچپن کا دوست تھا۔ اس نے کہا کہ لڑکے کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ ایک رات میں اس نے رازداری کے وعدے پر مجھ سے سب اگلوایا۔

دیسے تو دقت ہر زخم کا مرہم بن جاتا ہے مگر مجھے نارتل زندگی کی طرف لوٹانے میں اس ڈاکٹر کا بہت ہاتھ رہا۔ اس نے دو انیس کم دیں۔ باتیں زیادہ کرتا رہا۔ وہ میرا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ میرے دماغ سے انتظام کی دیوانگی کو نکالتا رہا۔ اچھے مستقبل کے لیے جذبات کے بجائے عقل سے کام لینے کی ترغیب دیتا رہا۔

ایک مینیجمنٹ بعد میں یونیورسٹی گیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ فرخندہ کو سب بھول گئے تھے۔ ایک طرف رشتوں کی زنجیر تھی دوسری طرف جبر کی۔ میں محض ایک قیدی تھا جو اپنی مرضی سے کچھ کر سکتا تو اس دنیا کو تباہ کر دیتا لیکن میں پھر بھی حالی میں لگ گیا اور فرخندہ کو بھلانے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن انتظام کی آگ میرے وجود کے اندر لٹکتی رہی۔

میرے ابا کے ڈاکٹر دوست نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ریٹش کی زندگی عزیز ہے تو کراچی چھوڑ دو۔ وہ یہاں رہے گا تو اس ماحول سے نجات نہیں ملے گی اور نہ وہ تنظیم کے چنگل سے نکل سکے گا۔ بے شک تنظیم کا دائرہ پاکستان کے دیگر صوبوں تک پھیلا ہوا ہے لیکن یہ لاہور یا اسلام آباد میں انجینی ہوگا۔ یہاں اسے دباؤ میں رکھنے والے پرانے سامی ہیں اور یہ کراچی میں رہا تو انہی کے ہاتھوں مارا جائے گا جن کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔

ابا کو قدر پر کا انجام دیا تھا۔ انہوں نے اپنے دوست کی بات مان لی۔ وہ پھر اترتے اور محکمہ تعلیم میں گریڈ اٹھارہ کے ملازم۔ ان کو لاہور فرانسفر کرانے میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا۔ کچھ سفارش اور کچھ رشوت دینے کے بعد ان کی درخواست قبول کر لی گئی لیکن اسلام آباد کے بجائے انہیں لاہور بھیج دیا گیا۔ یہ 1998ء کی بات ہے۔ وہ میرا بی کام آنرز کا آخری سمسٹر تھا۔ ابا اکیلے ہی لاہور گئے۔ وہ ڈاکٹر انکل کو پاور آف انٹاریٹی دے گئے کہ مکان کو فروخت کرادیں اور چار ماہ بعد میرے فاضل سمسٹر کے امتحان ختم ہوتے ہی مجھے ادارہ کی کوٹھا موشی سے لاہور روانہ کر دیں۔

ڈاکٹر انکل کے کردار کی عظمت کو میں آج بھی سلام کرتا ہوں۔ وہ میرے والد کے ہی نہیں میرے بھی سب سے محض

صدے سے اس نے ایک چیخ ماری ”رفیق! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”شنو رائی! تمہارے مطلب میں آنے والے بدجامیں دیں گے۔“

”تم بھول رہے ہو آج اتوار ہے“ شہناز نے کہا۔
راجا نے سر پر ہاتھ مارا ”یار! کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اپنے ہونے والے شوہر پر شک کرنا اور سائے کی طرح اس کے تحتاب میں رہنا۔ ہم کی غلط جگہ نہیں جا رہے ہیں۔“
”تم رشتہ میں بھائی کے ساتھ ہو تو مجھے یہ خطرہ بہر حال نہیں۔ مگر تمہیں کیا پریشانی ہے میرے ساتھ جانے سے؟“
راجا نے کہا ”ہم راستے بھر بہت بے شرعی کی مردانہ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ تم سن کے کیا کرو گی؟“

”میں کان بند کر لوں گی۔ ایر پلگ سے“ میں آگے بیٹھ کے ڈرائیونگ کر دوں گی۔ تم دونوں پیچھے بیٹھ کے باتیں کرنا انگریزی میں وہ نہیں سمجھتی۔“

راجا کے لیے اس کے بعد تسلیم خم کیے بنا چارہ نہ تھا۔ جب شہناز نے راستے کے لیے کھانا چائے اور دیگر لوازمات رکھوائے تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے سفر کی تیاری خالص زائد انداز میں پہلے ہی کر لی تھی۔

شہناز کی ڈرائیونگ راجا سے اچھی تھی لیکن راجا بے بات تسلیم نہیں کرتا تھا۔ شہر کے راستوں پر بڑھک مچ کے وقت کچھ زیادہ تھی۔ ملتان روڈ سے نکلنے میں ہی ہمیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ راجا کو میں نے اپنے ساتھ پیچھے بٹھالیا تھا کیونکہ مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی تھیں اس کے لیے میں نے شہناز سے معذرت کر لی تھی۔

راجا نے خود ہی کچھ دیر بعد کہا ”میں صبح سے دیکھ رہا ہوں تو کسی الجھن کا شکار ہے۔ میں نے گھر پر شہناز کے سامنے بات نہیں کی تھی۔“

میں نے شہناز کی طرف دیکھا۔ اس کی ساری توجہ ڈرائیونگ پر تھی ”یار راجا! میں نے اس بندے کو پہچان لیا ہے۔“

”کس بندے کو؟“
میں نے کہا ”وہی جو ہمیں پریس کلب میں نظر آیا تھا۔“
راجا نے سر ہلایا ”کون ہے وہ؟“
میں نے کہا ”نام تو معلوم نہیں ہے مجھے اس کا لیکن وہ فرخندہ کا بھائی ہے۔“

اس نے بے خیالی میں کہا ”فرخندہ کون؟“
میں نے ایک غصہ کی سانس لی ”واقعی..... وہ ایک بھولا برنامہ ہو گئی ہے۔“
راجا چونکا ”وہ.....؟ جو یونیورسٹی میں تیرے ساتھ

میں نے کہا ”ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو۔ مگر چپ کر وہ کل تو آئی ہے یہاں کب تک بھی رہ سکتی ہے؟“

”اس کی فکر مت کر ٹھیکہ پتر! ایک طریقہ تو ہے شرعی کہ اسے بند کر دیں مثل کاک میں۔ مفسر سلطان کالے مند والا خود بین سے دیکھے یا ایکس رے کرائے۔ خاک پتا نہیں چلے گا کہ تیرے ساتھ مفرد حسینہ ہے کہ اماں ہیں۔ دوسرا طریقہ ٹھیک ہے اس کا حلیہ بدل دیں گے۔ دیو آنند کی فلم ٹیکسی ڈرائیور کا فارمولا جو بعد میں کئی بار آزمایا گیا۔ لڑکی سے لڑکا بنے کوٹ پتلون پہنا دیں گے ضروری ہو تو داڑھی مونچھ لٹا دیں گے۔“

”اب کچھ نہ کچھ تو کریں گے اس کے لیے رہنے کی کوئی جگہ بھی دیکھنی پڑے گی۔“
”وہ یہاں رہ سکتی ہے رشتہ بھائی۔“ شہناز نے کھانے کی میز پر شے کی پٹیلیں رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹی می سر ہلایا ”اس میں ہم سب کے لیے رہ سکے۔ تمہارے لیے اور خود فریال کے لیے۔“
شہناز بھر بکن میں لوٹ گئی تو راجا نے کہا ”یار آج میرے جھوٹ کی لاج رکھ لی تو نے۔“

”بس مجھے ترس آ گیا تیری صورت کی جتنی دیکھ کے۔“
اس نے کہا ”ایک گاڑی منگوائی ہے میں نے۔ پندرہ آنے کی تو کھ لیں گے۔ جو قیمت مناسب لگی دے دیں گے۔“

”بے منت ابھی کرنی ہوگی۔“
”نہیں یار! ہم اسی گاڑی میں جائیں گے ست بدھائی۔ فرانس کے لیے۔ ابھی دو چار دن وہاں رہنے کا پروگرام ملوای۔ پرسوں صبح فریال کو ریسیو کرنا ہوگا۔ کل رات تک ملوٹ آئیں گے۔“

ابھی ہم بات کر رہے تھے کہ گاڑی آگئی۔ یہ تین سال پرانے باڈی کی کورولا تھی مگر دیکھنے میں بالکل نئی شوروم سے لگی ہوئی تھی۔ ڈرائیور صرف چابی دینے آیا تھا۔ میں نے راجا سے کہا کہ کیا یہی ڈرائیور ہمیں ست بدھائی لے جائے گا۔ گاڑی راجا کے کسی جاننے والے کے شوروم سے آئی تھی۔ اس نے فون پر بات کی مگر یہ مسئلہ نہ ہو سکا۔ جسمانی طور پر راجا جاب میں بالکل فٹ نہیں تھے کہ اتنی لمبی ڈرائیونگ کر سکیں اب پر دیگر ام بدلائیں جا سکتا تھا۔

میں متاثر ہوئے ہی تھے کہ شہناز نے بھی ہمارا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ ”اکیلا تو ہرگز نہیں جانے دوں گی میں تمہیں“
”تم حالت میں۔“

ڈالے جانے والے پھول بھی مر چکے ہوتے۔ کل سونم ہوتا۔

شہناز کی آواز پر میں خیالوں کے برآسب چلنے چھوٹا۔ وہ دروازہ بجار ہی تھی اور چلا رہی تھی ”رشتہ بھائی آپ کی کال ہے لندن سے ڈاکٹر شانت۔“

میں نے کہا ”اس سے پوچھ لو کیا بات ہے؟ وہ قمرے بھی تو بات کر سکتی ہے۔“
”اچھا۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ نہار ہے ہیں۔“ شہناز واپس ہوئی۔

میں دس منٹ بعد باہر نکلا تو شہناز کسی بات پر راجا بے جھگڑ رہی تھی۔ حسب عادت راجا اپنے جھوٹ کو شہناز کے قسم کھا کے بچ بنانے میں مصروف تھا۔ شہناز نے چپا مار کے راجا کی جیب سے پچاس ہزار روپے برآمد کر لیے تھے اور یہ سامنے پر تیار نہ کی کہ اسے آفس سے بونس ملا ہے۔ ”تھو وہ وقت پر نہیں دے“ وہ بوریڈ پر عمل نہیں کرتے وہ بولی دے گے ”راجا! میں معلوم کر لوں گی۔“

راجا نے کہا ”کوشش کر کے دیکھو۔ میری سگی بھوی ہوئی تو وہ اخبار والے کچھ نہ بتاتے تم کون ہوئی ہو۔“
شہناز رد ہاکی ہو گئی ”رشتہ بھائی! آپ بتائیں۔“
راجا کی رحم طلب نظریں دیکھ کر مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑا۔
”اس نے مجھے یہی بتایا تھا شہناز۔ اب پہلے بتاؤ نون پر کیا ڈاکٹر شانت ہے؟“

شہناز مطمئن ہو گئی ”اچھی خبر ہے آپ کے لیے۔“
میں نے کہا ”کیا فریال کا پتا چل گیا؟“

راجا نے دوستانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ مارا۔
”اے بتا مت پوچھ۔ وہ تو بظلم خود اور بدھوری ہے۔ کچا خور کھیتی چلی آ رہی ہے جمنوں کی طرف۔“

شہناز نے کہا ”فریال کینیا سے کل رات کو کراچی پہنچی گی اور پرسوں صبح لاہور۔“
میں نے جراتی سے کہا ”کینیا سے یا لندن سے؟“
شہناز نے کہا ”وہ لندن سے تیرہ دن پہلے چلی گئی تھی۔ اب تیرہ دن پہلے آ رہی ہے۔ اس ڈاکٹر نے کچھ نہیں بتایا کہ تیرہ دن پہلے کیوں گئی تھی۔ عجیب آدمی ہرگز عورت ہے۔ سب سے پہلے مجھے بس اتنا ہی معلوم ہے اور فون بند کر دیا۔“

میں نے کہا ”وہ ایسی ہی چیز ہے۔“
راجا نے کہا ”اے اس نے چکر دیا ہوگا مفسر ملان کو۔ اسے براہ راست فلائٹ پکڑنے میں خطرہ محسوس ہوگا۔“

ایک جھلک واضح تھی۔ وہ فرخندہ کا وہی بھائی تھا جو اس کے گھر میں ہونے والی واردات میں زندہ بچ گیا تھا۔ اس رات فرخندہ کی ماں ایک اسپتال کے آئی سی یو میں تھی اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ مگر میں سب جاگ رہے تھے اور دعا میں لگے ہوئے تھے۔

شاید حملہ آوروں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے ان کو دیکھتے ہی وہ کہیں چھپ گیا ہو۔ کسی بینڈ کے نیچے غصے کیا ہو۔ اس نے دہشت زدہ کر دینے والی وہ واردات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو۔ اس وقت اس کی عمر نو دس سال تھی۔ اس وقت وہ کیا کر سکتا تھا۔ بڑا ہونے پر اس کو سب معلوم ہو گیا ہوگا۔ اب وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔

آج اگر وہ اپنی بہن اور اپنے باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب مجھ سے برابر کرنا چاہتا تھا تو یہ ایک فطری بات تھی۔ انتقام میں نے بھی لیا تھا۔ انتقام لینے کا حق اسے بھی حاصل تھا۔

☆☆☆

میں بہت دیر سے جاگ رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں کے شیشوں کے سامنے پردے پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کے پیچھے سے دن کا اجالا نمایاں تھا۔ گھر کے اندر کی خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ کینیا ابھی سوئے پڑے ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب شہناز کال بیل پر ابھی۔ غالباً یہ دودھ والا تھا۔ کچھ دیر بعد بکن کے برتنوں کی آوازیں سے میں نے اندازہ کیا کہ اب وہ چائے بنارہی ہوگی یا ناشتے کی تیاری میں مصروف ہوگی۔

رات بھر کی سلسلندی دور کرنے کے لیے میں نے واش روم کا رخ کیا۔ میرے جسم میں حرکت سے درد اٹھا تو مجھے یاد آیا کہ شہناز نے آٹھ بجے یاد سے دوا کھانے کی تاکید کی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ خود ہی مجھے دقت پر دوا دے مگر میں نے وعدہ کیا تھا کہ الام رک گے ٹھیک سات بجے دوا کھالوں گا۔ شہناز کی تھکن سے بچنے کے لیے میں نے یہ کام پہلے کیا اور پھر گرم پانی کے ٹب میں اترا گیا۔

اس سے میرا دوران خون بحال ہوا اور میرے جسم کو بہت سکون ملا۔ مجھے پھر گزشتہ روز کا حادثہ یاد آیا تو ایک لمحے کے لیے میرے جسم پر کھجی سی طاری ہو گئی۔ یہ قدرت کا احسان ہی نہیں مجھ کو تھا کہ میں ہلاک نہیں ہوا تھا ورنہ مارنے والے نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ یہ خیال بڑا دہشت انگیز تھا کہ اس وقت ہم دونوں دوست قبرستان میں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے۔ قبر کی مٹی بھی خشک ہو چکی ہوئی اور اوپر

تھی؟“

میں نے افسردگی سے اقرار میں سر ہلایا ”تو بھی بس اتنا ہی جانتا ہے مگر وہ اس سے کہیں زیادہ بھی۔“

راجا کی اور میری دوستی بہت پرانی ہے۔ ہم ایک ہی اسکول میں اور پھر ایک ہی کالج میں رہے مگر اس وقت ہمارے درمیان اعتماد کا یہ رشتہ نہیں تھا۔ کالج میں وہ بہت ایلو تھا۔ وہ مباحثوں میں حصہ لیتا تھا اور کالج میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اس میگزین میں زیادہ تر مضامین بھی خود اسی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بھی وہ اخباروں کے لیے آرٹیکل وغیرہ لکھتا تھا جس سے اسے کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ پھر وہ کسی اخبار میں کام کرنے لگا۔ وہ رات کے وقت کام کرتا تھا تو دن میں کالج اینڈ کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر کلاس کے دوران میں سو جاتا تھا۔ کچھ پروفیسر اس کے مسئلہ کو سمجھتے تھے اور اسے یوں بھی رعایت دیتی تھی کہ وہ ایک ڈین طالب علم تھا۔ کچھ اسے اکثر کلاس سے نکال دیتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ کلاس وہ صرف حاضری پوری کرنے کے لیے اینڈ کرتا ہے۔ ورنہ پاس تو وہ امتحان سے کچھ روز قبل خود پڑھ کے بھی ہو جائے گا۔ بعد میں اس کے اور میرے درمیان تعاون باہمی کا مجموعہ ہو گیا۔ میں کلاس میں اس کی حاضری بول دیتا تھا۔ سوسائٹیز کی کلاس میں کسی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ آڈاکڑ سے آئی۔ لیکن ایک دن میں پکڑا گیا۔ پروفیسر نے مجھے کلاس سے نکال دیا۔

مزید یہ اطلاع میرے والد کو پہنچائی گئی۔ مجھے کلاس سے نکالنے والے پروفیسر میرے والد کے دوست تھے اور وہ پہلے کسی کالج میں ساتھ پڑھا چکے تھے۔ ابانے مجھ سے پوچھا تو میں نے صاف بتا دیا کہ ایسا میں نے کیوں کیا تھا۔ چونکہ اس کے وجود میں پیدائشی طور پر ایک صفائی کی روح موجود تھی اس لیے وہ کسی حد تک ”آئینہ جواں مردان حق گوئی دے باکی“ والے فلسفے پر عمل کرتا رہتا تھا یعنی عام زبان میں پتہ چلنے کا شوق نہیں تھا۔ اسلامیات پڑھانے والے استاد نے ایک مرتبہ راجا کو سوتے ہوئے پکڑا تو سخت برا بھلا کہا کہ واپا بت فلیس لی وی پر دیکھتے ہوئے تمہاری آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں اور داغ بھی مستعد رہتا ہے۔ دین کی باتیں ہوں تو جھمبیں نیند آنے لگتی ہے۔ راجا نے بیزار سے کہہ دیا کہ سر میں جان بوجھ کے تو ایسا نہیں کرتا۔ بعض فلیس بھی اتنا ہی بیزار کرتی ہیں جتنا آپ کا لکچر۔“

بات بڑھ گئی اور پرنسپل تک پہنچی اور اگرچہ راجا نے معافی مانگ لی کہ کسی استاد کی بے عزتی کرنے کا وہ سوچ بھی

نہیں سکتا تھا مگر مولوی صاحب اس کے پیچھے بڑے اصرار سے بات پر راجا کو کلاس میں واپس کرنے لگے۔ کچھ آگے راجا نے ان کے خلاف کچھ مواد اکٹھا کیا اور ایک پمفلٹ چھاپ کے سارے کالج میں تقسیم کر دیا۔ اس میں مولوی صاحب کے قول و فعل کے تضادات کے بہت سے حوالے تھے۔ وہ ایک مسجد کہیں کے جیڑ میں تھے۔ وہاں کے حسابات کا کچھا تھا۔ یہ الوٹھی گلیز پرورنگ کا پہلا کارنامہ تھا جو اس نے سرانجام دیا۔ مولوی صاحب اسے بریٹان ہوئے کہ اپنا جادو دوسرے کالج میں کرایا۔ راجا فحشی معصوم اور لالچ بنا رہا۔

دوسری بار اس نے میرے لیے ایسا کیا۔ جس کالج میں میرے والد پڑھاتے تھے وہاں پرنسپل کا رویہ اپنے اسٹاف کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز تھا۔ کچھ لوگ ذاتی فائدے کے لیے خوشامد میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے تھے کہ پرنسپل کے ذاتی کام تک کرتے تھے۔ فنڈز میں خورد خرچہ بد اخلاقی اور نااہلی کے الزامات الگ تھے مگر وہ سفارتی تھے اور ان کے خلاف شکایات کی شنوائی نہ تھی۔ میں نے راجا سے ذکر کیا تو اس نے پتا نہیں کس کس سے مل کے اور کن ذرائع سے اندر کی ساری معلومات حاصل کر کے ایک نیچر بنایا اور اخبار میں چھاپ دیا۔ اب اسے اس کی چیٹھی تھی اور اب ڈر ہے کہ وہ آپس میں تعطل کر دیا جائے گا مگر اس نیچر کے جیسے ہی معاملات اٹنے ہو گئے۔ کچھ تعلیم نے ایک انکوائری کمیٹی بنادی اور اس نے کالج میں اسٹاف سے تفتیش کی تو مزید خبریاں سامنے آئیں۔ دوسرے مینیجری پرنسپل کا ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ ذاتی سفارش کی بنا پر کسی گریڈ کالج میں چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں اس نے خواتین کو بے حد پریشان کیا۔ نتیجہ یہ کہ ایک دن کالج میں ہنگامہ ہوا۔ کچھ پیکچرار نے اس کی آفس میں سینڈلوں سے توڑ مار کی۔ وہ باہر بھاگا تو خواتین نے چھپا کر اور پرنسپل کی گوشائی کا منظر طالبات نے بھی دیکھا۔ یہ خبر اخبار میں بھی آئی۔ بعد میں پتا نہیں کیا ہوا۔

راجا کا شکر یہ ادا کرنے میں اس کے گھر گیا تو پہلی بار مجھے اس کے افسوس ناک حالات کا علم ہوا۔ اس کی ماں اکیلا رہتی تھی۔ باپ کوئی موٹر سائیکل ملینک تھا اور اچھا خاصا کانا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ ہیر و من کے چکر میں پڑ گیا۔ کام ختم ہوا۔ دکان بک گئی اور دروادی انداز میں اس نے بیوی کے زور پر گھر کی دوسری چیزوں کو ٹھکانے لگایا۔ جب پیٹھ کو کچھ نہ رہا تو اس نے بیوی کو بیچنا چاہا اور بیوی نے جو تے مارے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ ادھر ادھر بھٹکتا پھرا۔ بعض اوقات وہ رات

گھر کے دروازے پر آ کے سو جاتا تھا اور کئی کئی دن وہیں پڑا رہتا تھا۔ راجا کی ماں نے وہ گھر اور محلہ چھوڑ دیا۔ وہ میٹرک پاس تھی۔ اسے بارہ سو روپے ماہانہ پر ایک پرائمری اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس نے کئی بار اپنے شوہر کو ادھر ادھر فٹ ہوں پڑا دیکھا۔ کچھ عرصے بعد وہ غائب ہو گیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔ راجا کی ماں نے سمجھ لیا کہ اب وہ سہاگن نہیں بیوہ ہے۔

راجا میٹرک کا امتحان دے کر آ رہا تھا کہ اس نے اپنے باپ کو پکڑ دیکھا۔ وہ ایک فٹ ہاتھ پر جت پڑا تھا اور کچھ دن اس کے گرد جمع تھے۔ اس کے تن پر پیل چپل کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ راجا نے بھی وہاں رگ کے چند منٹ تک بیٹھ رہا۔ اسے سر اور داڑھی کے بالوں اور کھلی آنکھوں والے مکروہ چہرے کو دیکھا جو بھی اس کا باپ تھا۔ ایک خوبصورت آدمی سمجھا جاسکتا تھا۔ جو ہر وقت ہنستا رہتا تھا اور ایک مارکسٹ تھا۔ اس نے اسے نہ پہچانا ہی بہتر سمجھا اور آگے ہو گیا۔ یہ بات اس نے اپنی ماں کو بھی نہیں بتائی۔

اس کی ماں راجا کے کالج پہنچے کے بعد بھی اسکول میں پڑھاتی تھی اور برسوں بعد اس کی خواہ صرف چند سو ہوئی تھی۔ راجا جاتا تھا کہ اب وہ کام کرے اور ماں آرام کرے لیکن ماں کی ایک ہی رٹ تھی۔ مجھے ایم اے کرنا ہے صفائی بنے کے لیے اس نے عملی جدوجہد کا آغاز تو بہت پہلے کر دیا تھا۔ اس کی کمائی سے گھر میں تھوڑی بہت خوشحالی بھی آ گئی تھی۔ ماں کی ضد پوری کرنے کے لیے وہ ایم اے بھی کر لیتا تھا۔ ناکام ہو کر دوبارہ بیوی اور مر گئی۔ اس نے راجا کے بی اے کا رزلٹ آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ جب ماں ہی نہ رہی تو راجا ایم اے کس کے لیے کرتا۔ صحافت کے میدان میں تو وہ اپنے جھنڈے پہلے ہی گاڑ چکا تھا۔ راجا کی اور میری دوستی کو اپنی مٹا دیا۔ اس پر استوار کرنے والی اس کی ماں ہی تھی۔ وہ ہم دونوں سے کبھی بھی کسی ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑتا۔ دنیا میں جادو مست خوش نصیبی سے ہی ملتا ہے۔

اسے ماریا کی مجھ میں دلچسپی کا بھی علم تھا اور صفائی ہونے کے ساتھ وہ ماریا کے باپ سے بھی واقف تھا۔ تنظیم سے تعلق نہ تھا۔ اسے راجا نے ہمیشہ آگے بڑھنے سے روکا اور طاقت میں میری مدد بھی کی۔ وہ کل کے تنظیم کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ تنظیم کی مستعد کارروائیوں سے سب ہی فائدہ اٹھاتے تھے۔ لیکن راجا سے میری دوستی سے مختلف مواقع پر اہل کار مدد سے میرا کام آسان ہو جاتا تھا۔

لی کام آرز کے بعد میں بھی لاہور چلا گیا تو راجا کی اور میری دوستی کا نیا دور شروع ہوا۔ میں نے ایم کام کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور کچھ عرصہ تنظیم کے معاملات سے لائق رہ کے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ میری جان چھٹ گئی لیکن درحقیقت ایسا نہ تھا۔ بہت جلد لاہور کی تنظیم نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہاں میرا پاس گاہے شاہ تھا جو پنجاب کے کارکنوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ پورے پاکستان کے لیے چیف کا نائب شہاب الدین تھا۔ خود چیف اس زمانے میں زیادہ تر دینی میں رہتا تھا۔

میرے ملک سے فرار کے بعد یہاں بھی حالات نے پلٹا کھایا اور تنظیم کے حریف برسر اقتدار آ گئے۔ چیف کو روپوشی اختیار کرنی پڑی۔ خود گاہے شاہ اور شہاب الدین جیسے سب باتو پکڑے گئے یا مارے گئے۔ کچھ جیلوں میں پہنچے تو کچھ باہر نکل گئے۔ چیف دینی سے نکل کے مختلف ملکوں میں پناہ لیتا رہا اور بالآخر لندن پہنچا۔ اب یہ سننے میں آ رہا تھا کہ لندن میں بھی اس کے گرد قاتلون کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اس کے دشمن اسے ختم کرنے کے درپے ہیں چنانچہ وہ فرانس میں سیاسی پناہ لینے کی سوچ رہا ہے۔

لاہور سے ست بدھائی تک جی ٹی روڈ پر ایک سوسٹر کلو میٹر کے بعد جہلم کا شہر آتا تھا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا قصبہ ”دینہ“ یہاں سے بائیں ہاتھ کی سڑک پر دس کلو میٹر کے فاصلے پر بتا کا قلعہ تھا اور دریائے کپہا تھا۔ مزید دس کلو میٹر کے بعد ٹیلہ جوگیاں ایک گاؤں تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے خاصی چڑھائی طے کرنی پڑتی تھی۔ ٹیلہ جوگیاں سے ست بدھائی کا فاصلہ بھی نو دس کلو میٹر تھا۔ اس طرح یہ سارا سفر اس دوڑھائی سو کلو میٹر کا تھا۔

گاڑی بہت اچھی تھی اور ڈرائیو تک کرتے ہوئے شہناز نے بھی اس کی تعریف کی مگر اس کے باوجود گوبر انوال کو کر اس کرتے کرتے ہمیں دوپہر ہو گئی۔ اس کی ایک دجہ یہ بھی تھی کہ ہم میں سے کسی کو کوئی ٹی روڈ کے بائی پاس کا اندازہ نہیں تھا اور نہ ہم شہر کی ٹریفک سے بچ کے نکل جاتے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے اس سفر میں آہستہ آہستہ میں نے راجا کو وہ سب بتا دیا جو اسے آج تک معلوم نہ تھا۔ میں نے اپنی اور فرزندہ کی شادی کا ذکر بھی کیا اور ماریا اور اس کے باپ سے انتقام کا بھی۔ ان کی موت کا ذکر دے دیا میں تھا لیکن میں نے قتل کسی کو نہیں کیا تھا۔ میں نے ماریا کو خود کشی پر مجبور کیا تھا اور جب اس کے باپ کی کٹیج پر کوئی مارا تو وہ پہلے ہی ہارٹ فل ہوئے سے مر چکا تھا۔ راجا نے مجھے بہت گالیاں دیں کہ

اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے رسمی طور پر سلام دعا کی

میں نے بیچے پلٹ کر دیکھا تو پوری عمارت ایک گھنٹہ
جیسی دکھائی دی۔ شاید گزشتہ نصف صدی میں کسی نے اسے
آباد نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کے مالکوں نے اسے فراموش
نہیں کیا تھا۔ اس کا آخری مالک انگلستان کی سرزمین پر
مخلوق ہزار ہا تھا اور پھر وہیں دفن ہو گیا تھا۔ اس نے جانے

راجا صاحب! آپ غائب وکیل ہیں۔“

راجا نے کہا ”نہیں۔ ان کا نام بشارت فاروقی تھا۔ اس جگہ کے نئے مالک ہیں رفیق احمد۔ یہ لندن سے آئے ہیں۔“

اکبر خان کی نظریں احترام آمیز انداز میں مجھ پر جم گئیں اور اس نے دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا ”آپ کا انتظار تھا؟ میں سب کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

میں نے کہا ”تھک یو اکبر خان! تمہارے والد کہاں ہیں؟“

”ان پر فالج کا اثر ہے، اٹھ نہیں سکتے مگر سب سے زیادہ وہی آپ سے ملاقات کے لیے بے چین تھے۔“

میں نے کہا ”میں خود جا کے ان سے مل لیتا ہوں چلو۔“

اکبر خان پلٹا ”وہ روز مجھ سے پوچھتے تھے کہ رفیق صاحب آئے؟ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ لندن میں مالکوں نے سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا ہے وہ آپ کی واپسی کی دعائیں مانگتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“

”کون سا فرض اکبر خان؟“ میں نے کہا۔

”یہی..... اس جگہ کی حفاظت کا۔ وہ کہتے تھے یہ بڑی ذمہ داری ہے“ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا گیا۔

میں نے کہا ”اکبر خان! تمہاری ٹانگ کو کیا ہوا؟“

”ٹانگ شہید ہوئی سر! اس اکبر کی جنگ میں۔ میں نے ٹانگ اڑا کے ایک بھارتی ٹینک کو گمرانے کی کوشش کی تھی۔ آئیے سر! دھر سے آئیے۔“ اس نے ہنس کے کہا۔

برآمدے میں اب کم سے کم میں افراد جمع ہو چکے تھے۔

ان میں نصف بچے تھے۔ عورتوں میں ایک بوڑھی تھی۔

ادھر عمر کی تھیں اور دو جوان۔ ان میں سے ایک سولہ سڑا سال کی لڑکی تھی۔ مردوں میں بھی ایک لڑکا تھا۔ انیس سال کا تھا۔

یہی جان محمد کی دوسری اور تیسری نسل کے لوگ تھے۔

اکبر خان مجھے ایک تاریک کمرے میں لے گیا جہاں چار پائی پر ایک بڑی کاڑھا تھا پڑا تھا۔ اس کے سرواڑھی اور پٹوں کے بال تک سفید ہو چکے تھے۔ میری نظریں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو میں نے چار پائی کی پٹا پر بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ فرط جذبات سے کانپ رہا تھا اور اس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”آپ آگئے مالک!“ اس نے کمزور آواز میں کہا ”خدا اچھا کیا“ میں آپ کی امانت آپ کے حوالے کیے یا مرنے لگا

اور حویلی کی گمرانی کے لیے پرانے ملازموں کو یہاں رہنے دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک حویلی کے دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ خالی دیوار نظر نہیں آ رہی تھی۔ بند حویلی کے اندر کیا تھا اور کیا باتیں بجا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کا اندازہ میں بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

سامنے والا حصہ جو پہلے شاگرد پیشہ کھلاتا ہوگا لیکن اب اسے سردنٹ کو ارتز کا نام دیا جا سکتا تھا جو پوری طرح آباد تھا۔ برآمدے میں چار پائیاں پڑی تھیں۔ ڈوریوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے اور باہر بچے کھیل رہے تھے۔ معلوم نہیں وہاں کل کتنے افراد اور خاندان رہتے تھے۔ مجھے اپنے سامنے آٹھ دس مختلف عمر کے بچے۔ چار پانچ دیہاتی قسم کی عورتیں اور چار پانچ مرد نظر آ رہے تھے۔ کار کو احاطے میں داخل ہوتا اور پھر اس میں سے ہمیں اترنا دیکھ کے وہ سب جیسے نجد ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے خاموش تماشاویں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ اندر سے نکل نکل کے آ رہے تھے یا کہیں پچھلی طرف سے۔ پیچھے بھٹنا کھیت ہوں گے اور ان کی کوٹھریوں کے دروازے ادھر بھی نکلے ہوں گے یا انہوں نے نکال لیے ہوں گے۔

غربت ان سب کی حالت سے عیاں تھی۔ گزشتہ چند ماہ میں یہاں بہت لوگ آئے تھے جو نئے مالک یا ان کے نمائندے تھے۔ ان میں راجا کو شاید وہ پہچان گئے ہوں گے۔

ہمارے بارے میں بھی ان کے دل میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوگا کہ ایسی شاندار گاڑی میں اتنے اعتماد کے ساتھ اندر آنے والے نئے مالک کے خاندان والے ہی ہو سکتے تھے۔ کوئی

سیاح یا آوارہ گرد یہاں اس طرح داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

چند منٹ بعد ایک شخص آگے بڑھا۔ اس کی ایک بغل میں بیساکھی تھی کیونکہ اس کا ایک پاؤں بچے کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ وہ پچاس پچپن سال کا درازند اور تندرست آدمی تھا۔

اس کے قریب آنے سے پہلے ہی راجا نے بتا دیا ”یہ اکبر خان ہے۔ گزشتہ پچاس برس سے اس کا باپ حویلی کا گمران تھا۔ مگر وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے فرائض اب اکبر خان انجام دیتا ہے۔ یہ سب سے بڑا بیٹا ہے۔ جالو یا جان محمد کی

تین لڑکیاں یہاں رہتی ہیں۔“

اکبر خان اتنی دیر میں قریب آ گیا۔ اس نے سلام کے بعد اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا تو مجھے اس کی مضبوط گرفت میں مگر جوشی کا خلوص محسوس ہوا۔

”رٹائرڈ نائب موہے دار اکبر خان جناب!“ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا ”آپ تو پہلے بھی آئے تھے

”چل اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ کیا پتا اندرون سے جاننے کے برتن ہوں۔ اشرفیوں کے توڑے رکھے ہوں خفیہ تجوروں میں۔ تجھے تو دیواروں کا اور فرش کا اکسیر سے کرا کے دیکھنا چاہیے۔“

میں نے کہا ”یار جن بھوت بھی تو ہوں گے یہاں۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ ویران گھر میں جن بسرا کرتے ہیں۔“ ”جن بھوتوں کے علاوہ چلیں ہوں گی لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنی ہی جیسی کے لوگ ہوں گے۔“ راجا نے کہا۔

اکبر خان آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا جب ہم اندر سے گھبرا کے باہر نکل آئے تھے۔ ”سور! صرف ایک پیڑ ویکس لپ میں تیل تھا۔ لیکن وہ بھی روشن نہیں ہوا۔ دو کے میٹل ٹوٹ کے جھڑپکے ہیں۔ بلاشبہ یہ میری کوتاہی ہے۔“

میں نے کہا ”کوئی بات نہیں اکبر خان!“

”کل سب انتظام ہو جائے گا۔ آج آپ کو اسی لائٹن کی روشنی میں گزارا کرنا ہوگا۔“

”ہم لائٹن کی روشنی میں حویلی کو دیکھیں گے۔“

”جیسی آپ کی مرضی سر!“ اکبر خان نے کہا۔

لیکن اس کے بعد عجیب بات یہ ہوئی کہ اکبر خان کو وہ چاہوں کا کچھ نہیں ملا جو میں نے کچھ دیر پہلے ہی اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ معلوم کر کے آتا ہے کہ کسی بچے نے یا کسی عورت نے تو چاہیاں

نہیں اٹھائی ہیں۔ وہ ایک گھنٹے تک نہیں لوٹا اور جب آیا تو اس کے ساتھ کھانا لانے والے تھے۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے مرغیاں بھونی تھیں اور پرائے تلتے تھے۔ اس کے باوجود وہ معذرت کرتے رہے کہ آج ہمیں گزارہ کرنا پڑے گا۔ کل سے ہمیں ہر پر ہماری مرضی کے مطابق ملے گی۔

ہمارے سونے کے لیے اسی کمرے میں بستر لگا دیے گئے۔ شہناز نے اکیلے سمہری پر سونے سے انکار کر دیا۔ ہم قایلین پر ایک قطار میں نیت گئے اور باہر سے آنے والی

سنانے کی گونج سننے رہے۔ اس ماحول میں نیند کا نہ آنا ایک فطری بات تھی۔

آدھی رات کے بعد کسی وقت میں نے محسوس کیا جیسے کمرے کی پر روشنی چلی ہے۔ شاید باہر بادلوں گئے اور یہ چمک چمکی ہوئی۔ میں نے سوچا اور اٹھ کے باہر آیا تو مجھے تاریکی میں دو سائے دکھائی دیے۔ یہ راجا اور شہناز تھے جو

خٹک تالاب کی منڈ پر بیٹھے تھے اور اس ماحول کو انجوائے کر رہے تھے۔

صبح میری آنکھ پہلے کھلی۔ میں نے سوچا کہ حویلی سے باہر جا کے جنگل میں طلوع آفتاب کا منظر دیکھوں اور ان پرندوں کو دیکھوں جن کے چپھانے کی آواز اندر تک آ رہی تھی۔ میں ایک چنل پاؤں میں ڈال کے نکلا جو ہمارے خدمت گزاروں نے فراہم کی تھی۔ برآمدے کی میز چالانے کے لیے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت قافلہ

ست میں سے ہوئے ملازمین کے رہائشی حصے میں خاص اہمیت شروع ہو چکی تھی۔

دور سے ہی میں نے گاڑی کو دیکھا تو وہ مجھے کچھ نیچے بٹھسی ہوئی لگی۔ اس کے اگلے دونوں ٹائرؤں میں ہوائیں تھیں۔ مجھے کچھ پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ ہم ایک قلیت نازری بدل سکتے تھے۔ غریب جا کر دیکھنے پر مجھے پیچھے کے دونوں ہار بھی زمین سے لگے نظر آئے۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ان ٹائرؤں کی ہوائ نکلی تو گرجا۔ مجھے بچوں پر غصہ آنے لگا۔ یہ حرکت ان کے سونے کو نرسکتا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو صورت حال کی گنجائی مجھ پر عیاں ہوئی۔ چاروں ہار کسے ہوئے تھے اور ناقابل استعمال ہو گئے تھے۔ یہ بچوں کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ناز بچن میں عام استعمال کی چھری سے بھی نہیں کاٹے جاسکتے تھے۔

یہ کس کی تخریبی کارروائی تھی؟ اس سوال سے پہلے میرے ذہن میں آنے والا سوال یہ تھا کہ اب ہم کیا کریں گے؟ قابل استعمال ناز کہاں سے آئیں گے اور کیسے؟ یہاں فون بھی نہیں تھا اور ہمارے موبائل فون بھی ڈیڈ تھے۔ ہم مدد کے لیے ایس او ایس میں نہیں کر سکتے تھے۔

میں ٹوٹ کے کمرے میں گیا تو اندر سے میں مجھے صرف راجا نظر آیا۔ میں نے اسے چکایا ”راجا! شہناز کہاں ہے؟“

راجا اٹھ بیٹھا ”ہوگی قافلہ خانے میں یا ادھر عورتوں میں۔“

میں نے کہا ”یار! رات کو کسی نے ہماری گاڑی کے چاروں ٹائر کاٹ دیے ہیں۔“

راجا گھبرا کے باہر نکلا ”یہ حرامی پن کس نے کیا ہے؟“

اسی وقت اکبر خان نمودار ہوا۔ اس نے شہناز کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا۔ شہناز بے ہوش تھی۔ ”یہ باہر پڑی تھیں سر! رویش کے حصار پر۔۔۔۔۔“

جو خیال اکبر خان کو اپنے مقابل دیکھ کے آیا تھا وہ کچھ دیر غماز میں نے اس کے اظہار کو التوا میں رکھا۔ فوری توجہ لینے کے لیے اس کے بازو نیچے لٹکے ہوئے تھے اور گردن پیچھے جھکی ہوئی تھی۔

دو سے کھلے بال پوری لمبائی کے ساتھ فرش کو چھوئے نظر آ رہے تھے۔

اکبر خان نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ سمہری پر لٹایا۔ یوں جیسے وہ ریت کی بنی ہوئی عورت ہے جو ذرا سی فیس لٹنے سے بکھر جائے گی۔ راجا اس پر جھکا ہوا بڑی

عظرائی کیفیت میں ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔ شہناز! کیا ہوا ہے تمہیں! دیکھو میری طرف دیکھو! لیکن شہناز اپنی آنکھیں بند کیے بالکل بے حس و حرکت لٹی ہوئی تھی۔

راجا نے اس کی بغض دیکھی۔ بغض کی رفتار سے کوئی دھڑکا کرنا صرف ایک ڈاکٹر کے لیے ممکن تھا۔ راجا نے پریشانی سے میری طرف دیکھا ”یار! کیا ہو گیا ہے اسے؟ یہ بڑی بڑی باتیں؟“ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اسے بچکھا لیتے لگا۔

یہ صورت حال زیادہ پریشان کن اس لیے ہو گئی تھی کہ اس علاقے میں دور دور تک کسی ڈاکٹر کی دستیابی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ شہناز خود ایک ڈاکٹر تھی۔ وہ یہاں موجود ہر شخص کی کچھ نہ کچھ مدد بھی کر سکتی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر تھا۔

اچانک گاڑی کے ناقابل استعمال ہونے کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ کوئی ذمہ دار نہیں تھا۔ ہمارے تعاقب میں تھا جہاں ہم مار دیے گئے تھے کہ کمرے پر محصور ہو گئے تھے۔ ہم کسی سے مدد مانگ سکتے تھے اور نہ ہی اس خوش گمانی پر آسرا کر سکتے تھے کہ حسن اتفاق سے کچھ ہو جائے گا۔

کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اب ہماری واپسی کی صورت کیا ہوگی۔ کیا گاڑی کو یہیں چھوڑ کے ہم اسی طرح اپنی جائیں گے جیسے گاؤں کے لوگ جاتے تھے۔ کسی تیل گاڑی میں سوار ہونے کے لیے بھی ہمیں پیدل چل کے چلنا پڑے گا۔ یہاں تو گاڑیوں کا ایک سیرا سار نہ ملے گا۔ یہاں تو گاڑیوں کا ایک سیرا سار نہ ملے گا۔ یہاں تو گاڑیوں کا ایک سیرا سار نہ ملے گا۔

میں نے کہا ”اچھا وہاں جانے کی کیا صورت ہوگی۔ تم نے دیکھا ہماری گاڑی کے چاروں ٹائر کسی نے کاٹ دیے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا ”ہاں جی! ابھی دیکھا میں نے بھی۔“

”تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں کیا بتاؤں سر! یہاں تو بس ہم لوگ ہیں آپ کی رعایا۔“

مجھے یوں لگا جیسے اس کے لہجے میں کچھ طنز ہے مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا ”ڈاکٹر شہناز کو ٹیلا جو گیاں لے جانا ہو

بدھائی پہنچ کے گاڑی میں لگے اور گاڑی کو ہم تک پہنچائے۔ اب مسئلہ زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔ شہناز کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کے بے ہوشی سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے اگر وہ جلد ہوش میں نہ آئی تو اس دیرانے میں کیا ہوگا جہاں نڈائز نہ ہوتا تھا۔

میں نے اکبر خان کو دیکھا تو اس کا چہرہ سیاہ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ پلک بچکائیے بغیر شہناز کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بند اور کھیر رہی تھیں۔ کچھ اور دیکھ رہی تھیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کا خیال نہ جانے کہاں سرگرداں تھا۔ میرے شک کی تصدیق اس وقت ہوئی جب میں نے اچانک اس سے سوال کیا۔ ”اکبر! یہاں آس پاس کوئی ڈاکٹر ہے؟“

وہ چونک پڑا ”یہاں۔۔۔۔۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے سر!“

میں نے کہا ”کوئی بیمار ہو جائے تو کیا کرتے ہو؟“

وہ سوچ کے بولا ”یہ تو بیماری پر ہے جی! معمولی بیماری ہو تو خود ہی دوا دار کر لیتے ہیں۔ آگے پنڈت خاں کی مسجد کے مولوی صاحب دم در دم کرتے ہیں وہ جیسے بھی ہیں۔“

میں نے کہا ”اپنے والد کا علاج کس سے کراتے ہو؟“

”کسی سے بھی نہیں۔ اسے کیا ہے بڑا چاہے علاج تو کوئی نہیں۔“

میں نے زچ ہو کے کہا ”یار! کوئی سخت بیمار ہو کسی کی ٹانگ ٹوٹ جائے کوئی مل جائے زچگی کا مسئلہ ہو۔“

وہ سادگی سے بولا ”بچے تو خود ہی پیدا ہو جاتے ہیں مگر میں۔ عورتیں سنہال لیتی ہیں۔ ٹانگ ٹوٹ جائے تو ایک پہلو ان ہے ادھر وہ جراح بھی ہے۔“

میں نے کہا ”اکبر خان، ڈاکٹر کہاں ملے گا؟“

اس نے کہا ”ٹیلا جو گیاں میں سرکاری ڈاکٹر ہے۔ ہفتے میں ایک دودن آتا ہے حاضری لگاتے۔ باقی وقت ادھر ہوتا ہے روہتا میں۔“

میں نے کہا ”اچھا وہاں جانے کی کیا صورت ہوگی۔ تم نے دیکھا ہماری گاڑی کے چاروں ٹائر کسی نے کاٹ دیے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا ”ہاں جی! ابھی دیکھا میں نے بھی۔“

”تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں کیا بتاؤں سر! یہاں تو بس ہم لوگ ہیں آپ کی رعایا۔“

مجھے یوں لگا جیسے اس کے لہجے میں کچھ طنز ہے مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا ”ڈاکٹر شہناز کو ٹیلا جو گیاں لے جانا ہو

تو کیسے لے جائیں۔“ اس نے کہا ”میں کسی کو سائیکل پر بھیج دیتا ہوں۔ اگر ڈاکٹر مل گیا تو اسے لے آئے گا اپنے ساتھ۔“
”کھسے..... سائیکل پر..... لاجول دلاؤ پھر مسئلہ ہوگا دو کا۔ نہیں! اگر خبر مان لیا! کیا جگیاں سے کوئی گاڑی نہیں مل سکتی۔ کسی قسم کی گاڑی بھی ہو۔“

اچانک راجا چلا یا ”یار شہناز ہوش میں آگئی۔“
میں نے قریب جا کے دیکھا۔ شہناز آنکھیں کھولے جھٹ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی صورت پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ نہ دکھ کے نہ تکلف کے پھر اس نے سر ہٹا کر میری اور راجا کی طرف دیکھا۔

راجا نے اس کا ہاتھ تھام لیا ”شہناز..... کیسی ہوتی؟“
اس نے آہستہ سے سر ہلایا ”ٹھیک ہوں۔“
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے سر سے پریشانی کا بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ شہناز کی ذہنی اور جسمانی حالت بہتری کی طرف مائل تھی اور فوری طور پر توشیح کے اسباب دور ہو گئے تھے۔ پانی معاملات فرصت سے نمٹائے جاسکتے تھے۔

اگلے آدھے گھنٹے میں شہناز کی حالت اس حد تک مستحضر مئی کہ اس نے گاڑی میں سے اٹھامیڈیکل بیگ منگوایا جس میں ایک ڈسے دار خاتون اور ہوشیار ڈاکٹر کی حیثیت سے اس نے ایمر جنسی میں ضرورت پڑنے والی تمام دوا میں بھر لی تھیں۔ اس نے خود ہی اپنے لیے دوا کا انتخاب کیا۔ مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب راجا نے ایک ماہر کیا وڈو ٹرکی طرح سرخ میں دوا بھری اور شہناز کو انٹروژن انجکشن لگایا۔

شہناز میری حیرت پر آہستہ سے مسکرائی ”دیکھا رفتی بھائی! کیسی تربیت ہے میری؟“
میں نے کہا ”اب مجھے امید نظر آتی ہے کہ کسی دن تم اسے انسان بھی بنا لو گی۔“

اکبر خان اس دوران میں خاموشی سے کھٹک گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد نمودار ہوا تو اس کے ساتھ تین عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک کو میں نے گزشتہ رات بھی دیکھا تھا۔ وہ کبیر خان کی ماں اور اکبر خان کی بیوی تھی۔ اپنے لیے کپڑوں اٹھنے بالوں اور بھاری بدن کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے والی وہ عورت بد حال بیڑا اور بیمار نظر آتی تھی۔

دوسری جوان اور خوبصورت عورت تھی جس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا رنگ اجلا اور جسم بے حد متناسب تھا۔ جولیا اس نے پہن رکھا تھا وہ بہت معمولی اور کم قیمت کپڑے کا تھا مگر اس کے بدن پر یوں فٹ تھا جیسے لاہور کے

کسی ماہر فن لیڈر نے ٹیلر نے سیاہ ہو۔ عام گھروں کی عورتیں اپنے کپڑے خود کپتی ہیں تو اپنے بدن کی ضرورت کے مطابق ایک ایک ہنگے سے وہ کمال دکھائی ہیں کہ ستر پوشی کرنے والا ہمارے ہی کشمیر حسن کا وسیلہ بن جائے اور دیکھنے والے کی نظر بھی مغوا مستور کے تصور میں اسیر ہو کر رہ جائے۔

یہ عورت بھی ادا نے حسن کی فنکاری میں طاق قی حالانکہ وہ فیشن اور گھمیری دنیا سے بہت دور تھی۔ اس نے آنکھیں سرخ رنگ کا انتخاب کیا تھا۔ آدمی آستین میں پیسے ہوئے اس کے گداز گورے بازو کمر کے خم پر چمک ہو کے پٹے اوپر دائروں میں پھیل جانے والے لباس کا کشادہ گریبان پر گردن کے آگے پیچھے چھل جیسے سنہرے شیب و فراز میں ٹٹاؤ بہکا لے جاتا تھا اور اس کے بیڑی چہرے پر نمایاں بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن کو اس نے کامل سے زیادہ اثر انگیز سیاہ دے دی تھی۔ یہ سب اس کے حسن کی قوت تیز کار اسلحہ تھا اور عورت کی طرح وہ خوب جانتی تھی کہ یہ اسلحہ کب کہاں اور کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس نے کسی بیوی باری سے میک اپ نہیں کروایا تھا اور اسے یہاں کچھ میسر بھی نہ تھا مگر اصل بات یہ تھی کہ اسے کیا سامان آرائش کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس دریاں حویلی اور اس دور افتادہ گمنام اور پس ماندہ مقام پر ایسے شاہکار حسن کا نظارہ ایسا ہی تھا جیسے جنتی ریت کے بے آب اور سنسان صحرا میں پھٹکنے والے کوئے پتہ کی کولا کا سانس پور ڈنظر آ جائے۔ جیسا کہ کسی اشتہار میں دکھایا جاتا ہے یا دکھایا جاسکتا ہے۔ اس کو دکھ کر راجا اور میں دم بخور رہ گئے تو یہ ایک فطری رد عمل تھا۔

تیسری عورت ابھی تکمیل کے مراحل میں تھی۔ وہ چوچندہ برس کی معمولی صورت اور سائولی رنگت والی لڑکی تھی جس کے بدن کے گھٹن میں آغاز شاب کے شگوفے پھوٹ رہے تھے اور جذبہ صدا دیتے تھے کہ قیاس کن زاگشتان کن بہا، من لیکن نظر میں آفتاب ہو تو چاند ستاروں کا وجود ہی کہاں محسوس ہوتا ہے۔

وہ تینوں ہمارے لیے ناشتا لائی تھیں اور جب انہوں نے تمام اسباب کو ترپے سے دسترخوان پر بچھ دیا تو انہوں نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اعلان کیا ”یہ چائے میری دوسری بیوی ہے“ نور جہاں۔ اور یہ میری تیسری بیوی ہے۔ دو بھائی اس سے بڑے ہیں۔ ایک کی شادی ہو چکی ہے اس سے چھوٹی ایک بہن ہے۔“

میں نے اور راجا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ اس وقت تک ہماری آوارہ نگاہی کو شہناز نے بھی

پہنایا تھا اور ایک عام عورت کی طرح اس کا احساس کمتری خود بخود برہمی کا انداز بن گیا تھا۔ اسے ہماری غیر ارادی محبت بھی آتی تھی مگر اس گزری تھی جتنی نور جہاں کی پراہمینان مسکراہٹ۔

مجھے اس ادیب عمر کے لنگڑے سابق فوجی کی قسمت پر رعب آیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اس جیسے غربت نصیب شخص کے ہاتھ یہ اُصول پیرا کیسے لگ گیا؟ جس کا معیج مقام تو کسی جوہر شناس قدر دان ریش کے قعر عالی شان کی خواب گاہ تھی مگر یہاں ست بدھائی کے ایک سروڈنٹ کوارٹر میں اسے راستے میں پڑے پتھر کی طرح کوئی دیکھنے والا بھی نہ تھا لیکن ظاہر ہے میں یہ سوال کرنا تو اپنی حیثیت سے مگر جاتا۔

اس صورت حال کو شہناز نے کنٹرول کیا ”اکبر خان! تم جاؤ ابھی نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

اکبر خان کے ساتھ ہی تینوں عورتیں بھی نکل گئیں۔ نور جہاں سب سے پیچھے تھی۔ دروازے سے باہر نکل کے اس نے بڑی ادا کے ساتھ گردن گھمائی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے لبوں کی مسکراہٹ زیادہ روشن اور گہری ہو گئی ہے اور ایک خطرناک چپچپ دینے لگی ہے جو بہت واضح اور عیاں ہے کہ ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کے وارث و مالک! کیا خیال ہے آپ کا اس کنیرے کے بارے میں؟

شہناز نے باری باری مجھے اور راجا کو گھورا ”کیا اب آپ حضرات ناشتے پر توجہ دیں گے؟ وہ تو کئی۔“

راجا جس پڑا ”معاف کرنا شہناز! مجھے کچھ بھلنے کی بو آ رہی ہے۔ نیچے بیڑا! یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟“
میں نے آہ بھری ”میرے دل سے راجا۔ کیا عورت تھی بارا۔“

”ایٹم بم سے زیادہ تباہ کن“ راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔

شہناز نے فحاشی سے کہا ”شرم آتی چاہیے تم دونوں کو۔ وہ کسی کی بیوی تھی۔“

”پھر کیا ہو۔ خوبصورت تصویر کا مالک اگر کوئی کہاڑی ہو تو کیا اس کے حسن کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے؟“ راجا بولا۔

”وہ کوئی شریف عورت نہیں لگتی مجھے“ شہناز مزید فحاشی ہوئی۔

راجا نے سر ہلایا ”خرافات کو تم اپنے معیار سے دیکھ رہی ہو شہناز۔ اس پر تو خود تمہارے سوا کوئی پورا نہیں اترتا“ میں بھی

نہیں رفتی تھی نہیں۔“
شہناز نے ناشتا چھوڑ دیا ”اچھا تو تم کرو اس کی

باتیں۔ بلاول اسے رفتی بھائی“ آپ نے بھی ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ شہناز نہیں کیا ہوا تھا؟“ وہ غصے میں آگئی۔

راجا نے اسے دبوچ لیا ”آئی ایم سوری، مگر تم کو مجھ سے یوں بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ میری نظر میں تم سے زیادہ حسین نہ ہے نہ ہوگا۔ کیونکہ تمہارا حسن ہے میری محبت۔“

شہناز نے ہچل کے کہا ”چھوڑو مجھے بے شرم۔“

”تم جانتی ہو۔ مجھے منانے کا دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔“

راجا نے کہا۔

شہناز نے اسے غصے سے گھورا اور پھر بس پڑی۔

میں نے کہا ”راجا۔ یہ کردار مجھے بہت پراسرار لگتا ہے۔“

”کون اکبر خان..... میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”کیا تو نے دیکھا؟ جب وہ شہناز کو تھکا لایا تو کیسے لایا تھا؟ اس نے شہناز کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔“

راجا سوچ میں پڑ گیا ”واہی یار.....!“

”اس کی بیساکھی کہاں تھی؟ مجھے اس نے بتایا تھا کہ سن اکبر کی جنگ میں اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ میں نے پوچھا تو

کہہ رہا تھا کہ میں نے ایک ٹینک کو ٹانگ اڑا کر کرانے کی کوشش کی تھی۔“

”یہ تو بہت بڑا جھوٹ ہوا اس نے۔ اس کی موجودہ عمر کتنی ہوگی پچاس پچپن۔ پچیس سال پہلے وہ ہوگا تیس سال کا“

ایک عام سپاہی۔“ راجا بولا۔

میں نے کہا ”اور اگر فوج میں بھرتی کے بعد ہی اسے حماد جنگ پر جانا پڑا تھا جہاں وہ زخمی ہو گیا اور اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نائب صوبے دار کیسے بن گیا۔ عام طور پر ایک سپاہی کو جو تیر کشف آفسر کے عہدے تک پہنچنے کے لیے تیس پچیس سال درکار ہوتے ہیں۔

صوبے دار کے عہدے پر ان کی ریٹائرمنٹ ہو جاتی ہے تاہم کچھ خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جن کو اعلیٰ کارکردگی کے باعث میں اعزازی طور پر ریشمن دے دیا جاتا ہے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد خود کو اعزازی لیفٹیننٹ پائیٹنٹ لکھتے ہیں۔ اکبر خان کو

ایک ٹانگ کٹ جانے کے بعد فوج سے ریٹائر کر دیا گیا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص دو چار سال سروس میں رہا وہ نائب صوبے دار کیسے ہو گیا؟“

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا ”یہ اس سے پوچھا جاسکتا ہے۔“

”لیکن ابھی نہیں اس کا باپ اور دوسرے گھر والے سب سیدھے سادے لوگ ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اکبر خان

سے سب ڈرتے ہیں۔ وہ سب پر حکم چلاتا ہے اور انہیں اپنے دباؤ میں رکھتا ہے۔ ابھی ہمارے پاس وقت نہیں ہے ورنہ ہم معلوم کرتے۔“

راجا پھر شہنشاہ کی طرف متوجہ ہوا ”یار آخر ہم کتنی بار پوچھیں اور کس زبان میں پوچھیں کہ تم آدھی رات کو ایکی ادھر کیوں گئی تھیں۔ اس درویش کے مزار پر۔ جس کا نام بھی معلوم نہیں کیا ہے؟“

میں نے بھی کہا ”ہاں! اکیلے میں ایسی کون سی منت مانی تھی اور ہمارے لاہور میں جو مزارات ہیں! کیا وہاں حاضری دینے سے تمہارے دل کی مراد بر نہیں آئی تھی۔ کیا یہ کوئی اسپیشلسٹ پیر ہیں؟“

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم اسے چھیڑ رہے ہیں وہ چپ بیٹھی رہی اور کچھ دیر بعد بولی ”تم مذاق اڑاؤ گے؟“

میں نے کہا ”ہرگز نہیں۔“

”یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔“ اس نے قدرے تذبذب کے بعد کہا ”جب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے تھے تو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجھ پر حویلی کے زمر اسرار ماحول کا اثر تھا۔ بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے باہر سے قدموں کی چاپ سنانی دی ہے اور برآمدے میں لوگ چل پھر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید یہی لوگ ہوں گے جو یہاں رہتے ہیں۔ حویلی کے ملازم ممکن ہے وہ رات کو باہر پیرا دے رہے ہوں۔ میں نے خوف دور کرنے کے لیے آیت الکرسی اور دعائے قوت دہرائی۔ اس سے کچھ سکون حاصل ہوا اور نیند آ گئی لیکن پھر آکھ مٹلی تو مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں کوئی باتیں کر رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھی۔ کچھ دیر کان لگائے بیٹھی رہی اور پھر دعائیں دم کر کے سو گئی۔ دوسری بار میری آکھ ایک روشنی سے مٹلی جو کھڑکی کے شیشوں پر نظر آ رہی تھی۔“

میں نے کہا ”روشنی تو میں نے بھی دیکھی تھی۔ میں سمجھا باہر بادل ہیں اور بجلی چمک رہی ہے۔ باہر نکل کے دیکھا تو تم دونوں تالاب کی منڈ پر پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔“

راجا نے حیرانی سے میری طرف دیکھا ”میں تو سب سے پہلے سو گیا تھا اور جب اس وقت جاگھا تھا جب تو نے جگا۔“

”مگر میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تم دونوں باتوں میں مگن تھے۔ میں نے ڈسٹر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

راجا ہنسا ”تو نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی لیلیٰ مجنوں کو دیکھا ہوگا لیکن پتر! وہ بیٹھے ہوں گے وہاں فکری محبت کا منظر پیش کرنے کے لیے۔ میں تو ہرگز نہ جاؤں اس اجازت جگہ پر شہنشاہ کے ساتھ یہاں مٹی دھول کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ

ڈرپوک کب جائے گی میرے ساتھ۔“

شہنشاہ نے اس کی تائید کی ”ہاں رفیق بھائی! ہم جاتے ہیں آپ سے کیوں چھپاتے؟“

میں نے کہا ”کیا عجیب بات ہے۔ میں نے سنا دیکھا تھا تم دونوں کو..... خیر! ابھی اس بحث کو چھوڑ دو آگے بٹاؤ۔“

”میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ باہر بجلی چمکی ہوگی۔ اس وقت میں نے دیکھا تو راجا غائب تھا۔“

راجا بولا ”غائب تھا کا کیا مطلب خاتون! وضاحت فرمائیے۔“

”مطلب یہ کہ..... تم وہاں نہیں تھے جہاں سو رہے تھے۔ میں اٹھ کر دروازے تک گئی تو تم برآمدے میں کھڑے سکر بیٹ پڑے تھے۔“

راجا اچھلا ”میں سکر بیٹ پڑ رہا تھا۔ تمہارا دماغ خراب ہے شنو!“

شہنشاہ نے فحقت سے کہا ”مجھے بھی حیرانی ہوئی تھی۔ بلکہ غصہ آیا تھا کہ ایک بری عادت نہیں تھی۔ وہ بھی لگتی ہے۔ تم چپ چپ کے سکر بیٹ پڑے گے ہو۔ میں واپس آئی! پھل پھنپھن گئی تو تم برآمدے میں کافی آگے ٹپٹپے جا رہے تھے۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے گئی۔ تم برآمدے سے نیچے اترے اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھے تو مجھے غیب ہوا پھر میں نے تمہیں آواز دی اور تم نے مڑ کے بھی دیکھا مگر پھر آگے بڑھ گئے۔ میں نے کہا کہ راجا اس وقت کہاں جا رہے ہو تو تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ تم باہر نکل کے اٹنے باجھ کی طرف گئے۔ وہاں ٹھکے درخت ہیں اور جھاڑیاں ہیں۔ تم ان کے پیچھے گئے تھے۔ جب میں وہاں گئی تو مجھے تم کہیں دکھائی نہ دیے حالانکہ میرے اور تمہارے درمیان چند قدم ہی کا فاصلہ ہوگا۔

وہاں ایک پختہ قبر تھی۔ اس پر چادریں اور پھول وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ قبر کے گرد چار ستون تھے اور ان پر پھت بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے تمہیں آواز دیں اور آگے گئی۔ قبر کے چوتھے کی جانب سر ہٹا دیا۔ میں نے اوپر چڑھ کے دیکھا تو اس کے بالکل پیچھے ایک عجیب سی قبریں نظر آئیں۔ میں نے ہر طرف دیکھا اور تمہیں آواز دی۔“

راجا نے غل انداز کی ”پھر وہاں ایک سبز پوش نمودار ہوئے! لمبی اور لہرائی سفید داڑھی والے! انہوں نے کہا کہ لڑکی! ہم ہیں راجا!“

شہنشاہ نے فکری میں سر ہلایا ”ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھے کوئی روح ملی نہ مجھے کوئی آواز سنانی دی۔“

”شنو! آخر میرے روپ میں تمہیں وہاں لے جانے والا کون تھا؟“

راجا نے کہا ”وہ تمہارے رفیق بھائی کے کوئی پردادا کے پردادا وغیرہ ہی تو تھے۔ میرا روپ بدل کے آگئے تھے تمہیں درغلانے۔“

”مجھے تو وہاں عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی۔ اسی نے میرے دماغ پر اثر کیا۔“

”یعنی جتنا بھی تھوڑا بہت دماغ ہے..... یا محسوس ہے۔“

شہنشاہ اس وقت برا ماننے کے موڈ میں نہیں تھی ”مجھے پکڑ سا آیا! وہ حواس پر طاری ہونے والی خوشبو تھی۔ اس نے مجھے میری ساری طاقت سلب کر لی۔ اب میں کیسے بیان کروں! میڈیکل میں ہم نے ہر قسم کی بو اور خوشبو کا تجربہ کیا ہے۔ کلورین یا ایسونا اور کورڈ فارم کی بھی تو بو ہی ہوتی ہے جو بے ہوش کر دیتی ہے مگر یہ خوشبو تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔“

میں نے کہا ”چلو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ ایک مافوق الفطرت واقعہ تھا لیکن آگے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس سویرے اکبر خان ادھر کیا لینے گیا تھا۔ ایسے ہی اور بھی سوالات ہیں جو میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔ فی الحال گاڑی کا مسئلہ اہم ہے۔“

”رفیق بھائی! آپ کو کس پر شک ہے! اکبر خان پر؟“

میں نے کہا ”ابھی کوئی بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کوئی ہمارے پیچھے یہاں تک آیا ہو اور ابھی آس پاس ہی موجود ہو۔ ظاہر ہے صرف گاڑی کے ٹائر کاٹ کے تو وہ مطمئن نہیں ہوگا اگر اس مفروضے کو مان لیا جائے تو پھر ہمیں قحط بوکے اپنے دفاع کو مضبوط کرنا ہوگا۔ یہ دشمن کے پلان کا پہلا حصہ تھا۔ ہمیں محصور اور بے بس کرنے کے بعد وہ اگلا قدم اٹھائے گا۔“

”کیا ہوگا! اگلا قدم؟“ شہنشاہ نے ڈر کے پوچھا ”اور کون ہو سکتا ہے ایسا دشمن..... تمہارا یا راجا کا؟“

میں نے کہا ”میں نے ایک مفروضے کی بات کی تھی۔“

راجا بولا ”تمہارے تمام سوالات کا جواب ایک تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ میں ہوگا جو مختصر عرصے میں اپنا کام شروع کر دے گا۔“

میں نے کہا ”میرا دھیان رجب علی کی طرف بھی جاتا ہے۔ یہ اس کینہ پرور شخص کی کارروائی نہ ہو۔“

راجا نے کہا ”یار مجھے یاد آیا..... جب میں گاڑی سے

میڈیکل بیک نکالے گیا تھا تو مجھے گیٹ پر ٹائروں کے نشانات نظر آئے تھے۔ جیسے کسی نے گیٹ سے گاڑی کو تھوڑا سا دبا دیا اور پھر دائرے میں کھما کے لے گیا۔ ہم تو سیدھے اندر آگئے تھے! چل دیکھتے ہیں۔“

راجا کی نظر نے عجیب سا شاہدہ کیا تھا۔ کوئی گاڑی رات کے وقت گیٹ تک آئی تھی۔ یہ بات میں بھی ثابت ہوئی تھی کہ نرم مٹی میں دو طرح کے ٹائروں کے نشانات بہت واضح تھے۔

ہماری گاڑی میں جنرل کے ریڈیل ٹائر تھے جبکہ دوسری گاڑی میں شاید کوئی غیر ملکی برائڈ کے ٹائر تھے۔ شوقین اور دولت مند اپنی قیمتی گاڑیوں میں ڈنپ اور گڈائر کے یا کورین ٹائر بھی لگوا رہے تھے۔ ٹائر بالکل نئے تھے چنانچہ ان کا پرنٹ بہت نمایاں تھا۔

راجا نے مل کی طرف دیکھا ”گاڑی اسی بل پر سے گزر کے آئی تھی۔ بیڈ لائنس چلائے بغیر یہ کار نامہ سرانجام دینے کا خطرہ کوئی مول نہیں لے سکتا۔“

میں نے کہا ”رائٹ۔ ایک موڑ کا نٹے ہی بل آ جاتا ہے۔ اس موڑ کے بعد گاڑی کی لائنس کو ڈرائیو کے لیے روٹن کیا گیا۔ اس کی چمک میں نے بھی شیشے پر دھیمی اور شہنشاہ نے بھی۔ ہم دونوں نے یہی سمجھا کہ باہر بجلی چمکی ہے۔ مل سے یہاں تک لائن چلائے بغیر آنا کوئی مشکل کام نہیں۔“

”رات بارش تو ہوتی ہے“ شہنشاہ نے کہا۔

”ہاں..... مگر بہت معمولی اگر زمین نم نہ ہوتی تو ٹائروں کے نشانات کا فرق اتنا نمایاں نہ ہوتا۔ تو دیکھ یہاں کی زمین کچھ تخت اور چھتری ہے۔ ہماری گاڑی کے نشانات غور سے دیکھے بنا نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ میری جاسوسی حس یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ بڑی گاڑی تھی۔ ٹائروں کا دائرہ دیکھ کے اندازہ ہو جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”یہ رجب علی خود کو برا خاندانی ظاہر کر رہا تھا مگر ہے بہت کینہ اور چھوٹا“ صرف ٹائر کاٹ کے اس کے دل کو تسلی ہو گئی؟“

راجا نے کہا ”ہو سکتا ہے خود رجب علی نے کچھ نہ کیا ہو۔ اس کے پیچھے بھی تو ہوں گے۔ کسی شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار نے کہا ہوگا کہ ان سنے شہری دولت مندوں کا دماغ درست کرنا ضروری ہے جو یوں خاندانی رئیسوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرتے ہیں۔ تو نے اس کے ڈرائیور کا جارحانہ موڈ دیکھا تھا! وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے ہمیں گولیوں سے بھونکے رکھ دے گا۔“

میں نے کہا ”ایک ڈرائیور کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ

مالک کی مرضی کے بغیر اس قسم کی کارروائی کر سکے اگر وہ پکڑا جاتا تو کیا بات رجب علی تک نہ جانی؟ وہ خود بھی ہمارے رویے پر برہم تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مشین نے سزا جو تیر کی ہو اور اس نے مشکوری دے دی ہو کہ چلو ابیں تھوڑا سا سبق سکھا دو مگر خبردار! کوئی پکڑا گیا تو میں ان کے سامنے دس جوتے اضافی لگاؤں گا۔“

راجا نے کہا ”چل دفع کر اسے۔ یہ بتا ب کیا کریں؟“ میں نے کہا ”ہم سب ٹیلا جوگیاں تک مارچ نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے ایک جائے گا۔“

”اور اس ایک کا مطلب ہے میں۔۔۔۔۔“ راجا نے غصہ کی سانس لی۔

”معتل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔“ راجا نے شکایت آمیز نظروں سے شہنشاہ کو دیکھا ”تم میرا دل رکھنے کے لیے تو کہہ سکتی ہو کہ تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی کیا۔“

”میں یہ پورا گانا سنا سکتی ہوں مگر جاؤں گی نہیں۔ مجھے پیدل چلنے کی بالکل عادت نہیں“ شہنشاہ نے کہا۔

”اگر سواری مل جائے۔ اکبر خان کی فیملی کے پاس سائیکل ضرور ہوگی۔ میں تمہیں بٹھا کے لے جا سکتا ہوں۔“

میں نے کہا ”ٹیلا جوگیاں میں فون ہوگا۔ ممکن ہے کوئی گاڑی بھی مل جائے۔ قریب ترین شہر جہلم ہے۔ وہاں سے تجھے تین ماٹریڈ کر لانے ہوں گے۔ نیوب اور اسٹریٹ کے ساتھ۔ چوتھا ہمارے پاس ہے۔ آنے جانے میں مجھے چار پانچ گھنٹے ضرور لگ جائیں گے اور دس ہزار خرچ بھی ہوں گے۔ تو میرا لے لی ایم کارڈ لے جا۔“

”کارڈ میرے پاس بھی ہے۔“ راجا بولا ”پیوس کا کوئی مسئلہ نہیں۔“

ہم درمیانی محکم کو عبور کر کے روڈ کو اڑھائی تک گئے۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے۔ پانچ سے دس سال کی عمر کے کچھ بچے باہر کھیل رہے تھے۔ کوئی باقاعدہ کھیل بھی نہ تھا۔ ہر روز کی طرح وہ محض وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کر رہے تھے۔ ان کے کپڑے نامکمل اور بویدہ تھے۔ چار سال کی ایک

بچی نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ دوسری اس سے ذرا بڑی نے صرف قمیص گلے میں ڈال لی تھی۔ سات سال کا ایک لڑکا صرف بنیان میں لمبوس تھا تو اس سے دو بڑے نگر پہنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے انہیں کپڑوں کے خراب ہونے کی فکر تھی اور نہ ہی یہ خیال تھا کہ ہاتھ پیر گندے ہو جائیں گے۔ وہ منی میں لوٹ رہے تھے ایک دوسرے کو گرا رہے تھے اور مار پیٹ میں

گالیاں بھی دے رہے تھے مگر یہ سب ان کے لیے بھی کھیل تھا اور ان کے ماں باپ کے لیے بھی۔ وہ اسکول نہیں جاتے تھے اور پڑھتے نہیں تھے اور کوئی کام کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔ ہر غیر ضروری کام صبح سے رات تک وقت گزارنے کے لیے ضروری تھا۔

اکبر خان کی آؤٹ آف ڈیوٹ ہو جانے والی منگھو برآمدے میں چار پائی پر بیٹھی ایسے ہی شعل سیکاری کے طور پر اپنی بیٹی کے بالوں میں بڑے انتہاک سے کھلی پھیر رہی تھی۔ ہر بار کھلی کوتیل میں ڈوبے بالوں سے گزرا کر وہ غور سے معائنہ کرتی تھی کہ اس میں کوئی جوں برآمد ہوئی یا نہیں؟ اس کی نین اب بڑی فریج پر پاؤں پارے مکمل پیر کی کے ساتھ بڑا بیٹھی تھی۔ اسے جان چھڑانے کا اچھا موقع ملا۔ وہ بڑی شوخ فہمی کے ساتھ لہرا کے ابھی اس نے فوراً دو پنا کھینچا اور ہم پر واضح کیا کہ میرے پاس بھی۔۔۔۔۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

چار پائی سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے مہاتما بدھ کے آسن میں ایک مجذوب صفت بزرگوار تشریف فرما تھے۔ اس کی عمر تو شاید چالیس پچاس ہوگی مگر بالوں میں غالب سفیدی نے اسے بزرگی عطا کر دی تھی۔ یہ بال جھاڑ جھکاڑ داڑھی کی صورت میں بھی پھیلے ہوئے تھے اور شانوں تک آنے والی زلفوں کی شکل میں تھیں۔ وہ قدرے پتہ قد اور سیاہ رو تھا لیکن اس کا بدن گتھا ہوا اور مضبوط تھا۔ خصوصاً اس کی گردن کی پھینے جیسی تھی جس میں اس نے گڑبڑوں کی مالا پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے کڑے تھے جو ہاتھ کی حرکت سے بچتے تھے۔ اس نے بیروں میں بھی ہتھکڑیاں باندھ رکھے تھے۔ وہ گھنٹوں سے نیچے تک آنے والے تاریکی رنگ کے جفے میں لمبوس تھا جو کثرت استعمال سے انتہائی میلا ہو چکا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔

وہ لپک کے برآمدے سے اترتا اور ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سوائے نشان بن کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی لال لال میلی آنکھوں سے ہم سب کو باری باری گھورا۔ شہنشاہ ڈر کے راجا کے پیچھے ہو گئی۔

میں نے کہا ”تم کون ہو۔“

”حق“ اس نے ایک نعرہ لگایا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا ”کیا تو جانتا ہے کہ تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جانے گا بول۔“

میں نے متانت سے کہا ”اکبر کہاں ہے۔“ اس نے ایک دم جھک کے زمین سے مٹی اٹھالی اور

ہری طرف ہاتھ پھیلا کے ایک مجذوب ماری ”اکبر اعظم سکندر اعظم“ مثل اعظم! سب ایک منہی خاک۔۔۔۔۔ میں اور تو سب منی کے پتلے۔۔۔۔۔ سب منی۔“

اگر میں فوراً پیچھے نہ ہٹا تو لمک کی پھوک سے اڑنے والی مٹی میری آنکھوں میں پڑتی۔ خیریت گزری کہ اسی وقت اکبر خان کی بیوی خود کو سنہاٹتی پائین کا پتلی آگے آگئی ”یہ میرا دیور ہے جی! اکبر خان کا چھوٹا بھائی اصغر۔ بڑا اللہ لوک ہے جی!“

اللہ لوک صاحب نے ایک قہقہہ لگایا ”چھوٹا بڑا۔۔۔۔۔ اصغر۔۔۔۔۔ اکبر“ اور ازراہ عنایت واپس تشریف لے گئے۔

میں نے کہا ”مجھے اکبر خان سے کام تھا۔“

”وہ باپ بیٹا پیچھے ہوں گے“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا ”اس وقت کھیت میں ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”کسی بچے کو پیچھا سونے والا کرانے۔“ اس سے پہلے کہ اکبر کی بیوی اپنے شوہر کی طبی کی لیے کسی ذمے دار تابع اور اور پروردار کا انتخاب کرتی برآمدے میں کپڑے نچوڑنے والی خاتون نے چلا کے کہا ”بھابی! انسانی نہیں دیتا اندر لا رہا ہے۔“

چھوٹی بھوی مراد ہے مسر مسر حرم جانو بابا سے تھی جوشا یہ بڑی بھوکا یاد کر رہے تھے ”تو پوچھ لے نا اٹھ کے“ اکبر کی بیوی نے کہا۔

چھوٹی بھو یعنی مسر اللہ لوک کی دانف نے ترخ کے جو جواب دیا اس کا مطلب آسان اردو میں یہ نکالا جا سکتا ہے کہ میری جانی ہے جوتی۔ بڑا ہار رہا ہے نہ جان چھوڑتا ہے۔ سارا دن پڑا چلا رہا ہے۔ اس صورت حال کو انفس ناک ضرور کہا جا سکتا تھا مگر اسے بدل نہیں جا سکتا تھا۔ میں اکبر خان کے انتظار میں کھڑا ہوا چل کا جائزہ لے رہا تھا کہ اکبر خان کی بیوی اندر گئی اور پھر باہر آئی۔

”صاحب جی! جانو بابا آپ کو بلارہا ہے۔“

مجھے حیرانی ہوئی کہ اسے میری آمد کا علم کیسے ہوا۔ وہ ادنیٰ سنستا تھا۔ باہر سے میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے راجا اور شہنشاہ کو وہاں رکھنے کا اشارہ کیا اور پھر اس تاریک کمرے میں گیا جہاں جانو بابا قید حیات کے آخری ایام گزار رہا تھا۔ اندر ایک ناقابل بیان قسم کی بدبو تھی جس میں سانس لینا بھی دشوار تھا مگر میں ضبط سے کام لیتے ہوئے اس چار پائی کے کنارے پر کھ گیا جس پر جانو بابا کا خستہ تن ڈھا چھاپڑا ہوا تھا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا ”اکبر کون ہے یہاں جناب!“

میں نے اکبر خان کی بیوی کی طرف دیکھا اور وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گئی ”اب کوئی نہیں“ میں نے کہا۔

”دراصل۔۔۔۔۔ مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا جناب! یہ جو میرا بیٹا ہے نا اکبر! آپ نے اس کو چایاں سوپ کے اچھا نہیں کیا۔“

میں نے حیرانی سے کہا ”کیوں جانو بابا!“

”وہ۔۔۔۔۔ کب سے چاہتا تھا کہ میں چایاں اسے دے دوں۔ مگر میں جانتا تھا اس کی نیت ٹھیک نہیں اس نے کئی بار تجھ کی۔۔۔۔۔ بد بخت ہے وہ۔ اس نے اپنے باپ کو مارا۔“ جانو بابا رونے لگا ”مارڈ اتا وہ مجھے اگر اس کی ماں بیچ میں نہ آتی۔ میں نے کبھی نہیں بتایا اسے کہ چایاں کہاں ہیں۔ وہ کچھ نہ چھوڑتا اگر چایاں آسے مل جاتیں۔“

میری حیرانی بڑھ گئی ”چایوں میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”آپ کو نہیں معلوم جناب! انہوں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟ بڑے مالک نے۔“

”معتل احمد نے؟“

”سرکار۔۔۔۔۔ برامت نامیں۔۔۔۔۔ میں پرانے دقتوں کا بڑھا آدمی ہوں۔ آپ کے والد اور دادا کا نمک کھایا ہے ایک بات کہوں۔“

میں نے کہا ”تم کہو جو کہنا چاہتے ہو۔“

”جناب! یہاں ہم اپنے سے بڑوں کا نام نہیں لیتے۔ آپ چھوٹے مالک ہیں وہ بڑے مالک ہیں۔ وہ آپ کے دادا ہوتے ہیں۔“

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی ”تم نے بہت اچھا کیا جانو بابا۔ لندن میں رہ کے میں یہاں کے سارے ادب آداب بھول گیا تھا۔ مجھے دادا دایا کہنا چاہیے انہیں ان کا نام نہیں لینا چاہیے۔“

”کیا بڑے مالک نے نہیں بتایا کہ یہاں پرانی حویلی اور آبائی زمین کے علاوہ کیا ہے؟“

”نہیں، کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟“

”حویلی کے جو کمرے بند ہیں۔ ان میں ڈیڑھ سو سال میں جمع ہونے والی بہت سی قیمتی چیزیں ہیں۔ آپ کے خاندانی نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ میں نے خود آپ کے دادا کی خدمت کی ہے اور ان کے دادا کے زمانے کے چاندی سونے

کے برتن استعمال ہوتے دیکھے ہیں۔ آپ کے والد کے زمانے میں ولایتی چینی کے برتن آگئے تھے۔ سونے چاندی کے ظروف محفوظ کر دیے گئے تھے۔“

میں دم بخود رہ گیا۔ ”اگر وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتے تھے تو میرے جواہرات اور زیورات بھی ہوں گے۔“

”کیوں نہیں جناب! ان کی بیگمات کیا عام عورتیں تھیں۔ ان کا سارا زیور بھی محفوظ ہے لیکن اس کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں۔ وہ سب تجویروں میں رکھا جاتا تھا اور تجویز خفیہ ہوتی تھیں۔ صرف مالک جانتے تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کیسے کوٹلی جاسکتی ہیں۔ میں نے بھی کسی کو تجویز کوٹلتے نہیں دیکھا۔ دراصل بن بلائے ہم ہر جگہ نہیں جاسکتے تھے۔ خاص طور پر خواب گاہ میں۔ یہ چایاں ان کی امانت تھیں۔ میرا کام حفاظت کرنا تھا۔ تھلائی لینا نہیں“ وہ بولتے بولتے ہانپنے لگا۔

میں نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی تمام زندگی کتابی اصولوں کے مطابق صراطِ مستقیم پر چلتے گزرتی تھی، جن کے مطابق وہ خادم تھا تو مالک نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے نمک کھایا تھا تو نمک حرامی نہیں کرسکتا تھا۔ محافظ تھا تو چور نہیں بن سکتا تھا۔ خواہ کوئی دیکھنے والا یا پوچھنے والا یا حساب لینے والا ہو نہ ہو۔ اس نے غربت اور افلاس کو برداشت کیا، سختی، جھجکی، دکھ اور بیماری کا مقابلہ کیا مگر اس خزانے میں سے جس پر اسے عمل اختیار حاصل تھا، اپنے لیے ایک روپیا نہیں لیا۔ ایک عام آدمی زندگی کے ایسے پرزائش دور میں کمزور پڑ جاتا ہے اس کا ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے شیطان اس پر غلبہ پانے کے لیے لالچ اور ہوس کے ہتھیاروں سے یلغار کرتا ہے۔ اسے وہ غلامتا ہے کہ ڈرتے کیوں ہو؟ مالک کہاں ہیں کہ انہیں کچھ پتا چلے اور انہیں جیل بھی گیا تو وہ جیل نہیں بچ سکتے دیں گے۔ تمہارے پاس ضرورت کا جواز ہوگا۔ وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔

لیکن وہ پرانے وقتوں کا جاہل بڑھا تھا مترغبات اور مجبوریوں کے تقاضوں کے سامنے چٹان بن کے ٹکڑا رہا تھا۔ میرے لیے یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ میں اکیسویں صدی میں ایمانداری، خداترزی اور فرض شناسی کا ایسا کامل نمونہ دیکھ رہا ہوں۔ ٹیوٹیجیسی خیالی ریاست کی طرح ایک مثالی فرشتہ سیرت انسان میرے سامنے موجود ہے۔

اب وہ میری حفاظت کا فریضہ پورا کر رہا تھا۔ مجھے سمجھا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ مجھے خبردار کر رہا تھا کہ میرے دشمن کون ہیں۔ میں جو مالکوں کی میری یا

چوکی نسل سے تعلق رکھتا تھا اس کے لیے اتنا ہی محترم تھا جتنا پہلے والے مالک تھے۔

”ایک بات اور بتا دوں مالک.....!“

کچھ دیر کے لیے میرا ذہن اس کی باتوں سے ہٹ گیا تھا۔ معلوم نہیں اتنی دیر میں اس نے کیا کہا کیا بتایا۔

”اگر آپ کی ملاقات بڑے مالک سے ہو..... یا بات ہو.....“

میں نے کہا ”جانو بابا! کیا تمہیں معلوم نہیں مجھے وارث مقرر کرنے کے بعد تمہارے بڑے مالک یعنی میرے دادا عقیل احمد کا انتقال ہو گیا تھا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہا ”آپ نے کیا کہا چھوٹے مالک!“

میں نے کہا ”تمہارے بڑے مالک اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی وفات لندن میں ہی ہو گئی تھی۔“

اس نے آہستہ سے کہا ”اللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ کیا انہوں نے بھی میرا ذکر کیا تھا؟“

جانو بابا کا دل رکھنے کے لیے کہا ”ہاں، انہوں نے کہا تھا کہ وہاں ایک شخص ہے جس پر میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہوں اس کا نام جان محمد ہے۔ وہ تمہیں سب بتا دے گا۔ تم بھی اس پر بھروسہ کر سکتے ہو۔“

اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی ”ٹھیک کہاں انہوں نے مالک۔ اب بڑے اور چھوٹے کی بات تو ختم ہو گئی۔ آپ ہی مالک ہو جب تک سانس ہے میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ کسی کو یہ بات نہ بتائیں۔ میں اونچا سنتا ہوں اور نہ ہی میرا حافظہ خراب ہے۔ یہ سب میں نے خود کو بچانے کے لیے مشہور کیا تھا۔ اکبر خان مجھے رابھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ چایاں میں نے کہیں رکھی ہوں گی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ کہاں رکھی تھیں۔ کسی دن یاد آ جائے گا۔ بہت سی باتیں میں سنتا تھا جن سے مجھے اس کی نیت کا اندازہ ہو جاتا تھا مگر میں ظاہر بھی کرتا تھا کہ میں نے کچھ نہیں سنا۔ چایاں میری بیوی نے کہیں چھپائی تھیں۔ جب آپ کے آنے کی خبر ملی تو اس نے مجھے لادری تھیں۔“

میں نے کہا ”تم نے کمال کر دیا جانو بابا۔ اب تم فکر مت کرو۔ تم یہاں نہیں ہو گے۔ تمہارے آرام اور علاج کی ذمہ داری میری ہے۔ میں تمہیں شہر کے بہترین اسپتال میں داخل کرادوں گا۔ تمہاری رہائش کا انتظام بھی شہر میں ہوگا۔ تم نے بہت خدمت کی۔ اب تمہاری خدمت میرا فرض ہے۔ ابھی میں چلتا ہوں تم سے پھر ملاقات ہوگی۔“

بیوی بچوں کو بھلا دیا ہے۔ کبیر خان کوئی بچہ نہیں جو بیس سال کا نوجوان ہے۔ وہ سب کھتا ہے..... مگر کچھ نہیں سکتا۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہو بابا! آپ نے اچھا کیا کہ مجھے خبردار کر دیا۔ میں محتاط رہوں گا۔“

جب میں باہر آیا تو نہ مجھے راجا دکھائی دیا اور نہ شہناز نظر آئی۔ کچھ فاصلے پر درخت کی ڈالی سے بندھ جھولے پر ایک نوجوان جھول رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کے لیے کھلے بال لہراتے نظر آئے۔ یہ ریشماں تھی جس نے مردانہ شرٹ کے ساتھ پرانی جینز کی پتلون پہن رکھی تھی۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ یہاں ریشماں کو یہ لباس پہننے کی اجازت کس نے دی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے ماں کے ساتھ سر میں تیل لگواتے دیکھا تھا تو وہ عام قسم کے شلوار قمیض میں تھی۔ میرے بلانے پر وہ قریب آئی تو میں نے کہا ”کیا اکبر خان یہاں آیا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور طمسی ”اس وقت تو وہ ہوتا ہے اپنی ایٹور یا رانے کے پاس۔“

میں اس کی فلی مثال پر حیران نہیں ہوا۔ اب گاؤں کی ہر گوری پر شو بڑس کا سارا گھیر براہ راست آسان سے اترتا ہے اور سیٹلائٹ چینل کی جلوہ سامانی سب جگہ وہی ہے۔ کیا شہر اور کیا بن۔ کیا صحرا اور کیا چمن۔

میں نے کہا ”اچھا..... وہ جو یہاں کھڑے تھے ان کا نام راجا ہے۔“

وہ ہنس پڑی ”وہ کہاں کے راجا ہیں یہاں کے راجا تو آپ ہو۔“

میں نے کہا ”وہ بہت بڑے بھائی ہیں۔ ان کے ساتھ جو خاتون تھیں ڈاکٹر شہناز!“

وہ ناک سیکڑ کر بولی ”وہ..... وہ ڈاکٹر ہے؟ شکل سے تو کچھ اور ہی لگتی ہے۔ وہ پھر ہنس پڑی۔

میں نے سختی سے کہا ”فضول باتیں مت کرو۔ یہ بتاؤ وہ کہاں گئے ہیں؟ تم نے دیکھا ہے تو بتاؤ۔“

وہ ڈر گئی ”وہ جی..... راجا صاحب تو بھائی کے ساتھ سائیکل پر گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ ادھر ہیں“ اس نے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا وہاں فیصل توڑ کے راست نکلا گیا تھا۔ باہر کھیت تھے جن میں موسم کی سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ دو دو عمر لڑکے اور تین عمر رسیدہ عورتوں کے علاوہ کچھ بچے کھیتوں میں کام کر رہے تھے یا کھوم رہے تھے۔ تقریباً چار سو گز کے فاصلے پر ایک بیل روتی قسم کے مٹ کوٹھارہ تھا

جانو بابا کے چہرے پر خوشی، اطمینان، تشکر اور امید کے ملے جلے جذبات کی روشنی اتر آئی تھی۔ اس نے محبت سے میرا ہاتھ قلم کے اپنی آنکھوں سے لگایا اور چوا۔ اس کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا جس سے وہ میرا شکر ادا کر سکتا۔

میں نے اس وفادار جاندار کو یہ نہیں بتایا کہ اکبر کے ہاتھ میں جانے کے بعد چایاں پراسرار طور پر کم ہو گئی ہیں لیکن باہر نکلنے نکلنے مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے کہا ”بابا! فرض کرو اکبر کی روزتالے توڑ دیتا.....؟“

جانو نے سر ہلایا ”ہاں..... وہ ایسا کر سکتا تھا مگر میں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جس روز ایسا ہوا میں خود اس کے خلاف رپورٹ لکھواؤں گا۔ اور ہم کوای بھی دیں گے..... میں اور میری بیوی۔“

میں نے کہا ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی کی مدد سے تالے کھولے ہوں اور کچھ سامان نکال لیا ہو“ تمہیں کیا پتا پڑے گا؟“

”نہیں مالک، ایسا ہو نہیں سکتا۔ ایک ایک چیز میری دیکھی بھائی ہے۔ مجھے سب یاد ہے کہ کون کی چیز کہاں رکھی تھی۔ وہ وہیں ہونی چاہیے۔ سونے کا ایک چھچھو لے گا تو مجھے پتا چل جائے گا۔ اس کے علاوہ ابھی تک میں نے دن رات چوکیداری کی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں وہیں رہتا تھا۔ وہیں ہوتا تھا۔ صبح شام تالے چیک کرتا تھا۔“

”اپنی حفاظت کے لیے کیا تمہارے پاس؟..... کوئی ہتول یا رپو الوور؟“

”رپو الوور تھا مالک۔ لائسنس بھی تھا میرے نام پر مگر ہو گیا۔ بلکہ چوری ہو گیا۔ میں نے اس کی رپورٹ لکھوا دی تھی۔ مجھے معلوم ہے چور کا نام مگر میرے پاس ثبوت کوئی نہیں تھا۔ میری حفاظت کرتا تھا میرا پوتا کبیر خان۔ وہ بابا پر نہیں فحش ہو گیا ہے۔ جوانی کی کوئی تصویر ہوئی تو میں آپ کو دکھاتا۔ مگر اب وہ کبیر خان تھا لیکن اصل بات صورت کی نہیں سیرت کی ہوتی ہے مالک۔ آپ اس پر پورا بھروسہ کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا ”وہ بابا کی مخالفت کرتا ہے؟“

”جو کچھ وہ کر رہا ہے..... اس میں کوئی بھی اکبر خان کا ہاتھ نہیں دے سکتا۔“

میں نے کہا ”ممکن ہے تمہارا شک درست ہو۔ اس کی نیت میں نور ہو لیکن ابھی تک تم نے اس کے عزائم پورے نہیں ہونے دیے۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟“

”بہت سی باتیں ہیں مالک!“ وہ ابھر کے بولا ”جب سے وہ اس عورت نور جہاں کے چکر میں پڑا ہے اس نے اپنے

اس نے دوبارہ ہلکا سا "ووہ بہت اچھا ہے جی" کہا۔
 سمر نے ان جھمی پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔
 "تم کو وہ کیا کہتا ہے۔ رانی کمرچی یا ایشوریہ رانی؟"
 میں نے افسوس کا اظہار بھیجے۔ سمر نے سچے سچے کیونکر یہ سنا ہے؟
 کی لپٹار نے پیار کا مقبوضہ اور محبت کی زبان سب کیلئے

”نہیں جی وہ تو پہلی بیوی کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔“
 ”تمہاری معلومات واقعی مکمل ہیں“ میں نے اعتراف کیا۔
 ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے چاچے کے ساتھ کیا ہوا۔
 جب اسے پوری سے نکال کے رانا صاحب کے سامنے پیش کیا گیا؟“

”اسے کاٹ کر کتوں کے سامنے ڈال دیا جاتا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی۔ ایک تو جانو بابا نے لندن میں مالکوں کو ٹیلی فون پر بتا دیا تھا کہ اصغر نے کیا حرکت کی ہے اور اب وہ لاپتا ہے لیکن جس دن وہ پکڑا گیا اس دن رانا واقعی اس کی لاش اپنے شکاری کتوں کے آگے ڈال دے گا۔ لندن والے مالک نے جانو بابا سے کہا کہ وہ اصغر کی گمشدگی کی رپورٹ کھوادیں۔ پولیس آسانی سے رپورٹ کہاں کھتی ہے مگر لندن والے مالک کا دباؤ تھا۔ رانا نے تو کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ جانو بابا کی رپورٹ لکھ لی گئی۔ جس دن اصغر کو گرفتار کر کے لایا گیا وہاں علاقے کے ایس بی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ رانا اس سے خوش نہیں تھا اور بعد میں رانا کی وجہ سے اس کا تبادلہ بھی ہو مگر ایس بی نے رانا سے کہہ دیا کہ یہ ست بدھائی والوں کا بندہ ہے اور لندن سے مجھے فون آیا تھا کہ اس کا پتا لگایا جائے۔ اب آپ اسے چھوڑ دیں۔ رانا نے انکار کر دیا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے اپنی بے عزتی کا حساب برابر کرنا ہے۔ ایس بی جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ بندہ مجھے آپ سے زندہ سلامت وصول کرنا ہے اگر یہ مر گیا تو آپ کے خلاف قتل کا پراچا میں خود درج کر دوں گا۔ بس اسی سے چاچا بچ گیا مگر اس کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ اس نے چاچا کا حال خراب کر دیا۔ اس کو بہت ذلیل کیا گیا اور مارا چٹا گیا۔ سنا ہے کھانے میں زہر بھی دیا گیا۔ وہ مبینہ بھرے زیادہ رانا صاحب کے پاس رہا تھا۔ اسے کتوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ ایک میں اسے بھی بند کر دیا گیا تھا۔ اسے وہی کھانا پڑتا تھا جو کتے کھاتے تھے۔ اس کے لیے ہونکنا پڑتا تھا۔ وہ چاروں باتوں بیروں پر چلتا تھا اور رانا صاحب کے قدموں میں لوٹتا تھا۔ وہ باغ میں یا گاؤں اور کھیتوں میں جاتے تھے تو وہ ان کے پیچھے چلتا تھا۔ وہ اس کو بید کی پتلی چمڑی سے مارتے تھے اور اس کی کھال ادھیر دیتے تھے۔ اس کے گلے میں پٹا تھا اور اسے زنجیر سے باندھ کے ہر جگہ لے جایا جاتا تھا۔ کتوں کی طرح اس کے تن پر بھی کپڑے نہیں ہوتے تھے۔“
 ”یہ سب اس نے بتایا؟“ شہناز نے جبر جھری لے کر کہا۔

”نہیں ہے۔ اسے میرا اسلام دینا۔ اللہ کے بعد وہی تیری حفاظت رکھتا ہے۔ پہلوان کو چوہدری اللہ داتا کی حمایت حاصل تھی۔ نے پوچھا کہ کیا تو نے اصغر سے نکاح کر لیا تھا؟ کبجری نے کہا کہ جب بچہ ہو گیا تو وہ نکاح کرنا چاہتے تھے مگر کوئی مولوی ناپراشی نہ ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ تم دونوں گناہ گار ہو اور یہ بچہ داتا ہے۔“ اس نے بڑی روانی سے کہا۔

”تم تو بہت کچھ جانتی ہو؟“ میں نے طنز سے کہا۔
 ”یہ سب چاچے نے خود بتایا تھا۔ پنڈت خات کے اس بیان نے اعلان کر کے اس کبجری سے نکاح پھوٹا لیا۔“
 شہناز نے کہا ”اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔ بار بار اسے کبجری کیوں کہتی ہو؟“

”زیر نام تھی جی اس کا۔ چوہدری اللہ داتا کی رانا صاحب سے پہلے ہی نکاح تھی۔ رانا صاحب نے پیغام بھیجا کہ زبجو کو باپ کر دیا جائے۔ چوہدری نے جواب دیا کہ اب وہ ہمارے ہنس کی عزت ہے۔ پہلوان نے کہا کہ میری بیوی کا نام بھی لیا گیا ہے تو اچھا نہیں ہوگا مگر ہاتھوں کی لڑائی میں بے چارے کی عزت (ہنس) میرے ہیں۔ رانا کے بندوں نے ایک دن ہنس تلے سے زبجو کو قتل کر دیا۔ وہ اس وقت پہلوان کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ وہ زبجو کا سر کاٹ لائے اور اسے رانا صاحب کے قدموں میں ڈال دیا۔ چاچے نے بتایا کہ رانا اس کوٹ بال کی طرح ٹھوکریں مارتا رہا۔“
 ”اس کے بعد پہلوان میں نے خوابی کا روروا کی ہوگی؟“

”آپ کو کیسے پتا چلی؟“ ریشماں نے حیرانی سے کہا۔
 ”ایسا ہی ہوتا ہے ایسی کہانیوں کا انجام“ میں نے کہا۔
 ریشماں نے اتفاق کے انداز میں سر ہلایا ”پہلوان اسی زمانہ کا ہو گیا تھا مگر جانے سے پہلے وہ اپنا بچہ چوہدری اللہ کے پروردگار تھا کہ اب اس عظیم کی پرورش آپ کرنا۔ کئی بچے بعد پہلوان ایک رات ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ ہمارا ہوا۔ رانا کے دو محافظ مارے گئے اور تین ڈاکو۔ کسی کو پتا نہیں چلا کہ جو تھا ڈاکو کو جلی میں ہے۔ وہ رانا صاحب علی کے ساتھ گھر گیا تھا۔ اور رات بھر وہیں رہا اس کی بیوی نے تیری بیوی بھی۔ حویلی کے اندر سے پکڑا جانے والا ڈاکو گروہ اسے بعد میں ہانسی ہو گئی۔“

شہناز نے پوچھا ”کیا وہ تیری بیوی ہی رانا صاحب علی تھا؟“

کر دیا تھا۔ یہ چاچا اصغر پہلے ایسا نہیں تھا۔ بڑا سوہنہا مگر جوان تھا۔ اکھاڑے میں زور بھی کرتا تھا۔ وہ ادھر کسی زمیندار کے ڈیرے پر تاجے آتی تھی۔ زمیندار کی بہن کی شادی تھی۔ زمیندار کے گھر میں ہی تک گئی۔ چاچا ادھر زمین پر کام کرنے والے مزارعوں کو قابو رکھتا تھا۔ ایک دن پنڈت خات کے پہلوان سے اس کا جوڑ بڑ گیا۔ چاچا نے اسے چت کر دیا۔ مقابلے میں رانا صاحب بھی تھے اور چوہدری صاحب بھی۔ میں نے چونک کے پوچھا ”کون رانا صاحب رانا صاحب علی؟“
 ”نہیں ان کے والد رانا صاحب علی آپ جانتے ہو انہیں؟“

میں نے نفی میں سر ہلادیا ”آگے بولو۔“
 ”چاچا اصغر جب منی سے بھرے بدن کے ساتھ رانا صاحب سے انعام لینے گیا تو ادھر وہ کبجری بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ چاچا اس کی نظر میں کھب گیا لیکن چاچا اس کے قابو نہیں آیا پھر اس نے کچھ گھول کے پلا دیا اور چاچا کی مت ماری گئی۔ وہ اسے لے کر نکل گیا۔ رانا صاحب کی بڑی بے عزتی ہوئی۔ انہوں نے ادھر ادھر بہت تلاش کیا مگر جگہ بندے نہ بھیجے۔ پولیس میں بھی رپورٹ کھواد کی مگر ملازم پچاس ہزار افتد اور تین لاکھ کا زبور لے کر بھاگ گیا ہے۔ پولیس میرے ابا کو بھی اغوا کر لے گئی دادا کو بھی۔ سب کو کھانے میں بہت مارا۔ انہیں کچھ معلوم ہوتا تو بتاتے کہ چاچا کہاں ہے؟ پتا نہیں کس نے ولایت میں بڑے مالک کو کوئی فون کیا اور انہوں نے یہاں کی سے بات کی تو تین دن بعد کھانے والوں نے چھوڑا۔“
 ”پھر چاچا اصغر کیسے واپس آیا؟“ میں نے کہا۔
 ”وہ ڈیرہ سال بعد اس کے ساتھ پکڑا گیا۔ رانا صاحب کو اطلاع ملی کہ وہ پنڈی میں ہے۔ انہوں نے اپنے بندے بھیجے۔ وہ چاچا اصغر کو پوری میں ڈال کے لے آئے۔“

”اور وہ عورت؟“ شہناز نے پوچھا۔
 ”وہ جان بچا کے گلے میں ڈرتے اس کو وہیں مار دیتے۔ شاید چاچے کو کسی طرح خبر مل گئی تھی کہ رانا صاحب کے شکاری کتے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اس نے کسی طرح دونوں کو فرار کر دیا۔ اس عورت کو اور اس کے بچے کو۔ ڈیرہ سال میں وہ ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ وہ چھ مہینے کے بچے کے ساتھ پنڈت خات پہنچی۔ اسی پہلوان کے پاس جس کو چاچے اصغر نے چت کیا تھا۔“

”وہ تو ایک طرح سے دشمن تھا؟“
 ”ہاں۔۔۔ مگر چاچے اصغر نے کہا تھا کہ وہ بڑا دل والا

تھا۔
 شہناز نے کہا ”کیا سرگرمی کی لت بھی اسی نے لگائی ہے تمہیں؟“
 ”وہ جی۔۔۔۔۔ بس ایک دو بار۔ اس نے کہا تو میں نے پئی۔۔۔۔۔“
 ”اور اس کے بعد خود پینے لگیں۔ کیوں۔۔۔۔۔؟“ شہناز نے کہا۔
 ”وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جی جانتا تھا۔۔۔۔۔ بے چینی سی ہوتی تھی جناب! اسگریٹ کا کش لے کر سکون ملتا ہے۔“
 ”اوامی گاڈ! تمہارے اس سلمان خان نے تمہیں نشے کی لت لگادی ہے اور تم اسے محبت کہتی ہو بے وقوف لڑکی۔“
 شہناز نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا ”ایک بات بتاؤ مجھے یہ غمی اسی چچا کا لڑکا ہے نا جو بڑا اللہ لوک ہے مگر میں نے اسے دیکھا نہیں کیا کرتا ہے وہ؟“
 ”وہ کلیز ہے جی ایک ٹرک کا۔ جہلم سے پشاور اور کراچی تک ہر جگہ جاتا ہے۔ کہتا ہے بہت جلد وہ استاد کی جگہ لے لے گا۔ خود ٹرک چلائے گا پھر ہم شادی کر لیں گے۔ ہم شہر میں رہیں گے۔ میں ٹرک پر اس کے ساتھ ہر جگہ جاؤں گی۔ اس کی آنکھیں کسی خواب کے مناظر والی فلم دیکھنے لگیں اور وہ نیند میں بولنے والے کی طرح بولتی رہی۔“
 میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا محبوب اسے تباہی کے کس راستے پر لے جا رہا ہے مگر اسے روکنا ظالم سماج کے بس کی بات ہی نہ تھی چنانچہ میں نے اشارے سے شہناز کو بھی روک دیا اور نہ راجا کی طرح وہ ریشماں کو بھی اصلاحی پتھر دینے لگتی۔
 ”تم اس سے ہر بات ملتی ہو؟“

”نہیں جی وہ آتا ہے کبھی دس دن میں۔ کبھی پندرہ دن بعد۔ میرے لیے چیزیں لاتا ہے۔“
 میں نے کہا ”دیکھو۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے۔ تمہارے چچا کا بیٹا ہے۔ تمہیں اس سے یوں چپ چپ کے ملنے کی کیا ضرورت ہے آخر اگر وہ اچھا کتا ہے اور بقول تمہارے سلمان خان جیسا بہرہ تو تمہارے ماں باپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے تم دونوں کی شادی پر۔“
 ”وہ جی۔۔۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ چچا کا بیٹا ہے۔ مگر چچی کا بیٹا نہیں ہے۔“
 ”اوہ۔۔۔۔۔ اس کی ماں کون ہے؟ پہلی بیوی یا دوسری؟“
 ”وہ مردوں ہونے لگی“ وہ۔۔۔۔۔ اس نے چاچے پر جادو ٹوٹا

میں نے کہا ”چلو دیکھتے ہیں درویش کے مزار پر کیا

تھی۔ یہ کمر بہت بعد میں بنا ہو گا۔ باہر سے اس کا پتہ نہیں آتا۔

کیوں جی! کہاں لے جائیں گی آپ مجھے..... آپ کو اللہ

ہاتھوں پکڑ دیا۔ چوہدری کی غنی فیملی بیوی نے تو فوراً غنی

ہیں؟“

میں نے کہا ”تو کوئی اور ہوگا۔ یہاں رہنے والے سب لوگوں سے تو ہم نہیں ملے۔“

شہناز خاموش ہوئی مگر صاف نظر آتا تھا کہ مطمئن نہیں ہوئی۔ حویلی کے ماحول کی پراسراریت اس کے ذہن اور اعصاب پر سوار تھی۔ میں نے طے کیا کہ حویلی میں اسے ساتھ نہ رکھوں۔ مجھے اب اکبر کا انتظار تھا اگر چاہاں میں نہیں تو ثابت ہو جائے گا کہ میں نے اسے یہ ذمہ داری سونپ کے واقعی بہت بڑی غلطی کی تھی اور اس کی نیت میں یقیناً فتور تھا تاہم اس کا سبب اب میرے اختیار میں تھا۔

دو پہر کا کھانا پھر بڑے سلیقے سے لایا گیا اور اس میں پیڑی فرمائش کے مطابق سبزی یاں میں جو اکبر کی بیوی نے لپکائی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں واقعی ڈانڈ تھا۔ اکبر خان کی ہنوز کوئی خبر نہ تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ شاید اس مختصر دورے میں حویلی کا مصلیٰ جائزہ لینا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے لیے مجھے دوبارہ زیادہ عرصہ قیام کے لیے آنا ہوگا مگر جانے سے پہلے مجھے کچھ حفاظتی اقدامات کرنے ہوں گے۔ جانو بابا مجھے پہلے ہی خبردار کر چکا تھا اور اب جبکہ جاہاں بھی اکبر خان کے ہاتھ میں آگئی تھیں وہ تالے کھول کر کچھ بھی غائب کر سکتا تھا۔ حویلی کے کمروں میں کیا محفوظ ہے اس کا حساب صرف جانو بابا جانتا تھا۔ اس کا ریکارڈ کہیں نہیں تھا۔

شہناز کو اب راجا کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ راجا کہاں اور کیا کر رہا ہے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ اطمینان ایک صرف بات تھی کہ وہ اکیلا نہیں ہے اس کے ساتھ کبیر خان تھا اور امیدی جاسکتی تھی کہ شام تک وہ ضرور لوٹ آئے گا اور ہم رات تک لاہور پہنچ جائیں گے۔

میں نے شہناز کو آرام کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ اس سبق و دق کمرے میں اکیلی رکنے پر راضی نہ ہوئی جہاں کے دیوار دور بھی اسے پراسرار لگتے تھے اور نہ فیم فریجز کا تین پردوں اور سامان آرائش کے تاریخی ماحول میں میرے آہ و آجدا و کی رو میں نظر نہ آنے والے سایوں کی طرح سرگرداں محسوس ہوتی تھیں۔

ہم نے نیچے سے اوپر تک راؤنڈ لگایا۔ طویل برآمدے میں دورادریاں پائی تھیں۔ ہر باداری میں آٹنے سانے چار کمروں کے دروازے تھے۔ اسی طرح کچلی منزل پر آٹھ کمرے تھے تو ایسے ہی نقشے کے مطابق اوپر بھی آٹھ کمرے بنائے گئے تھے۔ جس کمرے میں ہم نے قیام کیا تھا اس جیسے سات کمرے بند پڑے تھے۔ ان کے مضبوط اور نقشیں

لے لیے مجھے جھکنا پڑا اور میری نظر جھاڑیوں کے درمیان گئی۔ ہاں مجھے شین کا ایک چھوٹا سا مدبوع صندوق دکھائی دیا۔ میں نے شہناز کو چھوڑ کے اور گھنٹوں کے بل بیٹھ کے صندوق کو باہر نکلی۔ اس کے پیچھے مجھے ایک اور بڈل نظر آیا۔ یہ ایک میلی ٹیڈی اور چادر تھی جس میں ایک ٹکیلیٹ دیا گیا تھا۔

صندوق میں تالا نہیں تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس کے اندر مجھے مردانہ کپڑوں کے تین جوڑے ملے۔ دو شلوار ٹیٹ سوٹ اور ایک چٹلون اور ٹی شرٹ۔ کچھ دیر پہلے ریشماں نے بہن رکھے تھے وہ ان کے علاوہ تھے۔ باکس میں کچھ عام فم کا سامان آرائش تھا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر اور نیکل پالش وغیرہ۔ شیو کا سامان تھا۔ فیملی ڈرائنگ کے ہنرستارہ کلینک سے ملے والا سامان دونوں کے استعمال کا تھا۔ مگر بیٹوں کے ایک استعمال شدہ پیکٹ میں جس سے ہماری چار سگریٹیں تھیں اور ایک خالی پیکٹ میں وہ جس کو ابھی استعمال نہیں ہوئی تھی۔ صندوق کے اندر سے اٹھنے والی ہر بو پر جس کی بو عالجی تھی۔

شہناز میرے پیچھے گھنٹوں پر ہاتھ رکھے کرکے کے انداز میں کڑی تھی اور تلاشی کے عمل کو فور سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک دو بج پر گزرتی۔ ٹشک کی اب قطعی تمنا نہیں تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر تھی جس کا تعلیم کے دوران میں لیبارٹری آف پریشن تعمیر اور مرد خانوں میں ہر طرح کی ناگوار بو سے واسطہ پڑا ہوگا۔ شاید جس کی بو اس میں شامل نہ تھی۔ چنانچہ اسے اندازہ نہ تھا کہ اس بو سے وہ الگ ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ بہت سے لوگ فریویم سے بھی الگ ہے ہوتے ہیں جو عام لوگوں کو بہت پسند ہوتی ہے۔

میں شہناز کو اٹھا کے کمرے میں لے آیا۔ کچھ دیر بعد وہ بوش میں آگئی۔ اس نے پھر اپنے میڈیکل بیک سے نکال کے کوئی دوا لی۔

میں نے کہا ”اب تو گزشتہ رات کا پراسرار واقعہ سمجھ میں آگیا؟“

اس نے آہستہ سے کہا ”ہاں کسی حد تک۔“

”ٹشک کی اب کون سی بات رہ گئی ہے؟“

وہ بولی ”جب میں نے اٹھ کے دیکھا۔ تو راجا وہاں نہیں تھا۔“

میں نے کہا ”ممکن ہے وہ ہاتھ رو دم گیا ہو۔“

”اور جو آپ نے دیکھا تھا کہ ہم باہر فوارے کے کلاب پر بیٹھے ہائیں کر رہے ہیں؟“

میں نے ہنس کے کہا ”وہ ریشماں اور غمی ہوں گے۔“

”کیا وہ ایسے صحن کے بیچ میں بیٹھ کے روٹاں کر سکتے

احساس ہونے لگا تھا کہ ہم معاملات کو بہت آگے لے گئے۔ ریشماں کی ہمارے لیے اتنی اہمیت بہر حال نہیں تھی۔ وہ کیڑی تھی۔ ایک ملازم کی بیٹی۔ بے ٹشک اسے ضرورت سے زیادہ بولنے کی عادت تھی۔ ہمیں اس کی باتوں میں اتنی دلچسپی ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم اسے سمجھاتے اور جانے دیتے۔ ہم نے اسے بے بس کر کے دیوار سے لگا دیا تھا۔

اب وہ فرش پر اٹھی پڑی زور زور سے رو رہی تھی اور اس کا جسم جھٹکنے لے رہا تھا۔ تاہم خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ طوفان آگے گزر گیا تھا اور ریشماں کا کچھ دیر میں نابل ہو گیا۔ یقینی تھا۔ میں نے شہناز کو چلنے کا اشارہ کیا اور ہم باہر آ گئے۔ ابھی تک مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آخر ریشماں نے اپنا ہاتھ بدلا تو اتارا ہوا لباس کہاں چھپایا؟ دروازے کے سامنے مجھے فرش پر سگریٹوں کے ٹکڑے نظر آئے۔ میں نے ایک ٹکڑا اٹھا لیا اور اسے مسل کے سونگھا۔ مجھے جس کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔

میں نے دوسرا ٹکڑا شہناز کو دیا۔ اس نے میری ہڈی کرتے ہوئے اسے توڑ کے سونگھا تو ایک دم اس کی حالت عجیب گئی۔ اس نے سر جھٹکا اور لکڑائی۔ میں اسے نہ سنبھالنا تو وہ گر جاتی۔

میں نے کہا ”شہناز..... کیا ہوا؟“

وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی ”پتا نہیں..... یہ خوشبو.....“

میں نے کہا ”کون سی خوشبو؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا ”جیسی خوشبو تھی..... جو میں

نے کل رات درویش کے مزار پر محسوس کی تھی۔“

یہ بات مجھے عجیب لگی کہ وہ جس کی بو کو خوشبو کہہ رہی تھی۔ شاید یہ انفرادی احساس اور روٹیل کا مسئلہ تھا۔ کچھ لوگ ہیروئن کی بو کو بھی خوشبو کی طرح اچھا سمجھتے ہیں۔ رات کے وقت سونے سے اٹھ کے باہر آنے اور ریشماں کو لباس کی مشابہت کے باعث اور اندھیرے کی وجہ سے راجا سمجھ لے گا۔ معاملہ واضح ہو گیا تھا۔ اب یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ وہاں شہناز کے حواس پر کون سی خوشبو حملہ آور ہوئی تھی جس نے اسے کچھ دیر کے لیے بوش سے بیگانہ کر دیا تھا۔ یقیناً اس وقت ریشماں کے ساتھ کسی نئی جملہ عروسی میں موجود تھا اور وہ جس کے سگریٹ پی رہا تھا یا پی رہے تھے۔ اس کا دھواں ہوا کے رنڈے شہناز تک پہنچا جسے وہ براہ راست نہ کر سکی۔ غالباً اسے جس کی بو سے الرجی تھی۔

میں شہناز کو باہر لے آیا۔ وہ لڑکھائی اور پھر مرنے لگی مگر اس مرتبہ وجہ مختلف تھی۔ اس کا پیر ایک تاہم وار جگہ پر آ گیا تھا۔ جہاں ایک کچنے پتھر پر کای جی ہوئی تھی۔ شہناز کو چاٹنے

لگا۔ اپنی عزت بچانے کے لیے چوہدری نے اس کے جھوٹ کو جگ مان لیا۔ مٹی جانے واردات سے فرار ہو گیا تھا۔ اب وہ اس علاقے میں آتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔“

شہناز نے طنز سے کہا ”بس تمہارے پاس آتے ہوئے نہیں ڈرتا۔ بے وقوف لڑکی ابھی اچھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ شادی سے پہلے ہی وہ تمہیں بیوی کی طرح استعمال کر رہا ہے پھر شادی کرنے کی اسے کیا ضرورت ہے۔ جس دن اس کا دل پھر گیا وہ لوٹ کے ادھر آئے گا ہی نہیں۔ پشاور سے کراچی تک کہیں اور دل لگا لے گا۔ اس کا نہ گھر نہ خاندان، تم ماری جاؤ گی۔“

ریشماں کا رنگ فنی ہو گیا ”نہیں جی..... ایسا نہیں ہو سکتا وہ ایسا نہیں ہے۔“

”ابھی تمہیں کیا پتا دنیا کا۔“ میں نے کہا ”مگر کسی روز وہ چوہدری کے انتقام کا نشانہ بن گیا تو تمہیں معلوم ہی نہیں ہوگا۔ اکثر نرک ڈراماؤں نشہ کرتے ہیں۔ اسے بھی عادت ہوئی ہے اور اب وہ تمہیں عادی بنا رہا ہے اگر اسے اتنا خیال ہوتا تو کیا وہ تمہیں نشہ کرنے دیتا۔ کون سا نرک ڈراماؤں سے جو یہ لیت اپنے بیوی بچوں کو خود لگائے۔ عیاش لوگ شراب پی کے اور ملائے لطف کو دہلا کر کرتے ہیں۔ وہ سگریٹ کے کش لگا کے اور لگوا کر سردی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔“

شہناز نے کہا ”تم اتنی بے باک ہو۔ اس لیے ہم بھی تم سے کھل کے بات کر رہے ہیں۔ تمہیں سمجھا رہے ہیں۔ نہیں سمجھا تو ہماری طرف سے جہنم میں جاؤ۔ جھٹکوی تم خود۔ وہ کتنا سچا ہے۔ آ زمانے کے لیے تمہیں خود اپنے جذبات کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ اگلی بار جب وہ تمہیں ملائے تو اس سے صاف کہو کہ دیکھو کراب میں تمہاری خواہشات کی تکمیل تب ہی کرو گی جب تم مجھے شادی کر کے اپنے گھر لے جاؤ گے۔ اس سے کہو کہ مجھے ایک شوہر ایک گھر اور ایک بچہ چاہیے۔ وہ مرد نہیں جو چھپ کر میرے ساتھ رات گزارے اور صبح کا اچالا ہونے سے پہلے جاگ جائے۔“

ریشماں کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ روتے روتے وہ چلنے لگی ”جو ممکنہ بند کرکتا۔ میرے غمی اور مجھے کچھ کہنے سے پہلے اپنے آپ کو دیکھ۔ تیرے جیسی عورتیں روز کسی نئے مرد کے ساتھ سوئی ہیں۔ روز پیٹے گرائی ہیں اور بچی پھرتی ہیں پاک دامن۔ کنواری دو شیرہ۔ ٹھوکتی پھرتی ہیں دوسروں پر..... یہاں بھی دو چار ساتھ لاتی ہے۔“

میں نے اس کے منہ پر ایک پتھر رسید کیا۔ وہ جیتی اور دیوار سے گھرا کے فرش پر گر گئی۔ شاید میری طرح شہناز کبھی

دروازے سیاہ دیوار جیسی کسی لکڑی کو تراش کے بنائے گئے تھے اور ڈیزہ سو سال گزر جانے کے باوجود اپنی اصل حالت میں موجود تھے۔ یہی حال رنگین شیشوں والی کھڑکیوں کا تھا۔ ہر کھڑکی قد آدم تھی۔ اوپر کے حصوں میں نیم دائروں کی شکل کے روشندان تھے جن میں ٹھونچے پر لپکن شیشے لگے ہوئے تھے۔ چلی منزل پر گرد نظر نہیں آتی تھی، اوپر کچھ صفائی کی ضرورت تھی۔

دروازوں میں بھاری بھرکم فولادی کنڈیاں تھیں اور ان میں ایک ایک سیروزن والے قد بھر مزے تالے پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب ایک جیسے پتیل کے علی گڑھ والے قفل تھے جو بھینا مہارین فن نے خصوصی آرڈر پر بنائے ہوں گے۔ انہیں توڑنا یا کسی دوسری چابی سے کھولنا آسان نہ تھا۔ میری خواہش بڑی شدت اختیار کر گئی تھی کہ میں ان دروازوں کے پیچھے پوشیدہ نوادرات اور آبائی خزانوں کا مشاہدہ کروں۔ مجھے سونے، چاندی کے ظروف اور ہیرے جوہرات کی مالیت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری دولت مندی میں مزید ایک دو کردار کا اضافہ ہو جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

میری خواہش یہ تھی کہ میں اپنے آبائی تاریخی ورثے کو محفوظ رکھوں اگر اب تک کوئی رجسٹر اسٹاک بک یا کیلیگر نہیں بنا تھا تو بن جائے جس میں ہر چیز کی ساری تفصیل شامل ہو کر مل سکے۔ تاریخی حوالہ ہو۔ مالیت کا اندازہ ہو اور ایک رنگین تصویر ہو۔ پہلے اس طرح ریکارڈ رکھنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی تو اس کی بنیادیں وہی بنی ہو سکتی تھیں کہ مالک خود یہاں موجود ہوتے تھے اور ان کے نمک خوار ملازم چائو بابا جیسے لوگ تھے چنانچہ کسی چیز کے گم ہونے کا سوال ہی نہ تھا کہ اب ایسا نہیں تھا۔ وقت اینسو اس اور بیسویں صدی کی مسافت طے کر کے اکیسویں صدی تک پہنچ گیا تھا اور اس سفر میں بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ ایمانداری وضع درایٰ مرآت رشتوں کا احترام۔

اب مجھے اکبر خان کا غائب ہو جانا بھی معنی خیر لگ رہا تھا۔ چایاں پہلے ہی نہیں مل رہی تھیں اور اب وہ خود نہیں مل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شام تک ہم ضرور لوٹ جائیں گے پھر ہم کب آئیں گے۔ یہ غیر یقینی تھا۔ درمیان کی مدت میں اکبر خان کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا کیونکہ چائو بابا ہمارا مدد و مخدو تھا۔ اکبر خان کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اکبر خان سے چایاں واپس لے کر کبیر خان کو مل کر کرنائی کے اختیارات دے دوں گا۔ ضرورت ہوئی تو اسے اپنا راجا کاروبار بھی فراہم کر دیا جائے گا اگر اکبر خان اپنی دوسری بیوی کے ساتھ جہلم چلا گیا تھا تو اس کے شام تک واپس

آنے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ وہ ایسی بے وفائی نہیں کر سکتا جو اس کا ناقابل معافی جرم بن جائے۔

اکبر خان کی تلاش مجھے اس دفتر کی طرف لے گئی جس کی نشاندہی اکبر خان کی بیوی فاطمہ نے کی تھی۔ شہناز میرے ساتھ منجبل منجبل کر سبزی کے کھیتوں کی درسیانی منڈ پر چلتی رہی۔ اس نے اونچی اڑی کی سینڈل بھی استعمال نہیں کی تھی کیونکہ دروازہ قد بھی اور پائی نیل کے ساتھ راجا سے ایک دو انچ زیادہ لمبی تھی۔ جہاں سبزی کے کھیت ختم ہوتے تھے وہاں سے گندم کی کاشت کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اکتوبر میں فصل کافی چاچکی تھی اور اگلی فصل سے پہلے یہاں سبزی اگانے کے لیے زمین کو مل چلا کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ صبح جو سورج میں بیج یہاں کام کر رہے تھے انہیں نے جھاز جھکا کر اور جڑیں وغیرہ نکال کے زمین صاف کر دی تھی۔ اگلے مرحلے میں کھاد پڑتی تھی اور پھر ہموار قلعے بنا کے سوئم روای مہزیوں کے سج لگائے جاتے تھے۔

شیشم کے گھسے جنگل میں نظر آنے والی سفید عمارت تک پہنچنے میں میرے اندازے سے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑا۔ جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے چوٹی اور اس کے ارد گرد کی زمین پر بھی پہلے جنگلی ہی ہوگا۔ درخت صاف کر کے چوٹی کی تعمیر کے لیے جگہ نکالی گئی تھی۔ بعد میں مزید درخت کاٹے گئے تھے۔ اب تقریباً اس ایکڑ پر چوٹی کے ملازمین کا قبضہ تھا۔ اس پر وہ مٹی گندم اگاتے تھے وہ سال بھر استعمال کرتے تھے۔ دیگر ضروریات کے لیے سبزیوں کی فروخت سے ہونے والی آمدنی کا سہارا تھا۔ چوٹی کے اندر رہنے والوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ ان کے گزارے کے لیے آمدنی کم نہیں ہو سکتی اور ان کے حالات اتنے سخت بہر حال نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں یا وہ ظاہر کرتے ہیں تاہم وہ خوشحالی سے دور تھے اور جاں بچتے۔

درختوں میں گھری ہوئی عمارت ایک ہیرک جیسی تھی۔ اس کی طوالت سو سو سو فٹ تھی اور چوڑائی چالیس فٹ۔ مضبوط دیواروں اور پختہ سچت والی اس عمارت کو تعمیر ہونے کا زمانہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ دیکھنے میں یہ عمارت آفس سے زیادہ گودام لگتی تھی کیونکہ اس کے پچھلے حصے میں لمبائی کے رخ ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ سامنے والے حصے میں بھی دروازہ ایک ہی تھا اور اس کے ساتھ دو کھڑکیاں۔

سامنے کے رخ پر ایک برآمدہ پوری ہیرک کی لمبائی کے رخ پھیلا ہوا تھا۔ کھڑکی دروازے سب بند تھے اور مکمل خاموشی تھی انسان کی عدم موجودگی کا پتا دیتی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ تھی جس کی اونچائی آٹھ فٹ تھی۔ چار چار انچ کے فاصلے پر لگائے جانے والے تاروں کی دھریوں کے شکل

تھیں۔ ایک کھمبے سے دوسرے کا فاصلہ تقریباً دس فٹ تھا۔ تمام تار بٹ بٹ تھے اور ان کے درمیان سے کسی کے گزرنے کے لیے کوشش کرنے کے لیے تاروں کا ایک سلسلہ اوپر سے نیچے بھی بٹھا۔ اس طرح پوری باڑھ میں چار انچ چوڑے اور لمبے خانے بن گئے تھے۔

خاصی انتظام مجھے غیر معمولی لگا۔ مزید یہ کہ ہر کھمبے پر منوعہ خانے کی تختی بھی آویزاں تھی اور انگریزی اردو میں بھی لکھ دیا گیا تھا کہ بلا اجازت اندر داخل ہونے والے کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ محکمہ خزانہ کی یہ تھی کہ گرفتار کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ باغی کا واحد راستہ ایک فولادی گیٹ تھا جو سینٹ کے دو مضبوط تنوں پر قائم تھا۔

ہیرک کی سمت پر چاروں طرف روشنی پھیلانے والی بڑی ہلی سرخ لائٹس نصب تھیں۔ یہ میرے لیے بڑی حیرانی کی بات تھی کیونکہ یہ صرف دو فٹ لگ کے فاصلے پر بجلی موجود تھی۔ اس کے لیے کھمبے لگائے نہ جانے کہاں سے لائن فراہم کی گئی تھی لیکن چوٹی میں بجلی نہیں تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ جولائی میں یوب ویل جانے کے لیے دی گئی تھی وہ بھی بعد میں کاشت دی گئی تھی۔ اس کی مدد ذیل جیزر لگایا گیا تھا مگر پہلے تو ذیل کی عدم فراہمی کے باعث وہ بند پڑا اور پھر چوری ہو گیا۔

ابھی تک اس دفتر میں ہونے والے کام کی نوعیت کا مجھے علم نہیں تھا جس کے لیے عمارت میری زمین پر بنائی گئی تھی۔ لندن میں میرے دادا اعلیٰ احمد نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا شاید وہ خود بھی اس کی موجودگی سے خبر تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تعمیر ہمارے تھی۔ اس کے لیے قانونی مالکوں سے کوئی اجازت نہیں لی گئی ہوگی اور اگر کسی نے چسپا لے کر اجازت دے دی تھی تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ زمین پر قبضہ کر کے ایک غیر قانونی ملات کھڑکی کر لی تھی تو مجھے پورا اختیار حاصل تھا کہ میں اسے گرا دوں۔

لیکن اپنے تمام اختیارات کے باوجود میں اتنا بے اختیار تھا کہ اس عمارت میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا جو میری زمین کا ایک حصہ تھی۔ حقل یہ کہیں تھی کہ یہاں کوئی سرکاری دفتر نہیں ہو سکتا۔ سرکاری دفاتر زمین پر بنا جائز قبضہ کر کے نہیں بنائے جاتے۔ اس کے لیے مناسطہ کی ایسی کارروائی ہوتی ہے جس میں زمین کی خرید سے قبضہ کر کے منجھکے دینے تک ان گنت مراحل آتے ہیں۔ یہ سب نہ ہوں تو کوئی عمارت کرائے پر حاصل کر لی جاتی ہے۔ اس کے بعد سول یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کون سا سرکاری دفتر ہو سکتا ہے۔ پھر جاگیر پر چمکنے جنگلات کا مکمل دخل تھا اور نہ چمکنے زراعت کا۔ یہاں نہیں نہیں تھیں کہ آب پاشی والے آجائے اور شکار نہیں

تھا کہ اللہ لائف والے دخل دینے پر معاملہ یقیناً کچھ اور تھا۔ گیٹ کے سامنے سے ایک کپارستہ مخالف سمت میں جاتا نظر آ رہا تھا۔ آگے جا کے یہ راستہ درختوں میں گم ہو گیا تھا۔ اس پر آنے والے گاڑیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ مسلسل آمد و رفت کے باعث ہموار زمین کی جگہ نرم مٹی اور دھول نے لے لی تھی۔ بارش میں یہ دھول جب پانی سے لگی تھی تو کچھ بچتا تھا اور اس میں سے گزرنے والی گاڑیوں نے گہری گائیاں سی بنا دی تھیں۔ شہناز نے بڑی ثابت قدمی سے میرا ساتھ دیا تھا لیکن اب وہ محسوس کا شکار نظر آتی تھی۔ اس کا بار بار کاپی کی کھڑکی دیکھنا دلی اضطراب کو ظاہر کرتا تھا۔ راجا کی وابستگی کا متوقع قربت قریب تھا اور شہناز نے انتظار میں کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیا تھا۔ اب وہ واپس جانا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "یہاں کے معاملات کی ایک دن میں سمجھ نہیں آ سکتی۔ اس کے لیے مجھے بھرا نا ہوگا بہت جلد۔" آپ آنے کی مانتا کر رہے ہیں آپ تو اب یہیں رہیں گے۔ آپ کے تو بڑے چچے چوڑے پلان ہیں" شہناز نے کہا۔ "ہاں، اللہ نے چاہا تو وہ سب پورے ہوں گے۔ پہلے میں اس جگہ کا کنٹرول تو حاصل کر لوں۔ ابھی تو یوں لگتا ہے کہ اس زمین کو لاوارث سمجھ میں گیا تھا۔ معلوم نہیں یہاں کون کیا کر رہا ہے۔ مثلاً اس عمارت ہی دیکھو۔ اکبر خان یہاں کیا کرتا ہے۔"

"اس کی بیوی نے کہا تھا کہ وہ چوکیدار ہے۔"

"ایک شخص جو بیسیا کے سہارے چلا ہو۔ وہ کیا چوکیداری کرے گا اور اسے چوکیدار کس نے رکھا ہے؟ کس کام کے لیے۔ یہ دفتر کس نے قائم کیا ہے اور کس کی اجازت سے۔ مجھے اپنے دیکن فاروٹی سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا یہ زمین جس پر عمارت کھڑی ہے کسی کو فروخت کی گئی تھی یا لیز پر دی گئی تھی۔ ایسی بات ہوئی تو وہ مجھے بتانا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ..... یہ مسئلہ میں ہے اگر زمین کا کوئی قطعہ کسی کو دیا جائے گا تو وہ باہر ہوگا کسی کمار سے پر۔"

"یہ معاملہ واقعی مشکوک ہے" شہناز نے کہا۔

میں نے کہا "اب تم یہ دیکھو۔ یہ میری زمین ہے۔ اس پر بجلی کے کھمبے لگائے گئے ہیں لیکن چوٹی میں بجلی نہیں ہے۔ مجھے تو کسی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہاں سے میں جہاں تک چاہوں لائن لے جا سکتا ہوں۔"

شہناز نے کچے راستے کی طرف اشارہ کیا "یہ راستہ آخر کدھر جاتا ہے۔"

"یہ ضرور کسی سڑک سے جاملتا ہوگا۔ میری جغرافیائی حس یہ کہتی ہے کہ ادھر سے گھر کا ہر ایک کوئی سڑک ہوگی۔ وہاں سے

اناٹری 197 پہلا حصہ

ہے انتظامات چند روز میں نہیں ہو سکتے۔

جانو! بابہت اداس ہوا! اچھا! ایک دیکھو اب اس دنیا میں ملاقات ہوئی ہے یا نہیں؟

میں نے کہا "ارے جانو! اب! ایک باتیں مت کرو تم سوسال جوہ کے سارے معاملات تمہیں سنبھالنے ہیں۔"

"میری تو بوی خواہش تھی کہ آپ کی خدمت بھی کرتا۔ اب دیکھو زندگی کتنی مہلت دیتی ہے۔ ابھی تو میں اٹھ ہی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "فکرت کرو۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے چند دن کے علاج سے۔ گاڑی ٹھیک رہتی تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا! ایک اس کہنے بدبخت نے آپ کی گاڑی کو نقصان پہنچایا۔ کس نے اتنی ہمت کی مجھے تاجمل جانے تو اپنے ہاتھوں سے اس کو کوئی مار دوں۔ میرے لیے بڑی شرم کی بات ہے۔ آپ سمجھتے ہو گے کہ ہم سے کوئی ہے ٹھیک سمجھتے ہو آپ؟"

میں نے کہا "نہیں بابا! کل رات کوئی باہر سے آیا تھا گاڑی میں۔ یہاں تو سب میرے فرخ خواہ ہیں۔"

وہاں سب نے ہی برآمدے سے مجھے راہ اور شہناز کو سوز کی میں بیٹھ کر روانہ ہوتے دیکھا۔ صرف کبیر روزانے پر موجود تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ دو چار دن میں کوئی مکیٹک پورے سامان کے ساتھ آئے گا اور گاڑی کو ٹھیک کر کے لے جائے گا۔"

سوز کی ہل پر سے گزری تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ پہاڑی کا سوز کاٹنے کے بعد ایک جگہ میں اتر گیا۔ شہناز میرے فیصلے سے بہت پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ گھر کی کوئی بات نہیں۔ راہ جانے پھر مجھے محتاط رہنے کی تلقین کی پھر سوز کی غائب ہو گئی۔ میں کچھ دیر کچے راستے پر کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ واپسی کے راستے پر چل پڑا۔

صورت حالات کی ایک مبہم تصویر میرے سامنے آچکی تھی۔ اس میں سب سے بیشتر کردار اکبر خان کا بیٹا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ رانا رجب علی کی پوزیشن مجھے ان معاملات میں لوٹ نہیں لگتی تھی۔ اکبر خان کی حیثیت بھی کچھ نہیں تھی۔ اس کی پشت نہائی کرنے والے وہ لوگ تھے جو سرکاری دفتر کے نام پر میرے ہی علاقے میں کوئی غلط کام کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت محفوظ مقام کا انتخاب کیا تھا۔ ست بدھائی کے نامک اور دوارت حادثات اور آفات کا شکار رہتے۔ حویلی کچھ عرصہ آباد رہتی تھی اور پھر وہاں بوجالی تھی۔ اس کی محنت ایک رودیش کی بددعا سے منسوب تھی مگر اس کی ڈیڑھ

میں ہے راجا۔ ہم گاڑی چھوڑ کے جا سکتے ہیں لیکن میں اس کے لیے میدان خالی چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا جو مجھے اب ہم واپسی کے لیے تیار تھے۔ گزیرا اس وقت ہوا۔

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور میں نے چابی کھائی تو کوئی آواز نہ آئی۔ گاڑی کی بیٹری تھی اور ایک طویل سبز کے بعد پوری طرف نظر پڑا۔ ہو چکی تھی۔ صرف جوہیں گھٹنے میں بیٹری ڈیڑھ نہیں ہو سکتی تھی۔

کمزور ہونے کی صورت میں سیلف آہستہ گھومتا پھر کس کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا۔ ابھی تو ڈاکٹر پروہنشات کی گھر نہ تھے جو چابی لگاتے ہی نمودار ہو جاتے ہیں۔ بیٹری آگئی۔

ایک یا دو آواز ٹھیک سے بند نہ ہونے کے۔ میں نے ہارن دیا۔ ہارن خاموش رہا تو میں نے بونٹ کھولا اور سوز کی ڈرائیور نے اندھا

میں نے کہا "نہیں میں اکیلا ہرگز نہیں ہوں۔" میں نے چند سیکنڈ کے بعد اس نے سر ہلایا "سرچی! اور تو معاملہ خراب ہے۔"

میں نے نیچے اتر کے پوچھا "کیا بات ہے؟" "آپ خود کو لہو۔" اس نے کہا۔

میں نے انجن پر ایک نظر ڈالی اور کچھ گیا۔ گزشتہ رات کا تجربہ کار روٹی میں صرف تیرہ سو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

انجن کو تار کارہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے تمام تار کاٹ دیے گئے تھے۔ فین بیٹل نیچے پڑی نظر آ رہی تھی۔ یہ کارروائی کرنے والا وہاں تیار کی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے پاس وائر کڑی نہیں تھیں لیکن گاڑی کا نئے کے لیے آری بھی تھی۔

سوز کی ڈرائیور نے فحس سے کہا "کسی نے کام کیا تھا سرچی! یہ گاڑی ٹھیک تو ہو جائے گی آپ کو شہر سے مکیٹک سارا سامان لانا پڑے گا۔"

راجا نے پوچھا "اسے باندھ کر نہیں لے جا سکتے؟" سوز کی ڈرائیور نے معذرت کی "یہ بڑی گاڑی ہے۔ تاج سوز کی سمجھ لینی مگر اس راستے پر مشکل ہے اترانی چڑھانی ہے۔"

اس کے بھائی نے کہا "ہمارے پاس نہ مضبوطی ہے اور نہ خیر۔ بریک بھی نہیں لگتے ہیں یا نہیں؟"

ڈرائیور نے نیچے لیٹ کر دیکھا اور واپسی سے سر ہلایا "پھر" نے لائن ہی کاٹ دی ہے۔ کس نے کیا ہے۔ یہی جڑی پھٹا۔

میں نے کہا "جیسے ہی اس کا پتا چلا ہم اسے توپ دم کر دیں گے۔"

میں نے راجا اور شہناز کے ساتھ ایک ہنگامی پیشگی کی۔

میں نے جانو بابا سے رخصت لینے ہوئے یہ تاثر دیا کہ فوری طور پر میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور کچھ عرصے بعد میں ہمارے انتظام کے ساتھ آؤں گا تو پھر یہیں قیام کروں گا لیکن ظاہر

لگا دیے۔ راجا نے بتایا کہ اس کی ورکشاپ وغیرہ کچھ نہیں اصل میں تو وہ سوز کی ڈرائیور کا بھائی تھا اور وہ دونوں لڑکے کا چلائے تھے اور ایک دوسرے کے معاون تھے۔ برسوں سے کام کرتے کرتے انہیں چھوٹی سوتی خرابی خود ہی دور کر آگئی تھی۔

اب ہم واپسی کے لیے تیار تھے۔ گزیرا اس وقت ہوا۔

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور میں نے چابی کھائی تو کوئی آواز نہ آئی۔

گاڑی کی بیٹری تھی اور ایک طویل سبز کے بعد پوری طرف نظر پڑا۔ ہو چکی تھی۔ صرف جوہیں گھٹنے میں بیٹری ڈیڑھ نہیں ہو سکتی تھی۔

کمزور ہونے کی صورت میں سیلف آہستہ گھومتا پھر کس کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا۔ ابھی تو ڈاکٹر پروہنشات کی گھر نہ تھے جو چابی لگاتے ہی نمودار ہو جاتے ہیں۔ بیٹری آگئی۔

ایک یا دو آواز ٹھیک سے بند نہ ہونے کے۔ میں نے ہارن دیا۔ ہارن خاموش رہا تو میں نے بونٹ کھولا اور سوز کی ڈرائیور نے اندھا

میں نے کہا "نہیں میں اکیلا ہرگز نہیں ہوں۔" میں نے چند سیکنڈ کے بعد اس نے سر ہلایا "سرچی! اور تو معاملہ خراب ہے۔"

میں نے نیچے اتر کے پوچھا "کیا بات ہے؟" "آپ خود کو لہو۔" اس نے کہا۔

میں نے انجن پر ایک نظر ڈالی اور کچھ گیا۔ گزشتہ رات کا تجربہ کار روٹی میں صرف تیرہ سو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

انجن کو تار کارہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے تمام تار کاٹ دیے گئے تھے۔ فین بیٹل نیچے پڑی نظر آ رہی تھی۔ یہ کارروائی کرنے والا وہاں تیار کی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے پاس وائر کڑی نہیں تھیں لیکن گاڑی کا نئے کے لیے آری بھی تھی۔

سوز کی ڈرائیور نے فحس سے کہا "کسی نے کام کیا تھا سرچی! یہ گاڑی ٹھیک تو ہو جائے گی آپ کو شہر سے مکیٹک سارا سامان لانا پڑے گا۔"

راجا نے پوچھا "اسے باندھ کر نہیں لے جا سکتے؟" سوز کی ڈرائیور نے معذرت کی "یہ بڑی گاڑی ہے۔ تاج سوز کی سمجھ لینی مگر اس راستے پر مشکل ہے اترانی چڑھانی ہے۔"

اس کے بھائی نے کہا "ہمارے پاس نہ مضبوطی ہے اور نہ خیر۔ بریک بھی نہیں لگتے ہیں یا نہیں؟"

ڈرائیور نے نیچے لیٹ کر دیکھا اور واپسی سے سر ہلایا "پھر" نے لائن ہی کاٹ دی ہے۔ کس نے کیا ہے۔ یہی جڑی پھٹا۔

میں نے کہا "جیسے ہی اس کا پتا چلا ہم اسے توپ دم کر دیں گے۔"

میں نے راجا اور شہناز کے ساتھ ایک ہنگامی پیشگی کی۔

میں نے جانو بابا سے رخصت لینے ہوئے یہ تاثر دیا کہ فوری طور پر میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور کچھ عرصے بعد میں ہمارے انتظام کے ساتھ آؤں گا تو پھر یہیں قیام کروں گا لیکن ظاہر

راجا نے کہا "ہاں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم روہتاس پہنچ گئے تو آگے راست صاف ہے۔ تم لوگ دن بھر کیا کرتے رہے۔ حویلی کی بالکن کیا ڈاکٹر شہناز ہو گئی ہیں۔ چاہیاں تو اکبر خان کے پاس تھیں۔"

میں نے کبیر خان کو چلائے بنوانے کی خدمت پر مامور کیا اور مختصر راہ جاؤں پھر کی رواد سنا دی۔

وہ شکر ہو گیا "حالات محدود ہیں نیکے چتر!"

شہناز نے کہا "رفیق بھائی! یہ چاہیاں بھی ڈیڑھ گھنٹے ہیں۔" میں اچھل پڑا "ڈیڑھ گھنٹے!"

"جی..... آپ خود ہی دیکھ سکتے ہیں" اس نے چاہیاں مجھے تصدیق دیں۔

میں نے چاہیوں کو غور سے دیکھا "ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی تنصیص سے بالکل اتفاق نہیں کر سکتا۔ یہ وہی چاہیاں ہیں۔"

شہناز نے کہا "رفیق بھائی! میں نے دیکھا تھا۔ ان چاہیوں کو ایک ساتھ باندھنے کے لیے سفید دوری استعمال کی گئی تھی۔ وہ ذیل تھی یہ مشکل ہے۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے ڈوری کے دو حصے کیے گئے۔ آدھا چاہیوں کو باندھنے میں استعمال ہوا۔"

راجا نے کہا "بائی آدھا چاہیوں کے دوسرے سیٹ کو باندھنے کے کام آیا۔ تمہاری تو ت مشاہدہ زبردست ہے شہناز!"

میں نے کہا "چاہیوں کو کھولنے کی ضرورت اسی لیے محسوس کی گئی کہ ڈیڑھ گھنٹے بنوائی تھیں۔" بظاہر چاہیاں ایک ہی ہیں مگر اب

ٹھیک کی بات نہیں رہی۔ صبح سے اکبر خان اسی لیے غائب تھا کہ وہ چاہیاں بنوانے کے لیے شہر گیا ہوگا۔ خیر! اب میں بندوبست کر لوں گا۔"

"ڈیڑھ گھنٹے چاہیوں سے اکبر کچھ کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں کبیر خان اس کے نیچے کوکھرائی پر مامور کر کے جاؤں گا۔"

راجا نے نفی میں سر ہلایا "وہ باپ کو کیسے روکے گا؟"

میں نے کہا "اگر نیت ٹھیک رہی تو روک لے گا۔ اس کے مقابلے میں اکبر خان بوڑھا ہے اور معذور ہے۔ میں اسے اپنا رونا اور دے جاؤں گا کہ جو اور گزیرا کرے اسے کوئی مار دے بلا کلف۔"

"تھیک چتر! بیٹا کیسے کوئی مارے گا باپ کو۔ ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ہمارا راجا..... اب کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

جب تک ہم چائے پی کر فارغ ہوئے راجا کے ساتھ آنے والے مکیٹک نے چاروں کسے ہوئے ہزاروں کی جگہ نئے ہزار

سوسال کی تاریخ پر آشوب واقعات کا مجموعہ تھی۔

نصف ممدی گزرتی تھی اور ست بدھائی کی جاگیر اور جلی کو کسی نے آباد نہیں کیا تھا۔ اس کا آخری مالک چالیس سال مفلوج اور گمناں ہزاروں میل دور ولایت میں کسی زندہ لاش کی طرح پڑا رہا۔ جب وہ پھر زندگی کی طرف لوٹا تو وہ کل چیز پر اس نے اپنی آبائی جائیداد صرف اپنا حق ملکیت ثابت کرنے کے لیے سزا کیا۔ وہ آیا اور اپنی زندگی کا ثبوت دے کر لوٹ گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی سال کا وہ بوڑھا اکیلا ہے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اس کی موت کے بعد یہاں کوئی اور مالک بن کر آئے۔

چنانچہ ست بدھائی کو لاوارث سمجھنے والوں نے اپنے بڑے پھیلائے شروع کر دیے۔ یہ کیون لوگ تھے اور ان کے غم کیا تھے۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ واپس جاتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ آخر وہ کون لوگ ہوں گے؟ اسٹیکر نشیات فروش ڈاکو جلی کرکسی کا غیر قانونی کاروبار کرنے والے بے گروپ یا پھر ملک دشمن عناصر۔ وہ چند لوگ ہوں گے یا ان کا کوئی گروپ ہوگا۔ پورا نیت درک ہوگا یا میں الاوامی کر دو۔ بھلا ان کا میرا کیا مقابلہ۔

پھر میں نے ان سب خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا جو بڑے حوصلہ شکن تھے۔ میں نے فرض کیا کہ قانون کی طاقت میرے ساتھ ہے۔ میں آسانی سے ان لوگوں کو اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ لا قانونیت کی طاقت رکھنے والوں کا حال مضبوط ہوتا ہے مگر میں بھی تنظیم کی سیاست میں رہ کے وہ سارے حربے سیکھ چکا ہوں جن سے معاملات کو دوسرے طریقوں سے سلجھانا ممکن ہو جاتا ہے۔ میں پاکستان میں جی سکتا ہوں۔ میں اس محاورے کو کلی طور پر درست ثابت کر سکتا ہوں کہ روم میں وہی کرو جو روم کرتے ہیں۔ لوگ سیدھے جلتے ہوئے سیدھے چلنے والے جلتے ہوئے لٹے چلو۔ جس کی لامٹی اس کی جینس کا اصول چلنا ہو تو لامٹی اٹھاؤ۔ ”کل“ یعنی بات گانی اور کوئی جیسے بھی کوئی سمجھے اسے سمجھا دو۔

پہلے کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ ابھی تاریکی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ آسمان ایک سیلیٹی رنگ کی چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اسی جگہ میں نے گزشتہ روز کسی کا سایہ یا سہاڑی پر دیکھا تھا جو میری نظر پڑے ہی غائب ہو گیا تھا۔ اس نے کندھے پر کچھ اٹھار کھا تھا۔ راجا کے خیال میں وہ کوئی چرواہا تھا جس نے ریوڑ کو ہانکنے والی لامٹی اٹھار کھی تھی۔ لیکن وہ چرواہا ہوتا تو اپنی جگہ کھڑا دیکھتا رہتا۔ کیادو اکبر خان تھا؟ اس کے کندھے پر جیسا بھی تھی۔

میں وجہ کے بغیر میں رک گیا اور میری نظر اسی جگہ گئی۔ وہ پھر وہاں موجود تھا اور اسی پوز میں لیکن جیسے ہی میں نے سرگھما دیا پھاڑی کے پیچھے غوطہ مار گیا۔ ایک مظلوم خطرے کے احساس نے

مجھے اپنا ریوڑ اور نالے پر مجبور کر دیا۔ میں پلٹ کے اس پہاڑ کی طرف بڑھا۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ واضح نہیں تھا۔ دن کے اندر شاید میں کوئی پگھڑی بھی تلاش کر لیتا۔ اس وقت اندھیرے میں مجھے اپنا راستہ خود بتانا پڑا۔ میں عیروں کو ہموار زمین اور چٹانوں کے جمائے کسی درخت کی شاخ یا جھاڑی کو پکڑ لیتا تھا اور اوپر چڑھتا تھا۔

دن منٹ بعد ہی مجھے اپنی کوشش لا حاصل محسوس ہونے لگی۔ پہاڑی کی بلندی اتنی کم بھی نہیں تھی۔ اوپر پہنچنے میں مجھے کم سے کم ایک گھنٹا لگ جاتا۔ وہ جوں کی تو اب وہاں نہیں تھا اور یہیں ہو کر تھا کہ وہ دوسری طرف دیک کر بیٹھا ہوا مل جائے۔ اگر وہ میرے تعاقب میں ہوگا تو کسی اور مورچے سے میری نقل و حرکت دیکھ کر ہوگا۔

نیچے اتر کے پھر سڑک پر چلتے ہوئے میں نے خود کو قطعی غیر محفوظ محسوس کیا۔ پہاڑی کی بلندی سے میں کسی ماہر نشانہ باز کے لیے بالکل اوپن ٹارگٹ تھا۔ مجھے اطمینان سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ مگر ابھی تک مجھ پر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ کیا چاہتا تھا؟ میرے ساتھ یہی چاہے کہ مکمل کیوں مکمل رہا تھا؟ کہیں یہی میرا وہم تو نہیں تھا۔

پہلی عبور کر کے میں سیدھا چوٹی کے دروازے سے اندر نہیں گیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ رویش کے حرار کی طرف چلے گیا۔ دیوار تقریباً سونگڑا تھی۔ پھر سونگڑا جاتا تھا اور شاہی فیصل کے عیروں سے میں رویش کے حرار بھی شاید اتنے ہی فاصلے پر تھا۔ دیوار کے سونگڑے کچھ دور تھا جب میرے کانوں نے ایک آہٹ سنی۔ یہ کسی شاخ کے ٹوٹنے کے علاوہ کچھ کرنے کی آواز کی۔ میں نے بے اختیار گھوم کے دیکھا مگر ہر سو مکمل تاریکی میں ساکت کھڑے جنگل کے سوا کچھ نہ تھا۔ سرشام آشیانوں میں لوٹنے والے پرندے بھی اب خاموش تھے۔ کہیں کوئی صدا نہ تھی۔

میں نے اٹے پاؤں چلتے ہوئے باقی فاصلے طے کیا اور پھر دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اب میں دیوار کے کونے سے جھانکتے ہوئے پہلے تک کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ معلوم نہیں انتظار میں کتنا وقت گزرا لیکن عین اسی وقت جب میں تادمیہ مور اٹھا اچانک میرے سامنے نمودار ہوا۔

وہ اندھیرے میں بہت احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ دشمن کو دیکھتے ہی میرے منہ بے جلی صلاحت جال اٹھی۔ جیسے فحاشی حملے کا سازن بجتے ہی جوابی حملے کا نظام متحرک ہو جائے۔ میں اس کے احتیاط کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے مجھے حریف کی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ چھوٹے سے کچھ کم اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کے

بہنیں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک خنجر کے جو اس نے بڑے طرف بڑھا۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ واضح نہیں تھا۔ دن کے اندر شاید میں کوئی پگھڑی بھی تلاش کر لیتا۔ اس وقت اندھیرے میں مجھے اپنا راستہ خود بتانا پڑا۔ میں عیروں کو ہموار زمین اور چٹانوں کے جمائے کسی درخت کی شاخ یا جھاڑی کو پکڑ لیتا تھا اور اوپر چڑھتا تھا۔

دن منٹ بعد ہی مجھے اپنی کوشش لا حاصل محسوس ہونے لگی۔ پہاڑی کی بلندی اتنی کم بھی نہیں تھی۔ اوپر پہنچنے میں مجھے کم سے کم ایک گھنٹا لگ جاتا۔ وہ جوں کی تو اب وہاں نہیں تھا اور یہیں ہو کر تھا کہ وہ دوسری طرف دیک کر بیٹھا ہوا مل جائے۔ اگر وہ میرے تعاقب میں ہوگا تو کسی اور مورچے سے میری نقل و حرکت دیکھ کر ہوگا۔

نیچے اتر کے پھر سڑک پر چلتے ہوئے میں نے خود کو قطعی غیر محفوظ محسوس کیا۔ پہاڑی کی بلندی سے میں کسی ماہر نشانہ باز کے لیے بالکل اوپن ٹارگٹ تھا۔ مجھے اطمینان سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ مگر ابھی تک مجھ پر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ کیا چاہتا تھا؟ میرے ساتھ یہی چاہے کہ مکمل کیوں مکمل رہا تھا؟ کہیں یہی میرا وہم تو نہیں تھا۔

پہلی عبور کر کے میں سیدھا چوٹی کے دروازے سے اندر نہیں گیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ رویش کے حرار کی طرف چلے گیا۔ دیوار تقریباً سونگڑا تھی۔ پھر سونگڑا جاتا تھا اور شاہی فیصل کے عیروں سے میں رویش کے حرار بھی شاید اتنے ہی فاصلے پر تھا۔ دیوار کے سونگڑے کچھ دور تھا جب میرے کانوں نے ایک آہٹ سنی۔ یہ کسی شاخ کے ٹوٹنے کے علاوہ کچھ کرنے کی آواز کی۔ میں نے بے اختیار گھوم کے دیکھا مگر ہر سو مکمل تاریکی میں ساکت کھڑے جنگل کے سوا کچھ نہ تھا۔ سرشام آشیانوں میں لوٹنے والے پرندے بھی اب خاموش تھے۔ کہیں کوئی صدا نہ تھی۔

میں نے اٹے پاؤں چلتے ہوئے باقی فاصلے طے کیا اور پھر دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اب میں دیوار کے کونے سے جھانکتے ہوئے پہلے تک کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ معلوم نہیں انتظار میں کتنا وقت گزرا لیکن عین اسی وقت جب میں تادمیہ مور اٹھا اچانک میرے سامنے نمودار ہوا۔

وہ اندھیرے میں بہت احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ دشمن کو دیکھتے ہی میرے منہ بے جلی صلاحت جال اٹھی۔ جیسے فحاشی حملے کا سازن بجتے ہی جوابی حملے کا نظام متحرک ہو جائے۔ میں اس کے احتیاط کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے مجھے حریف کی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ چھوٹے سے کچھ کم اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کے

بہنیں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک خنجر کے جو اس نے بڑے طرف بڑھا۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ واضح نہیں تھا۔ دن کے اندر شاید میں کوئی پگھڑی بھی تلاش کر لیتا۔ اس وقت اندھیرے میں مجھے اپنا راستہ خود بتانا پڑا۔ میں عیروں کو ہموار زمین اور چٹانوں کے جمائے کسی درخت کی شاخ یا جھاڑی کو پکڑ لیتا تھا اور اوپر چڑھتا تھا۔

جاتے ہی رک گئی تھی۔ وہ پہلی تو اس نے مجھے دیکھا ”نہیں مالک۔ یہی نہیں ہے کون ہے یہ؟“

میں نے اطمینان کا سانس لیا ”ہاں چل جائے گا۔ یہ بتاؤ تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو؟“

اس نے کچھ وقت میرے سوال کو سمجھنے میں لیا ”آپ حکم کریں مالک!“

میں نے کہا ”تم بہت کچھ دار لڑکی ہو۔ آج تم نے خود کو مجھ سے قاتل ثابت کر دیا تو کل تمہیں اس کا جو انعام ملے گا بہت بڑا ہوگا۔ تمہاری اور غنی کی زندگی اس سے بدل جائے گی۔ میں منہ مانگا انعام دوں گا۔“

اس نے زیادہ عزم کے ساتھ کہا ”آپ بتائیں مالک۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

میں نے کہا ”تم یہاں روشنی کا بندوبست کر سکتی ہو؟ کوئی چھوٹی سی سوئی لادو یا مٹی کے تیل کا دیبا۔ جس کی روشنی باہر دکھائی دے یا نارنج ہو۔۔۔ میں اس شخص کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ پلٹ کے باہر گئی۔ میں نے صندوق کھولے جانے کی آواز سنی پھر وہ ایک نارنج کے ساتھ نمودار ہوئی ”اور کچھ مالک؟“

میں نے کہا ”اگر ایک سیل جانے جس سے میں ضرورت پڑنے پر اس کو باندھ کے ڈال سکوں۔“

”مالک!“ وہ جاتے جاتے رکی ”غنی کو آپ جیسا سمجھتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ دل کا بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس کا گھر کوئی نہیں ہے مگر ہوتا تو وہ مجھے کب کا شادی کر کے لے جاتا۔ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ اتنی بڑی حوصلی کے مدد سے میں نہیں ایک چھوٹا سا گھر دے دیں۔ ہم ساری عمر آپ کی غلامی کر سگے۔ آپ کو دعائیں دیں گے۔“

میں نے کہا ”تم ہو گئی تمہاری بات؟ اب جاؤ یا تو وقت آنے پر ہی جانا چلے گا تم خود کو چھوٹے سے گھر کا حق دار ثابت کرنا ہو یا بہت بڑے گھر کا۔“

وہ ہرنی کی طرح قہقہے بھر کے نکل گئی تو میں نے نارنج کا رخ فرش کی طرف رکھتے ہوئے روشنی کی۔ یہ درمیانے سائز کی نارنج تھی اور اس کے سیل بھی نہیں تھے۔ فرش پر بننے والے دائرے کی روشنی دم دم رہی۔ میں نے گھنٹوں کے مل بیٹھ کے روشنی کو اس شخص کے چہرے پر مرکوز کیا۔ وہ ابھی تک جس حد حرکت پڑا ہوا تھا۔

پھر میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ روشنی میں اس چہرے کے نقوش ایک دم نمایاں ہو گئے۔ اس چہرے کو میں تیسری بار دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار وہ مجھے پرئیں کلب میں نظر آیا تھا۔ دوسری بار میں نے اسے ایسی ڈنٹ کے بعد دیکھا تھا۔ اس نے فائر کر کے

”کون۔۔۔؟“ وہ چونکی۔

”نہیں میں نے دشمن کچھ کے اندر لٹا رکھا ہے۔ وہ بے ہوش ہے۔“

”ہاں اللہ!“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے ہلکی سی چیخ ماری

”اللہ!“ میں کچھ وقت زوردار ریشماں کے پیچھے کیا مگر وہ اندر

انہیں دکھانے کے لیے میں چلا گیا۔ فلیکس میں خاموشی سے کھڑے
آیا ہوں۔ آج رات میں صبح کے کچھ کارروائی کرنا چاہتا ہوں
میرا خیال ہے کہ اس کا نتیجہ نکلے گا۔ مجھے جس پر شک ہے وہ
جائے۔ میرے ذمے کے بجائے جانے کا سوال ہی نہیں۔ مجھے
یہاں رہنا ہے اور میرے کچھ ملان ہیں ان پر مجھے عمل کرنا ہے
میری بات ریشماں کے آنے سے ادھر وری رہ گئی۔ وہ
خاموشی سے اندر آئی اور مجھے فرخ سے تائب کرنا دیکھ کے ٹھنک

میرے اٹھنے اور اندھیرے میں ریوالور اٹھانے تک فرار ہونے والے کو کافی مہلت مل گئی تھی۔ ہندوہ ہیں سیکنڈ میں وہ

اب خرید و نقد بیق کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دیکھا اور باہر آ گیا۔ میں نے فرخ کو وہاں انتظار کرنے کو کہا

ہم اندھیرے کی چٹا میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔
 دروازے سے اندر جاتے ہوئے میں نے پورے احاطے کا جائزہ
 لیا۔ در درخت کو، بزرگ کے ایک کمرے میں لائیں کی مدد روشنی
 تھی۔ کہیں کوئی حرکت نہ تھی۔ کوئی آواز نہ تھی۔ میری گاڑی جیسے

میں نے کہا ”فرخ“ تم ٹھیک ہوتا؟“
 ”ہاں..... مگر وہ نکل گیا“ اس نے اپنے سر کو دہاتے ہوئے
 کہا ”اس نے تیرے بھائی کا منہ پر۔ درخت میں اسے پکڑ لیا، وہ ادھر ہی
 گیا ہے۔“

میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ ”چھا! تم اندر جاؤ۔ دیکھو پورا جانو بابا کی لاش پڑی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

حریقت خالص کے بغیر میں آگے بڑھا تاہم اب میں محتاط تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مجرم کسی درخت کی اوٹ سے مجھ پر حملہ کرے۔ بھاگتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پتھر آ گیا تھا۔ وہ درخت کی کسی موٹی شاخ کو ڈھٹے کے طور پر بھی استعمال کر سکتا تھا۔ ایسی شاخیں یہاں ہر طرف نظر آتی تھیں۔ یہاں درختوں سے ایندھن حاصل کیا جاتا تھا چنانچہ کافی جانے والی شاخیں سوکھنے کے لیے ڈال دی جاتی تھیں۔

مجھے دھکے سے گرانے والا ہیچ جوان اور صحت مند شخص تھا لیکن وہ اکبر خان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ خراب تھی۔ بسا بھی کے بغیر وہ خود بہت چل تو لیتا تھا مگر ایسے دور نہیں سکتا تھا پھر بھی تعیند کے لیے میں بڑی کے کھیتوں سے گزر کے اس بیرک تک گیا جہاں اکبر خان چوکیدار کی حیثیت سے ملازمت کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ اس عمارت میں ایسی ایک چیز ہو سکتی تھی جس کی حفاظت کے لیے رات کو اکبر خان ڈیوٹی دے۔

اس کا کام دن میں گیٹ کھولنے اور بند کرنے یا پھر کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے تک محدود ہوگا لیکن بند دروازے کے پیچھے کہیں میں روٹی تھی۔ میں نے سوچے کچھ بغیر لوہے کے گیٹ پر رپو اور سے دستک دی۔ میرے ہاتھ کوٹلی کا زبردست جھکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی عمارت کی چھت پر گئی ہوئی تمام سرخ لائٹس روشن ہو گئیں۔ دس دس فٹ کے فاصلے سے مٹی ہوئی ان لائٹوں کا رخ ایسے رکھا گیا تھا کہ چاروں طرف کا علاقہ ایک جیسا روشن ہو جائے۔ لائٹ اتنی تیز تھی کہ گرد و نواح میں سوکر تک چڑا بھی ملے سے نکل کے بھاگتا تو نظر آ جاتا۔ لائٹس آن ہوئیں تو اندر باہر آدمے میں کہیں ایک الارم بھی دھتے دھتے سے پہنچ کر گئے۔

اکبر خان کہیں میں سے کلاشکوف کے ساتھ برآمد ہوا۔ اپنے سامنے مجھے پاؤں دھت حیران ہوا۔ ”مالک! آپ؟“

میں نے برہمی سے کہا ”ہاں میں۔۔۔۔۔ ذرا گیٹ کھول کے باہر آؤ۔“

وہ پھر اندر گیا۔ شاید اس نے گیٹ سے پھلی کے نکشن کا سلسلہ متعلق کیا۔ جب اس نے گیٹ کھولا تو سرخ لائٹس آف ہو گئیں۔ ایسا بدیہہ اور خوفناک حقائق نظام میرے لیے جتنا غیر متوقع تھا اتنا ہی میرے شکوک میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

میں نے کہا ”اکبر خان۔۔۔۔۔ واٹ از دس۔ کیا ہے یہ سب؟“

اس نے پرسکون رہتے ہوئے کہا ”کیا ہے مالک؟“

میں نے کہا ”اس دروازے میں کرنٹ ہے؟ ہاڑھ کے تاروں میں بھی ہوگا۔“

اس نے غمراہانہ قرار میں سر ہلایا ”ہے مالک!“

میں نے کہا ”تنتا؟ چار سو چالیس وولٹ۔“

”تمی سرا“

میں نے دھاڑ کے کہا ”کیوں؟ کیا ہے یہاں جس کی حفاظت کے لیے ایسے خطرناک اقدامات کیے گئے ہیں؟ کیا ہمیں معلوم نہیں کہ اس سے انسانوں کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔ جہاں ایسے انتظامات ہوں وہاں واضح انداز میں وارننگ لکھی جانی ہے۔ ان بڑھو کوں کو خبردار کرنے کے لیے خطرے کی علامت بتائی جاتی ہے۔“

”شاک مجھے بھی لگا تھا۔“

”اس میں میرا کوئی قصور نہیں مالک!“

میرا بارالور چڑھ گیا ”مالک کے بچے! اسنے انتہاں اور بے خیرت بنو۔ تم اس کا ڈس کر رہنے والے جاہل دیہاتی نہیں ہو۔ فوج میں رہے ہو سب جانتے ہوئے تھے تاؤ۔۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟“

”کیا مالک؟“

”وہ ساٹ لکھ میں بولا۔“

”یہ سب کیا ہے۔ اس بیرک میں کیا ہے؟ کیوں نصب کی گئی ہیں یہ سرخ لائٹس؟ الارم سسٹم۔۔۔۔۔ ہیچا خیر کیرے بھی ہوں گے۔ کیا مقصد ہے ان حفاظتی انتظامات کا؟“

”آپ مجھ پر بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں سرا! میں ایک معمولی چوکیدار ہوں۔ مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں! میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”او۔۔۔۔۔ میں خود کچھ لیتا ہوں۔“ میں آگے بڑھا۔

”نہیں مالک! ایسا مت کریں۔ وہ میرے سامنے آ گیا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ فرض شناسی کا مظاہرہ کر رہے ہو تم؟“ میں نے طنز سے لکھ میں تھی سے کہا ”مجھے میری ہی زمین پر جانے سے روک رہے ہو؟“

”یہ ممنوع علاقہ ہے سرا!“

”ممنوع علاقہ میرے لیے؟“ میں نے گرج کے کہا ”اس شخص کے لیے جو اس زمین کا مالک ہے؟ اکبر خان! تمہارا سلا خاندان میرا ملک خوار ہے۔“

”لیکن اس وقت میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں سرا!“

”اب تمہاری حیثیت بھی ایک مجرم جیسی ہے اکبر خان! تم ان کا ساتھ دے رہے ہو جو میرے مجرم ہیں اور قانون کے مجرم ہیں۔ انہوں نے ٹریس پاس کیا ہے۔ ناچازر قبضہ کیا ہے میری زمین پر اور ہیچا یہاں کوئی غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ ان سب کے ساتھ تم بھی جیل جاؤ گے اکبر خان!“

میرے دل میں ایک شدید غواہش ابھی تھی کہ میں بے خبری

میں اکبر خان کو تک آؤٹ کر دوں۔ اس کی کلاشکوف چھین لوں اور اندر گھس جاؤں۔ سارے سکیورٹی سسٹم کو اور تالوں کو کلاشکوف کے برست سے اڑا دوں اور اندر جا کے دیکھوں کہ پوشیدہ طور پر یہاں کون سا غیر قانونی کام جاری ہے مگر میں نے ہوش سے جوش پر قابو پایا۔ یہ کام میں پورے جائز اور قانونی اختیارات کے ساتھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھے قانون کو اپنے ہاتھ میں اور کوئی رسک لینے کی کیا ضرورت تھی؟

واپس چلنے سے پہلے میں نے کہا ”ٹھیک ہے اکبر خان! تم اپنی ڈیوٹی کرو جب تک چوکیداری کی خواہ اور وصول کرلو۔۔۔۔۔ میں دیکھوں گا یہ عمارت یہاں کیسے کھڑی رہتی ہے اور ہاں ایک انفسون ٹانگ خبردار بھی ہے تمہارے لیے۔ تمہارے باپ جان محمد کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

وہ بے خیالی میں بولا ”قتل کر دیا ہے۔ کس نے؟“

میں نے کہا ”مجھے صرف اتنا ہی معلوم تھا باقی کھر آ کے پوچھنا۔“

جب میں واپس حویلی میں پہنچا تو وہاں رونا پیشا بچا ہوا تھا۔ جانو بابا کی لاش اٹھا کے لانے کے بعد اس کے کمرے میں چار پائی پر ڈال دی گئی تھی۔ میں نے میت کے گرد حلقہ بنا کر رونے والوں کو باہر نکال دیا۔ صرف مرحوم کی بیوہ اور اس کے پوتے کبیر خان کو وہاں رہنے دیا۔ ایک لائٹس کی روشنی کوڑ کھلا کے میں نے جانو بابا کی لاش کا غور سے معائنہ کیا تو میرے شکوک کی تصدیق ہو گئی۔ پوسٹ مارٹم سے تو بہت کچھ معلوم ہو جاتا مگر میری نظر سے بھی انگلیوں کے وہ نشانات پوشیدہ نہ رہ سکے جو گردن کے گرد چلے نیکسوں مائل گھائی مٹوں کی صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے کہا ”کبیر خان۔۔۔۔۔ دادا کو وہاں سے تم اٹھا کے لائے تھے؟“

اس نے کہا ”جی مالک!“

میں نے انفسون سے سر ہلایا ”تم نے بڑی غلطی کی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہی موت نہیں قتل ہے۔“

”قتل۔۔۔۔۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ جانو بابا کی بیوہ نے بھی ایک چیخ مار کے کہا کہ یہ غلط ہے۔“

میں نے ایک غصہ کی سانس لی ”انفسون کہ یہ سچ ہے۔ صبح جب پولیس آئی گی۔“

کبیر خان نے میری بات کاٹ دی ”پولیس۔۔۔۔۔ نہیں مالک!“

میں نے کہا ”ڈر نہ کیوں ہو؟ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ قاتل کا پتا چلانا ضروری ہے کبیر خان!“

وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کی دادی بھی ہاتھ جوڑنے لگی

”جانے دیں مالک! امر نے والا تو مر گیا اور کتنے دن جیتا۔ پولیس ہم سب کو پکڑے گی یہاں تو اور بھی کچھ نہیں تھا۔“

میں نے کہا ”کبیر! اپنی دادی کو سمجھاؤ۔ اس کو کسی چور نے مارا ہے۔ وہ اوپر والے کمرے میں گھسا ہوا تھا۔ میری مداخلت کی وجہ سے وہ کچھ لے جاتا نہیں۔ سارا کھانا بھاگ گیا۔“

”جب چور کچھ بھی لے کر نہیں گیا تو پولیس کو بتانے کا کیا فائدہ مالک!“ کبیر خان نے کہا ”پولیس لاش بھی لے جائے گی۔ ہمیں بھی بند کر دے گی۔“

میں نے انہیں بہت سمجھا یا کیر میری موجودگی میں پولیس کوئی زور زبردستی نہیں کرے گی۔ کسی کو بلاوجہ نہیں پکڑے گی اور انہیں ڈرنا نہیں چاہیے مگر وہ سب میرے گرد جمع ہو گئے۔ میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگے اور میرے پاؤں پکڑنے لگے تو میں مجبور ہو گیا۔ میں نے کبیر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور لوٹ کے حویلی میں آ گیا۔ فرخ ابھی تک اوپر ہی موجود تھا۔ اس کے پاس تاریخ بھی تھی لیکن اب اس کی روشنی سیل کنڈر پر بنے سے تو دم زور تھی۔

”کیا چور پکڑا گیا؟“ اس نے مجھ سے جیسے ہی سوال کیا۔

میں نے کہا ”نہیں۔۔۔۔۔ وہ چوری نہیں قاتل بھی ہے۔“

”مجھے بھی شک تھا۔“

میں نے کہا ”شک کی بات ہی نہیں۔ اس کے گلے پر انگلیوں کے نشانات بہت واضح ہیں۔ اسے گھاگھٹ کے ہلاک کیا گیا ہے۔“

کبیر خان افسردگی سے بولا ”ایسا کون ہو سکتا ہے؟“

میں نے کہا ”پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارا دادا تو اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ یہاں تک کیسے آ گیا؟“

”کس جی۔۔۔۔۔ قضا لے آئی اسے۔ دادی نے اور میں نے بہت روکا اسے مگر پتا نہیں کیوں وہ ضرور آ گیا کہ میں پھر اداں گا۔ سب نے سمجھایا کہ وہ اس قاتل نہیں رہا لیکن اس نے نہیں مانی۔ میں خود اسے یہاں لے کر آیا۔ میں اسے اٹھاتا جاتا تھا۔ اس نے منہ کر دیا۔ بولا میں چل سکتا ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچا۔ زینہ چڑھا اور دروازے پر بیٹھ گیا۔“

”لیکن کیوں؟“

”پتا نہیں مالک۔ کہنے لگا مالک نہیں ہیں۔ کسی کوڑے داری سوچ کر بھی نہیں گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے اکبر سے پوچھا تھا کہ چاہیاں کہاں ہیں۔ اب نے کہا کہ وہ تو مالک نے واپس لے لیں۔ بعد میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ چاہیاں کیا تھے دے گئے ہیں؟ میں نے انکار کیا تو کہنے لگے کہ پتہ تو غلط ہو گیا۔ وہ کل آئیں گے لوٹ کے۔ اپنی گاڑی لے جائیں گے۔ آج کی رات کیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ رات کو کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ مجھے

کیا بتا رہا تھا کو کیا ہو سکتا ہے۔ میری ساری عمر کی محنت رائیگاں نہ جائے۔ پھر وہ مندر کے یہاں آگئے۔

مجھے پاگل پن کی حد تک پہنچنے والے اس فرض شناسی کے احساس پر دکھ ہوا جس کی وجہ سے بالآخر جانو بابا کی جان گئی۔ ادا نے فرض کے لیے جان قربان کر دینا اور جائیداد میں جان دینا صرف زبانی مع خراج کی بات ہے مگر اس خاندانی نمک خوار نے اسے سچ کر دکھا ہوا تھا۔ حفاظت وہ خاک کرتا، سانس لینا بھی اسے دو مجھ تھا۔ دست قائل نے بے سبب ہی اس پر قوت بازو کو آزمایا۔ ایک جھٹکے میں طائر روح پرواز کر گیا ہوگا جو یوں بھی نفس مغصری سے ٹکے کے لیے پھر پھر اڑا ہوا تھا۔ باقی رہ گیا تھا جانو بابا کے فرض کا فرض جو مجھے کسی نہ کسی طور چکانا تھا۔

”ایک بات پوچھوں مالک!“ کبیر خان نے پوچھا۔

”میں چوٹا، ہاں کیا بات ہے کبیر؟“

”آپ تو چلے گئے تھے سب کے ساتھ واپس کیسے آگئے؟“ کبیر خان کی سوالیہ نظر اس فرض پر ٹھہر گئیں۔

میں نے اس کے سوال میں بھیجے ہوئے بے نام سے شک کو محسوس کیا۔ اس کی مجال نہ تھی کہ وہ نقش کش کرنے والوں کے لیے میں پوچھ سکتا کہ اگر جانو بابا کوئی کیا تھا تو کیا تم وضاحت کر سکتے ہو کہ جانے واردات پر تم کیا کر رہے تھے؟ کیوں موجود تھے۔ تمہارے ساتھ یہ ابھی کون ہے جودن کے وقت نظر نہیں آیا تھا اور آخر تمہارے اس بیان کی صداقت کو تسلیم کرنے کا جواز کیا ہے کہ جانو بابا کا قاتل وہی ہے جو چوری کرنے آیا تھا اور تم دونوں صلح ہونے کے باوجود اسے پکڑنے میں ناکام رہے؟ اگر میں انہی جیسا عام آدمی ہوتا تو پوس مجھ سے انہی سوالات کے جوابات مانگتی اور بذریعہ جھڑول اپنی مرضی کا ہر جواب حاصل کر لیتی مگر میں دولت مند اور باسرخ تھا۔ اس جاگیر کا دلایت سے آنے والا مالک تھا چنانچہ قانون کی دسترس سے باہر تھا۔

میں نے کہا ”کبیر خان! مجھے تمہارے دادا نے خبردار کر دیا تھا کہ یہاں کچھ لوگ قاتل اعتبار نہیں۔ کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تو مجھے شک ہوا کہ واقعی معاملات خراب ہیں۔ پھر جو کچھ میری گاڑی کے ساتھ ہوا انہیں بھی معلوم ہے۔ چنانچہ سب کے سامنے میں چلا گیا تھا مگر کچھ دور جا کے میں ازگیا۔ فرخ اھر سے اپنی موٹر سائیکل پر آ رہا تھا۔ یہ میرا اکرن ہے۔ اسے آتا تو تمہارے ساتھ ہی تھا لیکن کسی وجہ سے نہیں آ سکا۔ یہ جو شلا جوان موٹر سائیکل پر چل پڑا۔ یہ مجھے مل گیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل چھپادی اور ہم خاموشی سے یہاں آ کے چھپ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں دیر ہو گئی۔ ہم پہنچے تھے چور اور اپنی کارروائی میں مصروف تھا۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ جانو بابا بھی اوپر

بیٹھا ہے۔ جب اس کے چلنے کی آواز آئی تو ہم اوپر بھاگے اور وہ ہمیں دھکا دے کر نکل گیا۔ میں نے فارغی کیا تھا اس پر مگر وہ بچ گیا۔ خیر خراج کے کہاں جائے گا۔ اب میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک وہ پکڑا نہ جائے اور حالات میرے قابض میں نہ آجائیں۔“

”کیا اب میں جاؤں؟“ کبیر خان نے میرے خاموش ہو جانے کے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”ہاں، تم جاؤ۔“ میں نے گلائی کی گھڑی دیکھی جس میں رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ”لیکن ایک لائین دے جاؤ۔“

جب وہ چائیا تو فرخ نے جب میں ہاتھ ڈال کے چایوں کا ایک گچھا برآمد کیا۔ ”یہ ہاں پڑا تھا۔“

میں نے گچھے لیا۔ یہی چایاں تھیں مگر ان کو پرانی ڈوری سے باندھا گیا تھا۔ شہزادی کی بزرگوں بائیں ہاتھ کی کمرے خان نے اصل چایوں کی ڈبلی کیت ڈھالی تھیں۔ اپنی بیوی نور جہاں کو شہر چھوڑنے کے لیے جانے کا تو قصص بہانہ تھا۔ درحقیقت وہ چایاں بخوانے گیا تھا۔ ایک دن پہلے چایوں کے گم ہو جانے کا معاملہ باپ پراسرار نہیں رہا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر نگران نے چایاں بخوانے کس کو دی تھیں؟ اس کا دوسرا سہمی کون تھا جس کو وہ پورے اعتماد کے ساتھ شریک جرم کر سکتا تھا؟ کبیر خان کے لائین کے ساتھ نمودار ہونے تک میں ایسے ہی سوالات میں الجھتا رہا۔

اس وقت حویلی کے ہر کمرے کا قاتل کی جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ فرخ کے ساتھ میں صرف اس کمرے میں گیا جو کھلا پڑا ہوا تھا۔ میری حیرت اپنی جگہ مگر فرخ کا حال تو الف لیلہ کی کہانی کے کردار الدین جیسا تھا جو روزی کا بیٹا تھا۔ قسمت نے اسے قید خانے کے بجائے طمسائی خزانے تک پہنچا دیا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنے آیا تھا اور اب میرا سہمی بن کے قصبے کہاں جسے ماحول والی ایک حویلی میں محکم رہا تھا جہاں پر قدم پر اس کے جس کو بیدار رکھنے والے اسرار و رموز کی دنیا آباد تھی۔

لائین کی روشنی اس کمرے کی وسعت کے لحاظ سے بہت کم تھی جس کی چاروں دیواروں پر فرش سے آٹھ فٹ کی بلندی تک الماریاں اور کینٹ بنے ہوئے تھے۔ ان میں جو لکڑی استعمال ہوئی تھی وہ بھی بیش قیمت ہو گئی تھی زمرہ یوں کے سفر کے بعد ان کی مغبوطی پر قرار نہ دیتی۔ اس پر پالش پرانی ہو کے اپنی چمک کھو چکی تھی۔ پٹوں کے ششے دھندلا گئے تھے اور ہینڈل زنگ آلود ہو گئے تھے۔ نیچے کینٹ بند تھے اور لکڑی کے پٹوں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

الماریوں کے اوپر ایک قطار میں آرائشی ظروف اور اشیاء رکھی

ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر چودہ فٹ کی اونچائی والی محبت تک شکار کیے ہوئے جانوروں کے سروں کی شیلڈ آویزاں تھی۔ ہرن، بارہ ٹکے، چیتل اور بارے بھیڑیے اور چیتے۔ عقاب اور پہاڑی لوٹے کے سر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شاید ایک صدی سے شکار میں میرے آباؤ اجداد کی مہارت کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ وہ آباؤ اجداد جن کی کہانی بھی ایک عبرت کی داستان ہو گئی تھی۔ وہ خونخوار جانوروں کو شکار کرتے رہے۔ پھر موت نے انہیں شکار کیا۔ ان کی ہڈیاں تک خاک کا رزق ہو گئی تھیں۔ شکار ہونے والوں کے مرتبہ کے کاروان کو گزرتا دیکھ رہے تھے۔

وہ کمرہ ایک میوزیم تھا۔ اس کا پراسرار ماحول کسی حد تک فخرزدہ کرنے والا تھا۔ جو انسان کی لاش و خواہشات اور فتوحات کے انجام کی تصویر پیش کرتا تھا۔ لائین اور اٹھا کے میں الماریوں کے سامنے سے گزرتا تو گرد آلود شیشوں کے پیچھے مجھے صدی کے مارے مفرد لمبے کسی فرخون کی مٹی کی طرح محمد محسوس ہوئے۔ وہاں ہر قسم کے ظروف تھے۔ عام چینی کے دلائی برتن، چیتل اور کاسی کے۔ چاندی اور سونے کے۔ پیالوں، قابوں اور خزانوں سے بچھوں۔ پھریوں اور تازک چاموں تک۔ مضر دان، گلاب پاشی سرے داناں یا پاندان۔ قدیم نوادرات میں شمار کیے جانے والے مارے ظروف جواب کہیں استعمال نہیں ہوتے۔ ان الماریوں میں متید تھے۔

آخر میں ایک الماری کھلی ہوئی تھی۔ وہیں فرش پر ایک بوری آؤٹی بھری ہوئی رکھی تھی۔ اس میں ہر الماری سے نکالے ہوئے سونے چاندی کے منتخب ظروف تھے۔ آخری کم روشنی میں میرے لیے کسی بھی چیز کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ چیتل کی ہے یا سونے کی بنی ہوئی ہے؟ اسی طرح عبرت اور چاندی کا فرق بتائیں چلتا تھا۔ میں جانو بابا کی فراہم کردہ معلومات پر انحصار کرتے ہوئے خود ہی اندازے قائم کر رہا تھا لیکن چور کا معاملہ قلف ثابت ہو رہا تھا۔ اسے یقینی طور پر علم تھا کہ بلحاظ مالیت کون سی چیز زیادہ قیمتی ہے اور اس نے بوری میں بھرنے کے لیے انہی چیزوں کا انتخاب کیا تھا۔

فرخ بڑا مسرور سا کھڑا تھا اور ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایسی تاریخی نوادرات سے بھری قدیم حویلی اس نے شاید صرف فلموں میں دیکھی ہوگی۔ خود میرا یہی حال تھا۔ اگرچہ پاکستان میں بھی پرانے نوابوں اور جاگیرداروں کی حویلیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں لیکن میں نے آج تک کسی بھی ایسی حویلی کے اندر قدم نہیں رکھا تھا۔ میرے ذہن میں ان کا تصور پرانے شہنشاہی دور کی ”ساتھوں کی بنیاد پر تھا۔

ابھی وقت نہیں تھا کہ میں تمام چیزوں کا تفصیلی جائزہ لینا۔

میں نے ہر چیز کو اسی طرح چھوڑا اور دروازے کو قفل لگا دیا۔ ہم لوٹ کے منچے والے کمرے میں آگئے۔ فرخ کے ماتھے پر اس پتھر کا نشان تھا جو جرم نے فرار ہوتے ہوئے اس کا راستہ روکنے کے لیے مارا تھا۔ سامنے سے کھال پٹت گئی تھی اور خون جم گیا تھا۔ اس کے سر میں درد بھی تھا مگر فی الحال اس کے علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ سو جائے لیکن وہ وحشی طور پر مجھ سے زیادہ اپ بٹ تھا۔

ہم باہم کمرے رہے میں نے اسے اپنے بارے میں اپنے ارادوں کے بارے میں بتلایا۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ بھی مظلوم تھا ماں باپ کے بعد زمانے نے اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ رات انہی باتوں میں کٹ گئی۔ میں نے پوچھا ”کیا تم اپنے دو بیویوں والے گھوڑے پر ایک طویل سفر کر سکتے ہو۔۔۔ لاہور تک؟“

”بالکل کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے صبح کا انتظار کریں۔ میں ابھی جا سکتا ہوں۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ اب ایسی ایر جمنی بھی نہیں ہے کہ کوئی خطرہ مول لیا جائے۔“

”مجھے لاہور جا کے کیا کرنا ہوگا؟“

میں نے کہا ”تمہیں ایک نہیں بہت سے کام کرنے ہوں گے۔ اچھا ہوگا کہ اس کے لیے تم کچھ دیر آرام کرو۔“

”مجھے خیر نہیں آئے گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ آئیں بند کر کے لیٹے رہنے سے ہی فائدہ ہوگا۔“ میں نے کہا اور وہ آنکھیں بند کر کے تالین پر دراز ہو گیا۔

خیر مجھے بھی نہیں آتی۔ صبح کا اچلا کھلا کیوں کے شیشوں پر نمودار ہوا تو میں اتھ بیٹھا۔ فرخ کو غائب پا کے مجھے کچھ شوش ہوئی کہ کہیں وہ حالات سے گھبرا کے یا حوصلہ ہار کے فرار تو نہیں ہو گیا لیکن وہ باہر کھوم رہا تھا۔ اس نے درویش کا حراز اور ملحقہ علاقے سب دیکھ لیے تھے۔

”آپ کی یہ جاگیر کہاں تک ہے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”صحیح بات تو یہ ہے کہ کبھی مجھے بھی اس کی حدود کا اندازہ نہیں۔“

میں نے خود جا کے کچھ نہیں دیکھا۔ ایک دن میں یہ ممکن نہیں تھا اور پھر یہاں کے معاملات عجیب صورت اختیار کر گئے۔ حویلی میں ہم اس کمرے تک محدود رہے۔ پہلے چایاں گم ہو گئیں اور پوری حویلی کا جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا لیکن میں نے خاندانی نوادرات والا کبھی تمہارے ساتھ ہی پہلی بار دیکھا۔ کل کا دن ضائع ہوا۔ آج کا بھی ہوگا۔ فرصت ملے گی تو دیکھیں گے کہ اور کیا ہے؟“

وہ بولا ”میں تو ایک عجیب ہی دنیا میں آ گیا ہوں۔ کچھ مجھ میں نہیں آتا کہ یہاں آپ کیا کریں گے اور کہیے کریں گے۔ یہ جگہ اتنی

نے سر کے اشارے سے اس پر واضح کیا کہ میں آ رہا ہوں۔ میں اسی وقت حویلی کے صمد دروازے سے ایک گاڑی اندر آ گئی۔ میں نے راجا کو رانیر کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔ گاڑی کے رکتے ہی پیچھے والے دروازے سے فریال نے ہاتھ پر رکھا تو ایک لمبے کے لیے میرا دل جھڑک بھول گیا۔ میں نے جھٹ پر سے جھپ لگانے کی خواہش پر قابو پایا اور بے سے نیچے بھاگا۔

وہ سرپا ناز تصویر حسن و شباب اپنے وجود کی ساری تابکاری اور تہ کاری کے ساتھ میری نظروں کے سامنے تھی۔ انتہائے حریت اور فورسرت نے مجھے بے خود کر دیا۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ جب وہ میرے سامنے آتی تھی تو میری نظریں اور ہچکچاہٹیں رہتا تھا۔ میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔ سوائے اس احساس کے جس کا نام کوئی نہیں اور مجھ بھی ان گنت نام ہیں۔ پیار، محبت، عشق، سودا کہیں جنوں کہیں وحشت کہیں تھے۔

اٹھارہ عشق میں فریال ہمیشہ سے بے باک تھی۔ نہ وہ دیکھنے والوں کی پروا کرتی تھی نہ انشت نمائی کرنے والوں کی اور نہ باتیں بنانے والوں کی۔ اس نے یہاں بھی ہچکچاہٹیں دیکھا۔ کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ میں تو قریب پہنچنے کے رک گیا تھا مگر وہ نہیں رکی۔ جیسے ایک خاص فاصلے کے بعد لوہے سے جھٹا ٹھس کے لیے ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ کشش باہمی سے چپک نہ جائیں۔

وہ ایک دم مجھ سے چٹ گئی اور دوڑنے لگی۔ میرے لیے بڑی مشکل ہو گئی۔ راجا کے لیے یہ سین بالکل غیر متوقع نہیں تھا مگر کار کا ڈرائیور دم بخور ہو گیا۔ ایسا بے حیائی کا مظاہرہ اس نے صرف دلائی قلموں میں ہی دیکھا تھا۔ میرے پیچھے کہیں ریشماں تھی جو کھانے کی ٹرے اٹھائے کھڑی تھی غنی کے ساتھ میدان عشق کی دوڑ میں وہ اپنی کم عمری اور کم مانگی کے باوجود تمام رکاوٹوں کو عبور کر چکی تھی مگر اس لو سن پر فطرت جذبات میں اس کی بھی کچھ ٹھنک گئی۔

میں نے بڑی مشکل سے فریال کو الٹ دیا۔ ”فری! یہ کیا کر رہی ہو۔ سنبھالو خود کو۔ کیوں رو رہی ہو؟“ میں نے اسے سمجھوڑ کر کہا لیکن اس پر اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح کچھچھو سے روٹی رہی۔ گاڑی کے ڈرائیور کے ذہن نے اس بے خود کر دینے والے جذباتی منظر کی کوئی وجہ سمجھ لی ہوگی کہ وہ ڈکیمول کے سامان لٹا کے میں مصروف ہو گیا تھا۔ کچھ اسباب گاڑی کی چھت پر تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ کمرائے کی گاڑی ہوگی اور شاید اتر پورٹ سے ہی بک کر لی گئی ہوگی۔

راجا نے مجھے اشارہ کیا ”اے اندر لے جا اور آرام سے لٹا دے۔ بہت تھکی ہوئی ہے اور تڑپ رہی ایک ڈاؤن کا شکار ہے۔“ میں نے کہا ”ہاں۔ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے“ اور سسکیاں لیتی فریال کو صبح کے اندر لے گیا۔ وہ میرے بازو سے لگی رہی اور اسے

سنبھالنے کے لیے مجھے ایک بازو اس کے شانوں کے گرد رکھنا پڑا۔ ریشماں میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ شاید وہ خلوت میں کوئی زیادہ جذباتی ان ستر ڈسکین دیکھنے کی امید رکھتی تھی۔ میں نے اسے گھر کے دیکھا تو وہ بڑے بیز پر کمرے کے کھٹک تھی۔

فریال کو میں نے بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ مجھے جھوٹے پر تیار نہ تھی۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور ہاتھ غصے بڑھے تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں کے گرد ملتے نظر آرہے تھے۔ اس کی خوف اور وحشت زدہ نظریں ہر طرف سرگرداں تھیں جیسے ہرست سے نظر نہ آنے والے اور محسوس نہ ہونے والے خطرات اب بھی اس پر یلغار کر رہے ہیں۔

میں نے اسے بہت تسلی دی۔ بہت حوصلہ دیا۔ اسے یقین دلایا کہ اب وہ محفوظ ہے اور اسے پانی پلانے کے بعد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کے بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے جسم کی لڑش ختم ہو گئی۔ اس کی سسکیاں رک گئیں اور آنکھوں کے گوشوں سے بہہ کر ٹپکے میں جذب ہونے والے آنسو بھی ختم ہو گئے۔

میں نے سکرے کہا ”پگل لڑکی! مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ تم سیدھی یہاں آ جاؤ گی۔“

اس نے پڑھلاست لہجے میں کہا ”کیوں امید نہیں تھی؟“ میں نے نفرت سے کہا ”یہ جگہ اتنی دور ہے۔“

”دور ہے؟ کتنی دور ہے؟ میں لندن سے نیروبی اور پھر کراچی سے لاہور تک آ گئی۔ آخر کس کے لیے رو میو! تم کچھ پیچھے کے لیے اس سے بھی آگے جہاں بھی جانا پڑتا تھا میں جاتی۔“ وہ خود گلاہی کے انداز میں بولتی رہی۔

میں نے کہا ”آئی ایم سوری! جنہیں راجا نے بتا دیا ہوگا میرے نہ آنے کا سبب۔“

”میں شکایت نہیں کر رہی تھی؟“ وہ سادگی سے بولی۔ اگلے آدھے گھنٹے میں فریال کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔ راجا نے ایک ٹھنڈی یہی تھی کہ شہناز کو بھی اپنے ساتھ اتر پورٹ لے گیا تھا۔ اس نے وہیں دیکھا کہ طویل سفر کی محنت اور شہناز کے جذباتی بحران کے باعث فریال کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ انہوں نے کوشش کی کہ فریال کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ مگر اس کی ایک ہی رٹ دی کہ ”رہتی نہیں آ سکتا تو کیا ہوا۔ مجھے اس کے پاس بے چارے میں اور کہیں نہیں جاؤں گی۔“ سمجھوڑا راجا نے ست بدحالی تک کے لیے ہنسی باز کی۔ شہناز نے راجا کو چند دامن لکھ دی تھیں کہ فریال کو دے دیتا۔

راجا نے راستے میں وہ دو آنسو خیز لڑکی تھیں لیکن فریال نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ راجا نے اسرا نہیں کیا کیونکہ وہ سخت ترین کمیشن میں تھی اور راجا کو رتھا کس پر نہ چھٹ پڑا۔ اب راجا نے وہ دو اداں میرے حوالے کر دیں۔ میں نے

ریشماں سے کہا کہ گرم دودھ لا دے۔ فریال نے کوئی حراحت نہیں کی۔ اس کی قوت حراحت کا گراف زیادہ تھا اور جسمانی قوت بھی جڑا دے چکی تھی۔ سکون آور دواؤں کا اثر ظاہر ہونے سے پہلے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

راجا نے کہا ”خدا کا شکر ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتر پورٹ پر تو نظر نہ آتا تو یہ نارض ہوگی۔ وہاں تو کچھ کچھ بولی لیکن اس کے بعد میں نے کہا کہ میرے ساتھ چلو تو چلانے لگی کہ میں کیا تم سے ملنے آئی ہوں۔ کیوں جاؤں میں کہیں اور۔۔۔ شہناز نے سمجھنا چاہا کہ تم بھی ہوئی ہو۔ تو اس پر وہ ہم ہو گئی کہ ڈاکٹر صاحب یورپ سے اتر چکا اور ایشیا تک ہزاروں میل کے سفر میں نہیں مری تو پڑا وہ سو میل آگے جانے میں نہیں مروں گی۔ ظاہر ہے اس کے بعد شہناز بھی سمجھ گئی کہ اس کی کیفیت میں اس سے ہمدردی کا اثر ہی اٹا ہوگا۔“

میں نے کہا ”تیری ملاقات فرخ سے ہوئی؟“ راجا سر کھانے لگا ”یہ ناشانہ ہے یا مرانا؟“ میں نے کہا ”چل چھوڑ۔ یہ بتاؤ تو میرے گھر میں کیا بیان دیا؟“

”میں نے کہا کہ مملکت بہت بدحالی کے بلبل اللہ فرمانروا نے مٹا حکومت سنبھالنے کی حالات کا کنٹرول سنبھالنے کے اقدامات شروع کر دیے ہیں اور شب روز کی مصروفیت کے باعث وہ صرف امور سلطنت پر ساری توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔ فی الحال وہ اپنے دار الحکومت میں ہی قیام فرمائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ تیرے لبا خوش ہیں لیکن ایک تشویش ہے انہیں۔ پہلے کوئی ٹون کر کے تجھے پوچھتا رہا۔ اگلے کا کہنا تھا کہ کوئی تخت بدخیزا دی تھا۔ اسے بتایا کہ وہ کہیں ہیں تو کہنے لگا کہ آؤ وہ کب ملتے ہیں۔ جب پوچھا جائے یہی جواب ملتا ہے۔ اگلے نے کہا کہ مملکت نہیں پہلے آپ نے کب فون کیا تھا اور کس لیے یہ جواب دیا تھا مگر اس گھر میں جھوٹ کوئی نہیں بولتا۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے۔ اگلے نے کہا کہ وہ شہر سے باہر ہیں اور ان کی دواہی کا یہ نہیں ہے کہ کب ہوگی۔ مگر اس نے سو بائیں خبر مانگا۔ اگلے نے کہا کہ کس فون میں آپ کو دے دوں لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں کیونکہ وہاں رابطہ نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگا کہ کیا ولایت سے واپس آتے ہی آپ کے فرزند باؤنٹ ابورست پر چڑھ گئے ہیں کہ رابطہ نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے اس پر اگلے نے فون بند کر دیا۔“

”ایسا بدخیز کون تھا؟“ ”اگلے نے گھر کے دیگر افراد سے مملوک کیا تو راجا نے بتایا کہ اس کی بھی کسی سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو نہیں ہیں۔ وہ مگر مذاق کرنے لگا کہ آخر آپ کے وہ اتنا عرصہ باہر رہے کہ لوٹے ہیں۔ اب بھی اندر نہیں رہتے۔ راجا نے کہا کہ آپ کو بات کرنے کی گیز نہیں۔ آپ ہیں کون تو بولا کہ پہلے آپ بتائیں آپ اس کی پہلی

بیوی ہیں دوسری یا تیسری۔ راجا نے کہا کہ میں تو ان کی کزن ہوں۔ بیویاں ہوں کی تھوڑی بہنیں۔ چوٹی ہے تو اسے بھی یاد دلا۔“ مجھے فنی آئی ”کیا خوب فرمایا اس راجا نے۔ مگر وہ انوکھا بچا ہے کون؟ کیا جانتا ہے؟“

”میرا شک انہی پر جاتا ہے۔ گارے شاد پر آج کل تیرے سب پرانے دوستوں کو جلاب لگے ہوئے ہیں۔ چیف صاحب لندن سے فرار ہو گئے ہیں اور عائشہ فرانس پہنچ گئی ہیں۔“

”یہ آگئی خبر ہے لیکن کیا ایک کیا ہوا؟“ ”لندن میں اس کی رہائش گاہ پر چھاپا پڑا۔ صفائی پر ماسور کسی خاندان سے گناہنوں کے کے اطلاع دی گئی کہ وہاں ایک شخص مفلوج اور معذور پڑا ہوا تھا۔ اب وہ غائب ہے۔ اس نے کچھ عرصہ قبل چیف کو کسی سے بات کرتے سنا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے بچھا چھوڑا جائے؟ وہ کسی سے اس مفلوج شخص کے بارے میں بات کر رہا تھا کہ وہ کب سے لاش کی طرح پڑا ہوا ہے۔ بہتر ہے کہ اس لاش کو کھانے لگا دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیسے۔ وہ مختلف طریقے دیکھ کر ہے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا لندن پولیس کل کا سراغ لگانے میں ماہر ہے اور ان تک پہنچ جائے گی۔“

میں نے کہا ”کیا وہ ہینگر کے بارے میں ڈکس کر رہے تھے؟“

”عائشہ ہینگر کو تو نے مارا کے بھس بھر دیا تھا۔ بھس بھرے ہینگر کا وہ کیا کریں گے؟“

”چیف کے برے دن آگئے ہیں اور نہ وہ ایسا بے خوفی کیوں کرتا۔ خاندان کی موجودگی میں وہ مرڈر پلان پر بات کر رہے تھے۔ دوسرا کون تھا؟“

”ہائیں۔ دراصل انہیں ہوا ہو گیا۔ خاندان گھر پر تھی لیکن پہلے کئی سال پاکستانی سفارت خانے کے کسی اہلکار کے گھر میں کام کر چکی تھی۔ وہ وار دو میں بات کر رہے تھے۔ اس خیال سے کہ خاندان کا سبھی کی مگر وہ اردو جانتی تھی۔ عائشہ اسے وہاں پلاٹ کیا گیا تھا۔ کسی انجینی نے سکرایا ہوگا یا پھر وہ لندن پولیس کی خبر ہوگی۔ اس نے بتایا کہ ایک تو وہ زندہ لاش اب نظر نہیں آ رہی ہے دوسرے فرسٹ کی صفائی کے دوران میں اسے کچھ داغ دھبے بھی دکھائی دیے جو غیر معمولی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں صاف کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی مگر خشک ہونے کے بعد وہ بھر جھٹک دیے گئے۔ یہ دھبے تالین پر تھے۔ پولیس نے کسی کارپٹ کینز سے مملوک کیا کہ کیا کڑو شہناز وہاں سے اس علاقے میں کہیں کارپٹ کی صفائی کی گئی انہوں نے بتا دیا۔“

”بھر چیف کیسے بکے کھل گیا؟“ ”یہ بتائیں۔ شاید اسے بھی کسی ڈر ہے۔ پولیس کی کارروائی کی سن گئی تھی یا اتفاق سے وہ پہلے ہی کھل گیا تھا۔“

”لندن پولیس ایسے اتفاق کی نوبت نہیں آنے دیتی۔ مگر اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کیسے نکل گیا۔ وہ کسی مافیا کے سرخند سے کم تو نہیں۔ اس کا بھی ایک منٹل جسٹس درک ہے۔ پولیس کو وہاں سے کیا ملے؟“

”پلاسٹک کی چھوٹی تھیلیوں میں بند ایک لاش کے ٹکڑے۔ ان سب پر ”ڈاگ فوڈ“ لکھا ہوا تھا۔ ساری تھیلیاں ایک فریزر میں تھیں۔“

”کیا سمجھتے کہ اس مقام پر راجا وہ جوتا بیکر کھاتا تھا۔ اپنی خوں آشی کی وجہ سے۔ نہ جانے کتنے انسانوں کا شکار کر چکا تھا۔ خود کون کی خوراک بن گیا۔ شاید کون نے بیکر کے کچھ گوشت سے پیٹ بھی بھرا ہو۔ چھاپا نہ پڑتا تو وہ پورے کا پورا ختم ہو کے خارج ہو جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ چیف پر قتل کا الزام آیا تو وہ فرانس میں بھی کیسے رہ سکے گا انٹرپول اسے پکڑ لائے گی۔“

راجا بولا ”مجھ کو کہہ رہے تھے کہ یہ سنواری بتائی گئی ہے۔ چیف کا سابقہ ریکارڈ اسے ایک کزنل جینٹس ثابت کرتا ہے۔ اس کے دامن پر کتنے لوگوں کے خون کے داغ ہیں؟ مجمع حساب کا پتا تو میدان حشر میں ہی چلے گا لیکن یہاں اس کے خلاف ایک بھی قتل کا فرد جرم نہیں۔ جتنے لوگوں کو اس نے خود مارا اس سے دس گنا یا سونے کو دوسروں کے ذریعے مروایا۔ مگر کیا کبھی وہ پکڑا گیا؟ جب پکڑے گئے یا پکڑا نہ گئے؟ یہ گناہ تھے وہ ایک تیرے دو شکار کرتا رہا۔ ایک باقی کو مارا تو دوسرے کو قتل کے الزام میں تھوڑے دار پر پہنچا دیا۔ دیکھ لیتا اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ چیف ایسے کام بھی تو نہیں کرتا دوسروں سے کرتا ہے۔“

”ٹھیک کہا تو نے۔ وہ بھرتیج جانے گا۔ لندن کے مقابلے میں جیس ہمیشہ جلا وطنی کے لیے زیادہ محفوظ رہا ہے۔“

راجا نے کہا ”پریشانی زیادہ ہے نیچے درجے کے کارکنوں کی۔ وہ سب ایک کزنل ریکارڈ رکھتے ہیں اور بلیک میل بھی ہوتے ہیں۔ دس سال تک یہ لوگ بدعاشی کی طاقت میں خروں بہتے رہے۔ ظلم و ستم اور لوٹ مار کرتے رہے۔ اب ان کے ہاتھوں زک اٹھانے والے اقتدار میں شریک ہیں۔ بازی پلٹ گئی ہے تو انہیں منہ چھپانے کا ٹھکانا نہیں مل رہا ہے۔ گاہے شاہ اور شاہب الدین بھی بھاگنا چاہتے ہیں لیکن راستہ نہیں مل رہا ہے۔ اب وہ جاکے جگ ٹڑ رہے ہیں اور مرے مارے پر آمادہ ہیں کہ تم تو وہ ہے جس منہ تم کو بھی لے دوں گے۔ وہ تجھے بھی پریشان کریں گے۔“

میں نے کہا ”دیکھی جانے کی یاد۔ فون کے علاوہ تو کچھ نہیں کیا انہوں نے۔“

راجا نے کہا ”وہ جو تیرا حق الزامان کزن ہے نا افضل..... وہ کہہ رہا تھا کہ اسے باہر کچھ لوگوں نے روک کے پوچھا تھا کہ رفیق

کہاں ہے، پھر وہ لوگ گھر کے سامنے کھڑے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ اس نے یہ بات راجا سے کہی تو راجا نے کہا کہ اچھا وہ دبا رہ نظر آئیں تو مجھے بتانا۔ کل رات وہ چھت پر دروازہ کھڑا تھا۔ آج کل اسے باڈی بلڈنگ کا شوق ہو رہا ہے۔ اس نے اوپر سے دیکھا تو وہ لوگ بھر نظر آئے اور اس نے راجا کو اطلاع دی۔ راجا نے ذرا ہوشیاری دکھائی۔ گھر میں کہیں کیسے اترتا تھا اور اس میں قہم قہم تھی۔ اس نے اوپر والی کمر کی سے فوٹو اتاری۔ فلیش ہوا تو انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ راجا نے پھر ایک اسٹیپ لے لیا۔

”وہ کیا کرتے ہیں ناسائے آکے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”تمہارے گھر کے سامنے دروازے سے ذرا ہٹ کے ایک ہینڈ ڈریسری دکان ہے۔ وہاں دھنپے رہتے ہیں۔ جان بچان بنال ہوگی۔“

”راجا نے بڑی بے ڈھائی کی۔ انہیں ہوشیار کر دیا۔ تصویر اتارنی ہی تھی تو فلیش بند رکھی۔ دن میں اتارنی خیر..... پہلے یہاں کے معاملات سے نمٹ لیں۔ تو کسی مکیک کو نہیں لایا۔“

”لایا ہوں۔ وہ گاڑی ٹھیک کر رہا ہے۔“

”کون..... یہ ڈرائیور ایہ ٹیکسٹ بھی ہے۔“

”میرے ایک جاننے والے کی گاڑیاں کرائے پر چلتی ہیں۔ اس کی اپنی ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ اس نے ڈرائیور کی جگہ اسے ساتھ کر دیا کہ یہ تمہاری گاڑی ٹھیک کر کے اپنی گاڑی میں لوٹ آئے گا۔ میں تیرے گھر گیا تو امان نے تیرے کپڑے ایک سوٹ کس میں بھر دیے۔ چائے کافی کا سامان اور سوکٹ ڈال دیے کہ ہاں تو کچھ نہیں ملتا جب میں چلے گا تو پہلے تیرے ابا نے ایک ٹافہ دیا کہ اس میں پچاس ہزار روپے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں کوئی ضرورت نہیں مگر وہ مصر دے کر لے جاؤ۔ ضرورت کا کیا پتا۔ میں نے ایک تو خرید لیا جزیئر۔ چھوٹا ہے لیکن ہماری ضروریات پوری کرے گا۔ ہینڈول کم خرچ ہوگا۔ وہ بھی پانچ ہزار میں۔“

”پانچ ہزار میں؟ کیا چوری کا مالک تھا؟“

”چائے کو دے دے نیچے چڑا ہزار میں ہر چیز کوڑیوں کے دام مل رہی ہے غریبوں کو۔ کئی جزیئر جاپانی براڈ ہوٹو میں ہزار کا ہے اور جرمنی کا شاید اس سے بھی دگنا مہنگا ہوگا۔ یہاں اور اڑتے تو ہے نہیں میں تار اور بلب ہولڈر وغیرہ اٹھا لایا ہوں۔ ہم اٹھارہ واٹ والے دس انری میٹر بلب لگا سکتے ہیں۔ پچھے چلا سکتے ہیں دو۔“

”مجھے ہیں کہاں؟“

”دو چیل فین لایا ہوں میں۔ مگر اصل چیز یہ ہے“ اس نے اپنے بریف کس میں سے ایک موبائل فون نکالا ”یہ لائٹ ریسیور فون۔“

میں نے کہا ”تو نے بڑی عقل مندی کی لیکن میں نے یہ س

فرخ سے منگوایا تھا۔ اس سے تیری ملاقات نہیں ہوئی؟ اب یہ ساری چیزیں ہی اٹھالے گا۔ دونوں ہونے چاہئیں۔ ایک جزیئر اسٹینڈ بانی رہے گا۔“

”یاد ہے فرخ کا نام بھرا لیا تو نے۔ راتوں رات یہ کیا چیز آگئی تیرے ہاتھ میں؟ کون ہے فرخ؟“

میں نے کہا ”فرخ وہی ہے جو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تک اسی لیے آیا تھا۔“

راجا بھر بھر گیا ”وہی..... یعنی فرخ وہ کا بھائی؟“

میں نے کہا ”ہاں۔ مجھے شک تھا کہ اس نے فائر کر کے گاڑی کے اگلے بازو کو بربست کر دیا تھا۔“

”تو کیا ایسا نہیں تھا؟“

میں نے کہا ”نہیں۔“ اور پھر اسے تفصیل سے فرخ کے بارے میں بتا دیا کہ اس کی اور میری ملاقات کیسے ہوئی تھی اور اس کے بعد کیا واقعات پیش آئے تھے۔ راجا کے حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ تھی۔ فریاں گہری نیند میں تھی۔ چنانچہ ہم اطمینان سے دو گھنٹے باتوں میں مصروف رہے اور اس دوران میں بہت سے کام بھی نٹالے۔ ہم نے اوپر جانے والے زینے پر کمرے میں اور برآمدے میں جہاں ضرورت محسوس کی تو دونوں کو دیوار کے ساتھ رکھتے ہوئے انری میٹر لٹکا دیے۔ اب رات کو کسی بھی حصے میں مکمل تاریکی ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اصولی طور پر ہم پہلی ہی طے کر چکے تھے کہ اب اولین فرصت میں پوری حویلی کی ترمیم نوادہ آرائش کی جائے گی۔ اس رینویشن پر گرام میں ضروری مرمت رنگ زورنگن الیکٹرک ٹھنگ بننے کا کام اولیت رکھتے تھے۔ مین لائن اگر آدھا کمپیوٹر کے قافلے پر موجود تھی اور کچھ میری جاگیر کے اندر گئے ہوئے تھے تو عارضی انتظام کے طور پر وہاں سے تار جوڑ کے بجلی لیتا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بعد میں دو چار ٹھیکے گوانے جاسکتے تھے۔ واڈا کے اٹھاروں سے پوری امید تھی کہ وہ خود میرے در دولت پر حاضری دیں گے اور پوچھیں گے کہ حضور والا! ہمارے لائق کوئی خدمت۔ تقریباً تمام سرکاری محکموں کی کارکردگی کو گھٹانے پر جو احانے میں سکر رائج الوقت اسی طرح کام کرتا تھا جیسے کار

میں انکسپری لریز کرتا ہے۔ ابھی چونکہ ترقیاتی منصوبے ایک خیال سے زیادہ کچھ نہ تھے اس لیے سب بدعاشی میں مستقل قیام لا حاصل تھا۔ کسی بھی پروجیکٹ کے لیے زمینیں سروے سے فزیشنل رپورٹ یعنی قائل مل ہونے کے بارے میں انجینئر ز اور اپنے شعبے کے ماہرین کی رپورٹ سے بھی دوگنا دوسان کی فراہمی تعصیب اور مضروب کی تشکیل تک ان محنت مراعات تھے۔ اس کے لیے وقت سرمایہ اور افرادی قوت سب کو کھینچ کر آسان کا نہ تھا۔

میں نے راجا کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ جلد از جلد کنٹرول سنبھال کے اور سکوری کے انتظامات مکمل کر کے ہم کو واپس شہر چلے

جانا چاہیے اور دوبارہ اس وقت آنا چاہیے جب کسی ایک پروجیکٹ پر عملی کام کا آغاز کیا جا سکے۔ وہ یہاں ایک دو دن سے زیادہ قیام کے حق میں نہیں تھا۔

میں نے اس سے پوچھا ”آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہاں کے معاملات ایک دو دن میں نٹالے جا سکیں۔“

”ایسے کون سے ارجنٹ معاملات ہیں؟“

میں نے کہا ”ایک معاملہ تو اکبر خان کا ہے۔“

”ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ اسے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔ اس کے خلاف نہایت ثبوت ہے نہ گواہ کہ اس نے جاناو یا کو قتل کیا اور وہی چور تھا جو جیسی نوادرات سمیت کر فرار ہونا چاہتا تھا۔“

”پولیس خود معلوم کر لے گی۔“

”بالکل ٹھیک..... لیکن اس کے لیے رپورٹ درج ہوگی۔ تفتیش ہوگی پھر چالان پیش ہوگا۔ تھانہ کہاں ہے اس علاقے کا۔ کس کون سے ضلع کی عدالت میں جائے گا۔ یہ بڑا لمبا اور فضول پتہ ہے نیچے جزیئر۔ پولیس وکیل اور عدالت کے اہلکار سب تجھے زنج کر دیں گے۔ بڑا پیسا بھی خرچ ہوگا اور خوارگی الگ ہوگی۔“

”تو چاہتا ہے میں ان کمپس کان بند کر کے واپس چلا جاؤں؟ کچھ بھی نہ کروں تو وہ شیر ہو جائے گا۔“

”تو اسے نکال باہر کر۔ چھٹی کر دے اس کی۔ تو نے فرخ سے کہا تھا کہ کسی پرائیوٹ سکیورٹی ایجنسی سے رابطہ کرے۔ مجھے یہ آئیڈیا کچھ قابل عمل نہیں لگتا۔ شہروں میں ایسی بہت سی پرائیوٹ سکیورٹی گارڈز فراہم کرنے والی ایجنسیاں ہیں لیکن کیا وہ اپنے گارڈ یہاں بھیج دیں گی؟ یہاں ان کے کمانے رہنے اور آنے جانے کے انتظامات کیا ہوں گے؟ اول تو یہاں کوئی آئے گا نہیں۔ آیا تو معاوضہ چار پانچ گنا طلب کرے گا۔ اس کے بعد ہی گارڈی کوئی نہیں۔ شہر میں خود سکیورٹی گارڈ کتنے تھکوں میں ڈاکے ڈال چکے ہیں۔ کوئی سب کچھ صاف کر کے چلائے گا اور تجھے تباہ بھی مٹے گا۔“

”لیکن میں یہ سب ایسے ہی چھوڑ بھی تو نہیں سکتا مہاراجا!“

اس نے کہا ”اس کے لیے آسان طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ آج تک اس حویلی اور جاگیر کے محافظ لوگ تھے۔ انہوں نے اپنا فرض بڑی ایمانداری سے ادا کیا۔ ایک اکبر خان ہی تک حرام نکلا۔ جس پر تجھے شک ہے۔ اس کا بیٹا کبیر خان بھروسے کے قائل ہے تو اسے دسے دار بٹا دے۔ اکبر خان سے کہہ دے کہ وہ جس دختر میں چوکیداری کرتا ہے کرتا رہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے برہمی سے کہا ”میرا جتن پلے تو میں کل اس عمارت کو بھٹک دوں کروں۔ معلوم نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔“

”ہاں۔ پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے نیچے چڑھو ہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہ کام تو بھر پر چھوڑ دے۔ مجھے شک ہے کہ وہاں کوئی غیر قانونی

میں نے راجا کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ جلد از جلد کنٹرول سنبھال کے اور سکوری کے انتظامات مکمل کر کے ہم کو واپس شہر چلے

وکیل فاروقی سے بھی پرچنا چاہتا تھا کہ میری زمین پر ایک ہیرک کب اور کس کی اجازت سے تعمیر کی گئی تھی۔

رات ہو گئی تھی اور فرخ ابھی تک لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے بھی فکر تھی۔ میں نے راجا کو اپنے ساتھ لے جا کر وہ کمرہ دکھایا جو ایک طرح سے ہمارا خاندانی میوزیم تھا اور جہاں گزشتہ رات ایک نامعلوم شخص چوری میں شامل تھا۔ پہلے جانو باپاس کے عزائم کی راہ میں حاکم ہوا تو اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ پھر زمین دقت پر میں کچھ کیا تو وہ مال غنیمت کو چھوڑ کے فرار ہونے پر مجبور ہوا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ زندہ بچا گیا اور نہ میری گولی کا نشانہ بنا۔

اتفاق تھا کہ ہم باقی کی کمرہوں کو کھول کے دیکھ سکتے۔ میں کمرے کو متھل کر رہا تھا کہ ایک اندر جہاں مجھے اور مجھے سے سنائی دینے والی جزیر کی آواز بند ہوئی۔ راجا نے کہا کہ وہ جا کے دیکھتا ہے لائن کیسے بند ہو گئی۔ جزیر کا بیڑا ٹنک چھوڑا تھا لیکن اتنی جلدی بیڑا دل ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے زینے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کبیری جیسے برآمدے سے میری نظر بلی کی طرف گئی۔ کوئی گاڑی بلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

شاہ فرخ لوٹ آیا ہے میں نے سوچا۔ لیکن اسی وقت میری نظر میں لوہے بھر کے لیے روشنی کا کنڈا اسکا۔ یہ روشنی مخالف سمت میں نظر آتی تھی اور ایک لوہے جھک دکھا کے غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اندر میرے میں نظر بھاگے ہیرک کی طرف دیکھا کہ کیا کوئی سرچ لائن روشن ہو کے بجھ گئی تھی۔ اس وقت میرے کانوں نے کسی ٹرک کے انجن کی کھوکھوں سنیں۔ خاموشی میں یہ آواز قریب سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

چند سیکنڈ میں روشنی پھر بج گئی۔ اس بار میں نے مخالف سمت سے آنے والے ٹرک کی ہیڈ لائٹس کو دیکھ لیا جو پلٹے ہی بجھ گئی تھیں۔ شاہ ڈرائیور نے راستہ دیکھنے کے لیے انہیں آن کیا تھا اور پھر بھجایا تھا۔ میں ہیرک کی سمت میں دیکھا رہا۔ ٹرک کی آواز بہت واضح ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ ٹرک اسی ہیرک میں جا کر لیکن ٹرک ہیرک کے گرد گھوم کر کے پرآئے ہو جاتا رہا تھا ڈرائیور بیٹھا دھنوں کے درمیان سے ٹرک گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے سبزی کے بیجوں کو بھی بال نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد ٹرک جو بلی کے جنوبی حصے کی فسیل کے پیچھے آ گیا جہاں درویش کا حرا تھا۔ پھر وہ گھوم کر صدر دروازے تک آیا۔ میں نے ٹرک کو اندر میرے میں اندر داخل ہوتا دیکھا۔ اس کے رکشے ہی ایک ساتھ گلی افراد پیچھے کودے۔

معلوم نہیں کیوں راجا ابھی تک جزیر کو پھر سے رواں کرنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ باہر ہوزارت کی راج راج تھا اور میرے لیے اوپر سے نوواردوں کی صورت دیکھنا بھی محال تھا تو ان کے کردار اور عزائم کا میں کیا اندازہ کرتا۔

”بہت کچھ ہوا ہے۔ ہیرے ابانے صاف کہا کہ حق کی بات مت کرو۔ تمہیں مل جائے گا کچھ نہ کچھ مگر دھمکیاں مت دہاؤ بات کرو رہتی ہے۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ اب تو کھلی دشمنی کی فضا ہے۔ سوئی بچا کمرے سے چلے گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے معاملات مزید خراب ہوں گے۔“

بابر ملینک متھدی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے بالآخر آواز لگائی کہ صاحب گاڑی تیار ہے۔ اس وقت تک رات کا اندر ابھر سوجھا ہونے لگا تھا۔ راجا نے گاڑی میں سے جزیر نکالا۔ وہ اپنے ساتھ جیس لیئر بیڑا لے گیا تھا۔ موٹر ملینک نے اسے بھی چالو کیا اور لائنوں کے کشش جوڑ دیا۔ جو بلی کی مسعت کے اختیار سے چار بج رہی تھی۔ بیڑا بلیوں کو اجالا تھا۔ کاشی کا تھکا ایک رات لائٹوں اور بیڑا میکس لیپ کی روشنی میں گزارنے کے بعد ہمیں یہ نیلگوں اجالا بڑا سیدھا اور حوصلہ بڑھا نے والا لگا۔ ایک جھینڈا بلی ناول کا تختی کا مسل اول پر پہلی طرح لے۔ قیر کا شہکار بنانے والا پہلی اینٹ رکھ دے۔

سہ پہر سے اب تک سرفوت کو ارڈر کی طرف سے خدمت گزاری کا سلسلہ بڑے تواتر سے چل رہا تھا۔ سب سے اکیڈم ریٹش تھی۔ دوسرے وہ چائے لائی اور اس نے دس بارہ سال کے ایک بچے کی ذہنی دروازے کے باہر لگادی اور اسے ہمارا حکم سرفوت کو ارڈر تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ گزشتہ روز ڈاکٹر شہناز اور آج فریال کی آمد نے اسے بہت پر جوش کر دیا تھا۔ وہ گاڑی کی گدی سے شہر کی چھوڑی بننے کے لیے بے تاب تھی اور جو بلی میں وارد ہونے والی یہ لڑکیاں اس کے لیے رول نازل کا دھج رہی تھیں۔ ایک مرتبہ کبیر خان بھی آیا لیکن اکبر خان مجھے جانو باپا کی تدفین میں نظر آنے کے بعد پھر دکھائی نہیں دیا۔ وہ سب کچھ پریشان کچھ اداں اور کچھ اڑے ہوئے تھے۔ انہیں حالات نے بے چینی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ فریال چار گھنٹے ٹرک گزارنے کے بعد بھی اتنی کمری خند میں تھی کہ اس نے کوٹ تک نہیں بدلی تھی۔ جن حالات میں وہ لندن سے فرار ہوئی تھی اور جس طرح اس نے تنہا لندن سے تیرہویں پھر کراچی اور لاہور تک ایک طویل دہشت زدہ کرنے والا سفر اختیار کیا تھا اس نے فریال کو جسدانی اور اعصابی شکست ریتھت کی آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ سفر ختم ہوا تو وہ اپنی ساری توانائی صرف کر چکی تھی۔ اب یہ خیر سے زیادہ بے ہوش تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ بے ہوش ہی جاگے گی۔ سیت لائن فون کی بیل کی چارج ختم ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں اماں سے اور اماں سے مختصر بات کی۔ انہیں بتایا کہ میری طرف سے بالکل ختم ہوئی ہیں اور اپنا خیال رکھیں۔ پھر بیڑی نکلی ہوئی۔ دنیا سے رابطہ بحال ہوا تھا تو میرا خیال تھا کہ لندن میں جانے سے بھی بات کروں گا تاکہ اس کے پر دم کراہا جاوے۔

فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔“ راجا نے نگلی سے کہا۔ ”ابھی تک میری فریال سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ تجھے ہی بتائے گی کہ لندن میں کیا ہوا تھا۔ وہ کیوں اس انفارمیری میں فرار ہوئی۔ وہ مصد سلطان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل تو آئی ہے لیکن یہاں بھی محفوظ بہر حال نہیں ہے۔ اس مظلوم ہو جانے والا آخر کہ فریال تیرے پاس بچتی تھی ہے۔ یہ اس کے لیے عزت اور غیرت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ وہ تجھے صاف کرے گا اور نہ فریال کو۔ لندن میں روپوش رہ کے مجھ کو یہاں تم دونوں پر عمر حیات تک کر سکتا ہے۔ مصد سلطان مرزا ایک نام نہیں ایک طاقت ہے۔ لاقانونیت کی علامت ہے۔ تو جانتا ہے وہ کون لوگ ہیں جو دہشت گردی کی ایک کلک گیر بانی میں شامل ہیں۔ حکومت کی طاقت بھی ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔“

”تو کیوں مجھے دہشت زدہ کر رہا ہے ہمارا راجا!“

”میں تجھے خبردار کر رہا ہوں۔ اس خطرے کو سمجھ۔ اس پرانے میں تو ذرا بھی محفوظ نہیں ہے۔ تیرے گھر گناہوں کرنے والے کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ کیوں تیرے گھر کی گرائی کر رہے ہیں۔ اگر تو لوٹ کر نہ جائے تو کیا وہ مایوس ہو کے لوٹ جائیں گے؟ نہیں وہ تجھے لوٹنے پر مجبور کر دیں گے۔ وہ تیرے گھر پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر والوں کو پرغال بتائیں گے۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں نیچے پڑے یہاں جو بلی اور جاگیر کی حفاظت کے لیے مقرر ہے۔ وہاں کے معاملات کی فکر نہیں ہے تجھے؟“

راجا کی وارننگ نے مجھ پر چوہہ طبع روشن کر دیے۔ ”تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے راجا۔ یہاں کے معاملات سے بعد میں نشا جاسکتا ہے۔“

”ایک بات اور بتاؤں“ راجا کچھ دیر بعد بولا ”تیرے گھر کے اندر بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے کہا۔

”راجہ نے کیا بتایا تھا تجھے۔ تیرے حق وراثت نے رشتوں میں دراڑ ڈال دی ہے۔ ان کے دل میں حسد کی آگ بھڑکادی ہے۔ تیری بچی نے دھاندلی اور نا انصافی کا ایسا ڈھول چٹا ہے کہ تجھے ہی نہیں تیرے ساتھ سب کو مجرم اور سازش میں شریک بنا دیا ہے۔ تیرے والدین کو یہاں تک کدوا دی کہ۔“

”یہ تو بڑی زیادتی ہے۔“

”صرف زیادتی۔۔۔۔۔۔ یہ کیسی ہے۔ تیری بچی نے اعزاز ہراگا کر پہلے تو ان کی بجگ ہو گئی تیری اماں سے۔ پھر انہوں نے سوئی بلی کو اکسایا اور وہ ساری قلندری بھول گئے۔ انہوں نے بڑے بھائی سے مطالبہ کیا کہ آدھی جائیداد پر ان کا حق بنتا ہے۔ اگر وہ انہیں نہ دے۔“

”تو کیا؟ انہوں نے دھمکی دی ہے؟“

دھند چل رہا ہے۔ ان لوگوں سے براہ راست دشمنی مول لینا کوئی قلندری نہیں۔ چھٹانے کے ساتھ بہت لمبے ہوں گے اور ان کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ مظلوم نہیں ان کی پشت ہنای کون کون کر رہا ہے۔ ان پر ہم اس وقت ہاتھ ڈالیں گے جب ہمارے ہاتھ اتنے طاقتور ہوں گے کہ ان سے کمرے لے سکیں اور انہیں نیست و نابود کر سکیں۔ یہ کام مشکل اور خطرناک ضرور ہے لیکن نامکن نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے کچھ کیے بغیر ہی سب کچھ ہو جائے۔“

”ہاں۔ سوئی بلی کچھ جالی مل کر اس اور ان کے موکل سب کو جس جہس کر ڈالیں۔ جیسم کر دیں“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تیرے نازل ہونے سے اور تیرے عزائم کی خبر سے ان کو پریشانی تو پہلے ہی لاحق ہوگی۔ وہ خود پہا ہوا میں۔ خاموشی سے نکل جائیں۔ اپنے لوگ خود بھی کسی کی نظر میں آنا نہیں چاہتے۔ یہ جگہ لاوارث پڑی تھی۔ پوچھنے والا کوئی نہ تھا تو انہوں نے جگہ بکڑی۔ پیسہ خرچ کریں گے۔ لیکن اور سیت ہو جائیں گے۔ انہیں تھوڑا سا نام دے کر دیکھ لیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ایسا نہ ہو کہ اس میں نظر بھاگے چلا جاؤں بعد میں قانون کی آڑ میں بلیک میل کرنے والے مجھے گھیر لیں کہ تم اپنے علاقے میں کیا کر رہے تھے۔ کیسے دھند سے پھیلا رکھے تھے۔ کن لوگوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ یہ جو ایک اصطلاح بن گئی ہے نا۔۔۔۔۔۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے۔ ہتھی نہیں چلا کر نام کے پیچھے کیا کام ہے۔ پورا مافیا جیسا نیت ورک ہے ان کا بھی۔“

”تو مجھ پر بھروسہ کر۔ تجھ پر آج نہیں آئے گی۔“

میں نے کہا ”اوکے۔ یہاں کے معاملات کی گمرانی میں کبیر خان کے سپرد کر دیتا ہوں۔ وہ اکیلا کیا کرے گا۔“

”تو اسے ذمہ دار بناؤ یہ اختیار دے کہ اپنی مدد کے لیے مجھ سے دے کچھ لوگ لے آئے۔ گردنواح سے چار چھ افراد کا انتخاب کر لے جن کو وہ جانتا ہو۔ اس کی زندگی یہاں گزری ہے۔ بعد میں ہم کو اسی علاقے سے انفرادی قوت درکار ہوگی۔ یہ پہلا مرحلہ ہوگا۔ اس سے گردنواح میں سب کو مظلوم ہو جانے کا کرنے مالک آئے ہیں اور علاقے میں ان کی بھلائی کے کام کرنا چاہتے ہیں۔ تجھے ایک طرح سے پبلک سپورٹ حاصل ہو جائے گی۔“

میں نے کہا ”کیوں نہ ہم علاقے کا دورہ کریں۔ لوگوں سے خود ملیں اور انہیں بتائیں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ کل ایک رات ڈاکٹر گائیس کے لیکن شام تک یہاں کے معاملات قائل ہو جائیں تو ہم کل جا سکیں گے۔“

میں نے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اتنی جلدی کیا ہے واپس جانے کی۔ تو کیسی کھر ہے تجھے؟“

”مجھ تو قیوس رہا ہے نیچے پڑا ابھی کچھ اور معاملات پر تجھے

میرے پاس صرف ایک ریوالور تھا جو خود میری حفاظت کے لیے بھی نا کافی تھا۔ آنے والوں کے اصل مقاصد جانے بغیر انہیں لٹکارتا اور ان کے خلاف ایک جارحانہ طرز عمل اختیار کر لینا کوئی عقل مند فیصلہ نہ ہونی چاہتا تھا۔ میں اطمینان سے نیچے اتر اور پڑا ہوا انداز میں چلتا ہوا ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔

وہ تعداد میں پانچ تھے۔ چھٹا میرے سامنے ٹرک ڈرائیور کے کنبین سے کود کے اتر آیا۔ ان سب کی عمریں پچیس سے پینتیس کے درمیان ہوں گی۔ وہ سب ایک جیسے کپڑوں میں تھے۔ سب نے مختلف رنگوں کی شلوار قمیض اور پٹاوری سینڈل پہن رکھے تھے اور اسے کندھوں پر خطرناک قسم کا خود کار اسلحہ لٹکا رکھا تھا۔ ایک نوجوان پست قد اور ہماری بدن فہم سب کے پیچھے خاصی بے تکلفی کے انداز میں کھڑا تھا۔ سب سے آگے دراز قد اور تراشیدہ سیاہ داڑھی والا شخص اپنے انداز کی حاکیت اور چہرے کے درشت تاثرات سے ان سب کی لیڈری کا دعوے دار نظر آتا تھا۔

”کون ہو تم؟“ دراز قد نے چند سینکڑ تک مجھے چمک جھپکایے بغیر گھورنے کے بعد کہا ”یہاں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے قدرے سخت لہجہ اختیار کیا ”یہ سوال کرنے کا حق مجھے ہے کیونکہ جرم تم نے کیا ہے۔“

وہ تھوہکے بولا ”کیا جرم کیا ہے تم نے؟“ میں نے کہا ”تم نے ٹریس پاس کیا ہے۔ ٹریس پاس سمجھتے ہو؟ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی پراپرٹی کی حدود میں داخل ہونا۔“

وہ کچھ پرستخیز انداز میں بولا ”مالک.....!“ اس کے پیچھے کھڑا ہوا پست قد شخص پڑا ”باقی سب مسکرانے لگے۔“

میں نے اپنی متانت برقرار رکھی ”ہاں..... میں ہی اس جاگیر کا اور جو ملی کا مالک اور قانونی وارث ہوں رشتہ احمد!“ دراز قد شہیے میں پڑ گیا ”اگر تم مالک ہو تو..... اکبر خان کون ہے؟“

”وہ..... وہ ہمارے خاندانی ملازم کا بیٹا اور خود بھی میرا ملازم ہے“ جانتے بوجھتے میں نے اکبر خان کے بارے میں ایک مالکانہ اور پر تجھیر رویہ اختیار کیا ”سرحد کو اتر کر رہتا ہے۔“

چند لمحوں کے لیے وہ لا جواب اور پریشان کھڑے رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہے۔ اسی وقت راجا کی کوشش بار آور ہونے سے

جزیرہ خرابا اور مجھے ہوئے سارے بلب بلم پر روشن ہو گئے۔ راجا کمرے سے باہر آیا اور گیت کی طرف سے فرخ نمودار ہوا۔ صورت حالات کو موافق پاتے ہوئے میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ شاید راجا نے میری تقلید میں ایسا کیا اور فرخ نے ہم دونوں کو دیکھ کر۔ یہ کسی پلان کا نتیجہ نہیں تھا لیکن ٹرک سے اترنے والوں نے خود کو تین طرف سے محصور اور گولیوں کی زد میں دیکھا۔ ہم تینوں محض اتفاق سے ایک بہت بڑی مشلت کے تین کونوں کی پوزیشن پر آ گئے تھے۔

میں نے غرا کے کہا ”اب بتاؤ مجھے کہ تم لوگ کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟“

دراز قد نے ناگواری سے کہا ”میرا نام جیو بخش ہے لیکن اس طرح ہم پراسٹیوٹان لینے کا کیا مطلب ہے آخر؟“ میں نے کہا ”سنا ہو کہ میرے گھر میں تم گھسے ہو۔ کیا مجھے اپنی حفاظت نہیں کرنی چاہیے؟ میں تو سوال کے بغیر بھی تمہیں شوٹ کر سکتا تھا۔“

اس نے برا سامنے بنایا ”چلو جی بات بڑھانے کا کیا فائدہ..... ہم واپس چلے جاتے ہیں۔“

اس کے اشارے پر بانی لوگ ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ گئے۔ ٹرک ڈرائیور بھی کہیں میں سوار ہو گیا۔ میں نے کہا ”تم غمزدہ بیرو بخش! ان مشکل مددہ بننے اور اتوار کو جانے دو۔ مجھے بتاؤ کہ اکبر خان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اس ٹرک میں تم کیا لائے تھے؟“

جیو بخش نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا ”میرے تھے مت لو ریش صاحب! تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں۔“

میں نے کہا ”لیکن تم بہت جلد جان لو گے جیو بخش کہ میں کون ہوں۔ میں نے تم سب کے چہرے دیکھ لیے ہیں اور ٹرک کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہے۔“

جیو بخش نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور ٹرک ریورس گیزر میں تھوڑا سا پیچھے کیا۔ باہر جانے والے راستے کو اس جیب نے بلاک کر رکھا تھا جس میں خرم واپس آیا تھا۔ یہ 1952ء کی ملٹری ماڈل اور نوڈیل ڈرائیو ولیز جیب تھی جو نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی پاکستان کی سڑکوں پر آج بھی رواں دواں نظر آتی تھی۔ چنگڑ کے باہر پاکستانی ملکیٹک مددہ ترین آٹو اسٹریٹر کے انجینئرز سے زیادہ ذہین تھے کہ انہوں نے اس میں ڈیزل انجن فٹ کر دیے تھے اور دستیاب نہ ہونے والے ہر پرزے کو خود بنانے کی مہارت بھی حاصل کر لی تھی۔ میرا دکھاؤ ہم جونی کے ساتھ ہے کہ وہیم بائپ فریم

اور آٹھ لائٹس والی جیب اب قوت جوش اور کسی حد تک بدعاشی کی علامت بن گئی تھی۔ اس پر سواری کرنے والے اسے بدست ہاتھی کی طرح پیچنے کے انداز میں شہر کی سڑکوں پر دوڑاتے پھرتے تھے کہے کہ اس میں ہمت جوہم سے طرے۔ فرخ نے جیب کو پیچھے بنایا تو ٹرک واپس ہوا۔ تھوڑا سا دائیں طرف گھوم کے سیدھا ہوا اور پھر سیدھا چل گیا۔ میں بھرا پر گیا تو مجھے ٹرک اسی راستے پر جاتا دکھائی دیا جس پر چل کے آیا تھا لیکن اب اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ شاید ان کے لیے اب راز دار کی غیر ضروری ہو گئی تھی۔

راجا اور فرخ نے پہلی فرصت میں تعارف کے رسمی مرحلے طے کر لیے تھے۔ جب میں واپس اتر کے آیا تو فرخ اپنی جیب کی طرف جا رہا تھا۔ وہ جیب کو ڈرائیور کے سینا برآمدے کی سیڑھیوں تک لے آیا۔ اس میں وہ تمام ماز و سامان لدا ہوا تھا جو میں نے شہر سے منگوا تھا۔ میں نے کہا ”فرخ تم تو موٹر سائیکل پر گئے تھے یہ شاعی سواری کہاں سے بکڑ لائے؟“

وہ بولا ”یہ میرے ایک کزن نے بڑے شوق سے بنوائی تھی۔ ماں باپ کا چہا بڑی بے دردی سے خرچ کیا تھا۔ پیسے والے لوگ تھے اور وہ اگلوٹا تھا۔ پہلے اس کی ہر فرمائش پوری کرتے رہے بعد میں جب وہ بگڑ گیا اور قابو سے باہر ہو گیا تو بہت پریشان ہو گئے۔ بڑی اچھی کاریگری اس کے پاس مگر وہ بھرتا تھا اس جیب میں۔ اس کے ساتھ اسی کے جیسے کچھ بے ہمار ختم اداے ہوتے تھے۔ میرے کزن کا کہنا تو یہ ہے کہ گاڑی کوئی اور چلا رہا تھا لیکن پولیس نے اسی کو پکڑا۔ جیب کے نیچے ٹرک کراس کرنے والا کوئی بوڑھا آ گیا تھا۔ اس کا بچا آئی آئی اس کی میں سمجھتا تھا۔ باقی سب بھاگ گئے اور بعد میں صاف کر گئے کہ ہم تو اس کے ساتھ ہی نہیں تھے۔ میرا کزن جیل میں ہے پولیس نے اس پر دس کیس بنادے تھے۔ شراب پی کے گاڑی چلانے کا لائسنس نہ ہونے کا۔ پہلے بیرونی اور پھر اسلحہ برآمد ہونے کا۔ میرے کزن کا باپ خود اچھا ڈیکل ہے۔ مل ملا کے کوشش بھی کر رہا ہے کہ کیس ختم ہو جائیں لیکن دو چار سال کی سزا لازمی ہے۔ میرے کزن کی ماں نے یہ گاڑی پولیس کی تحویل سے ملے ہی میرے حوالے کر دی تھی کہ اس شخص کو گاڑی کو کچھ دو۔ میں نے اسے ایک ہاتھ والے ڈیلر کے حوالے کر دیا مگر میں اپنے کزن سے ملنے بیٹھ گیا تو اس نے مجھے سختی سے تاکید کی کہ میں گاڑی نہ لیں۔ میں کیا کرتا۔ میں نے ڈیلر کو روک دیا۔ یہ گاڑی وہاں سبکا کھڑی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہاں کام آئے گی۔“

دو شیزہ میں شائع ہونے والا طویل ناول

ایک رات کی بات

سعید غزل

صفحات 528 قیمت 350

● عشق و محبت، نیکی و بدی اور سزا جزا کے فلسفے کے گرد گھومتی داستان۔

● ناکر وہ گناہ سہنے والوں کی دگداز داستان۔

● اُن لمحوں کی کہانی جب ایک رات کی خطا برسوں کے عذاب میں بدل گئی۔

بہترین کاغذ خوبصورت پرنٹنگ اور فوم والی جلد کے ساتھ

ڈاک خرچ 30 روپے

ایک ناول کے لیے

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰ عزیز پورٹ اردو بازار لاہور 7247414

اشاعت

علی بکسٹال چوک میوہ پتال، لاہور نسبت روڈ

لیکن پھر سے ہلانے جلانے سے صرف اتنا ہوا کہ اس نے ایک بار آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور پھر کڑوت بدل کے سوئی۔

اکبر کی بیوی کھانا چھوڑ کے جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔ ”دیکھو۔ کل سے یہ مہمان نوازی کا سلسلہ بند ہو جانا چاہیے۔“

وہ سادگی سے بولی ”کیوں مالک؟ کیا کھانا پسند نہیں آیا؟“

ریشماں نے کہا ”یہ بات نہیں ماں! اب ان کی گھر والی آگئی ہے۔ کل یہ اسی کے ہاتھ کا کھانا کھا میں گئے۔“

میں نے کہا ”میری گھر والی نہیں ہے۔“

”اجھا۔ پھر کون ہے؟“ ریشماں نے شونی سے کہا۔

میں نے کہا ”میری۔۔۔ دوست ہے۔ ولایت سے آئی ہے۔“

ریشماں نے سر ہلایا ”میں سمجھ گئی۔“

ماں نے ریشماں کو شنی سے گھورا تو وہ چپ ہو گئی۔ اس کے تجسس اور اس کی حیرانی اس معاشرتی سوچ کے پس منظر میں ایک فطری ریڈل کا نتیجہ تھے۔ جب اس نے منی خیر انداز میں کہا کہ میں سمجھ گئی تو کچھ کے بغیر اس نے مجھ سے کہہ دیا کہ

ایسی دوستی صرف ولایت کے حوالے سے ممکن ہے ورنہ یہاں کسی بھی غیر شادی شدہ لڑکی کا کسی مرد کے ساتھ دوستی کا دعویٰ ناجائز تعلقات کے زمرے میں آتا ہے۔ اپنی منگیتر کے ساتھ آزادانہ گھومنا پھرنا بے شری سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ کزن

ہوں جو پیدائش کے وقت سے ساتھ رہے ہوں تو یہ دوست یہاں کیسے رہے گی؟ میں نے فوراً بات کا رخ بدل دیا

”دراصل میں چاہتا ہوں کہ کل سے تم یہاں بکن کا انتظام سنبھالو۔ صبح سے رات تک کھانے پینے کا مکمل بندوبست کرو۔“

ضرورت کی ہر چیز منگوالو۔ اگر برتن نہیں ہیں تو وہ بھی۔ اب سونے چاندی کے ظروف میں تو ہم کھائیں سکتے۔ پرانی کراکری ہے تو نکال لو۔“

اس نے سر ہلایا ”جتنی کے برتن بہت ہیں مالک۔“

”اپنی مدد کے لیے تم ریشماں کو ساتھ رکھ سکتی ہو۔ یہ اوپر کا سارا کام کرے گی۔ کھانا لگانا منگانی اور ہر چیز کی دیکھ

بھال۔ جو خرچ ہوگا اس کا حساب کتاب تم کو لوگی ناں؟“

ریشماں نے ہر چیز سمجھ میں کہا ”میں سب کر لوں گی سر!“

”دیری لگا! تم دونوں کو ماہانہ تنخواہ ملے گی۔ ہم یہاں نہیں ہوں گے تب بھی۔ تین ہزار ریشماں کو ماہانہ جہاز نہیں۔“

”اور افضل کون ہے اس کا بھائی؟“

میں نے کہا ”نہیں! میرا خالہ زاد ہے۔ راجہ پر مرتا ہے۔“

فرخ کا چہرہ کچھ پیکا پڑا ”اور وہ۔۔۔ راجہ۔۔۔ کیا وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔“

میں نے کہا ”اس بارے میں یقین ہے کچھ کہنا مشکل ہے کہ وہ افضل کو واقعی چاہتی ہے یا اسے اٹو بیاتی ہے۔“

مالک وہ ایک ریڈی میڈ اٹو ہے۔ مجھے اس رومانٹک انفرم میں کوئی عشقی توازن نہیں لگتا لیکن فرخ صاحب، عشق کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ دل جس پر آجائے وہ میری بیوی ہو یا

پرل۔“

فرخ نے سر ہلایا ”مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔ میرا مطلب ہے ان کے درمیان اتنا فرق ہے۔ وہ لڑکی بہت ذہین خوش لباس اور خوش مزاج ہے۔ اتنی اچھی باتیں کرتی ہے اور۔۔۔“

میں نے راجا کی طرف دیکھا تو راجا بھی مسکرا رہا تھا۔

فرخ ایک دم رک گیا ”وہ کہنے لگی کہ آپ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ افضل کو میں نے کہا کہ یہ کیا کریں گے ہاں جا کے۔ وہ بولی کہ ہاں تو ٹھیک ہے۔ یہاں بھی

یہ کچھ نہیں کرتے لیکن ریشماں بھائی، کسی بھی کام پر لگا دیں۔ گھبراہٹ سے کہہ کر درخت کاٹنے پر۔ کوئے اڑانے پر۔ جن

بہت بھگتے پر۔ حویلی میں بہت ہوت بہت ہوں گے اور افضل ان کی صحبت میں بہت خوش رہتا ہے۔ خود بھی بہت چاہتا ہے۔“

”وہ بہت باتوں لڑکی ہے۔“

”میں نے کہا کہ ریشماں بھائی سے پوچھے بغیر میں کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ آپ خود ان سے بات کر لیں۔“

ایک دو دن میں سیلائٹ فون کنکشن مل جائے گا تو رابطے کا سلسلہ ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب سامان میں

اندر رکھ دوں ”فرخ نے برآمدے میں رکھے ہوئے سامان کو دیکھا۔“

راجا نے کہا ”نیچے پتھر! میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ تیرا مال تیری کزن پر مرنے والا ہے۔ یہ لوائٹ فرسٹ سائٹ کا کیس لگتا ہے۔“

میں نے کہا ”سیریس کیس!“

ابھی تک ہم باہری کھڑے ہوئے تھے۔ دور سے میں نے اکبر خان کی بیوی کے ساتھ ریشماں کو آتا دیکھا۔ وہ

تیسرے لیے رات کا کھانا لے کر آ رہی تھیں۔ رات کے نو بجے والے تھے۔ میں نے اب فریال کو جگانے کا فیصلہ کیا

پوچھنے لگا کہ کیوں بیجا ہے۔ وہ خود کیوں نہیں آئے۔ تم کون ہو؟ میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھیں۔ کچھ بتاؤ کوئی ایسی

دیکھی بات تو نہیں ہے۔ تم ان کے ذہن تو نہیں ہوتا؟ ایک دو سوالوں کے جواب تو میں نے دیے۔ پھر مجھے غصہ آئے گا

کہ یہ کیا جرح کر رہا ہے۔ جب اس نے دوبارہ وہی سوال دہرانے کا سلسلہ شروع کیا تو میں گرم ہو گیا کہ آخر تم ہو کون؟

خدا کی فوج دار کہ تھانے دار اور یہ ریشماں بھائی کا کھر ہے یا میں غلطی سے تھانے آ گیا ہوں۔ اس کے بعد اندر سے ایک لڑکی

نے دروازے سے جھانک کر باہر آگئی۔ مجھ تو بہت تیز لیکن بڑے قاعدے قریب سے مجھے اندر لے گئی۔ آپ کے

بارے میں پوچھتی رہی کہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں جو بھی کر رہے ہیں۔“

مجھے ہلکی آئی ”پہلے تم افضل سے ملے۔ پھر راجہ سے۔ یہ بتاؤ اب باقی بھی ملے یا نہیں۔“

”ہاں راجہ نے اندر جا کے بتایا تو آپ کے ابا اور اماں دونوں آگئے تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ آپ کے بارے

میں پوچھتے رہے۔ میں نے کہا کہ خیریت سے ہیں اور وہاں کے معاملات سنبھال رہے ہیں اس لیے فی الحال آؤ نہیں

سکتے۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں دل جمعی سے اپنا کام کرے آنا چاہنا تو لگا رہے گا۔“

”یہ سب کچھ وہ مجھ سے بھی معلوم کر چکے تھے“ راجا بولا۔

”ہاں، بعد میں انہوں نے کہا کہ راجا آیا تھا۔ وہ بھی یہی بتا رہا تھا کہ رفیق کے کچھ پروگرام ہیں لیکن پہلے اس جگہ کا

انتظام اپنے ہاتھ میں لیتا اور صورت حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔ مجھ سے ہی انہوں نے کہا کہ آدمی حدی سے کوئی دالی

دارت نہیں تھا۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ کوئی قبضہ گروپ جگہ کا مالک نہیں بنا ورنہ دیوانی عدالتوں میں دھکے کھاتے عمر

گزر جاتی اور ہم میں سکت کہاں بھی اتنی کہ تھانہ بھری کر سکتے۔ لاکھوں کا خرچ کرتے دیکھوں پر اور لاکھوں رشوت

میں دیتے۔“

میں نے کہا ”وہ خوش اور مطمئن تھے ناں۔“

”ہاں، بہت خوش تھے کہ تمہارے دماغ پر ولایت کا آسپ سوار نہیں رہا اور تم اپنی صلاحیت کو یہاں خوش حالی کے

ترقیاتی منصوبوں پر استعمال کرنے میں سیریس ہو گئے ہو۔ تم نے جو سامان منگوایا تھا وہ انہوں نے راجا کو دے دیا۔ جب

میں واپس آ رہا تھا تو وہ لڑکی پھر آگئی ”راجہ!“

میں نے کہا ”وہ میری کزن ہے چچا زاد!“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔ اس علاقے میں پھرنے کے لیے اس سے جائز اسواری کیا ہو سکتی ہے؟“

”اور جو آپ نے کہا تھا وہ سب لے آیا لیکن یہاں تو پہلے ہی بجلی آچکی ہے۔“

میں نے کہا ”کوئی بات نہیں۔ تم دو کلو دات کا بڑا اجزیئر لائے ہو تو یہ استعمال ہوگا۔ چھوٹا جو چل رہا ہے اسٹینڈ بائی

رہے گا۔ سیلائٹ فون ہم سب کے پاس ہوں گے تو اچھی بات ہے۔ ایک فریال بھی لائی ہے۔“

”اس کی لائن کل تک چالو ہو جائے گی۔ یہ ذرا مہنگا ملا ہے لیکن اس کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ بیٹری کے علاوہ یہ

سولائز می فون بھی چل جاتا ہے۔ دھوپ میں بیٹری کے بغیر بھی کام کر سکتا ہے۔ میں دو ہزار میٹر بجلی کا تار لے آیا ہوں۔

سات چو اسیس کچ کا۔“

”دیری لگا! کل ہم ڈائریکٹ پول سے کنکشن لیں گے تو جزیئر کی ضرورت ہی نہیں رہے گی“ میں نے کہا ”یہاں کیس

نہیں ہے۔ بکن کے لیے ہر چیز بجلی سے چلنے والی لائی جا سکتی ہے۔“

فرخ نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ جاری رکھی ”میں نے ایک کنسرکشن کمپنی سے بات کر لی ہے۔ ان کے بندے

کل آئیں گے۔ وہ ہر کام کر سکتے ہیں۔ ایکٹرک فننگ اور پلمبرنگ سے لے کر کنسرکشن اور رنگ روغن سے ڈیکوریشن

تک۔“

میں نے کہا ”تم تو بڑے کام کے آدمی ہو بر خوردار! لیکن یہ بتاؤ کہ تم یہاں خیر لے کر آئے تھے اب یہ ریو الوور

کہاں سے لے آئے اصلی ہے یا نقلی؟“

وہ ہنسنے لگا ”بڑی پہچان ہے آپ کو۔ یہ واقعی نقلی ہے لیکن کام تو کر گیا۔“

راجا نے اس کے کندھے پر ہتھکی دی ”ابھی کام چلاؤ۔ بہت جلد تمہیں اصل ریو الوور پھر کھائیں گے اور پھر توپ بھی

دلا دیں گے۔“

وہ بولا ”مگر اسے چلانے کا کون؟“

میں نے کہا ”میرے گھر گئے تھے تم؟“

”کیا تھا۔ سارے کام ختم کرنے کے بعد۔“ فرخ نے کہا۔

”کس سے ملاقات ہوئی؟“

”پہلے تو کوئی میری ہی عمر کا بیک آدمی لگا تھا۔ وہ کچھ عجیب سا تھا۔ گھبرا ہوا۔۔۔ غیر حاضر۔ مجھے بڑی شگ کی نظر

سے گھورتا رہا۔ میں نے بتایا کہ مجھے ریشماں بھائی نے بھیجا ہے تو

نے غلطی سے میرا چشمہ لگا لیا تھا اور میں نے تیل کا۔
 ”آئی ایم سوری!“ تیل نے سرگھما کے کہا مگر یہ درخت
 بھی توجہ میں آگیا خواہ مخواہ۔

تیل کی بات پر میں دم بخور ہو گیا۔ جب فکر ہوئی تو میں
 اوپر سے یوں نیچے ٹپک گیا تھا جیسے آدھی سے بکا ہوا آم گرم
 ہے۔ میں نے کہا ”تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیا کر رہے
 ہو؟ تمہیں پتا نہیں کہ ہر ایرے غیرے کو ڈیم پر آنے کی
 اجازت نہیں۔ یہ سیکورٹی رسک ہے۔“

بزرگوار نے شائیں شائیں چاک لہرایا ”گستاخ!
 نامعلوم! ہمیں ایرا غیرا کہتا ہے۔ ہم سے سوال کرتا ہے کہ ہم
 کون ہیں؟“

بڑی بی نے پوپلا منہ چلا کے کہا ”اجی کیوں ہنٹر
 چلا رہے ہو بے چارے بچے پر! یہ تمہارا غلام نہیں پوتے کے
 پوتے کا پوتا ہے۔“

میں نے کہا ”کیا آپ مسر عزت بیگ ہیں؟ میرے
 دادا نمبروں؟“

بڑی بی نے خوشی سے تالی بجائی ”اوہ میس! اور میں ہوں
 دادی نمبروں مسر عزت بیگ۔“

میں نے مسرت سے کہا ”آئی کی۔ کیا یہ دی گاڑی ہے
 جس کو دوڑا کے یہ ساری زمین گھیری گئی تھی؟“

”آف کوس! اور یہ کارنامہ میں نے سرانجام دیا تھا۔“
 تیل غرور سے بولا۔

میں نے کہا ”گر تم کچھ تیز دوڑتے تو دہائی زمین مل
 جاتی۔“

دادا نمبروں نے میری بات کاٹ دی ”خیز خاک
 دوڑتا آدھے پاس پاور کا تیل تھا اور تمہارے دادا نے کبھی
 ٹینک بھی نہیں کرائی۔ پیٹرول مہنگا تھا، سی این جی پر
 چلا رہے تھے۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا ”خیز کوئی بات نہیں۔ مجھے
 اپنے خاندان کے آدم دوا کے بھوت سے مل کر خوشی ہوئی۔
 ہاؤڈو پوڈو۔“

دادا نمبروں نے بھر چاک لہرایا ”بدقیمنز بے ہودہ! تم
 نے سازدج! یہ ہمیں خبیث کہہ رہا ہے۔ فرنگیوں کی زبان بول
 رہا ہے۔“

”اجی کیوں مجھ کو الزام لگاتے ہو اس بے چارے پر۔
 دیے تو تمہارے ابا بھی تمہیں خبیث کہتے تھے“ دادی نمبروں
 نے میری حمایت کی ”مگر اس نے نہیں کہا۔“

دادا نمبروں نے غلطی سے کہا ”کیوں..... کیا ابھی اس

جی دس منٹ بعد نیلے خواب میں میری کسی سے اپنا ٹکٹ
 ہے۔ وہ میں مس نہیں کر سکتا۔ میں فوراً سو رہا ہوں۔“ وہ
 زائے لینے لگا۔

میں نے اسے ایک لات رسید کی۔ ”ایسی آوازیں تو
 ٹوڑے میں سے اس وقت برآمد ہوتی ہیں جب اسے باکی
 پنے کی دال کھادی جائے بہت زیادہ۔“

راجا نے پلٹے بغیر کہا ”اور گدھا یوں لاتیں اس وقت
 چلاتا ہے جب اس کے عقبی حصے کی پرائیوٹ کو ڈسٹرب کیا
 جائے۔“

کچھ دیر بعد میں بھی سو گیا۔ جسنا دانی ٹھکن کے ساتھ دینی
 نور پر عدم تحفظ کے احساس اور پریشان خیالی کا شکار میں بھی
 فاپتہ خواب میں نے بھی دیکھا مگر وہ نہایت اوٹ چٹانک
 فاد میں تے تریلا ڈیم کی قبر کے دوران میں جمیل کے ذخیرہ
 آب میں ٹیکڑوں بستیوں کے غرق ہونے کا منظر دیکھا تھا۔
 ان بستیوں کے کینوں کو دہاں سے نکال لیا گیا تھا لیکن کچھ
 ایسے جذباتی دیوانے بھی تھے جو اپنے آباؤ اجداد کی نشانوں
 اور اسے پیادوں کی قبروں کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے اور
 ناب تھے۔

خواب میں بھی میں نے کچھ ایسا ہی سین دیکھا کہ میں
 ایسے کھار کی ڈیم سائٹ پر زرخیز ٹھیل عظیم منسوبے پر فخر سے
 پہلے کے کھار ہوں کہ ایک طرف سے گڑگڑاہٹ سانی دیتی
 ہے۔ یوں جیسے کوئی پھرتی زمین پر چاروں ہوا نکلے ہوئے
 اڑوں والی جب کو دوڑا رہا ہو پھر ایک تیل گاڑی نمودار ہوئی
 ہے جس کو سائٹ کلا زخمی دھنٹ لگی سفید لہرائی واڈمی والے
 ڈرگوار ڈرائیو کر رہے ہیں۔ سواری اور سوار دونوں کو آڈٹ
 فکسٹرول دیکھ کر میں ہند کی طرح اپنی چٹانک لگا ہوں
 دایک درخت پر جا بیٹھا ہوں۔ آج کل کی ایکشن فلموں کا
 ٹوپی ایسا کر سکتا ہے۔

بزرگوار نے سر پر ایک تھان کا عمامہ لپیٹ رکھا ہے اور
 اٹکا عظیم کے شاہانہ لباس میں برتوی راج کی طرح دہاڑ
 میں ”ابا ادب! بلا ملحد ہوشیار! پھر ایک دھماکا ہوتا ہے
 تیل گاڑی درخت سے ٹکرائے رک جاتی ہے۔ پیچھے سے
 تیز غارے کی طرح بلند ہوتی ہے اور پھر پھر اشوت کی
 سائٹ ہے۔ یہ ایک ٹھیل کا ک برقع ہے جس کو بٹاکے
 برتوی کی چلائے گئی ہے“ ارے تیرا استناں سو بڑھے۔
 پھر تیل کے بریک ٹیل ہو گئے یا کچھ جھکی آگئی! اب کیا
 لارگوار منتانے گا؟ کچھ نہیں بیگم! وہ دراصل..... تیل

راجا نے کہا ”توان کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے؟
 خدا کا شکر ادا کر کہ وہ آسانی سے مل گئے۔“

”لیکن مجھے معلوم ہوتا چاہیے کہ حویلی کو کون کون کس
 کس غیر قانونی دھندے کے لیے استعمال کر رہا ہے؟“

”سب پتا چل جائے گا وقت آنے پر۔ ایک ساتھ سب
 سے پنگا مت لے نیچے پتر۔ اپنے کام سے کام رکھ۔ اب
 صرف مجھے ہی نہیں شہباز کو بھی تیرے ترقیاتی منصوبے سے
 بڑی دلچسپی ہو رہی ہے۔“

”راجا! کیا واقعی تو سمجھتا ہے کہ اس علاقے میں کچھ
 ہو سکتا ہے۔ جس سے ہمیں بھی فائدہ ہو۔ ملک کو بھی اور یہاں
 کے رہنے والوں کو بھی؟“

”مجھے تیرے عزائم میں شیخ جلی کے خواب والی کوئی
 بات محسوس نہیں ہوتی۔ کام مشکل سہی! لیکن بے شاندار
 یہاں ایک فیکٹری ہو جس میں سب کو روزگار مل جائے۔ ہم
 فرنیچر ایکسپورٹ کریں۔ ڈیزائن اور کوالٹی ایسی ہو کہ ہمیں
 زرمبادلہ کی صورت میں منہ مانگی قیمت مل جائے۔ ہمارے
 کارکن خوش حال ہوں۔ ایک ماڈل رہائشی کالونی ہو جس میں
 اسکول! اسپتال اور زندگی کی ساری سہولیات موجود ہوں۔ ہم
 پولٹری فارم قائم کریں ڈیری فارم تک کریں۔ دودھ اور اس
 کی مصنوعات کی مارکیٹ پکڑیں۔ اس کے بعد سب سے
 گریٹ اینڈ با ہے ڈیم کا۔ یہ سب ناممکن نہیں ہے کیونکہ جہاں
 شہباز بھی کبھی ہے اور مظلوم ہے میری اس سے بات ہوئی تو
 اس نے کیا کہا؟ وہ کہنے لگی کہ میں بھی آ جاؤں گی وہاں۔ میں
 اسپتال چلاؤں گی۔“ وہ خوشی سے ہنسا۔

میں نے کہا ”تمہارا۔ خواب دیکھنا اور پھر تیرے
 جنون میں مبتلا ہونا انسان کی مجبوری ہے لیکن ہر شخص اپنی امت
 کے مطابق خواب دیکھتا ہے۔ جنون نے وصل ملی کے خواب
 کی تعبیر کے لیے جھٹکے عمر گودادی! سکندر اعظم نے دنیا کی فخر
 کا خواب دیکھا تو آج کے سائنس دان نے دنیا سے بھی
 آگے تخمینہ کا کائنات کی۔ ایسے ہی میں ایک خواب دیکھ رہا
 ہوں۔“

”ایک عظیم منظر کا قول ہے کہ آج کی ہر حقیقت کل ایک
 خواب تھی۔ اور تو کتنا خوش قسمت ہے کیونکہ ہر کچھ عظیم منظر
 بقلم خود تیرے سامنے موجود ہے“ راجا نے کہا۔
 میں نے اپنی بات جاری رکھی ”مجھے یوں لگتا ہے جیسے
 قدرت کا دست خبیث میرے خواب کی تعبیر کے اسباب فراہم
 کر رہا ہے۔“

راجا کر دھٹ لے کر بولا ”تو بول رہا یار۔ بارہ چالیس
 ٹھیک ہے؟“

ریشماں کا منہ حیرت اور خوشی کی انتہا سے کھلا رہ گیا تھا۔
 اس کی ماں بھی پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی ”تمیں
 ہزار!“

میں نے کہا ”کیا تم خواہم ہے۔ اچھا ریشماں تمہارے
 بھی پانچ ہزار لیکن تمہیں ماں کا ہاتھ پوری طرح جانا ہوگا۔
 کھانا تو تم خاک پکاؤ گی۔ یہ کام ماں کو کرنے دو لیکن باقی
 سب تمہاری ذمہ داری۔“

ریشماں نے بڑی مشکل سے کہا ”آپ..... مجھے پانچ
 ہزار دیں گے؟ ہر مہینے۔“

اس کی ماں نے اپنی آنکھوں میں آنے والے
 آنسوؤں کو دپنے سے صاف کیا اور پھر گھر کو گریہ لہجے میں
 دعائیں دینے لگی۔ ”اللہ آپ کو بہت دے مالک۔ آپ کی
 نوکری بھی ہماری عزت ہے۔ ہم غریبوں کے پاس دینے کے
 لیے صرف دعائیں ہیں۔“

ریشماں نے پھر کہا ”سچ مالک۔ آپ پانچ ہزار دیں
 گے۔ یہ تو بہت ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ میں لے
 کر نہیں دیکھے۔“

میں نے کہا ”اکبر خان کہاں ہے؟“

ریشماں کی ماں نے ایک آہ بھری ”مجھے کچھ پتا نہیں
 مالک۔ شاید ہوگا اسی کے ساتھ۔ یہاں وہ بہت کم آتا ہے۔“
 میں نے کہا ”لیکن وہ تو یہاں چوکیدار کی کرتا ہے۔ اس
 نے مجھے بتایا تھا کہ چندہ سو روپے ملتے ہیں۔“

”ملنے ہوں گے جی!“

”کیوں نہ چھوہیں کچھ نہیں دیتا؟“ میں نے کہا۔

وہ اور اداس ہو گئی ”دیتا تو ہمارا یہ حال کیوں ہوتا؟“
 میں نے کہا ”ابھی ایک ٹرک میں کچھ لوگ یہاں آئے
 تھے وہ اکبر خان کو پوچھ رہے تھے کہ تیرا نہیں جانتی ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”یہ لوگ بھی میں نے دو مہینے میں
 آتے ہیں۔ حویلی میں ٹھہرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کون لوگ
 ہیں۔ اکبر خان کہتا ہے میرے دوست ہیں۔“
 میرے سوالات سے وہ کچھ پریشان ہونے لگی تھی۔ میں
 نے اسے جانے کی اجازت دی۔ فخر بہت تھا کہ ہوا تھا۔ وہ
 کھانا کھاتے ہی لٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔ میں راجا کے
 ساتھ باہر نکل آیا اور ہم وسیع اجڑے ہوئے چمن کے وسط
 میں فوارے کی ٹوٹی منڈ پر بیٹھ گئے۔
 میں نے کہا ”راجا! اجیر بخش اینڈ کمپنی کے بارے میں تیرا
 کیا خیال ہے۔ ان کا مہندہ کیا ہوگا؟ فنیٹ یا اسٹو فرم؟“

نے ہمیں بھوت قرار نہیں دیا۔ بھوت ہوتی ہیں خبیث ارواح۔ جو بھٹکتی پھرتی ہیں۔“

میں نے کہا ”آئی ایم سوری۔ میرا مقصد ہرگز آپ کی دلا زاری نہیں تھا۔“

عزت بیک نے کہا ”دراصل ہم آئے تھے کالا باغ۔ سوری کہنا روڈیم کے خلاف مظاہرہ کرنے۔“ میں نے حکمرانوں کے لہجے میں کہا ”لیکن اس روڈیم کی تعمیر سے خوشحالی آئے گی۔“

خاتون نے اچانک برقعے کے اندر سے ایک بیڑ نکالا اور اپنے مجازی خدا کو گھنٹا دیا۔ اسے وہ میرے سامنے پھیلا کے کھڑے ہو گئے اور کے لہرا کے نعرے لگانے لگے ”کہنا روڈیم نامشور کہنا روڈیم ہائے ہائے کہنا روڈیم مردہ باد۔“

بیڑ پر لکھا ہوا تھا۔ ”سابق مالکان ست بدحالی کی انجمن ارواح ہم آئی ابدی آرام گاہوں کو تباہ کرنے کی سازش کی پُر زور مذمت کرتے ہیں۔“

میں نے انھوں سے سر ہلایا ”بزرگو! ضرور آپ کو مرحوم نصر اللہ خاں نے بریف کیا ہوگا۔ بھلا مرحوم کو روڈیم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔“

میرے دادا ان چیف نے پھر کوڑا لہرایا ”کیا تم چاہتے ہو کہ صدارت اہل چھوٹا جائے تو ہم سوئٹنگ کرتے ہوئے میدان شریک جائیں؟“

دادی ان چیف ناک براہنگی رکھ کے بولیں ”ہائے ہائے“ میں تو شرم سے پھر زمین میں گڑ جاؤں گی اگر مجھے ان بے حیا فرنگی میمن کی طرح جانا پڑا جو کبیری اور بانی کے ساحلوں پر تیرتی پھرتی ہیں۔“

یہ خواب ختم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں بارش میں کسی پرتالے کے نیچے کھڑا ہوں۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی لمبی سائز کا روڈی اچنی بڑی بڑی سو پھوں سیت میری ناک میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے بعد میرا قلق زرد ہو گیا جیسے غلطی سے میں نے چینی کے بجائے تمک چاکیا یا ہو۔

لیکن یہ سب خواب کی کیفیت نہیں تھی۔ جب میں ہڑ بڑاکے اٹھا تو مجھے فریال نظر آئی جو میرے قریب بیٹھی نہیں رہی تھی۔ مجھے چگانے کے لیے اس نے میری ناک میں دھاگے کی جی کھائی تھی۔ مجھ پرانی چمڑکا تھا اور کھانے کے برتنوں میں سے تمک دانی اٹھا کے میرے کھلے منہ میں تمک ڈال دیا تھا۔

اس نے اٹھ کے بھاگنا چاہا مگر میں نے اسے یوں دبوچا

نہیں۔“

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لیکن مجھے پھر بھی ڈر لگ رہا ہے روٹی! مجھ پر ابھی تک دہشت سوار ہے۔“

میں نے کہا ”اس کے فرشتے بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے۔“ ”نہیں روٹی! وہ شیطان ہے۔ اس کا تو کوئی نہیں۔ وہ پوچھ سکتا ہے۔“ فریال کا جسم آہستہ سے کانپا۔

میں نے تمک کر اس کے رخساروں کو چوما۔ ”پر سکون رہاؤ۔ اگر وہ یہاں نظر بھی آیا تو کوئی سوال کیے بغیر میں سے کوئی بارودیں گا۔ قیامت تک اس کا سرخ بھی نہیں ملے گا۔ وہ جس جگہ سے نہیں جھپٹ سکتا۔“

”مجھے ابھی تک اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آیا تو دیکھو کہ تم کے چنگل سے نکل کے میں تمہارے پاس پہنچ گئی ہوں۔“ ”نہیں یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں ایک انتہائی دہشت ناک رہے سے گزری ہوں۔“

میں نے کہا ”اس کا اندازہ مجھے ہو رہا ہے لیکن اس سے بڑھ کر میں تمہاری ایندوگر اسٹوری سنوں۔“ مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے لیے کیا لاؤں؟“

”دوسرے کرائی تو آسمان سے تارے توڑ لاتے ہیں۔“

میں نے کہا ”مگر ان سے پیٹ بھر سکتا ہے تو میں ابھی انہوں کی اگلی ہی خلائی پرواز سے ادھا کھوتا رہے لے آتا ہوں۔“

”روٹی! مجھے تو قیامت ہو کر لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا ”جب سے تم آئی ہو تم نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ پورے سولہ گھنٹے سے روٹی ہو۔“

”میں نے کھا تھا ناں۔ میں بہت تمک مٹی تھی۔ پتا تھا یہاں تک میں کیسے زندہ سلامت پہنچ گئی۔ اتنا کھا نہیں نے کیسے برداشت کر لیا۔ میرے جسم میں توانائی کا مافوق نہیں رہا تھا۔ کاربورٹر خشک ہو جائے تو انجن بند ہوتا ہے مگر گاڑی کچھ دیر رواں رہتی ہے۔ اسے ہی MOMENTUM میں کیا تمہاری کشش مٹی مجھے کھینچ لے گی۔ یہ بتاؤ کھانے کے لیے کیا لے گا اس وقت؟“

میں نے کہا ”وہ تو تمہارے حصے کا بچا ہوا کھانا بھی ہے۔“

”کھانے سے آتا ہے کھانا؟“

میں نے کہا ”ابھی تک یہی لوگ دن رات خدمت کرتے ہیں۔ جو خود کو میرا خاندانی ملازم اور مجھے مالک کہتے

ہیں تو مجھے بوجھ لگتا ہے۔ ناشتا کھانا چائے کانی سب مل رہا ہے۔“

”مگر یہ بات ہے تو پھر میرے لیے کانی منگواؤ۔ مجھے لگتا ہے کانی نہ ملی تو میں مری جاؤں گی۔“

”تمک ہے مری جاؤ۔ میں آدھی رات کو انہیں جگے کے حکم نہیں دے سکتا کہ میری مجبورے دینا دے لیے کانی حاضر کرو۔“

”وہ فہمی“ کیوں نہیں کہہ سکتے۔ ان سے کہو کہ مالک کی خواہش پوری نہ کی گئی تو توفانی کرنے والوں کے درے مار مار کے کھال کھینچ لی جائے گی۔ ایسے رعب اور جلال سے کہو کہ وہ قہر قہر کانپنے لگیں اور سر تسلیم خم کر کے کہیں کہ جو حکم عالی جاہ۔“

میں نے ہنس کے کہا ”میں نے کبھی کسی اسٹیج ڈرامے میں بھی ایسے ڈانگ نہیں بولے۔ حالانکہ ڈرامے بہت کیے تھے۔“

”دیکھو! آخر تم نواب ابن نواب ہو۔ ایک دم جینٹل! اور یہ بالکل ریشل لائف کا رول ہوگا جو تم کر دو گے۔ اچھا میرے بارے میں کیا پریس ریلیزی دی ہے تم نے؟ بھوت بولا ہے یا کچھ؟“

”میں نے سوچے کچھ بغیر کہہ دیا کہ تم میری دوست ہو۔ دلائل سے آئی ہو۔ لوگوں نے بے غمزی اور دھمائی کے اس مظاہرے پر دانتوں تلے انگلیاں دبائیں۔ تو یہ تو بہ کرنے لگے کہ دیکھو! یہ ہوتا ہے دلائل میں رہ کے۔ نہ رشتہ نہ تانہ آگئی ساتھ رہنے۔ کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار ڈاکٹر شہناز کے بارے میں بھی کیا گیا تھا جب وہ راجا کے ساتھ آئی تھی۔“

فریال ہنسی ”یار! کیا حراج ہے اگر صبح ہوتے ہی ہم نکاح پڑھو لیں سب کے سامنے! کیونکہ یہ تو اب ملے کے کہ میں رخصت ہو کے تمہارے پاس آگئی ہوں ہمیشہ کے لیے۔ بیڑ تو کیا اب مجھے قبر میں بھی تمہارے ساتھ ہی سونا ہے۔“

میں نے کہا ”کچھ خدا کا خوف کر دفریال! ایہ انگلستان نہیں پاکستان ہے۔ یہ سب یہاں نہیں چلے گا۔ جس قسم کے کپڑے پہن کر گئے ہیں تم نے۔ اور جو بے غمزی کا مظاہرہ تم نے سب کے سامنے کیا تھا یہاں آتے ہی۔“

اس نے میری ناک پکڑی ”میں سب کو جوتی کی لوک پر رکھتی ہوں نیچے ہڑ! اس وقت اگر کوئی دیکھ لے کہ ہم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر۔“

میں نے کہا ”لاحول ولا قوۃ۔ میں نے تم سے کھانے کا پوچھا تھا۔“

سودا کیا تھا۔ سلطان نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کام کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ وہ تو شاید اسے روایتی انداز میں کھڑکی چار دیواری میں محصور کر دے گا۔ جھگڑا بڑھا تو نازنین نے صاف کہہ دیا کہ اب وہ شادی کے لیے تیار نہیں اور اس وقت سلطان نے وہی تور اختیار کئے جو اس کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں کہ منگی تو زنا کوئی مذاق نہیں۔ اس کی عزت کا سوال ہے جس کی خاطر وہ جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے۔ پھر سلطان نے بیوی کو قتل کر دیا اور فرار پر مجبور ہوا۔ دس دن اس نے نازنین کے ساتھ اسی کوٹھی میں گزارے۔ میں نے حیرانی سے کہا ”وہ کیسے؟ کسی کو معلوم نہیں ہوا؟“

”نہیں، کوٹھی مقفل رہی۔ باہر صرف ایک مسلح محافظ رہتا تھا۔ ٹیلی فون لائن کاٹ دی گئی تھی۔ کھڑکی دروازے سب بند تھے اور باہر سے دیکھنے والے کو اندر اندر میری نظر آتا تھا۔ دس دن تک پولیس اس کی تلاش میں ہر جگہ چھاپے مارتی رہی۔“

”مگر پولیس وہاں نہیں گئی جہاں وہ موجود تھی؟“

”ہاں، علاقے کے ایس ایچ او نے چھاپا مارنے سے پہلے خود سلطان سے ملاقات کی اور یہ رپورٹ دی کہ کوٹھی عرصہ دراز سے غیر آباد ہے۔ ایک چوکیدار کے سوا کوئی وہاں نہیں رہتا۔ ظاہر ہے اسے سلطان کو تحفظ دینے کی اچھی قیمت ملی ہوگی۔ دس دن تک سلطان نے رات دن داد میس دی۔ وہ کیا کہتے ہیں جن عید تو رات شب برات۔ یوم وصل اور شب وصل میں کوئی فرق نہ رہا۔“

میں نے کہا ”باتیں بھی خوبصورت کرنے لگی ہوئیں۔ یہ بتاؤ نازنین نے احتجاج نہیں کیا؟“

فریال ہنس پڑی ”ایک کمزور اور بے بس عورت کا احتجاج کیا۔ اور پھر وہ کون سی شریف زادی تھی کہ عزت لٹ جانے کا سوگ منائی۔ اس نے مقابلے کی پالیسی ترک کر کے زنا نہ ڈیلوہی کا راستہ اختیار کیا۔ طاقت سے مقابلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے حسن و شباب اور ناز و انداز کا اسلحہ استعمال کیا۔ سلطان کی عقل اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی۔ اسے بے خود اور دہونڈے بنا کر ایک دن ناک آؤٹ کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ سلطان کو قتل کر دیتی لیکن ایک تو مناسب آلہ عمل نہ ملا۔ مگر میں سوچنے لگی کہ چھری کے کچھ نہ تھا اور وہ ڈرتی تھی کہ چھری سے وہ کچھ نہ کر پائے گی۔ انا سلطان اسے گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس نے سوتے میں سلطان کے سر پر پتیلی لپٹ مار دیا اور پھر اسے چادر بچاڑ کے

باندھ دیا۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا غنوس دیا۔ پھر اس نے اندر سے کھڑکی کھول کے شور مچایا کہ گاڑ..... دیکھو تمہارے صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟ انیس دل کا دورہ پڑا ہے۔ گاڑ بھاگ ہوا اندر آیا تو نازنین نے اس کے سر پر بھی انگلیں کا بھاری لپ مارا اور اس کا سر بچاڑ دیا۔ نازنین کا خیال تھا کہ سیکورٹی گاڑ مر گیا ہوگا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت تک نازنین کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے اور اس کے بھائی نے سلطان کے خلاف ایف آئی آر کو ادا دی ہے۔ اس نے واپس امریکا جانے کی مدت بھی بڑھوائی ہے اور امریکی سفارت خانے کو مطلع کر دیا ہے کہ اسے سیکورٹی چاہیے چنانچہ اپنے شہری کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے سفارت خانہ بھی وزارت داخلہ کو لکھ چکا ہے۔ نازنین نے سب نقد سمیٹا جو سلطان نے روپوشی کی زندگی کے لیے جمع کر لیا تھا۔ اپنا پورا اٹھایا اور فرار ہو گئی۔ فائدہ اسے یہ ہوا کہ پولیس رپورٹ اس کے حق میں تھی۔ علاقے کا تھانہ انچارج کہہ چکا تھا کہ کوٹھی برسوں سے غیر آباد ہے۔ چوکیدار کو کچھ دیر بعد ہوش آیا تو اس نے ہمت سے کام لے کر سلطان کو آزاد کیا جو پہلے ہوش میں آچکا تھا مگر نازنین نے اس کے ہاتھوں پیردوں کو یوں باندھا تھا کہ وہ حرکت کر سکتا تھا اور نہ ہی طلق سے کوئی آواز نکال سکتا تھا۔ اس بارے میں نازنین کو بعد میں دیگر ذرائع سے علم ہوا۔ سلطان نے چوکیدار کو اسپتال پہنچایا اور خود روپوش ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسپتال تکچے کے چوکیدار مر گیا۔“

میں نے کہا ”اگر وہ نہ مرتا تو ضرور حیرت کی بات ہوتی۔ اسے مار دیا گیا کیونکہ وہ تعیش میں بہت سے خاتون پر سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔ سلطان اسے زندہ رہنے کی اجازت دے سکتا تھا اور نہ پولیس ہی خطرہ مول لے سکتی تھی۔“

”نازنین کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ وہ ایک بہت وضع دار اور شریف انٹنس پروڈیوسر کے گھر میں چھپی رہی۔ جب وہ اغریا سے آئی تھی تو ایک ایئر وائزرنگ انجینی کے لیے سب سے پہلا اشتہار اسی پروڈیوسر کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے خاموشی سے نازنین کو دینی پہنچایا جہاں اس نے ایک اور سہارا تلاش کیا اور سیٹ ہونے لگی تھی کہ سلطان کے کارندے اسے تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ پاکستان کے اخبارات سے نازنین کو معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان انجینی تک گرفتار نہیں ہوا ہے لیکن اس کی سیکورٹی پر مامور گاڑ اسپتال جا کر مر گیا تھا اور مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیان میں نازنین کو قاتل نامزد کر دیا تھا۔ یہ جھوٹ تھا لیکن سچ بتا دیا گیا تھا۔ اس بیان کی

قانونی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے جو مقتول اپنی موت سے پہلے دیتا ہے۔“

نازنین اگر خود کو قانون کے حوالے کر دے اور عدالت میں پیش ہو جائے..... میں نے کہا۔

”تم کہیں یہ مقولیت کی باتیں کر رہے ہو کیے! نازنین جیسے عورت کے ساتھ پولیس کے ادنیٰ سے اعلیٰ افسر تک تعیش کے نام پر کیا سلوک کریں گے۔ کیا چھ سال ملک سے باہر رہ کے تم بھول گئے ہو کہ قتالوں میں کیا ہوتا ہے؟ عورت بے چاری تو انتہائی کمزور ہوجاتی ہے۔ مجرم ہونے کی وجہ سے نہیں عورت ہونے کی وجہ سے۔ مرد کو تنگ کیا جائے۔ انا تنگ کیا جائے اور اس کے سامنے فحش کلامی سے فحاشی تک کچھ بھی کیا جائے وہ سہہ لیتا ہے۔ عورت پر تو تشدد کا آغاز ہی عزت لوٹنے سے ہوتا ہے۔ وہ بھی تمہانے کے ماحول..... تو بے سیری تو روح کا بچ جاتی ہے اس تصور سے ہی۔ خیر..... بات بھی نازنین کی۔ اس کی پوزیشن مزید خراب یوں ہے کہ وہ اغریا سے پاکستان آئی۔ یہاں کسی قانونی اجازت کے بغیر ماڈلنگ کرنی رہی اور شو بڑا حصہ بن گئی۔ اعلیٰ سطح کے تعلقات کی بنا پر اس کے دینا کی مدت میں خود بخود توسیع ہوتی گئی اور ایک وقت ایسا آیا جب اس نے دینا کا تکلف بھی غیر ضروری سمجھا۔ فرض کر لیا کہ بس اب کون پوچھے گا مگر برا وقت آتے کیا رہ گئی ہے۔ وہ سلطان کی صورت میں نازل ہوا۔ وہ فرار ہو کر دہلی چلی گئی وہاں۔ لہنا وہ غیر معینہ مدت تک قیام کر سکتی تھی۔ اغریا پاکستان کے لوگ مقفل وہیں رہائش رکھتے ہیں اور آنا جانا بھی چلتا رہتا ہے۔ سلطان کے بندے پہنچے تو انہوں نے صاف کہا کہ بی بی جو کہ تم نے کیا! اچھا نہیں کیا۔ قانون کو دفع کر دو۔ اسے تو کوئی بھی خرید سکتا ہے یا بدل سکتا ہے۔ ہم سے سچ کے تم کہاں جاؤ گی؟ سلطان صاحب کا بیٹا مگر بے گناہ تھا چھوڑ دو۔ آرام سے دہلی میں رہو۔ وہ یہاں آ کر شادی کر لیں گے۔ انہوں نے جھپٹ فی الحال صاف کر دیا ہے اور مدد بھی برقرار ہے۔ نازنین بری طرح ڈر گئی۔ وہ اپنی صورت سے اور عذر اٹھ سے ہی بہت خطرناک لگتے تھے اور ان کی دھمکی کو نوازنا نازنین کا جاسکتا تھا۔ نہ ان کے خلاف قانونی کارروائی ممکن تھی کیونکہ وہ کسی کا نام بتا سکتا نہیں جانتی تھی۔ تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ بھی کئی کئی دفع سے اسے اغوا نہیں کیا جاسکتا مگر قتل ضرور کیا جاسکتا ہے۔ وہ کسی طرح سے دینا حاصل کر کے لندن پہنچ گئی۔ لہنا اسے میرے بارے میں معلوم تھا۔ جتنا عرصہ وہ سلطان کی سنگتیر رہی بہت سے خیر خواہوں نے اسے خبردار کیا ہوا کہ سلطان

کے دامن ہوس میں نہ پھنسے۔ وہ تو ایک خطرناک کمزری کی طرح ایسے ہی عرصین لڑکی کے لیے جال بناتا ہے اور جو تر ب آتی ہے وہ اس کا شکار ہوجاتی ہے۔ وہ کسی طرح میرا ایڈریس معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی اور ایک دن اچانک میرے قلیٹ پر وارد ہو گئی۔ اس بے وقوف نے بے نیس سوچا کہ میں کہاں آزاد ہوں۔ وہ خود چل کے سیکورٹی کے اس حصار میں داخل ہو گئی جو میرے گرد قائم تھا۔ ایک زنداں سے کھل کے دوسرے زنداں میں پہنچ گئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کی صورت میں نے کئی اشتہاروں میں دیکھی تھی۔ میں اس کی آمد کے مقصد کو بھی سمجھ گئی تھی لیکن میں نے اسے اپنی چتا سنانے کا موقع دیا جو کسی طرح بھی خود میری دکھ بھری آپ بیتی سے مختلف نہ تھی۔ اسے خود پر غصہ تھا کہ لاہور میں سلطان کی کوٹھی سے فرار ہوتے وقت اس نے کمزوری کیوں دکھائی۔ وہی وقت تھا جب وہ اپنے مصائب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر سکتی تھی۔ اس نے سلطان کو قتل کر دیا ہوتا تو اس کے ساتھ دوسروں کی جان بھی جھٹ جاتی۔ دوسروں سے اس کی مراد مجھ سے ہوگی یا مقتول بیوی کے بھائی سے جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ ایک ہوس پرست شیطان کا سچ انجام ہوتا جس پر شاید قانون بھی حرکت میں نہ آتا۔ اس کی اولاد ہرگز اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے میدان عمل میں نہ آتی۔ ابھی اسی کے بچے چھوٹے ہیں۔ بھائی کوئی ہے نہیں۔ مدی کون بنتا اور بدلہ کون لیتا۔ کم سے کم نازنین ہر الزام سے محفوظ رہی۔ میں نے کہا کہ چلو جو غلطی ہوئی ہو سکتی۔ یہ کیا طاقت فرمائی تم نے کہ مجھ سے ملنے آگئیں۔ اب واپس کیسے جاؤ گی۔ اب تک سلطان کو اطلاع مل گئی ہوگی کہ قیدی میردن کے پاس قیدی نمبر نو سیکٹر خود بخود پہنچ گئی ہے۔ وہ بہت گھبرائی مگر میں نے کہا بیٹھو کچھ سوچے ہیں پھر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا کہ تمہیں یہاں سے باہر نکالنا میری ذمہ داری۔ آگے تم خود سے دار۔ میں نے خوف سے کہا کہ پاکستان سے میری دوست آئی ہیں اور ان کو کچھ شایگ کرانی ہے اور کچھ لندن کی سیر۔ وہ ہمیں لے گیا۔ ہم نے چاہا کہ باہر کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ظاہر کیا کہ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ شاید کھانے میں کچھ کڑواہی پھر نازنین نے بھی ملتی اور چکر کی شکایت کی اور ہم ڈاکٹر شائستہ کے پاس ملے گئے۔ شوہر باہر گاڑی میں بیٹھا رہا۔ دیکھنے بعد شائستہ کی کارنگی۔ اسے شائستہ کا شوہر چلا رہا تھا۔ نازنین ڈکی میں باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد میں باہر آئی تو شوہر گھبراہٹا۔ اس نے پوچھا تو میں نے کہا کہ میری بیٹی کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی تھی شائستہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس

”معتلی طور پر تمہارا رویہ درست تھی۔ جذباتی طور پر مجھ نہیں ہے۔ میں اسے نارل نہیں سمجھتی۔“ اس نے برہمی سے کہا۔

”تم سے محبت میں یقیناً میں نارل نہیں رہتا۔“ میں نے اعتراف کیا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہوا رویہ۔ میں نے بھی تجھے کر لیا تھا کہ میں مر جاؤں گی یا ماردوں کی لکین اس جیون سے سخت قبول نہیں کروں گی۔ میں نے اس کا بھرپور مقابلہ کیا۔ نئے میں وہ پہلے ہی تھا۔ مجھے میں بالکل ہی پاگل ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے مقابلہ کیا۔ اپنے ناخون استعمال کیے۔ اسے لاشیں ماریں۔ دانتوں سے کاٹا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کیسا لڑا لڑا کرتا تھا۔ میں خود بھی جانور بن گئی تھی۔ ایک وحشی زخم خوردہ شیرنی سمجھ لو۔ وہ زخموں کی طرح مجھ پر حاوی آ جاتا جانتا تھا۔ میں مغلوب ہونے کے لیے تیار نہ تھی۔ لباس اس کے جسم پر تھا نہ ہی میرے جسم پر۔ وہ چیخ رہا تھا اور دھواڑ رہا تھا اور گالیاں کب رہا تھا۔ میں غرا رہی تھی اور اسے برابر کی گالیاں دے رہی تھی۔ وہ کئی بار مجھے دیوے کے بیڈنگ لے گیا۔

میں نے اسے دھکیل دیا۔ پیچھے گرا دیا خود اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اس کے ہر ہوس جذبات تو کب کے ذرا سمجھ کر تھے۔

اب وہ میری عزت نہیں سمجھتا جان لینا چاہتا تھا۔ اس پر خون سوار ہو گیا تھا۔ وہ میرا گلا دبا جانتا تھا یا میرا سر پھاڑتا چاہتا تھا۔ وہ رونا رونا سے مجھے شوٹ کر دیتا یا مجھ سے میرے گلوے کر دیتا لیکن اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا رونا رونا گڑی میں تھا اور گاڑی کا کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے چلانے کی آواز باہر ڈیڑھ گز دور تک نہیں پہنچ رہی تھی اور میں نے اسے موقع نہیں دیا کہ وہ دروازے تک بھی جا سکے۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ سب کیسے ہو گیا؟ مجھ میں اتنی ہمت تو تھی لیکن طاقت کہاں سے آگئی۔ میں نے ایسے درندہ صفت مرد کا مقابلہ کیسے کر لیا؟ اور یہ تائید نہیں ہے۔ ہوا قدرت نے میری مدد کی۔ اور یہ مدد کیسے نہ حاصل ہوئی۔ اللہ عالم کے ساتھ کیسے ہوتا۔ اس کا مظلوم کو طاقت دینا میں اس کے منصف ہونے کی دلیل ہے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں یا کہ یہ جنگ کتنی لمبی تھی۔ کتنے منٹ چلی۔ میرے لیے تو وہ جنگ عظیم سے بھی طویل تر تھا۔ کئی بار اس نے مجھے اٹھانے کے نیچے فرش پر پھینچا دیواری پر مارنا چاہا اور وہ ایسا نہ کر سکا۔ مجھے صرف ایک موقع ملا۔ میں نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور وہ سنبھل

نہ سکا۔ وہ دیوار کے قریب تھا۔ اس کا سر پہلے لگا۔ وہ چکر اکر

ہر چیز مل گئی۔ پانی میں نے ایک آئینہ اسٹو پر گرم کیا اور اس میں وہ سانسے ڈال دیے جن میں کافی کے ساتھ شوگر اور ملک بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ مجھے فریال کی ہمت پر جرأتی تھی۔ اپنی بزدلی لڑکی تھی جو اب میرے آبائی قبرستان میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے ہر طرف سنسان جنگلی تھا اور مکمل اندھیرا تھا۔ بس وہ بڑے سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید گزشتہ چار سالوں کے ہنسی و دھماکے دباؤ۔ شور ہنگامے اور اندیشوں سے معمور زندگی کے بعد اسے یہاں تنہا کھائیں اور اطمینان حاصل ہوا تھا جس نے اسے پراعتاد اور پرسکون کر دیا تھا۔

میں گرم کافی کے دوگ اٹھائے دس پندرہ منٹ بعد پھر وہیں پہنچا تو فریال کو موجود پا کے میرے دل کی ایک غلطش اور ہونٹوں کا ایک کٹاؤ کے احساس نے پیدا کی تھی کہ مجھے اس کو پاؤں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ جن ہمت یا خطرناک جانوروں کے علاوہ سب سے بڑا خطرہ خود سلطان تھا۔ جس سے پناہ کی سو فیصد ضمانت کہیں بھی آدمی اس کی بھی وقت حاصل نہ تھی۔ یہ فرض نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ یہاں نہیں پہنچ سکتا۔

کافی کاگ لیتے ہوئے وہ مسکرائی۔ ”تم آئی۔ ایس۔ او ISO9000 پر اپنا کوئی گائیڈ کرتے ہو۔“

”کس اعتبار سے۔“ میں اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔

”کسی بھی لڑکی کے لیے ایک آئیڈیل شوہر۔ میں آدمی نہیں کہہ رہی ہوں“ وہ ہنسی۔

”آف کورس۔ میں سمجھتا ہوں لیکن اب برائے نام تو یہ بتاؤ کہ پھر کیا ہوا۔“

”پھر؟“ اس نے ایک گھونٹ کافی لی کر غلام میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہوا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک درندہ بن گیا۔ اس نے مجھے ریپ کرنے کی دیوانہ وار کوشش کی۔ اس نے مجھے بہت مارا۔ میرے سارے کپڑے تار تار کر کے پھینک دیے۔ وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد سوال کیا۔ ”اور کیا وہ جانور اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا۔“

فریال نے چہرہ میری طرف گھمایا اور کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھی رہی۔ ”ہاں۔۔۔۔۔“

میں نے اسے اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ ”اس کے بارے میں سوچ کر شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔

میرے لیے تم وہی ہو۔ ویسی ہی ہو۔“

فریال نے مجھے درد رکھ لیا۔ ”تم کیسے آدمی ہو رہو

کھٹکی کے پتے ہوئے ہو۔ تمہیں غصہ تک نہیں آیا؟“

میں نے کہا۔ ”میں بھی ناممکن کی توقع نہیں رکھتا۔“

احساس ہوا کہ گاڑی مضامین کی طرف بڑھ رہی ہے تو میں نے احتجاج کیا پھر اس نے اپنا اصل روپ دکھایا۔ اس نے رپو اور نکال لیا اور مجھے گالیاں دینے لگا کہ اب مجھے تازمین کی مدد کرنے کا خیال نہ ہوگا اور اس جرم میں مدد کی سزا ڈاکٹر شائستہ اور اس کا شوہر بھی جیتھیں گے۔ وہ مجھے ایک کٹری ہاؤس میں لے گیا جس کے گرد سارے مکانات دور دور تھے اور ہر مکان کے گرد وسیع احاطہ تھا۔ مت پوجھو وہاں میرے ساتھ کیا ہوا۔ اسے باور کے اس وقت بھی مجھ پر خوف سے لرزہ طاری ہو رہا ہے۔“

میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ”بھول جاؤ اسے۔ یہاں تم محفوظ ہو۔“ فریال نے کہا۔ ”چلو باہر چلتے ہیں۔ صبح ہونے میں کتنی دیر ہے؟“

میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ”وہ دیکھو اسے صبح کا ستارہ کہتے ہیں۔“

ہم گاڑی سے نکلے تو میں نے محسوس کیا کہ باہر اچھی خاصی ٹھنکی ہے۔ میں اس کے لیے اندر سے ایک چادر لے آیا جسے اس نے شمال کی طرح پہن لیا۔ ہم آہستہ آہستہ گیٹ سے نکل آئے۔ وہ بیس فٹ اونچے پتھرانی دروازے میں رک کے پیچھے دیکھتی رہی۔ یہاں سے قدم چوٹی اس کے اچڑے باغ اور نور سے کا پورا منظر آخر میں بے ہوش سر دھت کو اتر کر دیکھائی دیتا تھا۔ وہ اس کی تاریخی روایات اور قدما ت کے حسن سے محسوس نظر آ رہی تھی۔

میں اسے درویش کے حمار تک نے کیا۔ وہاں ہم چوڑے کی گرد صاف کیے بغیر پیر کا کے بیٹھ گئے۔ کتنا عجیب لگتا ہے یہ سب۔ کہاں وہ لندن کا کلیٹ، کہاں یہ خولی۔ کہاں وہ روشنیوں کا شہر، کہاں یہ ویرانہ۔“

میں نے کہا۔ ”وہ کرائے کا کلیٹ تھا۔ یہ سب تمہارا ہے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”میں اس کرائے کے کلیٹ میں ہوتی تو رات یوں نہیں گئی ہر اپنے ہاتھ سے کافی بنا کے پلائی۔“

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ”میرا خیال ہے کافی بنا کے میں بھی لاسکا ہوں مگر۔ چیزیں تو سب ہی آگئی ہیں۔“

اندر جانا پڑے گا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں بیٹھی ہوں یہاں، تم جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”ڈیڑھ گھنٹہ گئے تمہیں۔“

”ڈرنا چاہیے زندہ انسانوں سے۔ مردے بچا کر کسی کو کیا کہتے ہیں۔“

میں نے اندر جا کے اسباب کے ذخیرے کو دیکھا تو مجھے

نے میری کھلی کو اپنے شوہر کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ کسی اسپتال گئے ہوں گے لیکن جیسا کہ طے تھا بعد میں شائستہ کے شوہر نے کہہ دیا کہ وہ اسپتال نہیں گئی کہنے لگی کہ مجھے میرے گھر پہنچا دوں اور میں نے ایک جگہ ڈراپ کر دیا۔ مجھے کیا معلوم وہ کہاں رہتی تھی۔ ظاہر ہے قیدی بھر دو کے فرار کی خبر بھی سلطان کو دی گئی ہوگی۔ وہ پہلے سے لندن پر دواز کرنے کے لیے تیار تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ اچانک نازل ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ بالکل مختلف موڈ میں تھا۔ میری توقعات کے برعکس اس نے غصہ دکھایا اور کوئی دھمکی دی۔ اس نے مجھے پکڑ لیا۔ اس نے کہا کہ اب وہ میرے ساتھ زبردستی کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اسے تازمین سے دفاعی محبت ہوگئی ہے اور یہ ماضی کی ہر محبت سے مختلف ہے۔ اب وہ تازمین سے شادی کر کے صرف اس کا ہو کے رہنا چاہتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تازمین راضی نہیں اب اس کے راضی نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہوئی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے جنہیں بھی منگنی کر کے پابند کر رکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے یہی تم مجھے قید کر لو گے اور کسی تیسری کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تیسری کے بعد چوتھی آجائے گی۔ تمہاری ہوس کی کوئی انتہا نہیں اور تم ایک نفسیاتی مریض بن چکے ہو۔ سلطان نے مجھ سے کہا کہ اگر تازمین مان گئی تو وہ مجھے آزاد کر دے گا پھر میں جس سے چاہوں شادی کروں۔“

”اس نے میرا نام نہیں لیا؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلی بار نہیں لیا تھا۔ بعد میں لیا۔ وہ کچھ دن ایسے ہی آتا جاتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ تازمین کے پاس گیا تھا۔ وہ روپوش تھی مگر کسی کا سراغ لگانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ ایک دن اس نے کہا کہ تازمین نے ایک شرط رکھ دی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فریال خود آ کے مجھے یقین دلادے کہ تم نے اسے آزاد کر دیا ہے مگر ختم ہونے کے بعد وہ پاکستان جا کے رہیں سے شادی کر سکتی ہے۔“

”گویا اسے سب علم تھا۔ ہمارے تعلق کا۔۔۔۔۔“

”اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ خود ہی کہا کہ وہ سب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ہم کب کہاں اور کیسے ملتے رہے تھے لیکن اب وہ خود ہی میرے معاملے سے دستبردار ہو رہا ہے تو اسے کیا کہ میں اپنا مستقبل کس سے وابستہ کرتی ہوں۔ اگر یہ محبت وہ مجھ سے گھر میں کرتا تو میں کبھی کہہ نہ تازمین کو یہاں لے آؤں گا مجھے اس کا فون نمبر بتاؤ۔ میں بات کر لیتی ہوں لیکن ہم باہر ایک جگہ بیٹھ کر رہے تھے جب اس نے یہ بات کہی۔ اس نے کہا کہ تازمین قریب ہی رہتی ہے۔ میں اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوئی۔ وہ جگہ قریب نہیں تھی۔ جب مجھے

خاموش رہی حالانکہ میری شدید خواہش تھی کہ میں بھی جواب میں اسے کہہ دوں کہ نامر کی اولاد۔ آج تک تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔ آئندہ کے لیے بھی سن لے کہ میں نے تجھے کتنے کی موت مارا تو میرا بھی نام فریال نہیں لیکن میں نے منہ بند رکھا۔ اور بالآخر فون بند کر دیا کیونکہ اس کی کوساں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کے بعد دو دفعے دقت سے وہ اس طرح مجھے فون پر ڈرا تا دمکا تا رہا۔ تیسرے دن میں نے وہ گاڑی شائستہ کے گھر کے باہر دیکھ لی جس میں وہ مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ شائستہ نے پولیس کو مطلع کیا اور پولیس نے اس گاڑی کو پکڑ لیا لیکن وہ ریٹ اسے کار ایجنسی کی گاڑی ثابت ہوئی۔ پولیس نے اس کے ڈرائیور کو پوچھ گچھ کے بعد مجھ کو دیا۔

”اس کے بعد میں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ مجھے فرار ہو کر تمہارے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے اپنے کچھ رابطے استعمال کیے۔ لندن انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹ سے میں نے چار سال کا کورس کیا تھا۔ وہاں دنیا بھر کے طلبہ تھے جو ٹین ڈیزائننگ سے انٹر ریڈیکیشن تک ہر طرح کے کورس کر رہے تھے۔ میرے علم میں افریقی ممالک کے کچھ ایسے لوگ تھے جن کے اپنے ملک سے باہر بھی انڈر ورلڈ میں کلش تھے۔ بظاہر وہ سب عام سے لوگ تھے اور میرے پاس سنی سنائی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاہم میں نے ایک ساتھ انڈر ورلڈ کی سہولتوں سے رابطہ کیا تو اس نے مجھے کینیا کے ایک سیاہ فام کا نمبر دیا۔ اس نے کہا کہ دس ہزار پونڈ میں میرے برطانیہ سے کینیا اور وہاں سے پاکستان جانے کا قیمتی بندوبست کیا جاسکتا ہے جس کا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ مال مفت دل ہے رقم۔ میں نے سلطان سے ملنے والے دس ہزار پونڈ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اسے منہ مانی رقم مل گئی اور میرا کام ہو گیا بعد میں اس اغذین لڑکی نے مجھے بہت ڈانٹا کہ یہ کیا بے وقوفی کی۔ تمہارا کام پانچ ہزار پونڈ سے کم میں ہو جاتا۔

”میرے پاسپورٹ پر ویزا لگ گیا۔ مجھے کراچی براستہ نیرول کی کالکٹ لی کیا اور میں لندن سے ایسے نکل آئی کہ سلطان کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی۔ اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ میں لندن سے پاکستان پہنچ جاؤں۔ اس کے کارندے کراچی، اسلام آباد اور دہلی کی تلاش دیکھ رہے ہوں گے۔ ممکن ہے یورپ کے دوسرے شہروں سے پاکستان جانے والی تلاشیں بھی ان کی نظر ہو لیکن کینیا کی ایئر لائن کی طرف ان کا دعویٰ نہیں جاسکتا تھا۔“

یہ تو تھا نہ گواہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لندن میں کہاں سے اور کس نام سے برطانیہ میں مقیم ہے۔ بے شک میں پولیس کو اس گھر تک لے جاسکتی تھی جہاں سلطان نے مجھے رہ کر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس گاڑی کا نمبر دے سکتی تھی جو مجھے اغوا کر کے لے جانے میں استعمال ہوئی اور ان تمام اسباب کی نشاندہی کر سکتی تھی جو ان واقعات کے پس منظر میں تھے لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میرا چار سالہ کورس اور لندن میں میرے قیام کی مدت ختم ہو رہی تھی اور مجھے لوٹ کے پاکستان جانا تھا۔ یہاں میں قانونی مشکلات کا شکار ہوئی تو پاکستان میں غیر قانونی مشکلات کا۔ تاہم میں نے شائستہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہو۔ اس نے پولیس حکام سے رابطہ کیا کہ اسے سیورٹی فراہم کی جائے کیونکہ وہ کچھ نامعلوم لوگوں کی طرف سے خطرہ محسوس کرتی ہے جو اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں اور ایسا کیوں کرتے ہیں۔ وہ برطانوی شہری تھی اسے پوری سیورٹی مل گئی۔ باقی انتظامات اس نے خود کیے، جس میں کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے اور خود کار الارم SURVEILLANCE جیسے انتظامات شامل تھے۔ اس نے ایک سبک سیوریٹی گاڑی رکھ لیا جو ہر جگہ ساتھ جاتا تھا۔

”میں سلطان کی طرف سے اگلے قدم کی منتظر تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ اس کے بریف کیس میں سے مجھے چوبیس ہزار پونڈ اور گیارہ ہزار ڈالر ملے تھے۔ وہ بریف کیس صرف نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے غیر قانونی روپوشی میں اسے رقم اپنے ساتھ رکھنی پڑتی تھی۔ اس میں سلطان کا کوئی پاسپورٹ نہیں تھا اور نہ کوئی سراغ دینے والی دستاویز تھی۔ سیٹ پر ریوایور کے علاوہ ایک سیٹ لائن فون ریسیور بھی تھا۔ یہ دونوں چیزیں میں ساتھ لے آئی تھی۔ تیسرے دن مجھے سلطان کی فون کال موصول ہوئی۔ وہ ڈسٹ اور بے غیرت شخص زندہ تھا۔ میں نے اسے ہلوائس کہا تھا مگر ظاہر ہے اس فون پر میرے سوا کون کال ریسیور کر سکتا تھا۔ وہ براہ راست مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا کہ فریال۔ میں اب بھی تمہیں معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ میں خود کو اس کے حوالے کر دوں۔ اس سے شادی کے بعد مجھے تحفظ بھی حاصل ہوگا اور ایک باعزت زندگی بھی ملے گی ورنہ میں کہیں بھی رہوں میرا اور مجھے پناہ دینا ہمارا دینے والوں کا حشر خراب ہوگا کیونکہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بہت ضبط سے کام لیا اور

ہوتا۔ میں بھر کہیں ٹریپ ہو جاتی۔ پیچھے سے سلطان کی دیوانے رنجھ کی طرح خرخر کرتا اور آ رہا تھا۔ اسے تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے تاک کے اور نشانہ نہ کرے گا۔ اس کے سر پر پتھر مارا۔ ظاہر ہے وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ چکرایا اور پلٹ کے گرا تو لڑھکھا ہوا پیچھے گیا۔ میں نے اسے فرسٹ فلوئر کے موزیک کرتے سنا۔ وہ گرا رہا تھا اور سخت اذیت میں تھا تمہارا اس کی آواز خاموش ہو گئی تو میں نیچے اترتی۔ ایک ایک زینہ احتیاط کے ساتھ۔ ڈرتی ہوئی اور جوانی جملے کے لیے پوری طرح چوک۔ وہ مجھے سے حس حرکت پر ناظر آیا۔ میں نے سوچا کہ کاش وہ مر گیا ہو مگر مجھے یہ ڈر بھی لگا کہ کہیں وہ مرنے نہ کر رہا ہو اور جب میں اس کے قریب جاؤں تو وہ ایک دم اٹھ کے مجھے بھر دیوچ لے کر ایسا نہیں ہوا۔ میں اسے پھلانگ کے نکل گئی اور نیچے چلی گئی۔ معلوم نہیں وہ گھر کس کا تھا۔ میرے اپنے کپڑے تو پہننے کے لائق نہیں رہے تھے۔ تلاش کرنے پر مجھے ایک ہاتھ روم سے اسکرٹ مل گیا جو سائز میں کچھ بڑا تھا۔ نیچے میں نے ایک مردانہ ٹائٹ سوٹ کا پجامہ پہنا اور اوپر ایک چادر پہن کر باہر آ گئی۔ کار کا ڈرائیور سو رہا تھا۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو پچھلی سیٹ پر سلطان کا بریف کیس بھی پڑا تھا اور ریوایور بھی رکھا ہوا تھا۔ میں ایک دم دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گئی اور شوفر سے کہا کہ چلو۔ ورنہ میں گولی مار دوں گی۔ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں رہا تھا۔ ایک دران جگہ پر گاڑی رکوا کے سامنے اسے اترنے کے لیے کہا اور حکم دیا کہ تاک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا چلا شروع کر دے اگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کے دیکھا تو گولی اس کی پیشانی میں سوراخ کر دے گی۔ میں نے اسے بتادیا کہ کسی خوش فہمی میں نہ رہے۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ ٹارگٹ، شوٹنگ کی بہت سی فرمائیاں ہیں میرے پاس۔ اس نے اپنی جان بچائی اور حکم عدولی کی محاکات نہیں کی۔ جب وہ سو قدم دور چلا گیا تو میں نے گاڑی کو ریس دی اور بھاگی۔ شوفر کے پاس بھی ریوایور تھا۔ اس نے پلٹ کے فائر کیا مگر اس وقت تک میں موزک ٹھیک چلی گئی۔ اس وقت تک میرے اعصاب قابو میں تھے۔ میں نے شائستہ کو فون کر کے بلایا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں ٹراما میں تھی۔ اس نے مجھے نفسیاتی اور جسمانی مددے کی کیفیت سے بچانے کے لیے چوبیس گھنٹے SEDATION میں رکھا نارمل ہونے کے بعد میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں پولیس سے رپورٹ کروں لیکن اس سے میں حریف مشکلات میں پڑ جاتی۔ میرے پاس نہ سلطان کے خلاف کوئی

گرا۔ میں پلٹ کر دیکھے بغیر دروازے کی طرف بھاگی۔ میں نے اوپر نیچے کی چٹنی کھولی اور باہر نکل گئی۔ اس وقت تک وہ سنبھل کے اٹھ گیا تھا۔ وہ میرے پیچھے لگا۔ میں نے دروازے کو باہر سے بند کیا تو اس کا ایک ہاتھ چٹ میں آ گیا مگر میں نے پروانہ کی۔ میں نے باہر سے کنڈی لگائی اور بھر بھاگی۔ گھر کے اندر کا نقشہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا اور نہ ہی پروانگی کہ میرے جسم پر کچھ نہیں ہے۔ میں اس حالت میں باہر نکل جاتی اور سڑک پر دوڑتی ہوئی قریب ترین گھر میں پہنچ جاتی۔ مگر جو دروازہ سامنے آیا اس نے مجھے ایک لاؤنچ میں پھنسا دیا۔ وہاں مجھے سب دروازے بند لے۔ سلطان نہ جانے کس طرح اور کس طرف سے نکل آیا تھا اور میں اس کی دھشیا نہ آواز سن میں سکتی تھی۔ میں اس دروازے سے نکلی جو مجھے کھلا ہوا ملا۔ یہ ایک زینے کا دروازہ تھا۔ میں اوپر کی طرف بھاگی۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اوپر سے کود جاؤں گی لیکن حکومتا ہوا یزید ایک بند دروازے پر ختم ہو گیا۔ معلوم نہیں اس کے اوپر کیا تھا۔ وہاں اندھیرا بھی تھا اور محسوس بھی۔ میں سلطان کی فٹس گالیاں تو سن رہی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان چند فٹ کا فرق تھا۔ اس کا ایک فائدہ ہوا۔ میری نظر اس کے آنے تک اندھیرے میں دھنسنے کے قابل ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اوپر جانے والے راستے کے دروازے میں تالا پڑا ہوا ہے۔ وہ خاصا بڑا تھا اور ظاہر ہے میرے پاس ہتھوڑا ہوتا تب بھی میں اسے توڑ نہیں سکتی لیکن میں بھر پکتی ہوں کہ قدرت کو بھانا منظور تھا۔ ورنہ شاید اس وقت میں تمہارے سامنے یہ سب کہنے کے لیے موجود نہ ہوتی۔“

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ ”کیوں؟ تم کہاں ہو تھیں؟“

اس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ”میں مرجانی رومیو۔ دین جان دے دیتی۔ خود کشی کر لیجی۔“

”تم باگل ہوفری۔ ایسا تم کیسے سوچ سکتی ہو۔“

اس نے کہا۔ ”بس..... کچھ بھی سمجھو۔ میں تمہارے لائق نہ رہتی تو پھر بھی کی کیا کرتی۔ اس وقت بالکل غیر ارادی اور اضطراب کی کیفیت میں جب میں نے تالے کو پکڑ کے زور سے بلایا۔ تو پتا نہیں کیا ہوا۔ تالا کھل گیا اور میرے ہاتھ میں آ گیا۔ شاید تالا پہلے ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا یا پراٹا ہونے کی وجہ سے اس کے انچر جبر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کنڈی کھول کے اوپر جاتی۔ اور اوپر جا کے بھی کیا

میں نے اس کی پٹھہ چھکی۔ ”شاباش ہے بی لومڑی۔ تم نے تو داعی کمال کر دیا۔ شیر کو نکل ڈال دی۔“

”لیکن سوال یہ ہے رفیق صاحب کہ اب کیا ہوگا۔ یہی سوچ سوچ کے میرے دل میں ہوں اٹھتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے تم اکیلے تھیں۔ اب میں ہوں تا تمہارے ساتھ مرنے کے لیے تیار۔ بھر ڈرنا کیسا۔“

آسان پر صبح صادق کی سفیدی رفتہ رفتہ اچالے میں ڈھلنے لگی تھی۔ صبح کے ستارے کا سفر تمام ہونے کو تھا۔ آشیانوں میں طیور انگریزوں کے بیدار ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنا دی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو ریشماں۔ سیراز اڑی سی رنگت پر کھلے کھلے سے گیسو۔ کی تیسری کھڑکی تھی اور اس کی صبح اس کی رات کا سارا فسانہ کبھری تھی۔

فریال اس کے اچانک نمودار ہونے سے چونک پڑی تھی اور کچھ گھبرا بھی گئی تھی۔ ”تم۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ اس وقت۔۔۔“

میں نے سمجھا اچانک کہ وہ اپنے جلدی عروسی سے برآمد ہوئی ہے ہم یہاں اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ وہ شاید خطر بھی کہ ہم اٹھ کے جائیں تو وہ بھی اپنی محبت کی پناہ گاہ سے نکلے۔ اب صبح ہونے لگی۔ وہ کب تک انتظار کرے گی۔ کچھ دیر میں اس کے گھر والے جاگ اٹھے تو وہ کیا بتاتی کہ کہاں سے آ رہی ہے۔ اچالا پھیلنے سے قہقہہ دے رہی وہ اپنے بستر پر جا کے لیٹ جانا چاہتی ہوگی۔

میں نے کہا۔ ”ریشماں! کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

اس نے خواب آلود نظروں سے مجھے دیکھا اور جمائی لے کر مسکرائی۔ ”مالک وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ضرور کرے۔ کس نے روکا ہے اسے۔ کہاں ہے وہ۔ بلاؤ۔“

”وہ یعنی وہ کچھ دیر بعد آئے گا۔“ اور پھر جھکی برنی کی طرح چونکریاں بونی ہوئی وہ چند لمحوں کے میں غائب ہوئی۔ ”یہ لڑکی ایسے کیوں آتی تھی۔“ فریال نے کہا ”چپکے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ کہیں سے نہیں آتی تھی۔ یہیں تھی۔ آؤ میں بتاتا ہوں۔“

اندرا آتے آتے میں نے فریال کو ریشماں کی اسٹوری سنائی جو۔ بے خطر کو پڑا آتش خرد میں عشق۔ کی عملی تفسیر تھی۔

”جس دن یہ چوکی گئی رکتے ہاتھ اس دن کیا ہوگا۔“ فریال نے کہا۔

”میرا خیال ہے کچھ نہیں ہوگا۔ باپ کو تو کمر ہے نہیں۔ ماں اس کا ہاتھ تھام دے گی چاہنے والے کے ہاتھ میں۔ لڑکا بڑک چلا تا ہے۔ اسے کما کے کھلا سکتا ہے۔ محبت کوئی کوئی فیکشن نہیں ہوتی، ہسکاٹی ہوتی ہے۔“

فریال نے کہا۔ ”یا غیرت میں قہل ہو جائے گی۔ یہ بھی تو ہوتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔“

اس وقت صبح کے پونے پانچ بجے تھے۔ فریال کو بالکل نیند نہیں آ رہی تھی مگر میری آنکھیں بوجھل ہو کے بند ہونے لگی تھیں۔ میں بیچے کی سو گیا اور پھر اٹھا تو نونہل رہے تھے۔ چار کھنکے کی نیند نے مجھے چارج کر دیا تھا۔ میں بھی زیادہ سوئے کا عادی نہیں تھا۔ عام حالات میں مجھ جات کھنکے بعد اٹھ جاتا تھا ورنہ ایک دو کھنکے کی نیند بھی کافی ہوتی تھی۔

ناشتے سے فراغت ہوئی تو ہم سب نے مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا میں نے کہا۔ ”دیوے تو کسی سے کوئی بھی بات جھپی نہیں رہی۔ جب مجھے والدین نے طلب کیا تھا تو خود مجھ پر اپنے مستقبل کے عزائم واضح نہیں تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ میرا فوچر لندن یا امریکا میں ہے اور جو تعلیم میں نے حاصل کی ہے اس کا یہاں کوئی مصرف نہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس جاگیر وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑوں گا اور اپنے والدین کو قائل کر لوں گا کہ وہ مجھے کامیابی کے اس راستے پر چلنے دیں جو انہوں نے ہی میرے لیے منتخب کیا تھا اور جس پر میں بڑی سعادت مندی خوشی اور مستقبل مزاحی کے ساتھ گامزن ہوں۔“

”ہم اسے مان لیتے ہیں“ راجا بولا۔ ”کبھی کبھار آدمی کے قدم صراطِ مستقیم سے ادھر ادھر ہٹ جاتے ہیں تو چلتا ہے۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہاں آ کے میرے خیالات میں جو تبدیلی آئی۔ وہ بڑی غیر متوقع تھی۔ لیکن اب یہ طے ہے کہ میں یہاں رہوں گا اور ایک پلان پر عمل کروں گا جو میرے ذہن میں ہے۔ اور سب جانتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ اس کے لیے بہت کچھ چاہیے۔ سرمایہ، ہمت، وقت اور وسائل۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا۔“

”تو اکیلا نہیں ہے نیچے چرا! راجا نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

میں نے کہا۔ ”راجا۔ تو میرے لیے اپنے مستقبل کا

”جس دن یہ چوکی گئی رکتے ہاتھ اس دن کیا ہوگا۔“ فریال نے کہا۔

”میرا خیال ہے کچھ نہیں ہوگا۔ باپ کو تو کمر ہے نہیں۔ ماں اس کا ہاتھ تھام دے گی چاہنے والے کے ہاتھ میں۔ لڑکا بڑک چلا تا ہے۔ اسے کما کے کھلا سکتا ہے۔ محبت کوئی کوئی فیکشن نہیں ہوتی، ہسکاٹی ہوتی ہے۔“

فریال نے کہا۔ ”یا غیرت میں قہل ہو جائے گی۔ یہ بھی تو ہوتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔“

اس وقت صبح کے پونے پانچ بجے تھے۔ فریال کو بالکل نیند نہیں آ رہی تھی مگر میری آنکھیں بوجھل ہو کے بند ہونے لگی تھیں۔ میں بیچے کی سو گیا اور پھر اٹھا تو نونہل رہے تھے۔ چار کھنکے کی نیند نے مجھے چارج کر دیا تھا۔ میں بھی زیادہ سوئے کا عادی نہیں تھا۔ عام حالات میں مجھ جات کھنکے بعد اٹھ جاتا تھا ورنہ ایک دو کھنکے کی نیند بھی کافی ہوتی تھی۔

ناشتے سے فراغت ہوئی تو ہم سب نے مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا میں نے کہا۔ ”دیوے تو کسی سے کوئی بھی بات جھپی نہیں رہی۔ جب مجھے والدین نے طلب کیا تھا تو خود مجھ پر اپنے مستقبل کے عزائم واضح نہیں تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ میرا فوچر لندن یا امریکا میں ہے اور جو تعلیم میں نے حاصل کی ہے اس کا یہاں کوئی مصرف نہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس جاگیر وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑوں گا اور اپنے والدین کو قائل کر لوں گا کہ وہ مجھے کامیابی کے اس راستے پر چلنے دیں جو انہوں نے ہی میرے لیے منتخب کیا تھا اور جس پر میں بڑی سعادت مندی خوشی اور مستقبل مزاحی کے ساتھ گامزن ہوں۔“

”ہم اسے مان لیتے ہیں“ راجا بولا۔ ”کبھی کبھار آدمی کے قدم صراطِ مستقیم سے ادھر ادھر ہٹ جاتے ہیں تو چلتا ہے۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہاں آ کے میرے خیالات میں جو تبدیلی آئی۔ وہ بڑی غیر متوقع تھی۔ لیکن اب یہ طے ہے کہ میں یہاں رہوں گا اور ایک پلان پر عمل کروں گا جو میرے ذہن میں ہے۔ اور سب جانتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ اس کے لیے بہت کچھ چاہیے۔ سرمایہ، ہمت، وقت اور وسائل۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا۔“

”تو اکیلا نہیں ہے نیچے چرا! راجا نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

میں نے کہا۔ ”راجا۔ تو میرے لیے اپنے مستقبل کا

”ہم اسے مان لیتے ہیں“ راجا بولا۔ ”کبھی کبھار آدمی کے قدم صراطِ مستقیم سے ادھر ادھر ہٹ جاتے ہیں تو چلتا ہے۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہاں آ کے میرے خیالات میں جو تبدیلی آئی۔ وہ بڑی غیر متوقع تھی۔ لیکن اب یہ طے ہے کہ میں یہاں رہوں گا اور ایک پلان پر عمل کروں گا جو میرے ذہن میں ہے۔ اور سب جانتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ اس کے لیے بہت کچھ چاہیے۔ سرمایہ، ہمت، وقت اور وسائل۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا۔“

”تو اکیلا نہیں ہے نیچے چرا! راجا نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

میں نے کہا۔ ”راجا۔ تو میرے لیے اپنے مستقبل کا

”یہی سوچ سوچ کے میرے دل میں ہوں اٹھتے ہیں۔“

فریال نے کہا۔ ”اس کے لیے مجھے لیڈ آف اپائنٹ چاہیے۔ جسے مقامی لوگ نکاح نامہ بھی کہتے ہیں۔ فی الحال میں وائف ہی نہیں تو ہاؤس وائف کی ڈیوٹی کیسے دے سکتی ہوں۔“

راجا نے کہا۔ ”OBJECTION UPHELD“

میں نے کہا۔ ”اے کے“ عہدہ تبدیل کیا جاتا ہے۔ تم ہاؤس کیپر۔ ہاؤس مینڈ۔ کہلاتا پسند کر دو گی یا دیر داخلہ۔ امور خانہ داری تمہارے سپرد ہیں۔ فاطمہ اور اس کی بیٹی ریشماں کو میں نے پہلے ہی تمہاری مدد کے لیے رکھ لیا ہے۔ سارے کام وہ کریں گی۔ تم نگرانی کرو گی۔ اس کے علاوہ تمہیں دو اہم ذمے دار یں دی جا رہی ہیں۔ ایک تو تم فرخ کو بتا دو گی کہ گھر کو گھر بنانے کے لیے تمہیں کیا کچھ چاہیے۔ دوسرے تم کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس حویلی میں جو قدیم فرنیچر ہے یا قلعین اور پردے ہیں۔ کیا ان سب کو بدلنا ضروری ہے۔ ہم ایک پرانی تاریخی روایات رکھنے والی حویلی کے ماحول میں رہ سکتے ہیں۔ اس کا اپنا طہم ہے۔ یا ہمیں اسے جدید انداز میں فرنش کرنا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس کے حق میں نہیں ہوگا۔ قدامت کا حق تو ایک انمول ورثہ ہے۔ اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔“ فریال نے کہا۔

”نوسرا! ہم حویلی کا ماحول کیسے بدل سکتے ہیں؟“ راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”دراصل کچھ چیزیں بہت پرانی اور ناقابل استعمال ہوں گی مثلاً پردے جن کا رنگ ہی ازگیا ہے۔ یا قلعین جو بالکل مسم ہیں۔“

فریال نے کہا۔ ”وہ میں گروں گی۔ تم مجھے مت سمجھاؤ۔ تم اپنا کام کرو۔“

”راجا میرے ساتھ رہے گا۔ ہم ذرا جاگیر کے معاملات کو درست کرتے ہیں معاملات خاصے مجھے ہوئے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کریں۔“

راجا نے کہا۔ ”ہم اکبر علی خاں سے شروع کر سکتے ہیں۔“

”یو آر رائٹ! خرابی اکبر خاں سے شروع ہو کے اکبر خاں پر ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ طے

”یہی سوچ سوچ کے میرے دل میں ہوں اٹھتے ہیں۔“

فریال نے کہا۔ ”اس کے لیے مجھے لیڈ آف اپائنٹ چاہیے۔ جسے مقامی لوگ نکاح نامہ بھی کہتے ہیں۔ فی الحال میں وائف ہی نہیں تو ہاؤس وائف کی ڈیوٹی کیسے دے سکتی ہوں۔“

راجا نے کہا۔ ”OBJECTION UPHELD“

میں نے کہا۔ ”اے کے“ عہدہ تبدیل کیا جاتا ہے۔ تم ہاؤس کیپر۔ ہاؤس مینڈ۔ کہلاتا پسند کر دو گی یا دیر داخلہ۔ امور خانہ داری تمہارے سپرد ہیں۔ فاطمہ اور اس کی بیٹی ریشماں کو میں نے پہلے ہی تمہاری مدد کے لیے رکھ لیا ہے۔ سارے کام وہ کریں گی۔ تم نگرانی کرو گی۔ اس کے علاوہ تمہیں دو اہم ذمے دار یں دی جا رہی ہیں۔ ایک تو تم فرخ کو بتا دو گی کہ گھر کو گھر بنانے کے لیے تمہیں کیا کچھ چاہیے۔ دوسرے تم کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس حویلی میں جو قدیم فرنیچر ہے یا قلعین اور پردے ہیں۔ کیا ان سب کو بدلنا ضروری ہے۔ ہم ایک پرانی تاریخی روایات رکھنے والی حویلی کے ماحول میں رہ سکتے ہیں۔ اس کا اپنا طہم ہے۔ یا ہمیں اسے جدید انداز میں فرنش کرنا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس کے حق میں نہیں ہوگا۔ قدامت کا حق تو ایک انمول ورثہ ہے۔ اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔“ فریال نے کہا۔

”نوسرا! ہم حویلی کا ماحول کیسے بدل سکتے ہیں؟“ راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”دراصل کچھ چیزیں بہت پرانی اور ناقابل استعمال ہوں گی مثلاً پردے جن کا رنگ ہی ازگیا ہے۔ یا قلعین جو بالکل مسم ہیں۔“

فریال نے کہا۔ ”وہ میں گروں گی۔ تم مجھے مت سمجھاؤ۔ تم اپنا کام کرو۔“

”راجا میرے ساتھ رہے گا۔ ہم ذرا جاگیر کے معاملات کو درست کرتے ہیں معاملات خاصے مجھے ہوئے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کریں۔“

راجا نے کہا۔ ”ہم اکبر علی خاں سے شروع کر سکتے ہیں۔“

”یو آر رائٹ! خرابی اکبر خاں سے شروع ہو کے اکبر خاں پر ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ طے

گا کہاں؟“

فرخ نے کہا۔ ”مگر آپ کو اس علاقے میں پھرتا ہے تو آپ جب استعمال کریں۔“

میں نے کہا۔ ”تم شہر آئے جانے کے لیے کار اپنے پاس رکھو۔ آج وہ بلڈنگ کنٹرکٹر آئے تو پہلے اس سے ایک کام کرالو۔ تار تم کل ہی لے آئے تھے۔ اس سے کہو کہ جیسے بھی ہو بجلی کے کھمبے سے یہاں تک کنکشن فراہم کر دو۔ جزیئر سے گزارہ تو ہو گیا تھا مگر سارے کام نہیں ہو سکتے۔“

”پول سے ڈائریکٹر کنکشن۔ یعنی کنڈا؟ میٹر کے بغیر؟“ راجا نے کہا۔ ”دیکھو اگر وہ بلڈنگ کنٹرکٹر سے تو اس کے لیے کوئی کام مشکل کام نہیں۔ میٹر کیا ٹرانسمارمر بھی لگوا دے گا۔“

میں نے کہا۔ ”بے شک یہ غیر قانونی ہے لیکن کھمبے ہماری زمین کا حدود میں نصب ہیں۔ قانونی اعتراض کرنے والا بھی یہاں ہماری اجازت کے بغیر آئے گا تو خود قانون شکنی کا مرتکب ہوگا۔ ہوگا یا نہیں؟“

راجا نے بے تکلفی سے فرخ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”خود میں اعتماد پیدا کرو پر خوددار۔ تم کوئی عام آدمی نہیں۔ ہر ہائی کس لواب رتی احمد شیرازی آف ست بدحالی انٹیٹ کے معتقد خاص ہو۔ جنہیں قانون سے نہیں قانون کو تم سے ڈرنا چاہیے۔ خود کو عوام مت سمجھو۔ تم خاص میں شامل ہو بلکہ دی آئی پی ہو۔“

”آپ نے ٹھیک کہا راجا صاحب!“ فرخ نے کہا۔

راجا نے قہقہہ مارا۔ ”راجا صاحب! یار، تم کیا میری رعایا ہو کہ مجھے راجا صاحب کہو۔ بس راجا کافی ہے۔ مجھے ایک بات بتاؤ فرخ۔ قانون کس کے لیے بنایا جاتا ہے، قانون کمزوری حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے چنانچہ پاکستان میں جو کمزور نہیں ہے اس کے لیے قانون کوئی چیز نہیں ہے۔“

فریال نے کہا۔ ”مگر یہ سچ روایت تو نہیں ہے۔“

راجا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”فریال بی بی۔ یہ قانون قدیم ہے۔ بقا کمزور کے لیے نہیں ہے خواہ وہ انسان ہو یا حیوان۔ آج کمزور افراد اور اقوام کے لیے جتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً پاکستان میں جہاں کمزور کی حفاظت قانون بھی نہیں کرتا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ خود کمزور مت سمجھو۔ طاقت حاصل کر دو جیسے بھی حاصل ہو اور استعمال کرو۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“

فرخ کے لیے اس منطق سے اختلاف یا اتفاق کرنا مشکل ثابت ہو رہا تھا چنانچہ وہ کام کا بہانہ کر کے بھاگ

گیا۔ ”میں ذرا وہ تار وغیرہ نکال لوں ٹھیکے دار کے آنے سے پہلے۔“

راجا نے کہا۔ ”جذباتی لو جو ان ہے۔ غیر عملی سوچ رکھتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو اس کے ذہن کو کنفیوٹ کر اپنے نظریات سے۔“

”یار، میں تو اسے کامیابی سے جینے کے رکھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”راجا آخر ہمارے سلاطین فون کب تک ایٹمی ویٹ ہوں گے۔ فون نہ ہونے کی وجہ سے ہم ساری دنیا سے کٹے ہوئے ہیں۔“

”کبھی نے کہا تھا کہ چونیں کھنے کے اندر۔ انشا اللہ آج کسی بھی وقت ہم کلکٹ ہو جائیں گے۔“

فریال نے کہا۔ ”میرے پاس ایک فون ہے اگر تم استعمال کرنا چاہو۔“

”وہی سلطان کا؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس میں رسک ہے۔ انٹرنیشنل سیٹ لائن فون کی کال ٹریس ہو جاتی ہے۔ یہ پتا چل جاتا ہے کہ کہاں سے کی گئی ہے۔ ملک اور شہر تو کیا اس مقام کی بالکل صحیح نشاندہی ہو جاتی ہے جہاں فون موجود ہو۔ کیا اس نے جنہیں پھر کال کی؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں۔ میں نے فون آف کر دیا ہے۔“ فریال بولی۔

”ٹھیک ہے، آف ہی رہنے دو۔ اس کے لیے ہم دوسری سہ لیں گے۔ کیا تمہارے سامان میں بدلنے کے لیے کپڑے نہیں ہیں؟“

”رونی! میں کسی پلان کے بغیر آئی ہوں۔ جان بچا کے بڑی مشکل سے نکلی تھی ورنہ کمر کا سارا سامان سمیٹ لائی۔“ اس نے ترشی سے کہا۔

”دراصل تمہارے یہ کپڑے۔“

”مجھے معلوم ہے کہ یہ انتہائی نامناسب ہیں اس ماحول میں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اس دیرانے میں بیٹھے ہو جہاں کچھ بھی نہیں ملتا۔“ وہ مزید خفا ہوئی۔

میں نے کہا۔ ”یار! اتنی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ویسے تو یہاں لاچار مسائل میں بیڈیٹ ہی استعمال کی جا سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم کی الحال ایک آدھ جزا ریشٹاں سے ادھار مانگ لو۔ مگر کوئی توبہ تو نہیں دیتا ملازمین کی اترن زیب تن فرماتا۔ لیکن مجبوری میں حرام بھی حلال ہے۔ جب تمہارے لیے شہر سے ملبوسات خریدے جائیں گے تو انہیں ایک کے بدلے دو جیتی جوڑے بخش دیا۔“

”یہ ٹھیک ہے، ریشٹاں کی اور میری ساخت میں کوئی

فرق نہیں۔“ فریال! ٹھٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آخروہ ہیں کہاں؟“

”وہیں ہوں گی۔ سر دھت کو اڑھیں اور کہاں۔“

”میں دیکھ کے آتی ہوں۔ ابھی تک تم نے مجھے حویلی بھی نہیں دکھائی۔ تجسس اور شوق سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔“

میں نے اسے چابیوں کا ایک سیٹ تمنا دیا۔ ”ایسے دو سیٹ ہیں۔ اب فاطمہ یار ریشٹاں کے ساتھ تم خود جب چاہو حویلی دیکھو۔ فاطمہ سے کہو کہ اکبر خاں کو ادھر پہنچ دے۔“

جب وہ چلی گئی تو میں نے راجا کو مختصر الفاظ میں وہ سب بتا دیا جو مجھے گزشتہ رات فریال سے معلوم ہوا تھا۔

”یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔ راجا نے ساری بات سن کے کہا۔ ”یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی ہے کہ فریال میرے پاس پہنچ گئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس نے مجھ سے بھی پوچھا تھا مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔“

”وہ تیرے انکار سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔“

”مجھے اس کا بھی اندازہ ہے لیکن اب فریال سے نہیں اس کا مقابلہ مجھ سے ہوگا۔ فریال میری ذمہ داری ہے اب۔“

”اس کا مقابلہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن ٹھیکے چتر! اس معاملے کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔ وہ یہاں کیسے رہے گی۔ اور جب یہ بات تیرے اماں ابا کو پتا چلی تو انہیں کیا جواب دے گا تو۔“

میں نے کہا۔ ”اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے میں نے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں انہیں سچ بتا دوں۔ ان سے کہوں کہ ان حالات میں یہ میرے لیے ناممکن ہے کہ میں فریال کو اکیلا چھوڑ دوں۔“

”وہ فریال کو بالکل پسند نہیں کرتے لیکن وہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے ہمارے پاس چھوڑ دو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بہت آسان حل تھا لیکن فریال کے تعاقب میں کتنے خطرات ہیں۔ فریال کے ساتھ ہی ان خطرات کا ٹارگٹ میرا گھر بن جائے گا۔ فریال کی حفاظت میرے والدین کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ خود مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ میں جانتے ہو جیسے انہیں خطرے میں کیسے ڈھک سکتا ہوں۔“

راجا نے کہا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں انہیں کچھ بتا ہی نہیں سکتا۔ ان کی مجھ سے محبت کا انداز اور پیانہ بالکل مختلف ہے۔ ان کے لیے

صرف میں اہم ہوں۔ میری سلامتی اہم ہے۔ وہ فریال سے میری جذباتی وابستگی کو محسوس ہی نہیں کر سکتے تو سمجھیں گے کیسے۔ ان کا تو بھی مطالبہ ہوگا کہ میں فریال سے لاطعن ہو جاؤں۔ وہ جانے اور سلطان جانے۔ کون سمجھا سکتا ہے انہیں۔“

”یار، اس کیس کا انجام کیا ہوگا۔ بلکہ اس جنگ میں جیت کس کی ہوگی؟ تیری اور فریال کی یا تیرے ماں باپ کی۔۔۔۔۔؟“

”شاید بالآخر وہی ان کی قربانی دس گے۔ ماں باپ بڑے مجبور لوگ ہوتے ہیں یار۔ خصوصاً اگوتے بیٹے کے۔ میری سوچ کا بے اندازہ بے رحمانہ حد تک خود غرضی پر مبنی ہے۔“ میں نے ایک گھری سانس لی۔ ”لیکن یہ ابھی سے سوچ کے پریشان ہونے والا معاملہ نہیں ہے۔“

”فریال کے بارے میں اماں کی رائے مزید خراب ہو جائے گی اگر انہیں معلوم ہو کہ وہ لندن سے آکر سیدھی تیرے پاس رہنے چلی آئی ہے۔“

”میں جانتا ہوں لیکن جب تک ممکن ہوگا میں یہ بات ان سے چھپاؤں گا۔ فوری طور پر افشاء راز کا خطرہ کوئی نہیں۔“

”اس کا امکان کم ہے لیکن اچانک کسی کا نازل ہو جانا بالکل ناممکن بھی نہیں ہے۔ تو اسے ہمیں اور نہیں رکھ سکتا۔“

”کہاں رکھوں؟ تیرے گھر میں یا شہناز کے پاس۔“

سلطان فوراً سراغ لگائے گا اور اس کے ساتھ شہناز کو بھی لے جائے گا۔“

”کوئی ایسی جگہ بھی تو ہو سکتی ہے جہاں سلطان کے فرشتوں کا خیال بھی نہ جائے۔ کسی کٹماں سے علاقے میں کوئی گھر۔ وہ کسی فحش کے ساتھ ہے ایک گیٹ کے طور پر ہے۔ یا کسی کوٹھی کا ایک پورشن ہو۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھ یار! ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن مجھے تیری وہی اسکیم اپنی کرنی ہے۔“

اس نے سر ہنجایا۔ ”میں تو ایک سو ایک اور ایک سے ایک شاندار اسکیم کا خالق ہوں۔ پتا نہیں تو کس کی بات کر رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ سلطان کے کارندے یہاں بھی پہنچ جائیں گے کسی دشواری کے بغیر۔ فریال کو ان سے چھپانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ انہیں یہاں دکھائی نہ دے۔“

”دوبی گڈ! ایسا کوئی جادوئی عمل ہے۔“

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول

سامراجیان

قیمت
800
روپے

صفحات 1200

رشتوں کے تقدس میں گندمی ہوئی
گھر بیلو کہانی۔
محبت کی چاشنی اور نفرت کے زہر
میں رچی کہانی۔
ہر گھر کی بہنوں، بیٹیوں اور ساسوں
کے لئے مشعل راہ۔

اردو ادب کی تاریخ کا سہ ماہی
اردو ادب کی تاریخ کا سہ ماہی

معمول ڈاک 50 روپے

برلا ولسٹنگٹن کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک
خرچ ادارہ کے نام پر آرڈر ڈرافٹ بنکر ارسال کریں

ناشر

ایکس پبلیکیشنز
ایکس پبلیکیشنز

۳۰ عروج گیت، اردو بازار لاہور 7247414 ©

آج اس نے قدرے حیرانی سے انگریزی میں پوچھا "آپ
کون ہیں؟"

میں نے حریف فرج چلائی "آپ نے کس نمبر پر رینگ کیا
ہے؟" بھر میں بات ٹوٹی پھوٹی انگلیش میں پوچھی۔

اس نے نمبر بتایا پھر بولا "یہ میرا تیل فون ہے۔"
میں نے آواز بنا کے کہا "تمہیں سوسیدو! یہ آپ کا فون
کیسے ہو سکتا ہے، یہ میرے پاس ہے۔"

"دیکھو سٹرا! میں اس فون کا مالک ہوں، یہ نمبر میرا
ہے۔"

میں نے کہا "یہ کیسی عجیب بات ہے۔ تم اپنے نمبر سے
خود کو فون کر رہے ہو اور میرے فون کو اپنا کہہ رہے ہو، کیا تم
نئے میں ہو؟"

سلطان نے کہا "لک میجر، جہیں یہ فون کہاں سے
لاؤ؟"

میں نے کہا "ملا کیا مطلب..... میں نے خریدا ہے بے
ڈوف کے بچے؟"

"کس سے..... کہاں.....؟"

"تم کیوں پوچھتے ہو؟ کیا تم پولیس میں ہو؟" میں نے
کہا۔

"دراصل یہ چوری ہو گیا تھا لیکن میں نے اس کی
رپورٹ نہیں کی کی۔ میں جانتا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ فون کس
سے خریدا تھا اور کہاں..... اور اس وقت کہاں سے بات
کر رہے ہو؟"

"تمہاری بات سمجھتا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ کیا تم
بگل ہو، سوسیدو! ہر شخص اپنے منہ سے یہ بات کرتا ہے۔"

"وفو! کس شہر میں ہو، کس ملک میں ہو؟"

میں نے کہا "روم میں اور میرا یقین ہے کہ روم ہمیشہ
ٹی میں رہا ہے۔ تم اب یہ پوچھو گے کہ روم کی کون سی سڑک،
کون سی گلی....."

وہ جھٹکا کے بولا "نہیں پوچھوں گا یا ر! یہ تو بتا دو کہ فون تم
ساکس سے خریدا تھا؟"

"ہاں، وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ اس کا نام تو مجھے
نہیں یاد تھا۔ وہ میرے ساتھ سو رہی تھی..... اور....."

وہ چلا "تمہارے ساتھ سو رہی تھی....."

میں نے سادگی سے کہا "ہاں، اس میں غصہ ہونے والی
بات نہیں۔ میں نے اس سے نہیں کہا تھا کہ آؤ میرے
گھر چلو۔"

اس نے جڑ ہو کے کہا "اتنا خوبصورت ڈریس ہے۔
کمی کمی کرنے کی کون سی بات ہے راجا!"

راجا نے اپنی لمبی روک کی "کس نے مشورہ دیا تھا تمہیں
یہ دلہنوں والا لالہ جوتا پہننے کے لیے۔"

وہ ڈانٹ کے بولی "ریشماں نے اور اس کی ماں نے۔
انہوں نے کہا کہ مجھ پر بہت اچھا لگے گا اور غلط تو نہیں کہا
تھا۔"

"فریال! تم نکاح سے پہلے گھر سے بھاگ آنے والی
دلہن لگ رہی ہو اور کپڑے نہیں تھے ریشماں کے پاس؟"

"تھے..... مگر جب انہوں نے اتنی محبت سے کہا تو میں
کیا انکار کر دیتی؟" فریال خفا ہوئے گی۔

"یعنی اب تم اس مشکل خیر طبعے میں پھرو گی؟" میں نے
کہا۔

وہ چرمی "ہاں، پھروں گی۔ کسی کی پروا نہیں ہے مجھے۔
مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

فریال واک آؤٹ کرنے کی والی تھی کہ کمرے میں
میوزیکل رنگ فون کو گنجے گی۔ فریال بری طرح چوگی "میرا
خیال تھا کہ فون آف ہے۔"

میں نے کہا "یہ سلطان والا سل فون ہے۔"

فریال نے اقرار میں سر ہلایا "بچتے دو۔ خود ہی بند
ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ایک منٹ..... فون مجھے دو۔"

"وہ پچھان لے گا تمہاری آواز" فریال نے خوف زدہ
لہجے میں کہا۔

میں نے ریسپور آن کر دیا۔ لندن میں قیام کے دوران
میں نے ایک لیکنو کچ اسکول سے فرج کیسی بھی۔ اس کا مشورہ
مجھے عائشہ کے باپ نے دیا تھا۔ دو بین الاقوامی زبانیں
جاننے سے کاروباری دنیا میں بہت فائدہ ہوتا ہے اور
انگریزی کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان فرج
ہے، ممکن ہے ایک انگریز کی حیثیت سے میں تعصب سے کام
لے رہا ہوں۔ شاید فرج کے بعد انگلیش ہو لیکن یہ مشورہ انتہائی
خلوص سے دے رہا ہوں" لاڈل ڈانٹ نے کہا تھا اور بالکل
ٹھیک کہا تھا۔ فرج میں مہارت میرے بہت کام آئی۔

میں نے فرانسیسی لب و لہجے میں سوال کیا "ہیلو۔ سوسیدو،
ٹاں ہال سارتر آپ سے مخاطب ہیں۔"

جلدی میں میری زبان پر اس تعظیم فرانسیسی ادیب اور
منکر کے سوا کسی کا نام ہی نہ آیا لیکن سلطان ایک جاہل آدمی
تھا۔ اسے اردو ادب پتا نہیں تھا تو فرانسیسی نام کیا سمجھ میں

میں نے کہا "ہم اس کی جنس بدل دیں گے۔"
راجا نے چٹکی بجا لی۔ "رائٹ..... فریال کے بجائے
مسٹر فریال ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں، بے خوف و خطر۔ وہ
پنٹ شرٹ کے مقابلے میں مردانہ شلوار تھیں پہنے کی تو بالکل
پتا نہیں چلے گا لیکن ایک مسئلہ ہوگا آواز کا دوسرا لہجہ کا۔"

"ہالوں کی اسے قربانی دینی ہوگی۔ زلف بنگال ٹائپ
پال ہیں۔ شولڈر تک دو بارہ آسانی سے ہو جائیں گے۔ ابھی
وہ بوائے کٹ کرالے۔ آواز ممکن ہے کچھ دن محکمہ خیر گئے
مگر یہ کوئی انوکھی بات نہیں سمجھی جائے گی۔ بہت سے لوگوں کی
زنا نہ آواز ہوتی ہے۔ احتیاط اسے کرنی ہوگی گفتگو میں۔ آئی
ہوں، جاتی ہوں سے آتا ہوں، جاتا ہوں وغیرہ بولنا
ابتدا میں اس کے لیے مشکل ہوگا۔"

راجا جسا "یہ ڈبل رول بھانا واقعی آسان نہیں ہوگا۔
دن میں مردانہ رول سب کے سامنے، رات کو ہمارے ساتھ
زنا نہ۔"

"لیکن بجاؤ کی بھی صورت سب سے بہتر ہے۔ جس
میں مجھے کوئی رسک نظر نہیں آتا۔"

"فریال مان جائے گی؟" راجا سوچ کے بولا۔

"میں کہوں گا تو کیوں نہیں مانے گی۔ نہیں یہاں سے
کچھ لوگ بھرتی کرنے ہوں گے۔ مختلف کام کرنے والے۔
ہم کہہ سکتے ہیں کہ فریال انٹیریور ڈیزائنر ہے، ڈیکورٹر ہے۔
اسے فرخ کے ساتھ لگایا جاسکتا ہے تاکہ وہ خویلی کے اندر ہی
رہے اور اس کا عام لوگوں سے رابطہ نہ ہو۔ اسے کوئی محنت
طلب کام بھی نہ کرنا پڑے۔"

"میں، یہ آئیڈیا چلے گا۔ بلکہ دوڑے گا۔" راجا بولا۔

میں نے کہا "وہ ذہن اور محنت لڑکی ہے اور حالات سے
لڑنے کا جتنا حوصلہ رکھتی ہے۔ وہ شاید مجھ میں بھی نہیں ہے۔"

اسی وقت وہ خاتون نازل ہوئیں جن کی تحریف ہو رہی
تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو میری نظر دھوکا کھا گئی۔ خود راجا
پوچھ کر رہ گیا۔ وہ ریشماں سے مانگ کے کوئی جوڑا پہننے لگی
تھی اور اب وہ ہمارے سامنے دلہنوں جیسا سرخ ریشمی غرارہ
سوٹ پہنے کھڑی تھی۔

"ہیلو....." اس نے راجا کو اور مجھے متوجہ کرنے کے
لیے ہاتھ ہلایا "مجھے پتا تھا تم لوگ دم بخود رہ جاؤ گے" اس
نے ایک الماری کے قد آدم آئینے کے سامنے دائیں بائیں
محموم کے خود کو دیکھا اور فنی "بائی گاؤ! کتنی خوبصورت لگ
رہی ہوں میں۔ کیوں روہو!"

مجھے اور راجا کو ایک دم ہلکی آئی "یہ کیا ہنسن آئی ہو تم؟"

”کیا تم کہہ رہے ہو۔۔۔ وہ خود آ کے سوگئی؟“
 ”بس موسیٰ! خود ہی آئی ہوگی۔ دراصل جب میں پہنچا تو وہ پہلے سے سو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ سو گیا۔“
 ”یو ہاں؟“ وہ جھج کر بولا۔

میں نے کہا ”غالباً تم کچھ اور سمجھ رہے ہو۔ وہ ایر پورٹ کا لائیج تھا جہاں وہ انتظار کر رہی تھی اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔ میں اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ مجھے بھی نیند آ گئی۔ ہم ساتھ سو رہے“ راجا اور فریال کا ہنسنا منہ کرنے سے برا حال تھا۔

”کون سے ایر پورٹ کی بات کر رہے ہو؟“
 ”وہ مجھے بڈاپسٹ میں ملی تھی۔“

وہ حیرانی سے بولا ”رومانیہ میں۔۔۔ وہاں وہ کیا کر رہی تھی؟“

”اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نوکیو جائے گی۔ ہم نے ایک نیپل پر کافی ساتھ چلی تھی۔ اسے جیسوں کی ضرورت ہوئی۔ اس نے فون مجھے سوڈا لارز میں جج دیا۔۔۔ اور ہاں، بڈاپسٹ، ہنگری میں ہے۔“

”جھوٹ بول رہے ہو تم۔“ سلطان نے دھاڑ کے کہا۔

میں نے کہا ”موسیٰ۔ تم کسی سے بھی معلوم کرلو۔ بڈاپسٹ ہنگری میں ہی ہے، رومانیہ میں نہیں۔ تم کو شرم آئی چاہیے کہ مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔“

”نہیں۔۔۔ تم غلط سمجھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسے جیسوں کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ اس کے پاس لاکھوں ڈالرز تھے، چوری کے۔“

”گویا چوری کا موہا بل فون جج کے اس نے اپنی دولت میں مزید سوڈا لارز بوجھا لیے، دیری گز۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔“

”کیا تم مجھے اس کا حلیہ بتاؤ گے؟“
 ”وہ اغڑن تھی۔ ساڑی اغڑا کا ڈریس ہے۔ اس کا قد ہوگا پانچ فٹ۔“

”نہیں۔ تم یاد کرو۔ وہ ساڑھے پانچ فٹ سے زائد ہوگی۔“

”اسے میں نے دیکھا تھا یا تم؟ وہ پانچ فٹ سے ایک انچ کم ہو سکتی ہے، زیادہ نہیں۔۔۔ اور وزن اس کا ہوگا ایک سو نوے پچانوے پونڈ کے درمیان۔ رنگ سرینا دلیم جیسا تھا۔ وہ جو بلیک تیس اشارے۔۔۔“

سلطان نے مجھے ایک گالی دی ”اور تم اسے خوبصورت

خاتون کہہ رہے ہو۔۔۔ اس موٹی کالی بھینس کو۔“
 ”آف کورس! مجھے ایسی ہی خواتین حسین لگتی ہیں۔“
 میں نے اسے جوابی گالی فرج میں دی مگر وہ فون بند کر چکا تھا۔

فریال نے ہنسی پر قابو پانے کے بعد کہا ”آواز تو بہت اچھی بتائی تھی تم نے۔۔۔ لیکن وہ چلاک آدمی ہے۔“
 راجا بولا ”فرج اور انگریزی کا آلیٹ خوب بنایا تو نے۔ سالانہ فوٹو ہوا ہوگا۔“

میں نے کہا ”اب سوچنا رہے کہ فریال سے وہ موہا بل اس حینہ کے پاس کیسے پہنچا جو بڈاپسٹ سے نوکیو جا رہی تھی۔ اگر فریال بھی وہاں تھی تو آگے کہاں گئی؟“
 ”تم نے تو کہا تھا کہ کال نہیں ہو جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں۔۔۔ لیکن یہ بہت مشکل اور پیچیدہ آلات کی مدد سے ممکن ہے۔ سیٹلائٹ ریسیورنگ اسٹیشن پر ہی دیکھا جاسکتا ہے کہ کسٹل کی کیا ڈائریکشن ہے۔ وہ بھی اسی وقت جب جھنگٹو جا رہی ہو۔“

راجا نے کہا ”لیکن اسے ہلاک کیا جاسکتا ہے۔ ہریٹ کا ایک مخصوص سیریل نمبر ہوتا ہے۔ اس سے سیٹ کو ناقابل استعمال بنادیا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”اب سلطان اور کچھ تو کر نہیں سکتا۔ سیٹ کو ضرور بند کرادے گا۔ اس سے پہلے کہ یہ ہمارے لیے بے مصرف ہو جائے، کیونکہ میں ایک انٹرنیشنل کال کرلوں۔ پتا نہیں کر ڈیٹ پینل کتنا ہے؟“

فریال نے سیٹ مجھ سے لیے لیا اور چیک کرنے کے بعد بتایا ”اب ایک سو گیارہ پونڈ زبانی ہیں۔ سلطان کی کال آنے سے پہلے ایک سو چالیس تھے۔“

”یعنی آئینس پونڈز کال ریسیور کرنے میں خرچ ہو گئے۔“ میں نے کہا اور بادداشت کی مدد سے لندن میں عائشہ کا نمبر ملایا۔ زمین سے خلا تک اور پھر خلا سے زمین تک رابطے میں میری آواز نہ جانے کتنے انٹرنیٹ روک راستوں اور دیلوں سے گزر کر ایک منٹ بعد عائشہ کے فون کی صفحہ پر آ گئی۔ رنگ جاتی رہی، جواب کوئی نہ آیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ شاید وہ سو رہی ہوگی۔ لندن میں صبح کا آغاز اچھی ہوا

ہی ہے۔ آج چھٹی بھی نہیں ہے اور دیسے بھی عائشہ کو سو نے کی عادی نہیں ہے۔ پھر کیا بات ہے؟ یہ تو ہمیشہ رات کے مجھے نمبر بھول گیا ہو۔ نمبر میرے دل پر نقش تھا۔ رات دن استعمال ہوتا تھا۔ اکثر صفحہ پر بھی تو آئی آئی اسکرین پر سامنے آتا تھا۔ کہیں اس کا نمبر تو نہیں بدل گیا؟ اس کی ماں

بت چلاک ہے، مجھ سے رابطے کو منقطع کرانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے حالانکہ کسی کا یا سیل فون نمبر معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور پھر عائشہ کب ایسا ہونے دے گی، یہ نمبر اس کے پاس شروع سے ہے۔ پھر کیا اس نے موہا بل بند کر رکھا ہے؟

یہ سب خیالات میرے ذہن سے اس مختصر وقت میں گزر گئے جو نمبر ملانے سے پانچ بار صفحہ کی آواز سنائی دینے اور کال ڈس کنیکٹ ہونے کے درمیان حائل تھا۔

فریال نے کہا ”چھوڑو، وہ بات کرنا ہی نہیں چاہتی تم سے۔“

میں نے کہا ”وہ نہ چاہے۔۔۔ میں تو چاہتا ہوں“ اور دوسری بار اس کے باپ لارڈ ارلٹ کا نمبر ملایا۔ صفحہ دوبارہ آئی۔

پھر لارڈ ارلٹ نے ہماری خوابیدہ آواز میں کہا ”ہیلو!“

میں نے کہا ”گنڈ مارنگ سر! رفیق بھیر۔ فرام پاکستان۔“

”اوہ ہیلو۔ تم نے صبح صبح کال کیا؟“ لارڈ ارلٹ نے آواز میں ہلاکت پیدا کی ”اپوری صبح اگے؟“

”اوہ یس! شاید میں نے تمہیں سو نے سے جگا دیا؟“
 ”اوہ نو۔۔۔ میں اٹھ گیا تھا۔“

میں نے کہا ”تمہیں کال کرنے سے پہلے میں نے ناشتہ کال کیا تھا لیکن بات نہیں ہو سکی۔“

اس نے کہا ”ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا سیل فون نمبر نہیں رہا جو پہلے تھا۔“

میں نے کہا ”اسے نمبر بدلنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔“

”یہ اس کا قصور نہیں تھا۔ دراصل پہلے تو اس کا فون نمبر کھو گیا تھا۔ خیر اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اس نے دوسرا آؤٹ لیا اور مجھ سے اس کا اور بجٹل نمبر برقرار رکھا لیکن پھر کچھ یاد ہو کر۔“

میں نے کہا ”تم رک کیوں گئے؟“
 ”دراصل کمرے کے اندر آواز کچھ صاف نہیں آ رہی تھی اس لیے میں ڈرا بھا ہوا گیا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا عائشہ کو کہ تم کال کر آئیں۔ OBNOXIOUS دھمکیاں ملنے لگیں۔“

میں نے کہا ”لندن پولیس کے لیے ان کا پتا چلانا کیا مشکل تھا۔“

”یس۔۔۔ لیکن پاکستان میں شاید یہ بہت مشکل ہے۔“
 میں نے چمک کے کہا۔ ”پاکستان کی کیا بات ہے؟“
 ”کال پاکستان سے کی گئی تھی۔“ لارڈ نے کہا۔
 ”پاکستان سے۔۔۔ آرویشور۔۔۔“

وہ بولا۔ ”اس کا ثبوت مل گیا تھا۔ نمبر بھی مل گئے تھے جہاں سے کسی نے کال کیا لیکن مجھے یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی جب ان کو ٹریس نہ کیا جاسکا۔ پولیس نے کہا کہ کنکشن جھٹی تھے۔ یہ بات پہلے میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہاں کونسلٹ کے ایک رکن نے وضاحت سے مجھے بتایا کہ یہاں لوگ فرض نام اور پتے سے کنکشن حاصل کر لیتے ہیں۔ عام طور پر جرائم پیشہ افراد اپنی شناخت چھپانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ حکومت نے کچھ تحقیق کی مگر اب بھی صورت حال

دہی ہے۔ لوگ قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ میں غلط تفصیلات دیتے ہیں۔ ایک شخص مختلف ناموں سے کئی شناختی کارڈ حاصل کر سکتا ہے۔ شناختی کارڈ جھٹی بھی بنائے جاتے ہیں جو اصل جیسے لگتے ہیں۔ آئی ڈی ٹنٹ نو یہ کیسے ہوتا ہے۔ پولیس کے علاوہ دوسرے ایجنسی جس کے ادارے بھی تو ہوں گئے۔“

میں نے کہا۔ ”ان کی بات چھوڑیں۔ پاکستان میں رشوت دے کر آپ نامکون کو ملنے دیتے ہیں۔“

”عائشہ کو آٹھ کالز موصول ہوئیں جو آٹھ مختلف نمبرز سے کی گئی تھیں۔ کوئی بھی پکڑا نہیں گیا۔ انا نقصان یہ ہوا کہ کال کرنے والا یا کال کرنے والے عائشہ کو سمجھانے لگے کہ وہ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر بھروسہ نہ کرے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ سب ان کی صفحہ میں ہیں۔ اسے زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ کیا کہتے تھے؟“

”ایک ہی بات، پاکستان آنے کا خیال چھوڑ دو۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ پاکستان میں کتنی لاقانونیت اور دہشت گردی ہے۔ سفید فام یہاں کیسے غیر محفوظ ہیں۔ خود کش حملوں کی کتنی وارداتیں ہو چکی ہیں۔“

”ادمانی گاڈ! کیا تم بھی ایسا سمجھتے ہو؟“

”میں کیا کروں۔ میں تم کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے بارے میں میری رائے ہمیشہ بہت اچھی رہی اور ابھی ہے شاعر مسلمان اور پاکستانی تو بھان ہیں۔ سب بہت اچھے ہیں لیکن ایک کسٹری کا امپریٹن خراب اس دہشت گردی کو مسلح جنگ کہہ دے تو پھر جو کچھ عراق، افغانستان یا پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اس کے خلاف میرا رد عمل ایسا کیسے

ہوسکتا ہے۔ تم تو جانتے ہو میں لائڈب آدی ہوں۔ کسی بھی مذہب پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس سے کیا فرق پڑسکتا ہے۔ اکثریت تو میری ہے۔“

”کیا تم مجھے دہنبردے سکتے ہو؟“

”کیوں؟ تم کیا کر دے گے۔ انہیں تلاش کر کے قتل کر دو گے۔ نہ تم سرانگرساں ہوں اور نہ تم اس سے زیادہ اثر رسوخ رکھتے ہو جو پرنس کو سلیف اور سفارت خانے نے استعمال کیا۔ حکومتی سرپر دہاؤ تھا مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ میرے پاس وہ نمبر نہیں ہیں۔ شاید پولیس کے پاس ریکارڈ ہوگا۔ چھوڑو ہم نے وہ نمبر بدل دیا اور یہ نیا نمبر بھی آبروروشن پر رہتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ہر بات ریکارڈ ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے گھر کے یا آفس کے دوسرے نمبرز آبروروشن پر ہیں یا نہیں۔ تم محتاط رہو تو بہتر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن لارڈ ارلست کیا ان دھمکی دینے والوں نے عائشہ کے خیالات بدل دیے ہیں؟ اس نے پاکستان آنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔“

”ابھی تک ایسا نہیں ہوا لیکن پہلے صرف اس کی ماں مخالف تھی۔ اب میں بھی نہیں چاہتا کہ وہ پاکستان جائے۔ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں ڈر گیا ہوں۔“

”کیا تم یہ چاہو گے کہ میں بھی اسے روکوں؟“

”شاید یہ تمہارے لیے آسان نہ ہو۔ اس کے علاوہ فیصلہ کرنے والی خود عائشہ ہے۔ اگر وہ جانا چاہے تو اسے حکومت بھی نہیں روک سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن حکومت پاکستان روک سکتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”عائشہ کو زیر اندہ کر کے۔“

”تم بھول رہے ہو سن کہ دہزادہ لے چکی تھی۔ وہ تمہارے ساتھ جاری تھی یا نہیں؟ وہ کسی بھی جہاز میں سوار ہو سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجددہ کیوں رکی ہوئی ہے؟“

”اپنی ماں کی وجہ سے۔“ لارڈ ارلست نے ایک آنکھ مچھری۔

”جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے بھی ماں کی پروا نہیں کی۔ ماں کی بات کا الٹا اثر ہوتا تھا۔“

”نو آر اسٹ! لیکن ہم سب جذباتی بلیک میلنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دلیل سے اور الفاظ سے مقابلے پر ڈٹے رہتے ہیں۔ سیلیا نے اپنا آخری پتا کھل دیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ وہ بازی جیت سکے گی یا نہیں۔ اس نے عائشہ کو

دھمکی دی کہ اگر اس نے انڈیا..... میرا مطلب ہے پاکستان جانے کا ارادہ ترک نہ کیا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔ ظاہر ہے عائشہ نے اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ سیلیا کو ایسا کرنا پڑا۔“

”کیا مطلب؟ اس نے.....“

”نہیں! اس نے آسان راستہ اختیار کیا۔ وہ سلیپنگ بلیو کھاتی ہے۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں نگلی ہیں۔ جو عادی نہ ہو وہ نصف مقدار پر ہلاک ہو جاتا۔ اسے ڈاکٹروں نے بچایا لیکن اس کے ذہنی اور اعصابی نظام کو ناقابل حلانی نقصان ہوا۔ وہ جزوی طور پر فنانج کا شکار ہے۔ سہارے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس کے ہاتھ کا پتہ نہیں ہے۔ عجیب قسم کے دورے پڑتے ہیں۔ اس کی نظر دھندلا جاتی ہے۔ کچھ پرانے واقعات کو وہ ایسے دیکھتی ہے جیسے سب کچھ ابھی ہو رہا ہو۔ کبھی بالکل بلیک ہو جاتی ہے۔ بھول جاتی ہے کہ وہ کھانا کھا چکی ہے، پھر کھا لیتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بہت افسوس ہوا یہ سب جان کے۔ مجھے پتا نہیں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”کچھ نہیں، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سب تمہاری وجہ سے ہوا مگر میں ان سے بالکل اتفاق نہیں کرتا۔“

میں نے کہا۔ ”میں عائشہ سے بات کروں گا۔ مجھے اس کا نمبر پتا دیں۔“

”اس کی ذہنی کیفیت بھی بہت عجیب ہے۔ وہ احساس جرم کا شکار ہے مگر یہ بھی سمجھتی ہے کہ ماں اس کے ساتھ دشمنی کر رہی ہے۔ پتا نہیں اس کا انجام کیا ہوگا، تم نمبر لکھو۔“

میں نے نمبر لکھنے کے بعد کہا۔ ”اس وقت وہ کیا کر رہی ہے؟“

”سورہی ہوگی لیکن تم سے بات کرنے کے لیے وہ جاگ سکتی ہے اور رہتی! اگر تم اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکو تو یہ مجھ پر احسان ہوگا۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ محفوظ ہوگی مگر اب یہ سوچتا ہوں کہ اس کے ساتھ شاید خودم بھی غیر محفوظ ہو جاؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے سرکہ آپ کچھ ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہے ہیں۔ سیاسی اسباب کی بنا پر چند واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل غلط ہوگا کہ پاکستان میں کوئی غیر ملکی محفوظ نہیں۔ یہاں سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں کی غیر ملکی بیویاں ہیں۔“

”کیا تم یہ عندیہ دے رہے ہو کہ تم اس سے شادی کر دو گے؟“ لارڈ ارلست نے کہا۔

”میں نے ایسا نہیں کہا۔“

”ایک غیر ملکی بیوی کی بات مختلف ہوتی ہے۔ تمہاری سوسائٹی اسے قبول کر لیتی ہے۔ عائشہ نے تمہارا مذہب بھی اختیار کر لیا ہے لیکن یہ باتیں عام دہشت گرد نہیں جانتا۔“

میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ عائشہ کے ساتھ پاکستان آنے کے خودمورت حالات کا جائزہ لیں۔ یہ ڈیڑھ سو ملین انسانوں کا ملک ہے۔ کراچی میں چہرہ ملیں اور لاہور میں دس ملین لوگ رہتے ہیں اور یہ شہر کسی طرح بھی لندن سے کم نہیں۔“

”میں مانتا ہوں لیکن رفیق! یہ عقل اور دلیل کا نہیں، جذبات کا مسئلہ ہے۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”او! میں اسے سمجھاؤں گا۔ پہلے بھی سمجھا رہا ہوں۔ تمہارے لیے پھر کوشش کروں گا کہ وہ پاکستان نہ آئے۔ حالانکہ پہلے ایک ذاتی وجہ تھی، اب اسے روکنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک غلط موقف کو تسلیم کر رہا ہوں۔ ان سب کا ہوا این کیا ہوں جو پاکستان کو دہشت گردی کی آماجگاہ کہتے ہیں۔ یہ میرے یقین کے خلاف ہوگا۔“

”کبھی آدمی کو مصلحت دیکھتے ہوئے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ مجبوری میں اصولوں سے بھی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے جیسے ہم نے کیا تھا۔ جب عائشہ نے تمہارے لیے اپنا مذہب، ملک اور خاندان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”وہ اخلاقی نہیں قانونی مجبوری تھی۔ تمہاری بیوی نے تو ابھی تک سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ میرے خلاف نفرت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے محبت اور نفرت کی جنگ میں فتح کس کی ہوتی ہے؟ بالآخر۔“

”شاید مجھے کہنا چاہیے کہ محبت کی۔“

میں نے کہا۔ ”لارڈ ارلست! مجھے شک ہے کہ تمہاری بیوی نے بڑی لمبی جنگ کی حکمت عملی بنائی ہے۔ وہ ہار کو قبول نہیں کرے گی۔ موت کو قبول کر لے گی خواہ موت میری ہو، بیٹی کی یا اس کی اپنی۔“

”میں تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔ وہ ضدی عورت اپنی حکمت کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ اس کی فطرت ہے جو بدل نہیں جاسکتی۔“

میں نے کہا۔ ”اپنی جیت کو قیمتی بنانے کے لیے اس نے پہلے بھی سازش کی تھی۔ یہ بھی مجھے اس کی سازش نظر آتی ہے۔ اس نے کسی سے فون کرائے ہوں گے۔ دھمکیاں دلائی ہوں گی۔“

”لیکن وہ تو پاکستان میں کسی کو نہیں جانتی۔“

”آپ کسی نادانی کی باتیں کرتے ہیں لارڈ ارلست! ہر ملک میں ہر کام اجرت پر کرنے والے مل جاتے ہیں۔ کرائے کے قاتل دستیاب ہوں تو پھر باقی جرائم کی کیا حیثیت ہے۔ تمہاری بیوی اپنی دولت اور اپنا اثر رسوخ دونوں کو خفیہ انداز میں استعمال کرنا جانتی ہے۔ ممکن ہے یہاں کونسلٹ میں اس کا کوئی محدود رجسٹر ہو جس نے اس کی مدد کی ہو۔“

”اس طرف میرا دھیان نہیں کیا تھا۔ ایسا ہو سکتا ہے رفیق! کیونکہ ایک شخص ہے جو سیلیا کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آج بھی.....“

مجھے لارڈ ارلست کے لہجہ میں رقابت کی بو آ رہی محسوس ہوئی۔ ”کون سے وہ؟“

”اس کا آکسفورڈ کے زمانے کا ایک دوست..... میں معلوم کروں گا اور تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“ اس نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں نے پھر چیک کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کریڈٹ بیلنس تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ شاید چند منٹ بعد لائن خود بخود ڈس کنکٹ ہو جاتی۔ اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ میں عائشہ سے بات کر سکوں۔ اس بات کا امکان ہی نہ تھا کہ سلطان دوبارہ فون کرے۔ میں نے فون کو پیچھے سے کھول کر سم کا دل دی۔

تیا کلکشن لینے تک ریون سیٹ بھی بے کار ہو چکا تھا۔ باہر فرخ کے ساتھ دو اجنبی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نسبتاً عمر رسیدہ اور بھاری بھر کم شخص شلوار قمیض پر کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ قراقری ٹوپی اور پٹادوری سینڈل کے ساتھ وہ خالص ٹھیکیدارانہ اطوار کا مالک تھا۔ دوسرا تینز اور ٹی شرٹ میں اسٹارٹ سالو جوان تھا۔

فرخ نے پہلے میرا تعارف کرایا۔ ”یہ ہیں رفیق! احمد شیرازی۔ اس حویلی اور جاگیر کے مالک، پاورڈ سے ایم بی اے، لندن سے آئے ہیں اور یہ سردار گل باز خان۔“

گلخان نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”میں پائدر کنکسریشن کمپنی کا اور پائدر سینٹ فیکٹری کا مالک ہوں اور یہ ہے میرا بیٹا شہباز خان۔ یہ بھی امریکا سے پڑھ کے آیا ہے، انجینئر ہے، اب بی بی سارا کام سنبھالتا ہے۔“ شہباز نے بھی مجھ سے معافی مانگی۔ وہ ایک خوش مزاج اور ذہن آدمی تھا۔ باپ پرانے وقتوں کا آدمی تھا جس نے کسی ڈگری یا ٹیٹل کے بغیر بہت اعلیٰ سطح سے کاروبار شروع کیا ہوگا لیکن اس نے کامیابی کے ساتھ مستقبل کی ایسی پلاننگ کی تھی اور اپنے بیٹے

کو جد یہ خطوط پر کاروبار چلانے اور پھیلانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ کوئی بہت بڑا پروجیکٹ نہیں ہے۔“
شہباز نے کہا۔ ”لیکن یہ دلچسپ جگہ ہے۔ اس ماحول نے مجھے بہت Fascinate کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”فرخ نے یہاں ہمیں کام کی نوعیت سمجھا دی ہوگی؟“

”نہیں سر! ہمیں اس تاریخی جگہ کو RENOVATE کرنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”رائٹ! کسی بھی تاریخی جگہ کی تعمیر نو میں اس بات کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے کہ اس کی اور جتنی بھی ضرورت ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں بھی قدیم عمارات کی ظاہری شکل و صورت کو تبدیل کرنا قانونی جرم ہوتا چاہیے۔ جیسا کہ اٹلی اور بعض دوسرے ممالک میں بھی ہے۔“ شہباز نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”اگر تم اس کی اہمیت کو سمجھتے ہو تو میرا خیال ہے کہ یہ یو آر رائٹ مین فار دس جاب!“

وہ مسکرایا۔ ”بات یہ ہے مسٹر شیرازی کہ پاکستان میں اب وضع دار یا اعلیٰ ذوق کے حامل لوگ نظر نہیں آتے۔ نو دلہے کسی قدیم حویلی کو کھنڈر سے زیادہ نہیں سمجھتے اور اسے گرا کے ایک جدید انداز کا اسٹیل اور گلاس کا اسٹرکچر کھڑا کر دیتے ہیں جیسے کہ شکاگو سے ٹوکیو اور لندن سے سنگاپور تک نظر آتے ہیں۔ اگر روم سے سینٹ پٹرز برگ تک تمام عمارات کو گرا دیا جائے تو کیا سن رہا ہے گا دنیا میں۔“

اس کے باپ نے شہباز کو گھورا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں کام کی بات کرنی چاہیے۔“

شہباز نے جلدی سے کہا۔ ”سوری سر! میں شاید کچھ زیادہ بول گیا، تاہم میں نے آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔“

”ہم انشا اللہ بعد میں بھی آپ سے مشورہ کرتے رہیں گے۔ آپ کی رائے زیادہ اہم ہے۔“ گل باز خان نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ ہمارے درمیان ایک لوگ ٹرم باؤنڈ ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ہو سکتی ہے اور ضرور ہوگی۔“ شہباز نے کہا۔
وہ ایک روبرو اجڑا جوان تھا جس کے کامیاب مستقبل کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔ اس کے باپ نے جائز طور پر اس

سے توقعات وابستہ کر رکھی تھیں اور وہ ان پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میرے نزدیک کاروباری تعلقات کے فروغ میں اس کی تعلیم سے زیادہ اس کی پرسنل سٹائز کرنے والی شخصیت اور اچھے میزبانی کی بنیادی اہمیت تھی۔

راجا نے کہا۔ ”دراصل ہمارے مستقبل کے کچھ پلان ہیں۔ مسٹر فرخ آپ کو بتا سکتے ہیں۔“

مجھے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ابھی تک میں نے راجا کو متعارف نہیں کرایا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ راجا ہیں۔ میرے دوست، دست راست اور سب کچھ۔“

”یہ کہاں کے راجا ہیں؟“ گل باز خان کچھ مرعوب ہو کے بولا۔

میں نے کہا۔ ”یہ دنیائے صحافت کے راجا بلکہ مہاراجا ہیں لیکن یہاں میرے تمام معاملات کے نگراں ہیں۔“

شہباز نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”آپ کا نام تو بہت مٹا ہے۔“

فرخ ان باپ پیٹا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ فریال اندر غرارہ لہرائی پھر رہی تھی اور تجربہ کار ہوئی شجر کی طرح فاطمہ اور اس کی بیٹی ریشماں کو امور خانہ داری کے بارے میں تفصیلی ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ ٹوٹ بک میں کچھ لکھی جارہی تھی۔

ابھی دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ میں نے راجا سے مشورہ کیا۔ ”کیا خیال ہے۔ ہم ریاست کا ایک راؤنڈ لگائیں۔“

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”اس وقت کا اس سے بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ جب لے کر چلتے ہیں۔“

خون سے بنائی جانے والی جیب مضبوط اور خوبصورت ہی نہیں کارکردگی میں بھی لا جواب تھی۔ اس کی سٹینل آرام دہ تھیں۔ اسٹیمپ اور سسپنشن بہتر بن تھے اور انجین بہت جاندار تھا لیکن ایک تو اس کی صحت نہیں تھی، دوسرے یہ کار کی طرح پر آ سائیں نہیں تھی۔

میں بلند وبالا صدر دروازے سے نکلا تو مجھے مغرب کی طرف اپنے بالکل سامنے دریا نے کنہار کا جموے والا پل دکھائی دیا۔ دریا جو اب سمت گردی سے بھی کم رہ گیا تھا، مشرق کی طرف سے آتا تھا۔ مشرق کی جانب اس کا پانی بہت وسیع تھا اور پانی تین دھاروں میں تقسیم ہو کے بہتا تھا۔ درمیان کی خشک سرنگ پر سگرے اور گول پتھر پھینچے ہوئے تھے اور کہیں کہیں خورد پودے بڑھ کر جھاڑیوں کی طرح پھیل گئے تھے۔ پل کے قریب تینوں دھارے سمت کر ایک

ہو جاتے تھے۔ یہاں پانی کم تھا چنانچہ گہرائی کچھ زیادہ تھی۔ پل کے نیچے سے گزر کے دریا نے کنہار پہاڑی کے سرخ چکر لگا تھا اور اس کا پانی بھر بدرجہا پھیلا جاتا تھا۔

باہر آتے ہی میں نے بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ جنوب کی طرف چٹان شروع کیا۔ حویلی کی بیریڈر فیصل کے ختم ہونے ہی سیاہ چٹروں سے نئی ہوئی وہ دیوار شروع ہو جاتی تھی جس کی بلندی کہیں بھی دو فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ بعض جگہ یہ اونچائی صرف ایک فٹ رہی تھی۔ استاد اوزمانہ کے باعث برائی دیوار کے پتھر جھڑ گئے تھے۔ یہ دیوار محض حد بندی کے لیے تعمیر کی گئی ہوگی چنانچہ اس کی مضبوطی کو مقدم نہیں سمجھا گیا تھا۔

دیوار کے دونوں جانب آنے والی گھاس پھوس اور جنگلی جھاڑیاں بھی صاف نہیں کی گئی تھیں چنانچہ حد بندی کی دیوار جگہ جگہ غائب ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کے باہر باہر اپنا سفر جاری رکھا۔ وہاں کوئی راستہ نہ تھا۔ سخت زمین تھی جس پر خشک چوں، کانٹوں اور ٹوٹی ہوئی شاخوں کے ساتھ جنگلی بڑی بڑی چٹانوں اور خشک و خشاک کا فرش بچھا ہوا تھا۔

جیب کے تاڑیے ہی دوش اور گز راستوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ جیب چھوٹی موٹی جھاڑیوں اور دوسری رکاوٹوں کو کھینچے ہوئے آگے بڑھتی تھی۔ کئی جگہ لمبے درختوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرنا پڑا۔ اس کے لیے کبھی میں دائیں طرف گھوم کے پھر اندازے سے واپس بائیں طرف آ جاتا تھا تو بعض اوقات واپس جا کے نئے سرے سے نیا راستہ تلاش کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔

کئی جگہ درختوں کی شاخیں اتنی کم بلندی تک آگئی تھیں کہ ہم سر نہ جھکاتے تو چہرے پر خراشیں آتیں۔ راجا کی نظر حد بندی کی دیوار پر تھی جو بالکل سیدھی نہ تھی۔ میری پوری کوشش تھی کہ کہیں بھی جیب اس دیوار سے زیادہ فاصلے پر نہ ہو۔ عام طور پر ہم تیس سے پچاس فٹ کا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیب کی رفتار بھی دس پندرہ کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ نہ تھی اور اگر ہم مجموعی فاصلے کو دیکھتے تو شاید جیب پیدل کی اوسط رفتار پر بھی نہیں جا رہی تھی۔

ست بدھائی کی جاگیر بائیں طرف تھی۔ دائیں طرف دریائے کنہار تک کا فاصلہ کہیں آدھا کلومیٹر ہو جاتا تو کہیں اس سے بھی زیادہ۔ میرے اندازے کے مطابق یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ یہاں اب گھنا جنگل تھا۔ وہاں پہلے دریا کی گزرگاہ تھی۔ جگہ جگہ نظر آنے والے گول پتھر اس قدر بلی کے کواہ تھے۔

ایک جگہ مجھے کسی جالور کا ڈھانچا پڑا رکھائی دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بلی بھی لیکن راجا نے کسی ماہر حیوانیات کی طرح جیب سے اتر کے اور گھنٹوں کے بل بیٹھ کے اس کا معائنہ فرمانے کے بعد یہ رائے دی کہ وہ خرگوش تھا۔

مجھے اپنے مقابل گھنے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیا جو کسی دیوار کی طرح ہماری راہ میں حائل تھی۔ اس قدر تھی فیصل کے گزرنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے ہم نے دائیں جانب پیدل چلنا شروع کیا۔ ہمیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ پھر اس راستے سے کتنی دور آچکے ہیں۔

ایک جھاڑی کے پیچھے مجھے سفید دھبہ سا دکھائی دیا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک خرگوش تھا جو بے ہوش اور نیم جاں لگتا تھا۔ جب میں نے اسے اٹھایا تو اس کا نرم گرم جسم میرے ہاتھوں میں کا پٹنے لگا۔ میں نے اسے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑی سی دیکھ بھال سے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

اسی وقت قریب کی ایک اور جھاڑی سے دوسرا خرگوش اچھل کے بھاگا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے خرگوش کے تعاقب میں کوئی اور جالور بھی تھا جو ہمیں دیکھ کر جھاڑیوں ہی میں رک گیا ہے۔ مجھے ذرا آگے جا کر دیکھنے سے اور جھاڑیوں کی تیز حرکت سے اندازہ ہوا کہ خرگوش کے فکار کے لیے تعاقب میں آنے والا جالور اب واپس جا رہا ہے۔ وہ خرگوش ایک جھلک دکھا کے اگلی جھلانگ میں نہ جانے کدھر کل گیا تھا۔ جو خرگوش میرے ہاتھ میں تھا وہ شاید مرنے والا تھا۔

میں نے کہا۔ ”راجا! کیا یہاں شکار ہوتا ہے؟“
راجا میرے ساتھ آگیا۔ ”فکار ہے تو فکاری بھی ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”غالبا وہ فکاری کتا تھا۔“
راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فکاری کتا ہوتا تو تعاقب ترک کر کے بھی واپس نہ جاتا۔ وہ خرگوش کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ وہ کوئی کومڑی ہو سکتی ہے۔ بھیڑ یا بھی ہو سکتا ہے۔“
”بھیڑ ہے تو انسانوں کے لیے بھی خطرناک ہوتے ہیں۔“

راجا نے کسی ماہر فکاری کی طرح سر ہلایا۔ ”نہیں، جب تک وہ بھوکے نہ ہوں یا محسوس نہ ہو جائیں، وہ انسان پر حملہ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اکیلا بھیڑ یا انسان سے بھگتا ہے۔ بھیڑیے غول کی صورت میں حملہ کرتے ہیں۔“

لیکن اس کی رائے فوراً غلط ہوئی۔ دور سے ایک کتے بھونکنے کی آواز آئی پھر بہت سے کتے بھونکنے لگے۔ میں نے کہا۔ ”کیا یہ بھونکنے بھونکنے ہیں راجا صاحب کتے کی طرح؟“

راجا نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”فیکلے پتر!..... کیا خرگوشوں کو دھوکا دینے کے لیے بھیڑیا ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ایک مکار جانور ہے۔“

اس وقت تک کتوں کے بھونکنے کی آواز قریب سے آنے لگی تھی۔ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ شکاری کتے ہماری طرف ہی بڑھ رہے ہیں۔ کتوں کے ساتھ کچھ انسانی آوازیں بھی شامل ہوئیں۔ کچھ لوگ حلق سے بے معنی آوازیں نکال رہے تھے جن کا مقصد شور مچانے کے سوا کچھ نہ تھا۔

”یہ ہانکا کرنے والے ہیں۔“ راجا نے کہا۔
میں نے کہا۔ ”راجا! یہ ڈنڈے لے کر جھاڑیوں پر مارے ہوئے پلٹے ہیں اگر کسی درخت یا جھاڑی کی پناہ میں خرگوش چھپا بیٹھا ہو تو وہ نکل کر بھاگنے پر مجبور ہوتا ہے پھر کتے جھوڑے جاتے ہیں جو اسے دانوں میں دیوبج کر زندہ پکڑ لاتے ہیں اور شکاری کے حوالے کر دیتے ہیں۔“
”کون ہو سکتا ہے یہ شکاری؟“ راجا نے کہا۔
میں نے کہا۔ ”انجی معلوم ہو جائے گا۔“

پھر ایک طرف سے تین اور دوسری جانب سے دو افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں سوئی یعنی لمبی سی ڈنڈی تھی جس سے وہ جھاڑیوں کو کھٹکالتے تھے۔ دوسرے ہاتھ سے انہوں نے ایک ویلے پٹے گردن میں اوٹے شکاری کتے کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ کتے اتنے شرذرہ تھے کہ انسان کو اپنے ساتھ کھینچتے جا رہے تھے۔ انسان عام دیہاتی تھے۔ سخت جان مگر جسمانی طور پر کمزور نظر آنے والے دیہاتی۔ ان کے گہرے سانولے رنگ دھوپ میں تپ کے سیاہ دکھائی دیتے تھے۔ پسینہ ان کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ ان کے جسموں پر میلی اور پھٹی ہوئی بنیائیں تھیں اور نیچے انہوں نے خاکی رنگ کی ٹیکریں پہن رکھی تھیں۔ ان کے پیروں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کانٹوں بھری سخت زمین پر ننگے پاؤں دوڑ رہے تھے اور انہیں کسی تکلیف کا احساس بھی نہ تھا۔ شاید نیچے سے ان کے پیروں کے تلوے سخت ہو کر چمڑے کا حلا بن چکے تھے۔

کتوں کے اور انہیں سنبھالنے والوں کے تہور دیکھ کر میں نے اور راجا نے داہنی اعضاء کرنا بہتر سمجھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہماری دھن اندازی ناگوار گزری ہے۔ جو شخص قیادت

کر رہا تھا وہ خاصا دراز قد تھا۔ اس کی نیکی موٹھیں تھیں اور لمبے بالوں کے پٹے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ پیچھے آنے والوں کے سر بالکل صاف تھے۔

موٹھوں والے دراز قد نے دوری سے چلا کے اشارہ کیا۔ ”اوتے بابو! اس کو چھوڑ دو۔ یہ شکار ہے۔“
میں نے کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ شکار کے قابل نہیں ہے۔“

راجا نے بھی کہا۔ ”یہ بہار ہے۔“
وہ چیخ کے بولا۔ ”تم کیا اسے اسپتال میں داخل کر آؤ گے۔ اسے جانے دو۔ رستم بے قرار ہو رہا ہے۔“
رستم غالباً اس خوفناک کتے کا نام تھا جو اس کی گرفت میں اچھل رہا تھا اور خرگوش پر حملہ کرنے کے لیے سخت بے قرار تھا۔ یہ نامکن تھا کہ میں اس بے ہوش جانور کو اس درندے کے آگے ڈال دیتا۔ میں نے بھی دھاڑ کے کہا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے اور اپنے اس رستم کو بھی لے جاؤ۔“

موٹھوں والا دراز قد اب ہم سے پیچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر آ کے رک گیا تھا اور مجھے کیڑو نظر سے محروم رہا تھا۔ باقی سب بھی اس کے ساتھ ہی ٹھہر گئے تھے اور اپنے اپنے کتوں کو قابو کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جو میرے ہاتھ میں خرگوش دیکھ کر رستم کی طرح حملہ کرنا چاہتے تھے۔

”اوتے بابو! میں آخری بار بول رہا ہوں۔ تو نے شکار کو نہ چھوڑا تو میں رستم کو چھوڑ دوں گا۔“

مجھے اندازہ ہوا کہ صورت حال کسی حد تک خطرناک ہو گئی ہے۔ میرے لمبے اس معصوم بے زبان جانور کے ساتھ خود کو رستم کے حملے سے بچانا مشکل تھا اگر رستم کے پیچھے اور دوسرے کتے بھی چھوڑ دیے جاتے تو راجا اور میں ان خوفناک درندوں کو ہاتھوں یا لاتوں سے مار کے دوڑ نہیں رکھ سکتے تھے۔ بیک وقت ایک ہی خیال پر رشتہ ہو کے میں نے اور راجا نے اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔ ”اگر تم نے یہ بے وقوفی کی تو میں رستم کو گولی سے آڑوں گا اور ضرورت پڑی تو تمہیں بھی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کون ہوں۔“

”اور تجھے اندازہ نہیں بابو کہ تو کہاں کھڑا ہے۔“
موٹھوں والے دراز قد نے ایک گالی دے کے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جھکا اور اس نے کتے کو اپنی کمر کی پٹیل سے منسلک زنجیر کی قید سے آزاد کر دیا۔

میں تیزی سے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ شکاری کتا ایک جست لگا کر میری طرف آیا۔ اس نے ٹھوم کے درخت کے پیچھے آنے کی کوشش کی۔ میرے ریوالور نے

شلٹ اُگھا۔ ایک دھماکا ہوا اور پھر کتے کی وحشتانہ چیخ سنائی دی۔ گولی نے اس کا بھجبا پاش پاش کر دیا تھا۔ نیچے گر کے چند منٹ بجز کتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔

رستم کے اس غیر متوقع انجام نے سب کو کتے میں ڈال دیا تھا۔ باقی حکم کے غلام جو پھرتے کہ انہیں بھی شکاری کتے ہم پر چھوڑنے کا اشارہ ملے، پھر کے بت بنے ٹھہرے تھے۔ راجا نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ ”تیرا رستم تو مارا گیا۔ چل اب تو خود آ جا۔ تیری تو.....“ راجا نے اسے جوگالی دی وہ بیٹش میں خود بخود اس کے منہ سے نکلی تھی۔

رستم کا رکھوالا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ ”اوتے بابو! یہ تو نے کیا ظلم کر دیا۔ رستم کو مار دیا۔“

میں نے کہا۔ ”اور میں کیا کرتا۔ اس کتے کو موقع دیتا کہ میری بھی ڈبیاں چبائے۔“
وہ ٹھٹھوں کے بل رستم کی لاش پر جھک گیا اور اس کے مردہ جسم پر ہاتھ بھرنے لگا۔ ”اوتے ظالم! تو نے میرے رستم کو مار دیا۔ تجھے کیا بتا اس کی قدر کا۔“

میں نے کہا۔ ”سنا تو سنائی ہوتا ہے۔ گلی کا ہوا شکاری اور اس کا نام رستم ہو یا بیر۔“

اس نے شلٹ بارنظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تجھے اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ تو رانا صاحب کو کہیں جاتا۔“

رانا کے نام پر میں نے اور راجا نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر میں نے مسکرا کے کہا۔ ”لیکن تیرے رانا صاحب مجھے جانتے ہیں۔“

اس نے جیسے میری بات ہی نہیں سنی۔ ”رانا صاحب کا علم ہے جو شکار خراب کرے اسے بھی شکار کر لو۔“

میں نے اس وقت تہذیب اور شرافت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس غلام ابن غلام ابن غلام سے اس زبان میں بات کرنے کا فیصلہ کیا جو آسانی سے اس کی سمجھ میں آ سکتی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیسیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ ”کتے کی اولاد! اٹھ اپنے باپ کی لاش پر۔“ تجھے پتا نہیں میں کون ہوں۔ کس کے سامنے بھونک رہا ہے تو۔ میں تین تک گنوں گا پھر تیری لاش ہی پڑی ہوگی یہاں۔“

موٹھوں والا درد سے بلجایا اور ایک پہلی دبا کے دہرا ہو گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے جو کچھ فاصلے پر سخت خوفزدہ کھڑے تھے اسے داہیں بلانے کی کوشش کی۔

”چل کا مو! ہم رانا صاحب کو بتا دیں گے۔“
”تو داہیں آ جا۔ رانا صاحب خود نٹ لیں گے اس

سے۔“
میں نے کہا۔ ”ایک.....“ پھر چند سیکنڈ کے وقفے سے کہا۔ ”دو.....“

کاسو اٹھا۔ آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ ”میں کیا تاؤں رانا صاحب کو۔ رستم کو کس نے مارا؟“

میں نے مسکرا کے کہا۔ ”ان سے کہنا رستم نے ست پڑھائی کے نواب رفیع احمد شیرازی پر حملہ کرنے کی گستاخی کی تھی۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ اس گستاخی کا ذمے دار وہ جنہیں قرار دیں۔ اسے تمہاری غلطی اور بے وقوفی سمجھیں۔“ راجا نے کہا۔ ”رستم تمہاری وجہ سے مارا گیا۔“

میں نے کہا۔ ”رانا صاحب کی نظر میں اس کتے کی اوقات تم سے کہیں زیادہ ہوگی۔ جان بچانے کے لیے میں جنہیں ایک جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہوں۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے کچھ نہیں کہا۔ نواب رفیع احمد شیرازی نے خود رستم کے سامنے آنے کی غلطی کی تھی۔ اس کا شکار ممکن نہ تھا۔“
”ہم اس جھوٹ کی تردید نہیں کریں گے۔ ہم کہیں گے کہ ایسا ہی ہوا تھا۔“ راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”جب ہم خرگوش کی جان بچانے کے لیے یہ سب کر سکتے ہیں تو تم جبر حال ایک انسان ہو۔ نام یاد رہے گا۔ کیا بتایا تھا میں نے؟“

کاسو نے سر ہلا کے میرا نام دہرایا۔ ”نواب رفیع احمد شیرازی۔“

راجا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے اب تم جا کر رانا صاحب کو بولنا کہ ہم سے مل لیں۔ ہم کتے کی قیمت ادا کر دیں گے۔“

کاسو جاتے جاتے پھر رکا۔ ”نواب صاحب! اس جگہ سے چلے جاؤ۔“

”کیوں، کیا یہ تمہارے باپ کی زمین ہے۔“ میں نے کہا۔

راجا نے ریوالور اٹھایا۔ ”تم ہمیں دفع ہونے کا کہہ رہے ہو۔“

کاسو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ رانا صاحب کا علاقہ ہے۔“

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑا کے کہا۔ ”اچھا، شاید ہم بھوک کر ادھر آ گئے تھے۔ رانا صاحب کہاں ہیں؟“

اس نے ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا۔ ”ادھر دربار کے پار۔“

میں نے کہا۔ ”کیا ان کی زمین دریا کے دونوں طرف

ہے؟“

راجا بولا۔ ”یہ دریا ان کی زمین سے گزرتا ہے؟“
کاسو نے کہا۔ ”جی۔“ پھر سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور واپس چل پڑا۔ اس کے ساتھ آنے والے بھی کتوں کو کھینچ کر واپس جانے لگے۔ غالباً اپنی جان بچانے کے لیے میں نے کاسو کو جس بھوت کی اجازت دی تھی اس نے کاسو کے دل میں میری عزت پیدا کر دی تھی۔

میں نے اپنی گود میں کانپنے والے خرگوش پر محبت سے ہاتھ بھرا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن میں نے کاسو کے فکارتی ٹوٹے کے سامنے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ جب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور ان کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں تو میں نے خرگوش کے سر وہ جسم کو سرمے کے برابر لبادیا۔ فکار اور فکاری، حاکم اور محکوم، بندہ صاحب و محتاج غنی ایک ہوئے۔ تیری سرکار میں پیچھے تو بھی ایک ہوئے۔ ”ڈھک دی لیوڑ! موت سب کو برابر گردیتی ہے۔ پھر ہم اپنی جیب کی طرف چلے گئے۔

راجا نے کچھ تشویش سے کہا۔ ”ہم نے دشمن کی سرزمین پر جا کے جارحیت کا ارتکاب کیا ہے نتیجہ بتر“
”بے شک ہم نے دانستہ ایسا نہیں کیا لیکن ان کے نزدیک یہ جرم ہی ہوگا۔ کسی خرگوش کی زندگی بچانے کی بات ایک احمقانہ جذباتی جواز ہوگی۔“
”میں سے کم رانا کی نظر میں۔ اس کی نظر میں تو یہ غلام زادے بھی کسی حقیر جانور سے زیادہ اہمیت رکھتے۔ اشرف المخلوقات وہ صرف اپنے آپ کو سمجھتا ہوگا۔ ان سب کو حشرات الارض۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے راجا! اب رانا چاہے گا کہ ہم رستم کی موت کی تلخی کریں۔ خود اس کی خدمت میں حاضر ہو کے اس تعمیر پر شرمندگی کا اظہار کریں اور معافی مانگیں باضابطہ۔ ہرجانہ یا جرمانہ جو وہ عائد کرے ادا کریں۔“

”ظاہر ہے یہ نامکن ہوگا۔“

”اس کے بعد ہمارے درمیان باقاعدہ دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی۔ خطرناک بات یہ ہے کہ اس کی اور ہماری سرزمین کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ کوئی نوٹ لینڈ نہیں۔ انڈیا پاکستان کی طرح ہماری سرحدیں لٹی ہیں۔“
راجا بولا۔ ”دریا نے کہا اس کی زمین سے گزر کے آتا ہے لیکن ہماری زمین پر سے نہیں گزرتا۔“
”کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پل بھی اس کی سرزمین پر

ہے؟ اس کی زمین دریا کے دونوں طرف ہے تو کیا اس بدحالی کی جو پل کے دروازے تک ہے؟ کیا ہمارا راستہ اس کی زمین پر سے گزرتا ہے؟“

راجا نے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پل کے بعد پہاڑی ہے اور سڑک ہے۔ وہ رانا کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس کی ملکیت کہاں تک ہے؟“
”لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہوگا۔“

راجا نے کہا۔ ”اگر یہ ملے قانون کے تحت سڑک، دریا، پل اور تمام دسائیں آمد و رفت سرکاری ملکیت تصور ہوتے ہیں لیکن وہ ہمارے دریا کے کنارے پر ڈیم بنانے کے پر وجہت کی راہ میں رانا حاکم ہو سکتا ہے۔“

”نہیں، یہاں پہلے بھی اسل ڈیم آرگنائزیشن والوں نے رہتاس میں ڈیم پلان کیا تھا۔ بعد میں وہ منصوبہ کی وجہ سے سرخانے میں چلا گیا یا ناقابل عمل قرار دے دیا گیا لیکن اس کے نہ بننے کی وجہ رانا کی طرف سے قانونی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔“

”ہاں، مگر وہ غیر قانونی رکاوٹ تو ڈال سکتا ہے۔“

ایک بار پھر ہم نے جیب کو مخالف سمت میں سوزا اور اپنی حد کے اندر آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب رہے، تاہم یہ احساس ایک سوال بن کے ساتھ رہا کہ کیا ہماری جیب خطرے کے بارڈر پر چل رہی ہے؟ ابھی میں خود اپنی کیفیت کا تعین کرنے والے قانونی خطوط کے بارے میں واضح نہیں تھا تو میں رانا کی سرحد کا تعین کیسے کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جاتے تھے، جنگل گہنا ہورہا تھا۔ درختوں کے درمیان فاصلہ کم ہورہا تھا اور ہمارے سر کے اوپر شاخوں اور پتوں کا پھیلاؤ ایک ایسی سرسبز چھت بن رہا تھا جس میں سے نیلا اجلا آسمان چھوئے چھوئے ٹکڑوں کی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ پھر یہ ٹکڑے بھی کم ہونے لگے اور اس کے نتیجے میں نیچے تک پہنچنے والی روشنی کم ہونے لگی۔ سایہ گہرا ہوتا چلا گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ دوپہر کے بعد کا نہیں غروب آفتاب کے بعد کا وقت ہے۔

میرے لیے جیب کو درختوں کے درمیان سے گزرا نا مشکل سے مشکل تر ہونے لگا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم راستہ تلاش کرنے کے لیے بھٹکتے رہے جہاں سے جیب کو نکالا جاسکے۔ ہر دس بیس گز کے بعد یہ مرحلہ سامنے آ جاتا تھا۔

اس گھنے جنگل میں ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں درخت تھے۔ یہ سب شیشم کے درخت تھے جن کی کٹری چھراتی قاصد کے لیے اعلیٰ بھی جاتی تھی اور فرخندہ بنانے کے لیے

بھی۔ یہ دولت زمین کا تحفہ تھا اور ابھی تک اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا تھا۔

جب ایک جگہ بند ہو کے رکے تو میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔ یوں جیسے وقفہ وقفہ سے کوئی درخت پر کھڑا ہے سے وار کر رہا ہو۔ میرا ہاتھ جو پھر انجن کو اشارت کرنے والا تھا، رک گیا۔ گھنے جنگل میں خاموشی کا راج تھا۔ اس خاموشی کا تاثر بھی کبھی سنائی دینے والی مختلف پرندوں کی آواز سے مجرد ہوتا تھا۔

میری سوالیہ نظروں کے جواب میں راجا نے کہا۔ ”شاید کوئی درخت کاٹ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی حیرت تھی کہ ان لاوارث درختوں پر کسی نمبر مانیا کے ٹھیکے داروں کی نظر کرم کیوں نہیں۔ ہوئی جس نے مری سے کاغان تک پہاڑوں کو گننا کر دیا ہے۔“

”چوری تو یہاں بھی جاری ہو گئی لیکن ابھی تک چھوٹے چور اکیٹو ہوں گے۔ چل ہم دیکھتے ہیں۔“ راجا نے کہا۔ ”یہ کام تو ہماری حدود میں ہو رہا ہے۔“

یہ ہو سکتا تھا کہ ہم ان بچروں کو رستے ہاتھوں پکڑ لیتے ہیں۔ کامیاب ہو جاتے جو دن دہاڑے درخت چوری کر رہے مگر ایک معمولی سے واقعہ نے خرابی پیدا کر دی۔

جنگل میں حشرات الارض کے علاوہ ہر قسم کے پر پٹنے والے جانوروں کی بہت تھی۔ گہریاں درختوں پر دوڑتی نظر آتی تھیں۔ زمین پر چھپکلی کی سل کے سارے جانور افراتفری میں بھاگتے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں گرگٹ، گدھ، جنگلی چوہے اور نیلے تک سب شامل تھے۔ ایک جگہ مجھے تین چار فٹ لمبا اور میری کٹائی سے سونے سا رنگ کا بھی نظر آیا لیکن وہ راستہ کاٹ کے سیدھا گزر گیا۔

میں راجا کے ساتھ جانے کے لیے جیب سے اتر رہا تھا کہ ایک چمک اور پر سے کوئی چیز گری۔ اس کے ساتھ ہی راجا نے چلا کے میرا نام لیا اور پھر فائر کر دیا۔ میں اچھل کے پلٹا تو مجھے اپنی سیٹ پر ایک سانپ مل کھاتا دکھائی دیا۔ راجا نے اس کا سراڑا دیا تھا۔ یہ سات آٹھ فٹ لمبا اور میری پنڈلی سے سونے سا رنگ والا سانپ تھا۔

راجا نے کہا۔ ”تو بیچ کیا فیکے پتھر! ایک سینکڑے فرق سے درنہ سانپ سیدھا چھ پر گرتا۔ یاد رہے اس کا تھا۔“
میں نے خوف کی سرد لہر کو جسم میں اتارتا محسوس کیا۔ اگرچہ مجھے بھی معلوم تھا کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن عام آدمی کی طرح میں بھی زہریلے اور بے ضرر سانپوں

میں تفریق نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے سانپوں کی قطعی پہچان نہ تھی۔ میرے نزدیک تو وہ بھی کوبرا تھا۔

راجا نے سانپ کی دم پکڑ کے کھینچا اور اسے نیچے ڈال دیا۔ ابھی تک اس میں جان باقی تھی۔ اس کے خون سے سیٹ خراب ہو گئی تھی۔ میں نے اوپر والے درخت کی اس شاخ کو دیکھا جس سے لنگ کے سانپ نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی تھی۔ خطرے کا احساس اب کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ پورے جنگل میں نہ کسی اس جگہ سانپ بائے جاتے تھے جہاں ہم انجن کے اتفاقاً بند ہو جانے سے رکے تھے۔

درخت پر کھڑا ہی کے دار کی آوازیں اب نہیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ فائر کی آواز نے درخت کاٹنے والوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بھاگ گئے ہوں۔ میں نے سیٹ کو بڑا دیا اور اس کی جگہ ایک فنڈ بیٹ دکھ کر جیب کو پھر اشارت کیا۔

ہمیں اس جنگل میں دو گھنٹے صرف ہو گئے تھے۔ مجھ پر اب محکم غالب آ رہی تھی۔ ہوا میں درختوں سے خارج ہونے والے بخارات کے باعث جس تھا اور ہمارے کپڑے پسینے سے بھگ رہے تھے۔ ہم اپنے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا

پہننے کا پانی تک نہیں لائے تھے۔ راجا نے کڑی دیکھی۔ ”سازمے تیں، وقت دیکھ کر تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں بھوک سے فوت ہو جاؤں گا۔“

”واپس گئے تو پھر دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ آگے چلنے ہیں۔“

”نہیں یار، یہاں سے نکل ورنہ خرگوش کے بعد ستاروں اور پھر سانپ سے تو ملاقات میں جان بچاؤ گئی۔ آگے آدم خورشیر نل جائے۔“

”شیر اب صرف چڑیا گھر میں رہتا ہے۔ بیف کھاتا ہے۔“
”پھر اسے اجازت کیوں نہیں کہ انسانوں کے ساتھ گھومے پھرے۔“ راجا نے ایک مضطرب سوال اٹھایا۔ ”اگر وہ آدم خورشیر سے تو ڈرے گا۔ اسے بند کیا کیوں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”تو کیا شیر کا وکیل ہے؟ وہ خود اعتراض اٹھا سکتا ہے۔“
اب جیب کے لیے راستہ کشادہ ہونے لگا تھا۔ جنگل پہلے جیسا گھنا نہیں رہا تھا تو روشنی بھی بڑھ گئی تھی۔ دس منٹ بعد ہم مشرق کی طرف طلوع ہوئے جہاں زمین ہموار تھی اور کاشت کے قابل تھی۔ آ جا رہا تھے۔ کچھ کے اکتوبر میں یک جانے والی فصل کاٹ لی گئی ہے اور زمین کو دم لینے کے لیے

کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔

کنائی کے دوران میں گر جانے والے گندم کے دانوں پر ہر قسم کے پرندوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر پھر سے اڑ گئے۔ اب ہمارے سامنے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں مشکل سے سو گھر ہوں گے۔ یہ سب مٹی گارے کی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھت والے کچے مکان تھے۔ واحد پختہ عمارت ایک چھوٹے سے پتھر والی مسجد تھی جس کو عبادت گزاروں نے خود بنایا سنوارا تھا۔ اس پر سفیدی کا اجلا رنگ دھوپ میں چمک رہا تھا۔

ہم سے دوسو گز کے فاصلے پر کنواں تھا۔ اس میں سے رہٹ چلا کے پانی نکالا جا رہا تھا۔ ایک مرلہ سائیل سرکاری ملازمت کے انداز میں گھومنے کا فرض پورا کر رہا تھا۔ رہٹ کے ڈول سے گرنے والا پانی بہہ کر ایک تالاب میں جمع ہو رہا تھا۔ وہاں چند عورتیں کپڑے دھوئے اور نہانے میں مصروف تھیں۔ دس بارہ سال تک کی عمر کے چند بچے لڑکے لڑکیاں بھی مرد و ستارہ بنیں ہوئے تھے پانی میں کھیل رہے تھے۔

عورتوں نے جیب سے ٹکے اور راجا کو اڑتے دیکھ کر چیخ پکار مچا دی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق بہت محفوظ اور باپردہ مقام پر نہا ہو رہی تھیں۔ وہاں کی عورتیں آپس میں شرم و حیا کے تلفف کی قائل نہ تھیں چنانچہ سب نے وہ کپڑے بھی اتار دیے تھے جو وہ گھر سے پہن کر آئی تھیں۔ ان کے پاس کپڑے کم ہونے کی وجہ سے وہ تن کے جوڑے کو پہلے دھو کے بھیلادیتی تھیں۔ پھر دوسرے کپڑے دھوئی تھیں اور جب تک نہا دھو کے فارغ ہوتی تھیں ان کے اپنے کپڑے سوکھ چکے ہوتے تھے۔ وہ انہیں پھر پہن کر بچوں سمیت گھر کی راہ لیتی تھیں۔

ان کے نہانے دھونے کی جگہ الگ اور خاصی محفوظ تھی۔ مقامی مرد خود ادھر سے گزرنے سے اجتناب کرتے تھے اور یہ کوئی گزرگاہ عام بھی نہ تھی۔ انہیں گھنی جھاڑیوں کا ایک جھنڈ تحفظ اور خلیہ فراہم کرتا تھا۔ اس وقت بھی کنوئیں سے پچاس قدم کے فاصلے پر گاؤں کے کچھ مرد چارپائیں ڈالے سو رہے تھے یا باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ فصل کٹ جانے کے بعد یہ ان کے لیے کام سے فراغت کے دن تھے۔ عورتوں کے چلانے پر سونے والے بھی اٹھ گئے۔ حصہ چنے والے اور تاش کھیلنے والے سب ایک ساتھ اٹھے اور ہماری طرف لپکے۔

ایک بوڑھی عورت جس نے پورے کپڑے پہن رکھے تھے، بگایاں بکتی ہماری طرف آئی۔ ”اوائے بے غیرو! شرم

نہیں آتی تمہیں۔ گھر میں ماں بہن کو بھی ایسے عورتا کتے ہو جب وہ نہایتی ہیں۔“ اس کی زبان بڑے فرائے سے چل رہی تھی۔ دیگر خواتین اتنی دیر میں کیلے کپڑے پہن چکی تھیں یا پانی میں چھپ گئی تھیں۔

میں نے راجا سے کہا۔ ”ابے یہ کدھر نکل آئے ہم۔“ ”یار! ہمیں کیا مظلوم تھا۔ چل اب جب کوموڑ لے۔“ لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ خواتین کی عزتوں کے رکھوالے مرد خطرناک جارحانہ انداز میں ہماری جانب بھاگے چلے آ رہے تھے۔ دو کے ہاتھ میں لٹھیاں تھیں۔ ایک کے پاس چمکدار پھل اور لمبی ڈنڈی والی کھانڑی تھی اور چوتھا اسی نئے کو بطور ہتھیار استعمال کرنے پر کمر بستہ تھا جسے وہ تھوڑی دیر پہلے گزرگزار رہا تھا۔ وہ بوڑھا تھا لیکن باقی تین جوان تھے۔ دو کم عمر کے لڑکے درخت کی سوکھی شاخیں کھوار کی طرح لہراتے شہری نوجوانوں کی بے شرعی کے خلاف جہاد میں شرکت کے لیے پیچھے پیچھے چلائے آ رہے تھے پھر انہوں نے بہتر سمجھا کہ پھر مارے اس کا رخبر کا آغاز کریں۔ بڑھا پہلے ہی اشتعال انگیزی کر رہا تھا کہ ان شہری بابوؤں کی لٹاں کولٹاں کر دوں۔ آخر کیا سمجھ رکھا ہے انہوں نے گاؤں والوں کی بہو بیٹیوں کی عزت کو۔

میں نے جب روک لی تھی۔ اب ہم زنانہ داش روم والے علاقے سے ایک سو اتی دہے کے زوادیے پر محوم چلے تھے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے لیکن ارتکاب جرم کر چکے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کی۔ انہیں چلا کے یہ سمجھا جا چکا کہ ہم راستہ نہ جاننے کے سبب وہاں آ نکلے تھے اور اپنی غلطی پر شرمندہ بہر حال ہیں لیکن وہ سننے کے موڈ میں بھی نہ تھے۔

لڑکے جب پر پتھر پھینک رہے تھے اور لٹھی برادر ہمارا سر جھانڑنے کے موڈ میں تھے تو کھانڑی والا شاید ہماری گردن اتارنا چاہتا تھا۔ میں نے اور راجا نے گھوم کے جب کے پیچھے پناہ لی اور پھر انہیں سمجھا نا چاہا۔ میں نے دھاڑنے ان کو خبردار کیا۔ راجا نے بھی روکا مگر بات نہ بنی۔

اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ ہم ریوالور کٹیں۔ راجا نے ایک ہوائی فائر کیا۔ دوسرا فائر میں نے کیا اور اس آتشیں زبان کا مطلب فوراً ان کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ ایک دم پلٹ کے بھاگے۔ خواتین میں چیخ پکار کے ساتھ آہ و بکا بلند ہوئی۔ غائبانہوں نے فرض کر لیا کہ عزتوں کے محافظ اداے فرض میں شہید ہوئے۔

میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ”کیا مصیبت ہے

راجا! شرافت کی زبان کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ پہلے وہ کاسو، پھر وہ ساپ اور اب یہ۔“

راجا نے ریوالور کو واپس جیب میں رکھ لیا۔ ”قصور ان کا نہیں ہے یا راجا! اشتعال انگیزی ہم نے کی کی۔“

میں نے بھی ریوالور جب میں ڈالا اور پسپا ہونے والوں کی طرف بڑھا جواب بھی نہیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کے اپنے پراسن دوستانہ عزائم کا اظہار کیا اور انہیں خریب بلایا مگر وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔

نزدیک جا کے میں نے بوڑھے سے کہا۔ ”چاچا! یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ کسی انجینی سے بات کیے بغیر اس پر چڑھا کر کردی جائے۔“

بوڑھے نے بڑھی سے کہا۔ ”اوائے! ہم بے غیرت نہیں ہیں تم شہر والوں کی طرح۔“

میں نے دھاڑ کے کہا۔ ”کواس بند کر داپنی، کیا ہم محل سے بد معاش لگتے ہیں۔“

ایک نوجوان آگے آیا۔ ”آ خر کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔ ”یہ حویلی دیکھی ہے تم نے؟“ اکبر خان کو جانے ہو۔ خانو کے بیٹے کو اور کبیر خان کو۔ وہ سب ملازم ہیں۔ میں مالک ہوں اس حویلی کا اور

اس زمین کا جس پر یہ کنواں ہے اور تم فصلیں اگا رہے ہو۔“

ایک دم ان سب کو ساپ سگھ گیا۔ عورتیں جو پیچھے سے شور مچا کے مطالبہ کر رہی تھیں کہ ہمیں زندہ گاڑ دیا جائے اور

بار بار ہماری مایا بہنوں کے حوالے سے اشتعال انگیز سوالات اٹھا رہی تھیں، لیکن خاموش ہو گئیں۔ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں اور انہیں یقین نہ تھا کہ اب

مجرم نہیں ہم وہ ہیں اور ان کا جرم ناقابل معافی ہونے کی حد تک سنگین ہے۔ انہوں نے مالکوں پر تاننا حملہ کیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم سے بھی نا دانستگی میں غلطی ہوئی اس لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔“

راجا نے کہا۔ ”معافی ہم نے بھی مافی مکرتم لوگ سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔“

میں نے مکمل خاموشی میں جیسے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا۔ ”میرا نام ہے نواب رفیق احمد شیرانی۔“

مجھے خود کو زمین کا مالک، حاکم یا نواب کہتے ہوئے شرم آنی تھی مگر میں مجبور تھا۔ جہاں اپنی بات منوانے کی اور کوئی صورت نہ ہو وہاں اپنی طاقت کے حوالے سے بات کرنی

خواتین کے مقبول ترین ناول

ناہید سلطانہ اختر

ساتھ بان

قیمت 800 روپے

1200 صفحات

بہترین کاغذ، خوبصورت پرنٹنگ اور فوم والی جلد کے ساتھ

سعدیہ غزل

ایک رات کی بات

قیمت 350 روپے

528 صفحات

بہترین کاغذ، خوبصورت پرنٹنگ اور فوم والی جلد کے ساتھ

فریدہ اشفاق

تنگ بست شرب

قیمت 400 روپے

704 صفحات

بلیقیں کنول

سلیپ

قیمت 400 روپے

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بندہ ادارہ

اپنے ہا کر اتنی کہ سارے طلب فرمائیں

۲۰ عرصہ کارکٹ

علی میاں پبلیکیشنز

آرڈو بازار لاہور

7247414

اشفاق

نسبت روڈ

علی بکسٹال

چوک میوہ پتال، لاہور

میں نے کہا۔ ”اس کی کیا وجہ ہے؟“
 ”وجہ.....“ وہ سوچ کے بولا۔ ”تم کی کیا کرے گا یہاں رہ کے۔ کیا ہے یہاں، پرانے مالک بھی بھی آتے تھے۔ انہوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ جس کے پاس جتنی زمین ہے اس پر کاشت کرے اور فصل کی ساری پیداوار اپنے پاس رکھے۔“

”پھر کیا مسئلہ تھا؟“
 ”مسئلہ یہ تھا کہ ہر گھر میں دو کے چار اور چار کے آٹھ افراد ہوتے جاتے تھے۔ چندہ میں برس میں ایک خاندان ایک کنبہ بن جاتا تھا مگر زمین اتنی ہی رہتی تھی اور اس کی پیداوار بھی۔ وہ زمین سب کا پیٹ تو نہیں بھر سکتی تھی۔ لہذا جو ان محنت مزدوری کرنے کے لیے نکل گئے شہروں کی طرف۔ کچھ بچے بچوں کو چھوڑ گئے، کچھ ماں باپ اور بھائی بہن کو، یہاں نہ روزگار ہے اور نہ کوئی زندگی کی سہولت پھر یہ تو ہوتا ہی تھا۔ پیچھے رہ گئے انتظار کرنے والے بوڑھے۔ اب بھی کیا ہوتا ہے، چودہ چندہ سال کا لڑکا کھر چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ دن خیال رکھتے ہیں، ماں باپ کا بھر بھول جاتا ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”بچے تعلیم حاصل کرنے کہاں جاتے ہیں؟“

”لو جی! تعلیم کی ضرورت کسے ہے۔“ وہ جی سے بولا۔ ”سب سے قریبی اسکول بھی ٹیڈ جو گیاں میں ہے۔ اتنی دور کون آئے جائے اور پھر تعلیم کا خرچ، کتابیں کا پیانا، یونیفارم، جوتے، سب کہاں سے آئیں گے۔“
 میں نے کہا۔ ”آپ نے بھی تو پڑھا اور پھر پڑھاتے رہے۔“

”میں بھی گیا تھا محنت مزدوری کے لیے۔ ایک شریف آدمی نے دکان پر رکھ لیا۔ اس کی اولاد نہیں تھی، مجھے پڑا لکھا دیا پھر وہ مر گیا اور اس کے رشتے داروں نے مجھے مار کے گھر سے نکال دیا۔ میں دینے کے گورنمنٹ اسکول میں پڑھانے لگا۔ اس وقت میٹرک تھا پھر ایف اے اور بی اے پرائیویٹ کر لیا۔ جب چٹن ہوئی تو ٹوٹ آیا گھر۔ ایسا بہت سے بے نصیبوں نے کیا۔ ایک چڑا سی تھا۔ ددو ج میں رہے۔ بوڑھے ہو کر واپس آئے۔ ان کے بچے ساتھ نہیں آئے۔ اب یہ بوڑھوں کی ہستی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ انہیں پڑھا سکتے تھے۔“
 ”وہ تو میں پڑھاتا ہوں۔ دو چار بچے روز آتے ہیں لیکن ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ نہ کتاب نہ کاپی، سلیٹ اور تختی تک نہیں۔ میں بلیک بورڈ پر لکھتا ہوں، وہ یاد کر لیتے

نظر خاصی کمزور ہوگی۔ اس کا اندازہ سیاہ فریم والی عینک کے شیشوں کی مونانکی سے ہو جاتا تھا۔ گزرے ہوئے دقت کی ایک عادت چھڑی کی صورت میں اس کے ساتھ تھی۔
 راجا اور میں ایک استاد کو تعظیم دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو اس کا چہرہ خوشی سے جھلک اٹھا اور اس نے بڑے غریب انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا جن کی تعداد اب پہلے سے زیادہ ہوئی تھی۔ اگرچہ پھر تقریباً گزر چلی تھی لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ ”مکمل مارنگ سراسر گل شیری اے۔“

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ ”میرا نام ہے رفیق اور یہ راجا ہیں۔ آپ پلیز ہمیں سر نہ کہیں، ہمیں شرمندگی ہوتی ہے۔“
 ”جناب عالی! اس نے کچھ نہیں سنا ہوگا۔“ ایک لوجوان نے کہا اور پھر لاؤڈ اسپیکر کی طرح میری بات ماسٹر کے کان تک پہنچانے کی کوشش کی۔
 ماسٹر نے سخت غصے کا ظہر کیا۔ ”اے جامل! کیوں گلا بھڑا رہا ہے۔ یہ دیکھ، کیا ہے یہ؟ مہرنگ ایڈ کہتے ہیں اسے۔ آئی سمجھ شریف میں؟“

لوجوان شرمندہ ہی نہیں سخت حیران بھی ہوا۔ غائباً حاضرین نے ماسٹر کو اس عظیم سائنسی ایجاد کے ساتھ پہلی بار دیکھا تھا جس کی مدد سے وہ عام لوگوں کی طرح ہر آواز سن رہا تھا۔

چندرسی جلوں کے بعد میں نے پوچھا۔ ”ماسٹر صاحب! آپ تو اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔“
 ”ہاں جی، ہم پیدا ہی یہاں ہوئے تھے۔ ذہن بھی یہاں ہوں گے، اگر اللہ کو منظور ہوا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا نام پنڈت سادات کیسے پڑ گیا۔ کیا یہاں کے لوگ بہت سخی ہیں؟“
 ”سادات شاہ آپ کے بزرگوں میں سے کسی کا شفیق تھا۔ اسے اور چند کارندوں کو یہاں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ آج یہ لوگ یہاں آباد ہیں، انہی کی اولاد میں ہیں۔ آپ اسی کے رشتوں کا دستور آج بھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اب کتنے گھر ہیں یہاں؟“
 ”گھر ہوں گے اسی پچاسی۔ آبادی پوچھو تو شاید چار سو سے اوپر لیکن آپ جا کے دیکھو تو اس میں آدمے سے زیادہ بوڑھے نظر آئیں گے میرے جیسے۔ ایک چوتھائی آبادی ادویہ عمر لوگوں کی ہے جو بوڑھے ہو رہے ہیں، لوجوان نہیں ہیں، بچے نہیں ہیں۔ ہاں لوجوان لڑکیاں بھی ہیں کمروں میں۔“

ہے۔ اٹھارہ سال ہو گئے۔“
 کوئی اور بولا۔ ”ہاں، اس دن تیری دوسری شادی کی بات چل رہی تھی۔“
 میں نے اس سلسلے کو دہریں روک دیا۔ ”پنڈت سادات، یہاں کوئی بڑھا لکھنا بند ہے۔“
 چاچا کی عمر کو چیلنج کرنے والے لوجوان نے کہا۔ ”جناب عالی! اسکول ماسٹر بے گل شیر، ریٹائرڈ ہے۔ ایف اے پاس ہے، بی اے لے رہا ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”کیا وہ یہاں آ سکتا ہے؟“
 ”بالکل آ سکتا ہے جناب عالی! چنگا بھلا ہے۔“
 لوجوان بولا۔

دوسرے لوجوان نے کہا۔ ”بس ذرا ادب چاہتا ہے اور انگریزی بہت بولتا ہے۔“
 پیچھے سے ایک بارہ، چودہ سالہ تماشین کو کھینچ کر آگے لایا گیا جو لوجوان کی نقل میں سے اجلاس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ لوجوان نے اس کے پیچھے ایک دھب رسید کر کے اس کا رخ گاؤں کی طرف کیا۔ ”چاؤ اے! ماسٹر کو اٹھالا۔“ ٹومر قاصد اس کے باوجود آہستہ آہستہ بے ٹی لے گیا۔
 میں نے کہا۔ ”یہ اٹھالانے کی بات تو تمھیں یاد رکھتے ہیں۔“

لوجوان بولا۔ ”اٹھانا تو پڑے گا جی، اس وقت وہ سو جاتا ہے۔“
 دوسرے لوجوان نے اضافہ کیا۔ ”تیسری بیوی کے ساتھ۔“

بوڑھا جو حق کو بطور اسلحہ استعمال کرتے ہوئے ہمیں مارنے دوڑا تھا، اب محاملات لوجوانوں کے ہاتھ میں پاگے پیچھے ہٹ گیا تھا اور غصے میں غصہ اٹھ کر گڑا رہا تھا۔ میں نے اور راجا نے کسی سے بھرے ہوئے گھاس خالی کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ گھاس دو لیٹر دالی میں باقی بھی چھتے۔ راجا نے آخری گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ”مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں پرکینٹ ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں بھی..... میرا غائب ٹوئن کیس ہے۔“
 ماسٹر گل شیر ایک دلچسپ کردار ثابت ہوا۔ اس کی عمر تو یقیناً ساٹھ سال سے زائد ہوئی لیکن اس کی کاغذی منسوبی۔ وہ سیدھا چلتا تھا۔ ہم سے ملنے کے لیے وہ بڑے اہتمام سے سفید شلوار زیبیں اور سیاہ واکس کے علاوہ جناح کیپ کے سرکاری تقریب والے لباس میں آیا تھا۔ ٹوٹی کے پیچھے جو بال نظر آ رہے تھے وہ سیاہ تھے تو یہ میرے گھر کا کرشمہ تھا۔ اس کی

پڑتی ہے۔ یہ جتنی طور پر اطاعت پسند لوگ تھے اور جاہل بھی تھے۔

میرے اعلان کے ساتھ ہی صورت حالات میں زبردست انقلاب آیا۔ سب سے پہلے جو بوڑھا اپنا حق پھینک کے آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگی۔ ”مالک! غلطی ہو گئی۔“ پھر اس نے میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔
 ”چلو چاچا جی! غلطی کی معافی ہم نے بھی مانگ لی اور تم بھی، بات ختم.....“

اب لوجوان آگے آئے اور ہمیں بڑی عزت سے اپنے ساتھ لے جا کے چار پالی پر بٹھا دیا پھر وہ خود پیچھے بیٹھ گئے۔ جتنی دیر میں ہم نے اپنی پوزیشن واضح کی اور بتایا کہ ہم ادھر کیوں اور کیسے آئے ہیں، ہمارے لیے گاؤں سے کسی آگئی۔ اس خبر نے ہر گھر میں سنسنی پھیلادی تھی کہ مالک آئے ہیں۔ ان پر حملے کی غلطی اور ان کی فائرنگ کے بعد پیش آنے والے واقعات کی خبر تیزی سے گھر گھر پھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ اب ہماری ضیافت کے خصوصی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

میں نے بوڑھے کو سختی سے منع کیا۔ ”دیکھو چاچا! یہ کھانے پینے کا سلسلہ چلا رہے گا بعد میں۔ نہ ہم کہیں جا رہے ہیں نہ تم جا رہے ہو۔ ابھی ہم اپنے علاقے کو دیکھنے آئے ہیں۔ ہمیں راستوں کا بھی کچھ اندازہ نہیں تھا اس لیے بھٹکتے ہوئے یہاں آ گئے۔“

بوڑھے نے کہا۔ ”ہم سے بڑی بھول ہوئی مالک!“
 میں نے کہا۔ ”چلو اب اس بھول کو بھول جاؤ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمھاری عمر کیا ہے اور کب سے تم یہاں ہو لیکن اس سے پہلے مجھے اس گاؤں کا نام بتاؤ۔ کیا یہ پنڈت سادات ہے؟“
 ”جی مالک! یہ پنڈت سادات ہی ہے۔“ ایک لوجوان نے کہا۔

بوڑھے نے اسے دھل در معقولتا پر گھمرا۔ ”اوئے! جب بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو سنہ بدر کھنا چاہیے۔ مالک محروم تیری کچھ ادب چاہیے۔“

”چاچا! اپنی بات پر تیس سال سے قائم ہے۔“ کسی نے خبر دے کر تو لوگ ہنس پڑے۔ ”میرے دم تک قائم رہے گا۔“
 چاچا نے برہمی سے کہا۔ ”یہ کون کبواس کر رہا ہے۔“
 بچے بولنے والے نے زیادہ ہمت سے کام لیا۔ ”کیوں جب اپنے جنرل ضیافت صاحب کے جواز کو گرہ لگایا تھا تو کیا کہا تھا تو نے سب کے سامنے؟ یہی ناک تو کچھ ادب چاہیے کا

ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ بڑے ہوں گے تو وہ بھی نکل جائیں گے کمانی کرنے۔“

”مجھے کچھ لوجوان نظر تو آرہے ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”ہاں کچھ ہیں، مگر ہذا حرام جو محنت مزدوری عی کرنا نہیں چاہتے۔ بس آوارہ گردی کرتے ہیں ادھر ادھر۔ ان کے کرنے کے لیے کوئی کام بھی نہیں ہے۔ کچھ دروازے کے گاؤں سے کوئی مرنی پکڑ لاتے ہیں یا بکری، کئی پکڑے بھی جاتے ہیں۔ پولیس چند دن چھتر دل کر کے چھوڑ دیتی ہے۔ ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ بالآخر بڑے ہو جائیں گے۔ جو بچے ہیں بڑے ہو کے نکل جائیں گے۔ گاؤں خالی ہو جائے گا۔“

ماسٹر کے پیچھے اب کافی لوگ کھڑے تھے لیکن کسی لوجوان نے اس کی تردید نہیں کی۔ یوزے خاموش کھڑے رہے۔ جموی فضا اتنی مایوس اور سوگوار ہو گئی تھی کہ مجھے بھی افسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنی ہر امید خاک میں ملتی نظر آتی تھی کہ ان لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم کر کے میں ان کی زندگی بدل سکتا ہوں۔ وہ کوئی بھی کام کرنے کے اہل نہ تھے۔ نہ ان کے پاس تعلیم تھی اور نہ کوئی ہنر۔ جموی موتی مزدوری کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اجانک مجھے احساس ہوا کہ وہاں موجود سب لوگ مجھ سے کچھ توقعات رکھتے ہیں۔ جیسے رعایا کسی نئے حکمران سے امیدیں وابستہ کر لیتی ہے کہ شاید وہ ان کی زندگی کے روز و شب کو بدل دے۔ قدرت کی یا قسمت کی مہربانی سے جو شای خزانہ اسے درے میں ملا ہے اس میں سے خوشحالی کی کچھ خیرات ان کی جموی میں بھی ڈال دے۔ عزت وہ اب بھی دے رہے تھے مگر خراج میں دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ بچتا تھا۔

لوگوں کی نظریں مجھ پر تھیں۔ ماسٹر نے مجھے سب بتا دیا تھا جو بچ تھا اور اس بچ میں ان سب کی زندگی کی تصویر تھی جو ست بدھائی کے اندر رہتے تھے۔ یہ اس جاگیر کی حدود میں واقع واحد گاؤں تھا جس کے رہنے والے شاید ایک صدی سے اس زمین کے ساتھ اپنی وہاؤں کا رشتہ بھارے تھے لیکن اب ان کی ہمت جواب دے چکی تھی کیونکہ ان کا کوئی والی وارث اور سرپرست نہ تھا۔ انہیں سہارا دینے والا اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔

اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جانے کے بعد میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ماسٹر صاحب! آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے یہ سب بتا دیا۔ اب میں کچھ

کہنا چاہتا ہوں۔ اب میں اس جگہ کا مالک ہوں لیکن میں یہاں ٹھونسنے بھرنے اور احکامات جاری کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں یہاں آپ سب کے درمیان رہوں گا۔ اللہ نے تو تین دی تو میں یہاں بہت کچھ کروں گا۔ میں نے سوچا ہے کہ یہاں فیکٹری لگاؤں گا۔ اس میں فرنیچر بنے گا۔ میں یہاں گائے، بھینسیں اور بھیڑ بکریاں پالتا جاتا ہوں بہت دست و پیانے پر۔ ان کا دودھ پک کیا جائے گا۔ دودھ سے کریم اور کھن نکالا جائے گا۔ انشاء اللہ یہاں دریائے کھار پر ایک بجلی گھر بنے گا۔ میرے ساتھ وہی لوگ کام کریں گے جو ست بدھائی کے رہنے والے ہیں۔ پہلا حق ان کا ہوگا۔ میں ان کے رہنے کے لیے گھر بناؤں گا۔ ہر گھر میں بجلی ہوگی۔ یہاں اسکول ہوگا اور اسپتال ہوگا بہت جلد!“

میری سیاسی تقریر کا رد عمل وہی ہوا جو ستر کی دہائی سے پہلے جموی کی روٹی، پکڑ اور مکان کے نعرے کا ہوا تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے نکتہ میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی امیدیں اور ان کے خواب ان کی آنکھوں میں روشن تھے اور ایسا لگتا جیسے امید کا اجالا پورے گاؤں میں پھیل گیا ہے۔ نئے بادشاہ نے نئی زندگی کی جولوہ دی تھی، لوگوں نے اس پر اعتبار کر لیا تھا۔ اب وہ سیرے ہاتھ چوم رہے تھے اور ہاتھ اٹھا کے مجھے دعا میں دے رہے تھے۔

جب ہم یہاں نازل ہوئے تھے تو جذبات کیا تھے اور اب کیا ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے لوگوں کو سمجھا بجھا کے پیچھے بٹایا۔ راجا اس جذباتی انقلاب پر دم بخود کھڑا رہا۔ وہ خود جذباتی ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ماسٹر صاحب! آپ کسی دن وقت نکالے۔ آپ کی یہاں کے حالات پر گہری نظر ہے۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔“

ماسٹر خوشی سے پھول گیا۔ ”آپ حکم کریں جناب! میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی مجھے جانا ہے۔ آپ سے پھر تفصیلی گفتگو ہوگی۔“

جب ہم سب سے معاوضہ کر کے رخصت ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جب روانہ ہوئی تو راجا جب تک کہ آنے کے بعد اس نے کہا۔ ”رفیق صاحب! یہ کیا محنت فرمائی آپ نے؟“

اس کے لیے کی ناراضی پر میں حیران ہوا۔ ”کیا؟“

”اس شعبہ بازی کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ چٹکی سے بولا۔

”اگر تیری مراد اس تقریر سے ہے۔۔۔۔۔“

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”ہاں، یہ سیاسی شعبہ بازی کیوں کی تو ہے؟ یہ سب ماریوں جیسی باتیں اس ملک کے حکمران کب سے کر رہے ہیں۔ خوبصورت وعدے اور دعوے سنتے سنتے عوام بھی اتنے تھک چکے ہیں کہ اب مستقبل سے ہی مایوس ہو گئے ہیں۔ اب انہیں ہر بات جھوٹ لگتی ہے۔“

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ کیا تو میری نیت اور میرے ارادوں پر اعتبار نہیں رکھتا۔“

”تو نے اپنے ارادوں کی شکست کے امکانات کو مد نظر نہیں رکھا۔“

”کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ اگر اللہ نے توفیق دی۔“

”بمقامت مان لیجئے پھر! تو نے اپنے ارادوں کو ایک خواب بنا کر ان سب کی آنکھوں میں بھر دیا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جب کچھ ہوتا تو سامنے آ جاتا لیکن معلوم ہے اب کیا ہوگا؟ یہ خواب انہیں دن رات بے قرار رکھیں گے۔ ابھی جو کچھ ہمارے ذہن میں ہے۔ ہم نے اس کا بچہ درک بھی شروع نہیں کیا۔ ہم نے پلان کو ڈسکس کرنے کے سوا کیا کیا ہے؟ ہمارے پاس بھی ایک خواب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خواب کو تعبیر لینے تک کتنے مہلوس سے گزرنا ہے۔ اس کو یہ جاہل اور سیدھے سادے لوگ کیا جانیں؟“

میں نے کہا۔ ”مگر تو جانتے ہیں۔“

راجا نے کہا۔ ”ہم کیا جانتے ہیں؟ کیا ہم نے کسی ایکسپٹ کے مشورہ کیا ہے۔ کوئی رپورٹ لی ہے ان منصوبوں کے قابل عمل ہونے کے بارے میں۔ یہ سب ممکن ہے یا نہیں، ہمارے پاس نہ بلیو پرنٹ ہے نہ ٹیکنیکل رپورٹ۔ نہ سرکاری منظوری نہ سرمائے کی فراہمی کا بندوبست۔ نہ ماہرین کی خدمات اور نہ۔۔۔۔۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ سب ہو جائے گا راجا اپنے وقت پر۔“

”ابھی تو میں تجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ سب اپنے وقت پر ہوگا لیکن یہ لوگ جو کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ قتل از وقت چکر لگانا شروع کر دیں گے کہ مالک کام کب شروع ہوگا، ہمیں نوکری کب ملے گی۔ مہینا پورا کر گیا۔ ابھی تو کچھ شروع نہیں ہوا۔ دو مہینے ہو گئے آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں فیکٹری لگے گی۔ فیکٹری لگ جائے گی تو پھر ہمیں گے کہ ہماری کالونی کب بنے گی جس میں کتنے بجلی ڈالے گھر ہوں گے؟ اسکول کب بنے گا؟ اسپتال کب بنے

گا؟“

”یار راجا! وہ سب اتنے ناامید تھے کہ انہیں دلاسا دینے کے لیے کچھ کہنا ضروری تھا۔ انہیں بعد میں سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ سارے کام چاؤدی چراغ سے نہیں ہوتے۔ میرے کام کو لاؤر دیکھو پریشان ہونے اور پریشان کرنے سے کچھ نہیں ہوگا اور وہ کچھ جائیں گے۔“

”تو نے صرف سیاسی فائدہ اٹھایا ہے۔“

”اگر یہ الزام ہے تو مجھے قبول ہے۔ ہاں میں نے سیاسی فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر نیا حکمران ایسا کرتا ہے۔ مجھے بھی ان کی حمایت چاہیے۔ ان کی حمایت ہی میری طاقت ہے ورنہ یہاں میں انہی ہوں اور مجھے ہر طرف سازشی عناصر نظر آتے ہیں جو میری آمد سے خوش نہیں ہیں۔ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ میں یہاں مکمل طور پر اپنا اختیار تسلیم کر اؤں۔ پہلے ست بدھائی کے مالک اور دربار ضرور تھے مگر ان کے پاس حق ملکیت کے سوا کچھ نہ تھا اگر وہ یہاں بھی آتے تو ہمالوں کی طرح۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے تو وہاں تک اڑو کہ؟ انہیں یقین دلا دیا گیا کہ سب ٹھیک ہے تو وہ واپس ولایت چلے گئے۔ یہ جگہ عملاً سازشی لوگوں کے قبضے میں رہی اور یہاں انہوں نے پتا نہیں کیا دھندہ شروع کر دیے جیسے یہ ان کے باپ کی جاگیر ہے۔ اب وہ پریشان ہوں گے۔“

راجا نے کہا۔ ”وہ تیرے ہر منصوبے کی راہ میں روڑے اٹھائیں گے۔“

”ان سے ٹھنسنے کے لیے مجھے ہر قسم کی طاقت چاہیے۔ قانون کی طاقت، دولت کی طاقت، بدعاشی کی طاقت، ایک طاقت یہ لوگ فراہم کریں گے جو ست بدھائی کے عوام ہیں جو ای طاقت۔۔۔۔۔“

جب راجا چلا رہا تھا اور اب ہم جنوب کی طرف ست بدھائی کی آخری حد سے واپس حویلی کی طرف آرہے تھے۔ شمال کی طرف جانے کا وقت نہ تھا ورنہ ہم دوسری طرف سے آنے جانے کا راستہ ہی دیکھ لیتے۔ جب اب اسی کے راستے پر تھی جس پر چل کے گزشتہ رات بھی ایک ٹوک حویلی تک آیا تھا۔ راستے کے ایک طرف کھیت تھے اور دوسری طرف خادراتاروں والا وہ علاقہ جو ست بدھائی کی حدود میں ہونے کے باوجود ہمارے لیے علاقہ غیر سے کم نہ تھا۔

راجا نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ یہ جگہ درمیان میں نہیں ہوگی۔ یہ ست بدھائی کی شمالی حد ہے لیکن اس کی قانونی حیثیت کے بارے میں شک کی کوئی بات نہیں۔ یہ قبضہ غیر قانونی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی قانونی قدم اٹھانے سے پہلے میں اپنے وکیل سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آخر یہ کون لوگ ہیں۔ یہ جگہ کسی کفر و خست کی گئی ہوئی تو قانونی مجھے ضرور بتانا۔“

”اس کے علاوہ یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”مجھے رو رہے کے نمک حرام اکبر خان کا رویہ یاد آتا ہے۔ اس نے میرے سامنے کلا شگوفہ تان لی تھی۔ چند روز رو پے ماہانہ کا چوکیدار کہتا ہے وہ خود کو اور اس کی یہ ہمت؟ معاملہ کچھ اور ہے راجا؟“

”اب تو وہ غائب ہے ورنہ اسی سے پوچھتے۔“

”اے وہ کب تک غائب رہے گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے خلاف جالو کے قتل کی ایف آئی آر درج کرادوں۔“

راجا نے کہا۔ ”اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ چور جو اندر میرے میں مجھے دھکا دے کر قتل کیا تھا، اکبر خان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”تیرے یقین کو پولیس بطور ثبوت تسلیم نہیں کر سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ جھوٹ اور جھلسا ہے۔ شاید وہ فوج میں بھی نہیں رہا لیکن ایسے اس کو خود کو نائب سید بیدار شہور کر رکھا تھا اور کئی جلدی اس نے میرے سامنے اعتراف کر لیا اپنے جرم کا۔ مجھے اس کی معنوی تائید پر بھی شک ہے۔ جب پولیس ان تمام معاملات کی تفتیش کرے گی تو سارے خالق سامنے آ جائیں گے۔“

”خوش فہمی ہے تیری نیکے پتر! مبتول کہ تو اب پاکستان میں ہے۔ پولیس کو سب پہلے سے معلوم ہوگا۔ ممکن ہے اس کے دھندے میں پولیس براہ راست شریک ہو۔ ایسے سارے غیر قانونی کام پولیس کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہو سکتے۔“

میں نے کہا۔ ”آخر یہ خود کار حفاظتی نظام، یہ سیکورٹی سسٹم کس کے لیے ہے یہاں۔ یہ کوئی فوجی انسپکشن تو نہیں ہے یا انٹیلی ریسرچ سینٹر تو نہیں ہے۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”شاید یہ اتنا آسان نہ ہو۔“

”راجا! میں نے کہا۔ ”نمک حرام اکبر خان آج گیت پر نہیں ہے۔“

راجا بولا۔ ”لیکن اندر کتنے مسلح محافظ ہیں؟“

”نظر تو کوئی بھی نہیں آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم بھی مسلح ہیں۔ کیا خیال ہے گیت توڑتے ہوئے جب کے

ساتھ اندر چلے جائیں؟“

راجا بجز گمیا۔ ”بار تو پاگل ہو گیا ہے۔ آخر جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ خدا نخواستہ اندر سے فائرنگ ہوگئی پھر کوئی ست بدحالی کے نواب صاحب کو دیکھ کر ادب سے رکے گی نہیں۔ تجھے نہ اپنا خیال ہے نہ فریال کا، نہ میرا نہ اپنے ماں باپ کا، کیوں مرنا چاہتا ہے تو؟“

مجھے ایک دم ہوش آ گیا۔ ”آئی ایم سوری راجا! اسی لیے تو میں نے تجھے ساتھ رکھا ہے۔ بقول شاعر اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل، ہمیں سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا ہوگا۔“ تو نے ٹھیک کیا۔

جب رکے تک راجا بولتا رہا۔ اس کے بعد فریال نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”آگے خیر سے بدحوالی کے گھر۔“ وہ مجھے دیکھتے ہی چلائی۔

میں نے کہا۔ ”گستاخ! نواب رفیع احمد شیرازی کو بدحوالی اور جلی کو گھر کہتی ہے۔“

اس نے گھڑی دکھائی۔ ”جھگڑنے سے لاپتہ تھے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر میرے پانے کے لیے نکل گئے تھے۔“ خوف سے اس کا برا حال تھا۔

”لاحول ولا قوۃ! اتم تو بالکل دیا نوی بیویوں کی طرح بول رہی ہو۔ اکیلی کہاں تھیں تم، فرخ یہاں تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ کیا بات ہے تم اتنی پریشان لگ رہی ہو۔“ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

وہ ایک دم چھوٹ چھوٹ کے رونے لگی۔ ”جہیں ملوم ہے بعد میں کیا ہوا؟“

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ”فری! کیا ہوا؟“ میں نے اسے ہاتھوں میں بھر لیا۔

وہ میرے سینے پر سر رکھ کر روتی رہی۔ ”وہ فرخ کو لے گئے۔“

میں نے اس کا سر اٹھایا۔ ”فرخ کو لے گئے، کون؟“

”مجھے نہیں معلوم وہ کون تھے؟“ فریال کا جسم کانپنے لگا۔

”انہوں نے جہیں پوچھا تھا؟“

راجا میرے ساتھ مجرم بنا کھڑا تھا۔ ”انہوں نے کچھ کہا تو ہوگا؟“

”انہوں نے فرخ سے کہا کہ رفیع صاحب نہیں ہیں تو تم ہو۔ فرخ بھی نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے لے جاتے۔“ فریال کا رونا جاری رہا۔

میں نے کہا۔ ”فریال! ڈونٹ لی سلی! مجھے بتاؤ وہ کتنے لوگ تھے۔ کیا چاہتے تھے۔ فرخ کیوں کیا ان کے ساتھ،

جانے سے پہلے فرخ نے کچھ نہیں بتایا؟“

”وہ جب میں آئے تھے۔ میں اندر مصروف تھی۔ باہر صرف وہ تھا۔ محمد ادرک جیٹا شہباز، اس نے بتایا کہ چار افراد تھے، سب نے منہ پر ڈھانے باندھ رکھے تھے۔ شہباز نے ان کی منگھٹوں کی لیکن اس نے دخل نہیں دیا۔ فرخ نے کہا تھا کہ رفیع صاحب تو نہیں ہیں۔ تم انتظار کرو۔ انہوں نے کہا کہ ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ تم جلو ہمارے ساتھ، فرخ نے پوچھا کہاں تو انہوں نے ریو اور نکال لیے اور فرخ کو بچھ کے گاڑی میں ڈال لیا۔ شہباز اتنا ڈر گیا تھا کہ دم سادھے چپ کھڑا رہا۔ جب چلی گئی تو اس نے مجھے بتایا اور پھر خود بھی بھاگ گیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کون لوگ تھے؟ میں کیا بتاتی؟“

میں نے کہا۔ ”یہ کب کی بات ہے۔ کتنی دیر پہلے کی؟“

”دو گھنٹے ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیسے تم سے رابطہ کروں۔ دولوں فون ایٹلی وینٹ ہو گئے ہیں۔ تم سے پوچھنے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ نہ پولیس کو اطلاع دے سکتی تھی۔ نہ کسی اور کو بتا سکتی تھی۔ مجھے تو ایمر جیسی کانبر بھی معلوم نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اُدکے! اب ایزی ہو جاؤ۔ میں کرتا ہوں کچھ۔ فرخ کو کچھ نہیں ہوگا۔“

فرخ کے انواری خیر نے مجھے بلا دیا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ انوار نے داؤں کا ٹارگٹ میں تھا۔ فرخ سے ان کی کوئی دشمنی نہ تھی۔ وہ ریٹال بنا تھا کہ بعد میں اس کی زبانی کے لیے میں اپنے آپ کو پیش کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ انوار کے لیے آئے والے شخص حکم کے غلام تھے۔ ان کو یہ حکم دینے والوں نے سمجھا یا ہوگا کہ خالی ہاتھ واپس نہ آنا۔ اصل بندہ نہ ملے تو کسی اور کو لے آنا، جس کی اتنی اہمیت ہو کہ اسے جہز انے کے لیے رفیق اپنے بیروں سے چل کر آئے۔ ہمیں پھر نہ جانا پڑے۔

اس میں کوئی شک کی بات نہ تھی کہ فرخ کی جگہ وہ شہباز کو بھی لے جاسکتے تھے اور اندر مگر فریال کو بھی اٹھانے میں تاہل نہ کرتے۔ مجھے یقین تھا، وہ فرخ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ چند گھنٹوں میں بھی فرخ اور شہباز کی ٹیم نے فوری ضرورت کے تمام کام نمٹا لیے ہیں۔ بجلی کے پول سے ڈائریکٹ کنکشن لینے کے بعد انہوں نے تقریباً ہر عرصہ عارضی کنکشن فراہم کر دیا تھا۔ گھر کے اندر فریال نے ناظر اور ریشماں کی مدد سے گھر اور خصوصاً بچن کو قافل

اطمینان حد تک کارآمد بنایا تھا۔

ہم اندر جا کے بیٹھے تو فریال نے بھی خود کو سنبھال لیا۔ غائب لال غرارہ موٹ سے وہ خود بھی اتنی عاجز آگئی تھی کہ اس نے دوبارہ اپنی جینر کے ساتھ شرٹ بچن کی تھی۔ وہ آنسو پونچھ کے چائے بنانے چلی گئی۔

راجا نے کہا۔ ”تجھے پوچھتا ہوں آسکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پارکس کا نام لوں؟ یہ کوئی خفیہ ہوا گاہ تو ہے نہیں جہاں کسی کا پہنچنا محال ہو۔ وہ چیف کے کارندے بھی ہو سکتے ہیں جو مجھے ہراساں کر کے بھگانا چاہتے ہیں۔ پہلے اکبر خان اور کل پتھر جیٹس کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ جرم پیشہ عناصر یہاں ہماری موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتے۔“

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ اگر ایسے حالات پیدا کر دیے گئے تو ہمارا ساتھ کون دے گا؟“

”شہباز بھاگ گیا۔ شاید فرخ بھی پیچھے ہٹ جائے۔“

راجا نے کہا۔ ”ہمارے لیے کوئی جان کو خطرے میں کیوں ڈالے گا۔ شہباز کر دیتی باپ کا اٹھوتا بیٹا ہے۔ اسے کیا پڑی ہے باپ جی دس لاکھ کے لیے رسک لے۔ فرخ سے بھی ہمارا کیا رشتہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”لیکن ہم اتنی آسانی سے بھاگے والے نہیں ہیں۔“

”ہاں! لیکن سوال یہ ہے کہ ابھی ہم کیا کریں؟“

فریال کا کئی کنگ ایک ٹرے میں رکھ کے لائی۔ ایک اس نے مجھے تھمبا دوسرا راجا کو دیا اور خود تیسرا لے کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔ ”بیٹھے کے باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ کرو۔“

”تم بتاؤ کیا کریں؟“ راجا براہمان کے بولا۔ ”ہم تو بے وقوف ہیں۔ میرے پانے کرتے پھر رہے ہیں یا یہاں بیٹھے گپ لگا رہے ہیں۔“

”اور کچھ نہیں تو پولیس کو نون کرو۔“

”پولیس کو کیا تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو؟ دس سال ہو گئے اخبار کی صحافت کرتے۔ دن رات واسطہ پڑتا ہے دونوں سے۔ کیا مجرم اور کیا قانون کے رکھوالے۔ نون کا کیا ہے میں براہ راست ڈی آئی جی سے بات کر سکتا ہوں۔“

”تو پھر کرتے کیوں نہیں؟“ فریال نے غصے سے کہا۔

”اس لیے کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ کیا بتاؤں گا میں اسے کہ میں کہاں سے بات کر رہا ہوں۔ ست بدحالی میں کیوں بیٹھا ہوں۔ مجھے کس پر شک ہے؟ چیف کا نام لوں گا

فرخ نے کہا، ”جواب مجھے پریشان کر رہی ہے وہ حریہ
نا قابل تصور ہے۔ مگر وہ بھی کہہ رہے تھے۔“
”انسان کی قبر میں کتے کو دفنانا..... کیا ایسا ہو سکتا ہے“

فریال بولی۔

فرخ نے دہکی چہرے سے فریال کو دیکھا ”وہ زندہ
انسان کو ایک مردہ کتے کے ساتھ دفن کرنے کی بات کر رہے
تھے۔ خود ہی دہشت زدہ تھے لیکن مجھے بتا رہے تھے کہ ایسا تو
ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا ”نہیں فرخ، تم نے غلط سمجھا۔“

”میں نے وہی سمجھا جو ان کا مطلب تھا۔ کاسو ابھی زندہ
ہے لیکن اس کو سزائے موت سنائی جا چکی ہے اور جیسے انگریز
کے زمانے میں باغیوں کی سزا کو پھرتی ناک بنانے کے لیے
انہیں چوک میں پھانسی دی جاتی تھی اور پھر ان کی لاش کی کئی
دن لٹکتی رہتی تھی۔ ایسے ہی کاسو کا انجام دوسروں کو سبق
سکھانے کے لیے ہے۔ شاید کسی نے انعام کے لالچ میں رانا
کو تباہ کیا کہ رستم کی موت کاسو کی بے وقوفی سے ہوئی۔ اس
نے رستم کو محلے کے لیے چھوڑا تھا۔ اس نے دوسری غلطی یہ کی
کہ رستم کی لاش وہیں چھوڑ گیا۔“

فریال جیسے کسی دہشت ناک خواب میں چلائی ”مگر ایسا
کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں نے اسے اپنے قریب کر لیا ”نہیں، نہیں..... یہ
نہیں ہوگا۔“

فرخ نے کہا ”وہ مجھے دہاں لے گئے تھے جہاں رستم کی
لاش پڑی تھی۔ تم نے اس کی لاش پر وہ خرگوش رکھ دیا تھا۔“
”ہاں، کیا اس سے رستم کی لاش کی بے حرمتی ہوئی؟“
میں نے جی سے کہا۔

”نہیں۔ رانا ایسا ہی سمجھتا ہے۔ تم نے اس کا مذاق
اڑایا۔ یہ پیغام دیا کہ وہ بے بس ہے۔ تم ایک خرگوش کو بچانا
چاہو تو رانا صاحب کا رستم کچھ نہیں کر سکتا۔ تم نے رانا کا شکار
چھینا۔ اسے چیلنج کیا۔ وہ ایک خطرناک نفسیاتی مریض لگتا ہے
مجھے یہ فرعونیت یہ تکبر.....“

میں نے کہا ”کیا تمہارے ساتھ جا کے انہوں نے لاش
اٹھائی؟“

”نہیں۔ لاش وہ پہلے ہی لے گئے تھے۔ مجھے انہوں نے
وہ قبر دکھائی جو کھودی جا رہی تھی۔ بالکل ایسی جگہ..... اور پھر مجھے
چھوڑ دیا۔ میری آنکھوں پر سے پٹی اتار دی۔ وہاں سے میں
اندازے سے سمت دکھ کے چلا ہوا یہاں پہنچا۔ کئی جگہ بھٹکا۔“
خاموشی کا ایک طویل اور بوجھل وقفہ آیا جس میں ہم

تاک میں جملہ مکمل کروں۔“
فریال سکرائی ”جملہ تو میں بھی مکمل کر سکتی ہوں لیکن
فرخ، تم آگے بولو۔“

”زینتی صاحب نے الٹا یہ کہہ دیا رانا کے غلاموں سے
کہ رانا نے کہا آ کے بیٹے جا گئے۔ اس پر وہ بہت چراغ
باتھا کہ اول تو یہ نقصان کوئی پر انہیں کر سکتا۔ نہ لاکھوں سے
نہ کروڑوں سے..... دوسرے وہ..... اب میں اصل الفاظ
استعمال کروں یا مطلب بتاؤں؟“

”اور بھل ٹیکٹ سناؤ؟“ میں نے کہا ”کچھ سن کر نے
کی ضرورت نہیں۔ فریال اتنی بالغ ہو چکی ہے کہ پنڈت
کو کارام کی بلند پایہ تصانیف سے بھی مستفید ہو سکتی ہے۔“
فریال نے کہا ”ایسا وہ تو بچوں کے لیے ہیں۔“

میں نے اپنا سر پھٹ لیا ”یابے شرعی تیرا ہی آسرا۔
فرخ، تم بولو۔“

”تم نے رانا کی عزت یہ کہہ کر دو کوڑی کی کر دی کہ وہ
خود آئے اور تم سے پیسے مانگے۔ یہ کیسے ممکن تو کروں کے نوکر
جو کتوں کے خادم ہیں ان کے سامنے رانا صاحب کے لیے
ایسے نازیبا الفاظ استعمال کیے اور ایسا ذلت آمیز انداز اختیار
کیا۔ اب خیریت مطلوب ہے تو کل تقریب میں سب کے
سامنے معافی مانگ لو۔“

”ورنہ وہ فوج کشی کر دیں گے تو پ خانہ لے کر
آجائیں گے مجھے ہاگی کے بیروں میں ڈال دیں گے؟ اس
سے کہتا تھا کہ کسی روز تو خود بھی کتے کی موت مارا جائے گا۔“
میں نے کہا۔

”اؤو..... کچھ دیر مت بولو ناں..... فرخ کی بات تو سن
لو، فریال جھلائی۔“

فرخ نے کہا ”اصل بات ابھی باقی ہے۔ رانا نے تو
نہیں بتایا مگر جو لوگ مجھے وہاں چھوڑنے آئے تھے انہوں
نے تقریب کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ رستم کے ساتھ
کاسو کو بھی دفن کیا جائے گا۔ زندہ۔“

میں بھونچا رہ گیا ”زندہ دفن کیا جائے گا؟“
”انہوں نے ایسا ہی کہا تھا۔ ممکن ہے وہ مجھے دہشت
زدہ کر رہے ہوں۔ کاسو کو پہلے ہی مار دیا گیا ہو۔“

”صرف اس لیے کہ رستم کی موت کا ذمے دار کاسو کو
قرار دیا گیا ہوگا؟“ راجا نے پوچھا۔
میں نے کہا ”کاسو مجھے غلاموں کو بلا تھیں مگر سزا دی
جاسکتی ہے، میں نے جی سے کہا۔“ لیکن اسے کتے کے ساتھ
لٹانا.....“

”اور رانا نے کہا کہ جانے دوا سے؟“ راجا بولا۔

”نہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو..... اور
میں نے بتا دیا۔“

”کیا بتا دیا؟“ میں نے کہا۔
”وہی جو جی تھا..... کہ دیوے تو زینتی صاحب دوست
ہیں۔ پہلے ایک رشتے سے وہ میرے برادران لاہمی تھے۔“

میں نے کہا ”کیا یہ بتانا ضروری تھا؟“
”میں واضح کرنا چاہتا تھا کہ نہ میں ملازم ہوں اور نہ
ایرا غیر۔“

”تم مشکل میں پڑتے تھے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”اس کے برعکس..... رانا کا
رو بہ اچھا ہو گیا۔ اس نے مجھے عزت سے اپنے پاس بٹھایا اور
پھر کہا کہ اب تم آگے ہو تو اپنے برادران لاگو بتا دیا کہ ہم
سے دشمنی مول نہ لے۔ اس کی وجہ سے ہمارا نا قابل حلانی
نقصان ہوا۔“

میں چونکا ”کیا وہ اپنے کتے کی بات کر رہا تھا؟“
”ہاں..... لیکن مجھے تو کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا
کہ رانا صاحب ایسے پیغام تو آپ کے بندے وہاں بھی دے
سکتے تھے۔ رانا نے کہا کہ وہ جو بڑا طرم خان بنا پھرتا ہے۔
صافوں کی تو پ سمجھتا ہے خود کو۔ راجا، ہم اس کو سمجھنا
چاہتے تھے کہ ہمارے لیے وہ اتنا ہی بے ضرر ہے جتنی بھگینوں
کی تو پ ہوتی تھی۔ اگر وہ چاہے تو اس کو خبر بنا کے شائع
کر دے اور جیسے چاہے بلا لے۔ فوٹو گرافرز کو اور اپنے
رپورٹرز کو تقریب کی کوریج کے لیے۔“

میں نے کہا ”کیا کتے کی شانہ انداز میں تدفین کے
لیے کوئی عظیم الشان تقریب ہو رہی ہے؟“
فریال سچ میں بولی ”نہ کتے کا کیا معاملہ ہے؟“
میں نے کہا ”آج جنگل میں ہمارے ہاتھوں رانا کا
ایک کتابارا گیا تھا اس کا نام رستم تھا۔“

”اس نے ہم پر حملہ کیا تھا۔“ راجا نے فریال کی صورت
کے تاثرات دیکھ کر وضاحت کی۔
”رستم کو واقعی کل بڑے اعزاز کے ساتھ دفن کیا جائے
گا۔“ فرخ نے کافی کا خالی گد رکھ کے بات پھر شروع کی۔
”لیکن اصل بات کچھ اور ہے۔ رانا اس پر ہم تھا کہ اس غلطی
بلکہ سنگین جرم کے بعد آپ دست بستہ رانا صاحب کی خدمت
میں معافی کی درخواست پیش کرنے کیوں نہیں گئے۔“

”اس کی تو.....“ میں نے کہا اور پھر فریال کی طرف
دیکھا ”تم اپنے کان بند کر لو یا کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ۔“

تو مجھے رفتی کے پورے بیک گراؤ کا حوالہ دینا پڑا ہے گا۔
سلطان کا نام لوں گا تو تمہارے بارے میں بتانا ضروری
ہوگا..... کیا کروں؟ بتا دوں اسے سب؟“

فریال چپ ہو گئی کیونکہ راجا مجھے میں آ گیا تھا۔ کچھ دیر
خاموش رہنے کے بعد اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا
”معلوم نہیں فرخ کہاں ہوگا۔ کس حال میں ہوگا بے چارہ۔“
فرخ جیسے اسی سوال کے انتظار میں دروازے کے پیچھے

تھا۔ وہ جواب سن کر یوں سامنے آیا کہ ہم سب اچھل کے
کھڑے ہو گئے۔ غیر ارادی طور پر ہم سب نے چلا کے ایک
ہی بات کی ”فرخ، تم..... تم تھک تو ہونا؟“

فرخ نے آہستہ سے سر ہلایا اور آگے آ کے صوفے پر
گر گیا۔ اس کی حالت بظاہر ٹھیک لگتی تھی۔ نہ اس کے جسم یا
چہرے پر خون تھا اور نہ کوئی تشدد کی علامت نظر آ رہی تھی لیکن
وہ سخت بدحواس اور تھکا ہوا لگتا تھا۔ فریال دوڑ کے اس کے
لیے پانی لائی جو اس نے ایک سانس میں یوں پی لیا جیسے وہ
کسی صحرا کے سفر سے پیاسا آیا ہے۔

میں نے کہا ”فرخ، تم واقعی تھک ہو نا۔“
فرخ نے کہا ”ہاں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔“

فریال نے کہا ”میں تمہارے لیے کافی لانی ہوں۔ چلو تم
یہ لو۔“ اس نے اپنا گد فرخ کو تھما دیا ”میرا ابھی موڈ نہیں۔“
راجا نے کہا ”ہم ابھی کچھ دیر پہلے واپس آئے تو فریال
نے بتایا.....“

اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور پھر اپنے جوتے
اتارنے لگا۔ ”میں بہت دور سے پیدل چل کے آ رہا ہوں۔
انہوں نے مجھے جنگل میں چھوڑ دیا تھا۔“

بیک وقت میں نے اور راجا نے کہا ”کس نے؟“
فرخ نے ایک گہری سانس لی ”وہ جب علی خیال کے
بندے تھے۔“

”کیا.....؟ جنہیں رانا نے اغوا کر لیا تھا..... مگر
نہیں..... میں نے کہا۔“

فرخ نے اپنے پاؤں سینئر ٹیکل پر پھسلا دیے ”وہ مجھے
کے دھوکے میں لے گئے تھے۔ میری آنکھوں پر پٹی

.....“
”اور غلطی کا احساس ہوا تو چھوڑ دیا؟“

”نہیں۔ جب انہوں نے مجھے رانا کے سامنے پیش کیا تو
بیکارہ اونے کھل کے بچا نہ یہ رفتی سے اور نہ اس کا
دست۔ چ..... تم سے کہا بھی تھا کہ حویلی کے کسی ملازم یا

ایرے غیرے کو مت اٹھانا۔“

سب ایک نامکن محسوس ہونے والے منظر کا تصور کر کے اندر ہی اندر غصے سے گلے کھاتے رہے پھر راجا نے کہا "یار! اگر ایسا ہوا تو؟"

میں نے کہا "ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔"

"مگر کیسے؟" راجا کی سوچ میں گم تھا۔

میں نے کہا "ہمیں اس معاملے میں پولیس سے مدد لینا چاہیے۔"

"پولیس یقین نہیں کرے گی۔ قبل از وقت وہ کچھ نہیں کرتے۔ قتل ہونے سے پہلے کھل خطرے یا امکان پر کارروائی نہیں ہو سکتی۔"

میں نے بڑے کہا "راجا" تیرے صفائی ہونے کا کیا فائدہ۔ فون کڑسارے زمانے کو بتا دے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام سے بات کر۔"

راجا نے سر ہلایا۔ "وہ میں کروں گا۔ لیکن کاسو کو کن بجائے گا؟ فرض کرو پولیس آگئی حکام ہالا کے دباؤ پر۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ رانا کہے گا کہ راجا صاحب نے بہت لی پی ہوگی۔ نئے میں آپ لوگوں کو بھی پریشان کیا۔ کاسو کو بھی سب کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ بڑے اچھے لباس اور طے میں۔ خوش و خرم اور صحت مند۔ ممکن ہے اس سے بیان بھی دلوادیا جائے کہ رانا صاحب تو محمود ابا زوالی راجا دینی اسلامی مساوات کا سلوک کرتے ہیں۔ بھائیوں کی طرح رکھتے ہیں۔" وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا "مگر سب کے چلے جانے کے بعد کیا ہوگا؟"

یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہاں کاسو کی زندگی کی کیا ضمانت ہوگی؟ ہم نے سمجھا تھا کہ غالب کے اڑیں گے پرزے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گئے تھے پر تماشا نہ ہوا۔ تماشے سے پہلے ایک اور تماشا۔ راجا صاحب کو دیکھو سالا صحافیوں کی توپ۔ مفت کی ملی ہوئی کر اتنی لی گیا۔ نئے میں جو چاہا کھ دیا۔ اور آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں کہ تماشا دیکھنے آ گئے۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے اس اکیسویں صدی کے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں؟

اور جب راجا کا تماشا بنانے والے جیتے ہوئے چلے جائیں گے تو اصل تماشا ہوگا۔ کاسو تیرے کو فیوض اللہ کر دے دو گئے کا صفائی کیسے بدل سکتا ہے؟ نہ وہ دلایت پلٹ چھو کر راجا اب خود کو لاپتہ کہتا پھرتا ہے۔ گاڑو اس میں سڑکتے کے ساتھ اس ذلیل غلام کو۔ اور غلام سرنگوں ہو جائیں گے۔ جو حکم آقا یوم حشر کا سوا یک کسے کی نبر سے برآمد ہوگا۔

"پھر کیا کریں راجا؟" میں نے بالا خر خاموشی کے جمود

کو توڑا۔

"کچھ تو کرنا ہی چاہیے" فرخ نے کہا۔

میں نے کہا "کیا انہوں نے بتایا تھا کہ تقریب کب ہوگی؟"

"ٹھیک اسی وقت۔ جب رستم کی موت واقع ہوئی تھی۔"

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا "ہم جائیں گے۔ ہم کاسو کو مرنے نہیں دیں گے۔"

فریال نے سکون کا سانس لیا اور میری طرف دیکھا۔ میں بھی جواب میں مسکرایا۔ اس فیصلے نے مجھ میں سکون دیا تھا۔ اب ہم ایک دوسرے سے نظر ملا سکتے تھے اور اپنے آپ سے بھی کڑسار نہیں تھے۔ پھر فرخ نے چلا گیا۔ فریال

کھانے کے انتظام میں لگ گئی۔ ایک فون راجا نے لے لیا اور شہناز سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ بتیش بچانے کے لیے میں نے

الہامی سے کہا کہ وہ میرا نمبر ملا میں۔

الہامی نے حسب عادت پہلے یہی کہا "بس اللہ کا شکر ہے جتنا سب ٹھیک ہے" مگر میں نے ان کے لہجے میں پوشیدہ

تشویش کو محسوس کر لیا۔

میں نے کہا "آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔ دادی کیسی ہیں؟"

"دادی اور تمہاری امی اللہ کے فضل سے اچھی ہیں۔ جھمپیں یاد کرتی ہیں کہ آتے ہی پھر چلے گئے۔ مگر۔۔۔"

میں نے کہا "مگر کیا الہامی!"

"ایک چھوٹی سی پریشانی ہے۔" انہوں نے تھوڑے سے تذذب کا مظاہرہ کیا۔ "کچھ لوگ ہیں جو جھمپیں پوچھتے

ہوئے آتے تھے۔ معلوم نہیں کون ہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں مگر تمہارے دوست نہیں ہو سکتے اتنے بدخیز!"

میں نے کہا "میں آپ سے سنتا چاہتا تھا ورنہ راجا نے بتا دیا تھا۔ کیا وہ اب بھی پریشان کر رہے ہیں؟"

"ان کی بدتماشی تو حد سے بڑھتی جا رہی ہے جیٹا۔ کہتے تھے کہ تم جموت بول رہے ہو۔ رشتے گھر میں چھپا ہوا ہے۔

میں نے کہا کہ کیا وہ تمہارا مقروض ہے؟ کتنے پیسے چاہئیں مجھے بتاؤ۔ وہ دتے ایک تو حد سے بڑھ گیا۔ کہنے لگا کہ ہاں وہ مقروض ہے لیکن پیسے نہیں! ہمیں جان دے کر ہی اس کا قرض ادا ہوگا۔ میں نے ناراض ہو کر کہا کہ اچھا پھر میری

جان لے لو۔ کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا۔ تم دھکی

دلوں بیٹوں کا حق برابر تھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو وراثت کا معاملہ ہے زندگی میں کوئی انتساب کچھ جس کو چاہے دے۔

وہ نہیں مانی کہ تم نے ہی رشتے کو کٹی پڑھا لی اور اس نے لندن میں بڑھے کو چھانسا لیا۔ پتا نہیں کیا جموت بولا اور کیا چکر

چلایا کہ اس نے سب رشتے کے نام لگھ دیا۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے! اسی جائداد کے لیے۔ بس اسی پر بات بڑھ گئی۔

میں نے کہا کہ خبردار جو مجھے لوٹ گیا۔ جو کہتا ہے رشتے سے کہتا۔ تمہاری دادی نے بھی چچا کو ڈانٹا کہ بیوی کی زبان چل

رہی ہے! چچی کی طرح اور تو بولتا نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ چچا بولنے پر کیسے روکوں۔ اس پر دادی بہت غصے میں آ گئیں

اور بس۔۔۔۔۔ وہ چلے گئے لیکن پھر نہ جانے کیادل میں آئی کہ جیسے گئے تھے دیے ہی لوٹ آئے۔ صفائی بھی مانگ لی مجھ

سے اور دادی سے۔"

ان کی بات ختم ہوئی تو شاید رابعہ آس پاس ہی کھین مٹھلا رہی تھی۔ وہ آگئی لائن پر کہنے لگی "بڑے حرے

آ رہے ہوں گے نواب صاحب! ارعایا کیسی ہے؟ گاؤں کی گوری کوئی دل کو بھائی؟"

میں نے کہا "یہ سیٹ لائن فون ہے۔ اس پر کبواس کرنا اور سنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ کام کی بات کرو۔"

"اوکے یور ہائی نس! وہ جو تمہارا ایک بانکا جھیلما سا دوست آیا تھا کل۔۔۔۔۔ شاد رخ خان تائب۔"

میں نے کہا "بے وقوف لڑکی! وہ خوشوار رخ خان تھا۔" اس نے بڑی غنڈی سانس لی "ہائے! ایسے نصیب کہاں

ہمارے کزن!۔۔۔۔۔ مگر سبھی اچھی تھی نام بھی اچھا تھا فرخ؟"

"راجا! مجھے دال میں کچھ کالافرا آ رہا ہے۔ وہ بھی آجیں پھر ہاتھ کہ تمہارے گھر میں دورانی کر تائب کون تھی؟"

وہ غصہ پڑی "بدخیز۔۔۔۔۔ ایٹور راجا نے نہیں کہہ سکتا تھا۔ خیر میں نے اس سے کہا تھا کہ اس تجربہ کو لے جاؤ اپنے

ساتھ۔ یہاں تو رہتا ہے جن بھوتوں کے ساتھ۔ کچھ کرتا کرتا نہیں۔ اس کو لگاؤ کسی کام سے۔"

میں نے کہا "کزن! وہ عشق کرتا ہے تم سے۔ اس سے زیادہ فضول کام یہاں میرے پاس کہاں؟"

"ایک بات بتاؤں۔۔۔۔۔" وہ رازداری سے بولی "میں نے اس کے عشق کا اکاؤنٹ کھول دیا ہے جیسے بینک

والے سیونگ اکاؤنٹ کو کر دیتے ہیں اگر اس میں کچھ نہ ہو۔" میں نے کہا "اب کیا فرخ کا کیا کرنت اکاؤنٹ کھل گیا ہے تمہارے ایلو بینک میں؟"

وہ زور سے ہنسی اور گانے لگی "یہ ایلا ایلو کیا ہے۔۔۔۔۔؟"

دینے آئے ہو؟ اس پر دوسرا اسے لے گیا۔ پھر وہ سامنے پان والے کی دکان پر نظر آنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا دن

دروازے پر نظر رکھتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو اس کے پاس ایک سے ایک ادبانی ہر وقت موجود رہتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ

وہ نئے والے سگریٹ اور پان کے علاوہ بڑا پیاں پیتا ہے۔ پولیس کا خبر بھی ہے۔ راجا نے کہا تھا کہ میں انہیں پکڑا دیتا

ہوں لیکن میں نے روک دیا۔ محلے میں بھی تو رہتا ہے جیٹا! لیکن اب کچھ کر پڑے گا چارہ نہیں اس کے سوا۔"

میں نے کہا "اب کیا ہوا ہے الہامی!"

"کل اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی۔ ایک بولا کہ بڑھے طوعے کو نیا سبق پڑھانا ضروری ہے۔ دوسرے نے کہا

کہ یار طوطا نہیں پکڑ رہے۔ پہلا بھنے لگا کہ طوطا اسی کو تو کہتے ہیں جو رتا دہ بول دیا۔ میں نے برداشت کیا مگر اوپر سے

رابعہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے افضل کو بھیجا کہ ان بدتمیز لوگوں سے پوچھو کہ آخر یہ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے افضل کو دھکے

دے کر دفع ہو جا۔ اس بے وقوف نے کچھ اتنا سیدھا کہا کہ تم مجھے جانتے نہیں جنات میرے مرید ہیں۔ تمہارے پیچھے لگ

گئے تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ اسی میں کچھ کالم ٹھونچ ہو گئی۔ انہوں نے افضل کو مارا تو افضل جان چھڑا کے بھاگا۔

افضل گھر میں کھسا تو وہ بھی اندر آ گئے۔ اس وقت میں گھر پر نہیں تھا۔ غورتوں کی چیخ پکار پر لوگ آ گئے اور انہیں نکال دیا۔

جاتے جاتے کہہ رہے تھے کہ ہم تو یہ دیکھتے اندر آئے تھے کہ رشتے کس کو نے میں چھپا ہوا ہے۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا جیٹا!

پولیس کے پاس شکایت لے کر جا میں تو معلوم ہے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ تم چھپاتے کیوں ہو؟ بتا دو رشتے کہاں

ہے؟ سنا بدھائی کا پتا ہم دینا نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "اگر وہ چاہیں گے تو یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ آپ کچھ نہ کریں کل میں آتا ہوں۔"

"ہاں آکے یہ قصہ ختم کرو۔ دیکھو وہ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "راجا نے بتایا تھا کہ چچی کی بیٹی داہن آ گئی ہے؟"

"ہاں! ایک فضول سی بات پر وہ ناراض ہو کے چلے گئے تھے۔ میں تو اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

"کیا جی وہ فضول سی بات؟"

"کچھ نہیں۔ تم تو جانتے ہو ابھی چچی کو۔ اس کی طبیعت میں دوسروں سے حسد اور لالچ بہت ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جائداد کے معاملے میں ان کے ساتھ دھوکا ہوا۔ رشتے

نے سب اپنے نام پر کرائی ورنہ وارث تو بیٹے ہوتے ہیں۔

اور میں نے فون بند کر دیا۔

دوسری کال میں نے عائشہ کو کی اور اتفاق سے وہ گھر میں ہی تھی۔ ”ارے ارے رتی! ابے وفا۔ بالکل ہی بھول گئے مجھے؟“

میں نے کہا ”ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔ کس کس سے تمہاری خبر نہیں پوچھی میں نے۔۔۔ لیکن۔۔۔“

میری خاموشی پر اس کے لہجے کی مصنوعی بٹاشت بھی رخصت ہوئی۔ وہ اداسی سے بولی ”بس رتی! پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔۔۔ لیکن میں اب ٹھیک ہوں۔ اسی ہفتے میں تم دیکھو گے مجھے۔ میں آ جاؤں گی تمہارے پاس۔ ساری رکاؤں سے دور کر کے۔“

میں نے کہا ”لیکن تمہاری ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے ابھی۔“

”اس کی ذمہ داری وہ خود ہے۔ اس کے لیے میں اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتی رتی! ایک ہی بار تو ملتی ہے زندگی جینے کے لیے۔ اس پر بھی اپنا اختیار نہ ہو تو پھر جینے کا فائدہ؟“

میں نے کہا ”آئی کو اتنا خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں بھی جی کہہ رہی ہوں۔ اس نے بڑی خود غرضی سے ہمیشہ اپنی خوشی کو دوسروں سے اہم سمجھا۔ پھر میں بھی ایسا ہی کیوں نہ کروں۔ وہ مرے گا ڈراما کر رہی ہے۔ مجھے پریشان کرنے کے لیے۔“

”ڈونٹ سے ڈیٹ عائشہ!“

”میں اسے سوئچ دے رہی ہوں۔ مرنا ہے تو مرجائے جلدی سے۔ میں غیر مصیبت تک انتظار نہیں کر سکتی۔ ایسا نہ ہو میں خود اسے مار دوں۔“

میں ہونچکا رہ گیا ”تم اپنی ماں کو قتل کرنے کی بات کر رہی ہو؟“

”ماں نہیں وہ دشمن ہے میری۔ اچھی طرح جانتے ہو تم بھی پھر کیوں اس کی حمایت کر رہے ہو؟“ وہ چلائے لگی۔

”نہیں! آئی دل لک رہی۔“

مجھے سخت ملیں ”آپا میں نے کہا“ میں پھر بات کروں گا تم سے“ ابھی تمہارا رخ خراب ہو رہا ہے“ اور فون بند کر دیا۔

راجا نے ساری بات سنی تھی اور فریال نے بھی۔ عائشہ کی بات نے مجھے سخت ڈسٹرب کیا تھا۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ پریشانوں نے بڑے منظم انداز میں مجھے ہرست سے محصور کر لیا ہے۔

فریال نے میرے پاس آ کے کہا ”پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا رومی! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کم آن“

تم کو اب سو جانا چاہیے۔“

راجا نے کہا ”فریال ٹھیک کہہ رہی ہے۔ شہناز جو دوائیں چھوڑ گئی تھی اس میں ایک سنگون آدرو گولی ہے۔“

میں نے کہا ”وہ تو کھالے میں ایسے ہی سو جاؤں گا۔“

کھانے کے بعد میں نے سونے کی کوشش بھی کی مگر ذہن پر دیوانہ کرنے والے خیالات کی بیخار تھی۔ فرخ کا کسی بھی معاملے سے براہ راست جذباتی تعلق نہیں تھا اور وہ اتنا

تھک گیا تھا کہ لیٹنے ہی سو گیا تھا۔ راجا نے ماحول سازگار کرنے کے لیے باہر کے سوا تمام لائٹس بھی آف کر دیں۔ وہ کچھ دیر کر دین بٹل رہا پھر شاید خواب آدرو گولی نے کام کیا

اور وہ بھی سو گیا۔

میں ایک کھٹے بعد بھی سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اور کاسو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے بچانے کی مجھے ایک

ی صورت نظر آئی تھی کہ ہم عین وقت پر اچانک نمودار ہوں اور کن پوائنٹ پر کاسو کو اس شیطان سے بچھین لائیں۔ مجھے

معلوم تھا کہ وہ مختلف ماحظوں کے بغیر کبھی نہیں جاتا۔ یہ کام اسی طرح ہو سکتا تھا کہ ہم پہلے ماحظوں کو بے بس کریں۔ ان

کا اسلر رکھ لیں۔ ممکن ہو تو ان کو ریفریال بنا کے اپنے محفوظ کی ضمانت کے طور پر ساتھ لائیں اور کئی دور ان کی جگہ چھوڑ دیں

جہاں سے اسے پیدل چل کے اپنے گھر جانا پڑے۔ جیسے انہوں نے فرخ کو چھوڑا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ

راجا کسی نو ٹو ٹو گرافر کے علاوہ کسی پولیس پارٹی کا بندوبست کر لے جو خاموشی سے ہمارے ساتھ پوزیشن سنبھال لے۔

میں یہیں تک سوچا اور پھر میری سوچوں کا رخ فرخ کی طرف مڑ گیا اس سے ہونے والی محکوم میرے ذہن میں تازہ ہوئی۔

پہلے وہ مجھے رتی صاحب کہتا رہا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ میں صاحب بالکل نہیں ہوں جو سال میں گورے

صاحبوں کے ٹک میں رہا اور وہاں یہ دیکھنا کہ بیٹا بھی باپ کو نام لے کر مخاطب کرتا ہے۔ پوتا اپنے دادا کا اور شاد کو اپنے

استاد کا نام لیتا ہے۔ میں گھر کی حد تک رشتوں کی تحریک کا قائل ہوں اور معاشرتی اخلاق کے مطابق غیروں کو گھر کے

حساب سے تقسیم دیتا ہوں مگر اپنے ہم عمر تو دوست ہی ہوتے ہیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ انتہائی بے تکلف دوست

مجھے نیکا کہتے ہیں۔

میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میرے فوج پر لمان کیا ہیں اور وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ”سب آپ کو کیا لگتا ہے رتی صاحب! کہاں امریکا اور لندن کہاں ست بدھائی۔“

میں نے کہا ”بالکل خواب کی طرح۔ ابھی تک میرے لیے بھی حیران کرنے والا انکشافات کا سلسلہ جاری ہے۔

حالات اور واقعات تاریخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ کچھ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ میں تو کسی اور ہی مقصد سے آیا تھا۔ برسوں کی دشمنی میری کتنی بڑی بھول تھی۔“

میں نے کہا ”اب اس بھول کو بھی بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ آگے تمہارے کیا ارادے ہیں؟ مگر اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم

کرتے کیا ہو؟ رچے کہاں ہو اور کس کے ساتھ؟“

وہ بولا ”آپ تو جانتے ہوں گے رتی صاحب!“

”بھروسہ صاحب؟“ میں نے اسے ٹوکا۔

وہ مسکرایا ”رتی بھائی کہوں تو ٹھیک ہے؟ آپ بڑے ہیں مجھ سے۔ جب میرا خاندان نہیں رہا تو گھر میں میرا اکیلے

رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ میرے کچھ عزیز تھے ایک چچا ایک ماموں۔ دو بھوپایاں اور دو خالائیں۔ خالہ اور بھولنی لائق

رہنے پر مجبور تھیں کیونکہ ان کے شوہر کوئی اضافی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے بیٹے زیادہ تھے۔ آمدنی

کم تھی اور گھر چھوٹے تھے۔ بات یہ ہے کہ دل چھوٹے تھے۔ چچا سے میرے والد کی زندگی میں بھی بات چیت بند تھی۔ اس

کا سب ایک مکان تھا جو دونوں بھائیوں نے مل کر بنایا تھا۔ مل کر رہنے کے لیے لیکن ان کی بیویوں نے ایسا نہ ہونے

دیا۔ چچا کی بیوی زیادہ تیز تھی اور چچا تھینا زیادہ بے وقوف تھے کہ اس کی باتوں میں آگے۔ مکان انہوں نے نبھالیا۔

اپلا لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والے تھے۔ تھانہ بکھری نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اماں کو بھی خاموش رکھا کہ اندھ مبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کتنے سادہ لوح تھے وہ بھی۔ تمام عمر فریب کھاتے رہے اور خود کو بھی فریب دیتے رہے۔

کیا اٹلا نہیں مبر کا صلہ۔ ان کو کسی بے آبروئی کی موت ملی۔ حقیقت کچھ بھی سمجھی۔ دنیا نے صرف تماشا دیکھا۔ مبر کرنے

والی بیوی کینسر سے مر گئی۔

میں نے کہا ”تمہارا خالہ دیکھی کسی حد تک شکر ہے پن پر جی سے۔ خدا جب اپنے بندوں کے مبر کا امتحان لیتا ہے تو اس کا کچھل دیتا بھولتا نہیں۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھ مبر نہیں ہے۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”شاید۔۔۔ اگر میرے لیے ابھی مبر کے امتحان اور بھی ہیں۔ تو میں راضی برضا رہنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ میری پرورش کی ذمہ داری

ماموں نے قبول کر لی تھی لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے

ممائی نے مجھے سوتیلے رشتے کی طرح قبول کیا۔ ان کے اپنے بھی بچے تھے۔ ان کے مقابلے میں میرے ساتھ بہت برا

سلوک ہوتا رہا۔ ماموں کہاں تک مجھے بجاتے۔ بیوی سے کتنا لڑتے۔ میں نے آزمائش کے اس دور کو ایک چیلنج سمجھ کے

قبول کیا۔ یہ سمجھ لیا کہ مجھے حوصلہ نہیں ہارنا ہے بلکہ کچھ بن کے دکھانا ہے۔ میں ہر چیز خاموشی سے کھاتا رہا۔ گایاں ماڈ

رو گئی سو گئی۔ میں نے بھی احتجاج نہیں کیا۔ بغاوت نہیں کی کیونکہ مجھے ایک مقصد عزم تھا۔ میرے کزن یعنی ماموں کے

بچے سب ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑتے تھے اور دین سے جاتے تھے۔ میں گورنمنٹ اسکول پیدل جاتا تھا حالانکہ

وہ دگنے فاصلے پر تھا۔ میرا ٹیکسی ریکارڈ پہلے بھی اچھا تھا۔ اب میں نے برائے نام والوں کے سامنے خود کو چھپا تات کرنے کا

عزم کر لیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں ہر کلاس میں اول آؤں گا۔ آپ سوچیں کہ ایک بچے کا ارادہ کیا کر سکتا ہے؟ ایسا

ارادہ تو ہر بچہ کر سکتا ہے۔ سب کے والدین بھی یہی مانتے ہیں۔ مگر کیا سب بچے محض خواہش اور ارادے سے اول

آ سکتے ہیں؟ میں اول آیا۔ ساتویں سے دسویں تک۔ پھر میٹرک میں مجھے اسکا لرش مل گئی۔ خوش صرف ماموں

ہوئے۔ ممائی حسد میں ملتی رہیں اور ان کی سیدی مامیں کرنی رہیں کہ میں مل کر کے پوزیشن لیتا ہوں۔ اندھوں میں کا نا

راجا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے میٹرک کیا تو میری عمر چودہ سال تھی۔ میری خواہش تھی کہ انٹر کے بعد میڈیکل کالج میں

داخلہ لوں۔ یہ درحقیقت میری ماں کی خواہش تھی۔ جب وہ اسپتال میں تھی۔ وہ سرکاری اسپتال تھا۔ تو وہاں کے ڈاکٹر زکا

روپہ انتہائی بے حس تھا۔ کسی حد تک سفاک اور غیر انسانی۔ وہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کینسر کے مریض۔ کے علاج پر جیسے

اور وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ انہیں تو گھر پر آرام سے مرنے کا سوئچ فراہم کرنا چاہیے۔ میری ماں بھی نرسوں اور

ڈاکٹروں کی جھنجھلاہٹ اور چڑھی سے دھکی ہوئی تھی۔ بعض اوقات وہ مریضوں سے یہ بھی کہہ جاتے تھے کہ آخر تم مرتے

کیوں نہیں؟ اب کیا رہ گیا ہے کہ جیسے جا رہے ہو۔ اس زمانے میں وہ مجھ سے کبھی رتی کی فرخ تو ڈاکٹر ضرور بنا مگر

ایسا نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایک جذباتی ساخو شوکت خانم جیسا اسپتال بنوا دیتا ہے۔ یہ شاید میری زندگی کی واحد

ٹھکانہ تھی۔ جو مسائل نہ ہونے کی وجہ سے میرے حصے میں آئی۔ ایف ایس سی میں میرے نمبر اتنے اچھے تھے کہ میں کسی بھی میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکتا تھا لیکن تعلیمی اخراجات

کا بار اٹھانا ماموں کے لیے ممکن نہ تھا۔ ایک دن وہ میرے

سامنے رو پڑے کہ میں اپنی بہن کی آخری خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ میں اس زمانے میں نیوشن پر دھاکے اپنے اخراجات پورے کر لیتا تھا۔ اگر میں نے نیوشن کی آمدنی جج کی ہوئی تو شاید داخلہ لے لیتا اور پھر نیوشن سے بھی پانچ سال کی سبکی مکمل کر لیتا لیکن ساری نیوشن فیس ممبئی وصول کر لیتی تھی کہ اب کمار ہے ہوتو خرچہ دو۔ بس اس کے بعد میں بی ایس سی کے سوا کیا کر سکتا تھا؟ میں نے کپیٹر سائنس میں داخلہ لیا اور بی سی ایس کر لیا۔ ساتھ ساتھ میں دوسرے کورس بھی کرتا رہا۔ پرائیویٹ اداروں سے میں بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھتا رہا اور ایم بی اے بھی کر لیا۔

میں نے تقریبی انداز میں کہا ”تم نے تو ایک قابل فخر مثال قائم کی ہے۔ دوسروں کے لیے۔“
”مجھے اپنی عیال غلط تھی۔ حقیقت سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ قابلیت اور صلاحیت کچھ نہیں جب تک کہ سفارش اور مستحق خالے نہ ہوں۔ چھ مہینے سے میں اچھی ملازمت کے لیے درخواستیں ارسال کر رہا ہوں۔ ایک پاکستانی ادارے میں بارہ ہزار ماہانہ کی نوکری ملی ہے۔ وہاں اوقات کار کی کوئی حد نہیں۔ بارہ گھنٹے تو لازمی ہیں مگر سولہ گھنٹہ گھنٹے بھی کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کا بزنس یورپ امریکا سے ہے۔ یہاں دن ہو تو وہاں رات ہوتی ہے۔ دن میں لوکل بزنس رات کو انٹرنیشنل سرکل۔ کسی کن کن پوری نیند نصیب نہیں ہوتی۔ زندگی کا کوئی معمول نہیں۔ سوچتا ہوں میری پہلی ہوتی تو کیا ہوتا۔ ان کے لیے میں کہاں سے وقت نکالتا۔ یہ صورت حال یہاں بہت عام ہے۔ بیوی بچوں کو آدی صرف کمائی دے سکتا ہے۔ توجہ اور وقت نہیں دے سکتا۔“

میں نے کہا تھا ”مجھے ایسا لگتا ہے کہ تقدیر نے جہیں منج جگہ پہنچا دیا ہے۔ یہ مصائب و حادثات کا پراڈت راستہ تھا مگر جیسا کہ کہتے ہیں۔ انت بھلا سو بھلا۔ اب تمہیں کہیں جانے کی کسی کی ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم میرے ساتھ رہو گے۔ میرے لیے کام کرو گے۔“ اس نے ہائی بھری تھی اور اب وہ میرا ساتھی تھا۔

میں انہی سوچوں میں تھا نہ جانے کتنا وقت گزرا کہ تاریکی میں ایک سایہ سا متحرک دکھائی دیا۔ پھر میرے حواس میں فریال کی خوشبو نے لینا کی اور اس سے پہلے کہ میں سمجھتا وہ بیڈ پر اپنی جگہ مٹا کے مجھ سے چٹ گئی۔

میں نے کہا ”فریال! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ پھر اس کے وجود کی رسمی حرارت نے مجھے سمجھادیا اور مطلق کر دیا۔ ”رہو! مجھے پتا چاہیے۔“ اس نے اپنا سر میرے سینے

میں چھاپا۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں! اکیلے ہیں سے۔“
میں نے اس کے ہونٹوں کو زخماںوں کو اور بالوں کو چوما۔ ”جان! میں خود بے پناہ تھک رہا ہوں۔“
اس نے میرے کان میں سرگوشی کی ”چلو ہم اس رات کی پناہ میں نکل جائیں۔ کہیں چلے جائیں۔ میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتی۔“
میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ”کاش ایسا ہو سکتا فری!“

”کیا تم میں اہمیت نہیں ہے؟“
”مجھے کچھ لو۔ میں رشتوں کی زنجیر کا قیدی ہوں۔ ان زنجیروں کو تو زائمرے بس کی بات نہیں۔“
”میں کب کہتی ہوں کہ سب کو چھوڑ دو۔ لیکن مجھے اپنا پولیو! فریال! فریال! مجھ سے بے خود ہونے لگی۔“
”نہیں فری! ایسے نہیں.....“ میں نے کمزوری مزاحمت کی۔

”ایسے دیے کو میں نہیں مانتی۔ تمہاری وجہ سے مجبور تھی لیکن وہ اب مجھے کسی کی پروا نہیں۔“
”میں اسی وقت جب طوفانی جذبات کا دھارا مجھے جھٹکی طرح بہا کے لے جانے والا تھا۔ میں نے باہر سے کسی عورت کی چیخ سنی۔ وہ چلا چلا کے مجھے پکار رہی تھی ”نواب صاحب..... نواب صاحب!“
اس آگ پر جو ہم دونوں کو جلا کے خاک کرنے والی تھی جیسے کسی نے جگ بستی پانی ڈال دیا۔ فریال ایک دم تڑپ کے اٹھی اور بھاگی پھر میں اٹھا۔ مگر مجھ سے پہلے راجا اٹھ گیا تھا۔ اس نے فریال کی چوری چکاری کی مگر وہ انجان بن گیا۔
پھر عورت اب بھی چلا رہی تھی۔

میں غلت میں باہر نکلنے لگا تو فریال نے میرا بازو دھام کے مجھے روکا ”رونی! ایسے مت جاؤ۔“
میں نے کہا ”پھر کیسے جاؤں زور بکتر ہیں کے؟“
”پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔“
میں نے کہا ”معد کرتی ہو تم بھی۔ ایک عورت مدد کے لیے چلا رہی ہے۔ ظاہر ہے معیبت میں ہوگی۔“
”کہیں تم کسی معیبت میں نہ پڑ جاؤ یہ کوئی چکر نہ ہو۔ یہاں کی عجیب دنیا ہے۔“ فریال بدستور میرے بازو سے چٹتی رہی۔

راجا بھی رک گیا تھا لیکن عورت کی آواز پھر مجھے پکارنے لگی ”نواب صاحب! آپ کو اللہ کا واسطہ!“
راجا نے کہا ”تو آپ کی رعایا ہے نواب صاحب!“

اب آپ! اپنے محل کے باہر زنجیر عدل بھی لگو الیں۔ جو فریادی آئے زنجیر پیچھے اور کھٹا بجے حرم میں۔ اب چلیے توپ ہے آپ کے محافظ خاص کے پاس۔“

یابہر کی لائٹس میں نے پہلے ہی جلا رکھی تھیں۔ فریال میرے متع کرنے کے باوجود باہر آگئی۔ وہاں میری گاڑی کے قریب ایک انجینی عورت سال سوا سال کے بچے کو گود میں اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کی اصلی عمر یقیناً کم ہوگی۔ سخت حالات اور سختی ایام نے اس پر قتل از دقت بڑھا پا مسئلہ کر دیا تھا۔

غربت اور افلاس اس کی صورت اس کی خراب صحت اور اس کے پیٹے پرانے کپڑوں سے عیاں تھے۔
جب وہ قریب آئی تو مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کی دھشت نظر آئی اور میں نے اس کے ہیر دیکھے وہ ہمیشہ نیچے باؤں ٹکڑوں پتھروں پر اور جتنی دھوپ سے چٹتی زمین پر اور کانٹوں بھرے راستوں پر چلنے کی عادی تھی۔ شاید بچپن سے اب تک زمین پر جوتے پہن کر چلنے کی عیاشی کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ اس کے باوجود اس کے ہیروں سے خون رس رہا تھا۔

یہ اس تصور رانی عورت کے نازک گلابی اور مٹی جلد والے ہیر نہ تھے جن کے لیے شاعر نے کہا تھا دیکھو تو دلفریب انداز نقش پا۔ موج خرام نہ بھی کیا گل؟ گئی۔ یہ اس حقیقی عورت کے بد صورت زخمی اور گرد آلود ہیر تھے جو آدمی رات کو مظلومیت کی فریاد لے کر دوڑتی ہوئی جنگل سے گزر کے آتی تھی۔

”نواب صاحب!“ وہ چہرہ لہجے میں چلائی اور ایک دم میرے قریب آ کے اس نے بچے کو میرے قدموں میں ڈال دیا ”اس کو بیچو ہونے سے بچا لو نواب صاحب! آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔“
میں نے دیکھا کہ وہ بچہ فرخ خاک پر لیٹا خاموشی سے آسمان کو دیکھ رہا ہے۔ ابھی اسے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کون ہے کہاں ہے اور آج جو اس کے ساتھ ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے؟

مجھ سے پہلے فریال نے جھٹ کر اسے گود میں اٹھایا ”یہ کیا ڈراما کر رہی ہو تم؟“ اس نے براہی سے کہا ”چلو سنبھالو اسے۔“
عورت ہاتھ جوڑ کے زارو قطار رو نے لگی تھی۔ اس نے بچے کو گود میں لے لیا ”اللہ آپ کا سہاگ قائم رکھے بیگم صاحب! مجھے یہ وہ ہونے سے بچا لو۔ وہ اسے مار دیں گے۔“
میں نے کہا ”دیکھو..... مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ تم

کون ہو! کیا اس کا سوتہا راشو ہے..... آرام سے بات کرو ڈرو نہیں۔“
”مجی نواب صاحب! کا سوتہا راشو والا ہے۔“
میں نے کہا ”میں کوئی نواب نہیں ہوں بار بار ایسا مت کہو۔“
فریال نے کہا ”آؤ..... اندر آ کے بتاؤ ڈرنے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔“
راجا نے بھی کہا ”جو ہم سے ہو سکا ضرور کریں گے۔“
وہ اندر آئی اور فرش پر بیٹھ کے اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ فریال نے اسے ایک گلاس میں پانی دیا تو وہ کچھ پرسکون ہوئی ”میں بڑی دور سے آئی ہوں نواب صاحب! چھپ کے..... میرے پاس تاہم بہت کم ہے۔“
میں نے کہا ”کیا چاہتی ہو تم آخر؟“
”آپ کا سو کو بچا لو۔ کل صبح وہ اسے مار دیں گے۔ رانا نے کہا ہے کہ اسے کتے کے ساتھ زندہ دفن کر دیا جائے گا۔“
وہ بھرو نے لگی۔

راجا نے کہا ”اس کی فکر مت کرو۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ فیصلہ ہم تمہارے آنے سے پہلے ہی کر چکے تھے۔“
میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ایسا کہتا آسان ہے لیکن عمل تو مشکل ہوتا ہے۔ رانا صاحب ہوں یا کوئی اور..... کسی کو زندہ دفن کر کے قانون کی گرفت سے کیسے بچ سکتا ہے۔“
وہ بے چین ہونے لگی ”ابھی آپ کو کچھ معلوم نہیں نواب صاحب! قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ہماری تو اوقات ہی کیا ہے۔ ہم کیڑے سے کوڑے ہیں غلام ہیں اس کے۔ اس کے سامنے سراسر اٹھا کے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ نظر اٹھا کے بات نہیں کر سکتے۔ ہماری کون سے گا؟“
میں نے کہا ”میں تم سے کہہ رہا ہوں نا..... کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صبح میں خود پولیس کو لے کر آؤں گا۔“
”اور اخبار والے بھی آ جائیں گے۔“ فریال نے راجا کی طرف دیکھا۔
”کاسو پھر بھی نہیں بچے گا بیگم صاحب!“ وہ مایوسی سے بولی۔

راجا نے کہا ”مگر اخبار والوں نے تصویر بتائی یا قلم بتائی اور پولیس کو بھیج دی تو پولیس کیسے نہیں پکڑے گی رانا صاحب کو۔“
وہ غصے میں بھڑکی ”آپ کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ آپ

محبت نے سو جانے والے بچے کو قائلین پر لٹا دیا اور
سنجیل سنجیل کے ہولنا شروع کیا "یہ ہو سکتا ہے نواب
صاحب!"
"خدا کے لیے یہ نواب صاحب کی رٹ مجھوز۔" میں
نے جھٹلا کر کہا۔

ری کو نوشتہ تقدیر کی طرح قبول کر لیا تھا۔ مالک اور مالکین
سے انعام و اکرام سے نوازتے رہتے تھے اور خوش ہو کے

کی فغاہی حد تک قائم ہوئی تھی۔ اس میں مولے کی کوشش کو بہت دخل تھا۔ اس نے دونوں ماں بیٹی کو قتل کر لیا تھا کہ وہ مخلص ہے اور اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ کچھ پرسکون نظر آنے لگی تھیں۔

ماں نے اعتراف جرم کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کو قتل کر چکی ہے۔ یہ اس کا دوسرا شوہر تھا جس سے اس نے ایک سال قبل شادی کی تھی۔ اس کا پہلا شوہر اٹھارہ سال ساتھ رہا تھا۔ وہ بلوچستان میں کولے کی کان میں کام کرتا تھا۔ زیادہ کمائے کے لیے وہ زیادہ محنت کرتا تھا۔ کان کے اندر کا ماحول اتنا خراب تھا کہ اس کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ جو خوراک اسے ملتی چاہیے تھی وہ ٹھیکے دار نے بھی نہیں دی اور وہ اپنی بھودا آدمی میں نہ بھی خوراک کھا سکتا تھا اور نہ ہی علاج کرا سکتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ماں بیٹی کا دہاں رہنا مشکل ہو گیا۔ ان کے پاس کرائے کی کوٹھڑی تھی۔ شوہر کے جو ٹھوڑے بہت واجبات تھے وہ بھی ختم ہو گئے تو فائدہ کسی کی نوبت آگئی۔ ان کے چاروں طرف ہوس کے مارے ہوئے بھوکے گدھے جیسے مردوں کی دنیا تھی جو ان کے جسم کو بچ لینے۔ ایک دو بار اوپاش لوگ رات کے وقت مین میں بھی کود آئے مگر ان کے شور مچانے پر بھاگ گئے۔ پولیس آئی تو انہیں یوں لگا جیسے غفرہ پیلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے صاف کہا کہ جب مرد نہیں ہے تو دوسرے مردوں کو کب تک روکی پسند کر لو گی کو بھی۔ مرد تو ہم بھی ہیں اور وردی والے بھی ہیں کھائیں گے پلائیں گے اور خوش بھی رہیں گے۔

ایسے ہی ایک ٹھیکے دار نے اسے شادی کی پیشکش کی۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ خود اس کا شوہر اس کی برائیاں کرتا رہتا تھا کہ حرام کھاتا ہے مگر مردوں کے پیسے پورے نہیں دیتا۔ مردوں کو انسان نہیں سمجھتا۔ شادی کی نہیں ہے اور دھرم نہ مانتا پھرتا ہے۔ کسی روز مارا جائے گا۔ یہ سب باتیں بے سبب نہیں ہوں گی مگر شادی کے معاملے میں وہ مخلص نظر آتا تھا اور اسے خود سے زیادہ بیٹی کی فکر تھی۔ اس نے یہ سوچ کے شادی کر لی کہ کم سے کم اس کا گھر تو ہوگا اور باپ سوتا سہی بیٹی کی حفاظت تو کرے گا۔

شادی کے چند ماہ بعد حالات بگڑنے لگے۔ دوسرے شوہر کا اصل چہرہ سامنے آ گیا۔ اسے شراب کی لت تھی اور نئے میں وہ جانور بن جاتا تھا۔ جوان بیٹی کے سامنے بچا ہونے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ پہلے اس پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا مگر وہ بال بال بچ گیا۔ پھر اس کے خلاف مین کے ایک کیس کی تحقیقات شروع ہوئیں تو اس نے کچھ دنوں

کے لیے ردپوش ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر بیوی اور سوتیلی بیٹی کے ساتھ لاہور آ گیا۔ اس نے فرضی نام سے مکان کرائے پر لیا اور کوشش کرتا رہا کہ اس کے خلاف مین کا کیس دب جائے۔

اس کی شراب نوشی جاری رہی اور بہت جلد یہ بات سامنے آ گئی کہ ماں کے ساتھ اس کی نضر سوتیلی بیٹی پر بھی ہے۔ اس روز اس نے نئے میں بیٹی کی آمد لوٹنے کی کوشش کی۔ ماں اس وقت کچھ سودا سلف لینے بازار چلی گئی تھی۔ وہ اچانک پہنچی تو اسے عجیب منہ دکھائی دیا۔ اس کی بیٹی نیم بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک جوان کا مقابلہ کرتے کرتے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور ماں نہ آتی تو شاید وہ جوان اس کے ہوش میں آنے کا انتظار بھی نہ کرتا۔ ماں کا دماغ لٹ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تو! بکلی سے نئی جگہ چھری اٹھا کے اس نے شرابی مرد پر حملہ کیا۔ کسی دشواری کے بغیر شوہر نے بیوی سے چھری چھین لی اور قریب تھا کہ اسے بیوی کو زخم کر دیتا کہ بچے سے بیٹی نے اس کے سر پر پھیل لپ مارا۔ وہ چلا کر گر اتو جنوں میں جھلما ہاں اسے اس کو زخم کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ کچھ دیر رونے دھونے کے بعد جب ان کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو انہیں صورت حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے شناخت ظاہر کرنے والے تمام کاغذات مقرر آنکس کیے۔ جتنا نگر میں تھا ساتھ لیا اور مکان کو تالا ڈال کے نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ جائیں گی کہاں وہ بس کے اڈے پر آئیں۔

جب اس کی باری آئی تو مولے نے پورا بچ نہیں بولا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور چونکہ وہ اپنے نوزائیدہ بچے کو پال نہیں سکتا تھا اس لیے اسے شہر لے آیا تھا کہ کسی خیم خانے کے سپرد کر دے۔ بچے کو اس نے ایسی ہیوم کے باہر رکھے ہوئے بھولے میں ڈال دیا اور رات گزارنے کے لیے قریب کی ایک مسجد میں چھپ کر سو گیا۔ اس کا ارادہ صبح اپنے گاؤں لوٹ جانے کا تھا۔ صبح جب اذان سے پہلے دروازے کھلے تو اس نے باہر نکلتا پایا۔ بد قسمتی سے گزشتہ رات مسجد سے ایک کلاک چوری ہو گیا تھا۔ موذن نے اسے پکڑ لیا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کی کسی نے ایک نہیں سنی۔ پولیس نے مارا کے اسے اعتراف جرم پر مجبور کیا اور دھمکی دی کہ یہ جرم قبول نہ کرنے پر اس کے قبضے سے بہرہ وں کی پڑیاں برآمد ہونے کا کیس درج کر لیا جائے گا۔ جان چھڑانے کے لیے اس نے جرم تسلیم کر لیا اور اسے چھ ماہ کی قید

ہوئی۔ وہ آج ہی جیل سے رہا ہوا تھا اور اب واپس گاؤں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

صبح تک ہونے والی کانفرنس کے نتیجے میں فریقین کے درمیان اعتماد باہمی کا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا۔ مولے نے عورت کو یقین دلایا کہ فرضی نام سے رہائش پذیر اس کے سابق شوہر کی لاش کو لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا جائے گا۔ پولیس اس کی شناخت میں ناکام رہے گی تو اس کی بیوی اور بیٹی تک کیسے پہنچے گی لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ردپوشی کے لیے کسی دور دراز اور گمنام مقام پر چلی جائیں۔ پھر مولے نے انہیں اپنے گاؤں کے بارے میں بتایا جہاں کسی کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہ تھی اور انہیں نیک نیتی کے ساتھ تحفظ اور پناہ کی پیشکش کی۔

مولے میں عورتوں کا دل موہ لینے کی خداداد صلاحیت تھی۔ وہ ماں بیٹی بھی غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہوئیں اور اس کے ساتھ جانے پر تیار ہوئیں۔ ماں بیٹی کو وہ بے حد قابل اعتماد محسوس ہوا تھا اور چونکہ ان کے سامنے نہ کوئی راستہ تھا اور نہ منزل کی چٹانچہ انہوں نے جان بچانے کے لیے قسمت آزمانے کو ترجیح دی۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ گاؤں جا کے وہ لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کیا کہانی سنائیں گے۔ یہ کہانی نصف سچ پر مبنی تھی۔ عورت کی زندگی کے اٹھارہ سال جو پہلے شوہر کے ساتھ گزرے تھے بر حقیقت تھے۔ اگر کوئی تفتیش کرتا جس کا امکان ایک ہی مدد بھی نہ تھا۔ تو اس عورت کے بیوہ ہونے کی تصدیق ہو جاتی۔ بس اس کے دوسرے شوہر کی جگہ مولے نے لے لی۔ درمیان میں سے ٹھیکے دار غائب ہو گیا۔ مولے نے اس سے ملاقات کی اور ایک قابل یقین کہانی شادی اور گاؤں میں انہیں میاں بیوی تسلیم کر لیا گیا۔

درحقیقت وہ میاں بیوی اس وقت تک نہیں بن سکتے تھے جب تک عورت اپنی موت کا زمانہ نہ گزرا لیتی۔ ایک ساتھ رہنے میں خرابی ہوتی۔ آگ اور پتھر دل کو اس لیے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ ایک دن بلا خراجہ بات کی ایسی طوفانی لہر آئی کہ شرعی اخلاقی اور قانونی دیوار محفوظ نہ رہ سکی۔ وہ نکاح کے بغیر عیسیاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے اور بیٹی نے ماں کی اس مجبوری کو نظر پر ضرورت کے تحت تسلیم کیا۔

اس غیر اخلاقی زندگی کے راستے کا انجام اگر ان تینوں کے بچھڑنے کی صورت میں نکلا تو یہ گویا اعمال کی سزا تھی۔ ایک منطقی انجام تھا۔

مولہ جب رانا کی قید سے فرار ہو کے دوبارہ شہر پہنچا تو

اس کے وجود میں بھڑکنے والی آنکس انتقام کسی کی آنکس فضاں کی طرح ہو گئی تھی۔ وہ باگل ہو رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے کیسے ہوتی ہے کیسے آدی کو بچوں بتاتی ہے۔ کیسے مولے کو شہباز سے لڑا دیتی ہے اور کسی طرح موت کا خوف دل سے نکال دیتی ہے۔ اس کے لیے مرجانیا مار دینا اس عورت کی جوانی کے مقابلے میں بہت آسان ہو گیا تھا۔ وہ مرد جس کے لیے برتی عورت بنے اور کسی طلب کے بغیر حاصل ہونے والی چیز تھی ایک پرانی استعمال شدہ عورت پر ساری دنیا کو قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔

سابقہ تجربے اس کے کام آئے۔ وہ ایک اخبار کے دفتر میں پہنچا۔ وہاں سہ پہر کے وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک کمرے میں ایک نئی سنوری فلمی ماڈل ٹاپ شوخ میک اپ اور اشتہاری لباس میں کسی رپورٹر سے فلٹ کے حوسے لے رہی تھی۔ فلمی رپورٹر سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے بے حد مصروف شینڈل میں کب اور کہاں ایئر جسٹ کرے۔ ایسے میں مولے کی مداخلت ان دونوں کو گراں گزری

سازشیں سید کے قلم سے ایک بارسلو اور خوفناک ناول

راکسٹس کی جنگی بولی ایک نیا کردہم میں داخل ہوئی تو اس نے کچھ کھلا۔

راکششیں

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر شے سے انکاری تھا۔

وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔

سرتا جس جسم کا تھا؟ شیطانی اندازوں سے جسم لباس کا متقد تھا۔

ایک ایسے کبدہ صحت کی سستی خیزی جو صرف ایک باگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

قیمت

125.00 روپے

اپنے گراں قدری بکسٹال سے طلب فرمائیے

علی علیان پبلیکیشنز ۳۰ عزیز ٹریڈنگ انڈیا بازار لاہور 07247414

فلیکس سٹال نیشنل بک چوک سیکسٹھال لاہور

پڑے "لو بھئی سنو اس کتے کی بات جو شیر کی طرح بھونکتا ہے۔ اوئے تیری بیوی وہ بھی کب؟ بول..... کیا نکاح پر مہوایا تو نے اس سے؟ اور تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ تو نے کیا جرم کیا ہے؟ بھئی تھانے دار! اس کو بتاؤ اس کے خلاف جرم کی فہرست کیا ہے؟"

مولے کو گرفتار کر کے لانے والی پولیس پارٹی کے انچارج اے ایس آئی نے فر فر بولنا شروع کیا۔ "مولے نے اس عورت سے آشنا کی۔ پھر اس کے شوہر کو قتل کیا اور لاش گھر میں چھوڑ کے اور تالا لگا کے اس عورت کو بچھا لایا۔" اس نے تعزیرات پاکستان کی مختلف دفعات کے علاوہ حدود آرڈی نٹس کی مختلف دفعات کے حوالے سے مولے پر قائم ہونے والے مقدمات کی فہرست پڑھی جن کے تحت اسے ہر جرم پر ایک بار سزائے موت ہو چکی تھی اور اسے سنگسار کیا جا سکتا تھا۔

تھانے دار خاموش ہوا تو مجمع ایک پر تجسس خاموشی کے ساتھ رانا صاحب کی عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ رانا صاحب کی آواز کوئی "تو خود سوزی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی گورنر ہاؤس کے سامنے..... اوئے مولہ کہ اس کے لیے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو یہاں بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے اتنا کھنڈ کر کے نہ تجھے تو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے دس بارہ لاکھ کا نقصان ہو گیا۔ ایک لاکھ دینے پڑے اس بلیک میلر کتے رپورٹر کو جو بھونکے کی دھمکی دیتا تھا۔ دس لاکھ گئے اس کیتا کے پاس جس کی آواز میں آواز ملانے اس جیسی گھروں سے نکل آتی ہیں بھریاں..... سب کے پیچھے یہ چھوٹے موٹے بیورو کریٹ سیاست داں اور..... دم ہلاتے بھرتے ہیں۔"

اچانک رانا صاحب کو احساس ہوا کہ یہ سب مولے سے کہا قطعی لا حاصل ہے۔ انہیں فیصلہ سنانا چاہیے۔ "چل جا مولے! خود سوزی کرنا چاہتا تھا تو..... کر لے..... محمد کچھ ذرا دور جا کے کرنا۔ سنا ہے بڑی گندی بو آتی ہے گنداخون اور گوشت جلنے سے۔" انہوں نے عمارت سے کہا اور پلٹ گئے۔

مولے کو رانا صاحب کے حکم بردار گھیت کر گاؤں سے باہر لے گئے۔ اسے بولی کے ایک گھماڑ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ مولہ چنگار رہا۔ دم بائیں ہاتھ حرکت آخر کی تو بو خدا کی بارگاہ میں بھی ڈول نہیں ہوئی۔ اس پر مٹی کا تھل چڑھا گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک شرابور ہو گیا۔

اس وقت تک غلاموں کا ایک خول اس عورت کو اور اس

بڑے احرام سے ایک لغافہ پیش کیا "یہ والد صاحب نے آپ کے لیے بھجوا یا ہے۔ دس لاکھ کا چیک۔ آپ تو ابھی طرح جانتی ہیں وہ خود حقوق نسواں کے کھتے حامی ہیں اور آپ کی تحریک کے ہمیشہ سے معترف رہے ہیں۔" ان کا میری طرف سے شکریہ ادا کیجئے گا۔" خاتون نے چیک وصول کرتے ہوئے ایک خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس فوٹو گرافر کے کمرے کی طرف دیکھا جس نے بد وقت اندر آ کے تصویر اتار لی تھی۔

"اخبار میں کب آئے گی یہ تصویر؟" رانا نے کہا۔ "کل صبح جناب! اور اس بار رنگین ہوگی۔" فوٹو گرافر بولا۔

چھوٹے رانا نے کہا "اب میں چلا ہوں۔" خاتون نے ایک ادائے ناز سے پلہ کر لیا "بہت جلدی میں ہیں آپ..... خیر اپنی چیز تو لیتے چاہیے۔" اس نے مولے کو اندر بلایا "لو بھئی تمہارا کام تو ایسے ہی ہو گیا۔"

چھوٹے رانا نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ہا! ایسی ناراضی کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ تمہاری بیوی اور بیٹی کو کم لے آئے ہیں۔" مولے کو یقین نہ آیا "آپ لے آئے ہیں؟" "یقین نہیں آتا تو باہر چل کے دیکھ لو۔ وہ بیٹھی ہیں باہر۔"

باہر آ کے مولے کو واقعی یقین آ گیا کہ دنیا گول ہے۔ باہر ایک پولیس وین پہلے سے موجود تھی۔ مولے کو فوری غا کے دین میں پھینک دیا گیا۔ چند گھنٹے بعد وہ پھر وہیں تھا جہاں سے چلا تھا۔ اس کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک استقبال تقریب پولیس وین میں ہی منعقد ہو چکی تھی۔ جب اس نے جہاں حالت میں بڑے رانا صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا تو مولے کو اپنے انجام کے بارے میں کوئی خوش فہمی رہی۔

رانا صاحب نے اس کی پسیلوں میں پے در پے کئی نوکریں مارنے کے بعد کہا "ہاں بھئی مولے! اچھے بیوی باپے اپنی۔ بیٹی تو خیر تیری سے نہیں کہ تو مانگے۔ اس کا باپ ہو گا تو اس سے نہت لیں گے بعد میں۔"

اب گڑ بڑا کے معافی مانگنا لا حاصل تھا۔ مولے نے دو سے لوٹنے ہوئے کہا "رانا صاحب میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔ بیوی مانگ کے۔"

رانا صاحب حاضرین و ناظرین کی طرف دیکھ کے ہنس

دہ مولے کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کے جاتے ہی رپورٹر نے رانا صاحب کو فون کیا اور انہیں بتا دیا کہ مولے نے ان کے خلاف اپنے بیان میں اس پر کیا الزامات عائد کیے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ یہ بیان سن دین شاہ ہو جائے۔ مورتوں کو بار پورا ذکر کرنے کی فلاحی تحریک کی کرنا دھرتیا یہاں موجود تھی۔ اب وہ مولے کو اپنے ساتھ لے گئی ہے۔

چھوٹے رانا صاحب رات کے وقت اخبار کی کاپی پریس میں جانے سے پہلے رپورٹر کے پاس پہنچے اور اسے اپنی شاندار خبری گاڑی میں بٹھا کے ایک فائبر اسٹار ہوش میں لے گئے۔ وہاں ڈر کے بعد اس نے رپورٹر کو پھولوں کا ایک مگی دستہ پیش کیا "یہ والد صاحب نے بھجوا یا ہے۔"

رپورٹر نے تاڑنے والی نظر سے گلدستے میں پوچھنے لگانے کی دہارت کو محسوس کیا اور مسکرا کے تختہ قبول کر لیا "مہو رانا صاحب کے خیر خواہ ہیں ہمیشہ سے۔ ایک تحفہ ہماری طرف سے بھی پیش خدمت ہے۔" رپورٹر نے خوبصورت رنگین کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا چیک آگے بڑھایا۔

رانا نے ہاتھ ملائے وہ پیکٹ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس میں مولے کا شیپ کیا ہوا بیان ہوگا۔ اس خیر خواہ سے یہ اندیشہ بہر حال نہیں تھا کہ اس نے بیان کی کوئی کاپی بنا کے رکھ لی ہوگی۔

مورتوں کو آزادی دلانے والی تنظیم کی چیئر پرسن نے مولے کو حفظ مقدمہ کے طور پر اس رات اپنے ہیڈ روم میں قید رکھا۔ وہ اکیلی رہتی تھی اور اپنی بائیں مٹی کی دروازی پر دے دقتا نوکیلا پاس شرم دھیا اور تین شہروں سے آزادی حاصل کر چکی تھی۔ اس نے مولہ کو ابھی طرح بریف کیا کہ پریس کلب میں صحافیوں کے سامنے اس کو کیا کہنا ہوگا اور ان کے سوالات کے جواب کیسے دینے ہوں گے۔ احتجاجی مارچ ملے جو اسپرلی تک ہوگا کیا نعرے لگائے جائیں گے۔ خواتین کے ہاتھوں میں کس قسم کے بیڑ ہوں گے اور آخر میں وہ کیا تقریر کرے گا۔ وہ اپنی فیلڈ دے گا کہ چوبیس گھنٹے میں اس کی بیوی اور بیٹی کو بازیاب نہ کر لیا گیا تو وہ گورنر ہاؤس کے سامنے خود سوزی کرے گا۔

ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ در بان نے کسی ملاقاتی کا کارڈ پیش کیا۔ چھوٹے رانا صاحب کا نام دیکھ کر وہ مسکرائی "انہیں بھلا ڈرائنگ روم میں۔" وہ دیکھ کر دیر بعد پوری تیاری کے ساتھ مٹی تو رانا نے ولایت پلٹ اپنی ٹیکس کے ساتھ کھڑے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ چائے کے رکی کھف کے بعد چھوٹے رانا نے

نکین جب مولے نے چھوٹے بڑے رانا صاحب کی سوانح عمری سے جدید و سنی خیر واقعات سنانے شروع کیے اور ان کے حرم کی رنگین راتوں کے قصے سنانے تو ان کی ساری کوفت دور ہو گئی۔

رپورٹر نے پولیس کی طرح مولے کو ایک بیان کی تیاری کرائی جو جی برقی ضرورتاً گم زیب داستان کے لیے اس میں بہت کچھ بڑھا دیا گیا تھا۔ مولے کے اعتراض پر کہ یہ تو مجھوت ہے رپورٹر نے کہا کہ دیکھو بھئی! اینٹ کا جواب پتھر سے دیے بغیر بات جتنی نہیں اور وہ کون سا پتھر چا اور ایماندار آدی ہے کہ تم اتنی ایمان داری سے صرف کچ پر اصرار کر رہے ہو۔

مولہ خاموش ہو گیا اور اخبار کے رپورٹر نے اپنی ہدایات کے مطابق اس کا ایک تھلکہ خیر بیان ریکارڈ کیا۔ "اب تم دیکھنا۔ صبح اخبار میں یہ بیان شائع ہوتے ہی چھوٹے بڑے رانا صاحب کے چودہ بیٹن روشن ہو جائیں گے۔" رپورٹر نے کہا۔

مولے نے سر ہلایا "مجھے میری بیوی تو مل جائے گی جناب؟"

"وہ خود لائیں گے تمہاری بیوی اور سوتیلی بیٹی کو اور تم سے ہاتھ جوڑ کے معافی بھی مانگیں گے۔" رپورٹر نے کہا۔

"مٹائی کے طور پر تجھیں بکھ نہ کھل جائے گا۔ نقد یا زمین کی صورت میں۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے پولیس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں؟"

"ارے نہیں یار! پولیس کو بھی تم نے مرگڑ دیا ہے اپنے بیان میں کہ انہوں نے تمہاری رپورٹ لکھنے کے بجائے الٹا تمہیں حالات میں بند کر دیا۔ تمہیں ذرا یاد دھکیا اور تم پر تشدد کیا۔ ان کی نوکریاں جا نہیں گی۔ آئندہ کسی غریب کی بیوی بیٹی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ تم نے بڑا اچھا کیا جو یہاں آ گئے۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت یہاں محترمہ بھی تشریف فرما ہیں۔ یہ خواتین کے حقوق کی بہت بڑی چیمپین ہیں۔ باقی معاملات کو یہ سنبھالیں گی۔"

محترمہ نے ادائے دلبری کے ساتھ مسکرا کے اور ساڑی کا پلہ کر کے اپنی جلوہ سامانی سے مولے کی نگاہوں کو خیرہ کیا "اب تم کھری نہ کرو۔ میں کل ہی ایک احتجاجی مظاہرے اور ایک پریس کانفرنس کا انتظام کرتی ہوں۔ اس سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آ جائے گا۔ آزادی نسواں کی جدوجہد اسی طرح کامیاب ہوگی۔"

بنی دو دن وہاں تھکی رہی۔ تیسرے دن مجرم کی پوزمی ماں زار و قطار روٹی رانا صاحب کے قدموں میں گر گئی تو لاش کو اتار کے دفنانے کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ اسے گاؤں سے دس کوس کے فاصلے پر گاڑا جائے۔

اگلے دن رانا صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ مجرم کے جنازے میں فلاں فلاں نے شرکت کی اور گاؤں کی مسجد کے مولوی نے نہ صرف اسے غسل اور کفن دیا بلکہ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ رانا صاحب نے مولوی کو طلب کر لیا ”اوائے ملا! غسل اور نماز جنازہ تو ہوتا ہے انسانوں کے لیے جن کو عزت کی موت نصیب ہو۔ تمک حرام کتوں کے لیے نہیں۔“

مولوی کی کوئی دلیل کام نہ آئی۔ جنازے میں شریک ہونے والوں کو تو معافی مل گئی مگر مولوی کی داڑھی موچیں اور بھونچیں موچر اور منہ کالا کر کے گدھے پر الٹا بٹھانے کے بعد گاؤں کی گلیوں میں پھرایا گیا اور گاؤں بدر کر دیا گیا۔ اس دار تک کے ساتھ کہ دوبارہ اس کی شکل نظر آئی تو اس کا جنازہ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

کی بیٹی کو گھیر کر لاپچا تھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ چلا رہی تھیں اور فریاد کر رہی تھیں۔ وہ شرمی اور قانونی طور پر شوہر نہ سہی سوچتا باپ نہ سہی، ایک اچھا آدمی تو تھا جس نے انہیں پناہ دی تھی اور آسرا فراہم کیا تھا۔ انہوں نے بھڑکتے شعلوں میں مولے کی ہرج مچ سنی۔ پھر خاموشی چھا گئی اور فضا میں صرف سرسراہٹ شعلوں کی صدا باقی رہ گئی۔ پھر وہ بھی نہ رہی۔ بول کا درخت اور مولے کا جسم راکھ میں تبدیل ہو گئے۔ خود سوزی کے اس واقعے کی خبر کسی اخبار میں شائع نہ ہوئی۔ اس سے صرف غلاموں نے عبرت پکڑی، فہو المطلب۔

دوسرا واقعہ بھی اتنا ہی عبرت ناک اور اسی سے ملتا جلتا تھا۔ ایسے ہی غیرت میں آ کے ایک غلام نے آقا پر قاتلانہ حملے کی جسات کی تھی۔ وہ تو عین وقت پر ایک جائنار اپنی گردن کٹانے کے لیے سامنے آ کے قربان ہو گیا اور نہ اس کی کلبھازی کے وار سے رانا صاحب کا سر عزیز کہیں جا کے گرتا اور دستار خود اپنے لبو سے داغدار ہو کے قدموں میں پڑی ہوئی۔ اس باغی کو بی الفور سزائے موت دی گئی۔ اسے گاؤں کے چوک میں بھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کی لاش نشان عبرت

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

تاوان

زندگی کی اس تاریک دنیا میں جہاں ایک استاد بننے پر مجبور کر دیا

ایک انسان کی کہانی جسے حالات کی ٹھوکروں نے شاہ جہاں سے جہانی استاد بننے پر مجبور کر دیا
بڑے بڑے تیس مارخان مجرم اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔
قانون کے لمبے ہاتھ اُس کی گردن تک پہنچنے سے معذور تھے۔
لیکن پھر ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اُس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا۔
لاہور جیل اور ایک جیل میں اُس پر تشدد کی انتہا کر دی گئی۔
پھر حالات نے اسے انجانے راستوں پر قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔
زندگی جہانی استاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور
فون: 7247414